
NOVEMBER 2011
خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
عید نمبر



نومبر 2011
جلد 39 شمارہ 7
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اُردو بازار، کراچی۔

ناشرہ آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: khawateendigest@hotmail.com , info@khawateendigest.com

مدیرہ

کہی سُنی

خواتین ڈائجسٹ کا نومبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اسلامی سن ہجری کے لحاظ سے یہ آخری مہینہ ہے۔ حج بیت اللہ اور عیدالاضحیٰ کا مہینہ۔ حج کے موقع پر ہر سال لاکھوں مسلمان بلاامتیاز رنگ ونسل دُنیا کے کونے کونے سے اس مقدس فریضے کی ادائیگی کے لیے اپنے خالقِ حقیقی کے حضور حاضر ہوتے ہیں۔ اُمتِ مسلمہ کا یہ اجتماع ایک عالمگیر مساوات، یگانگت اور اخوت کا مظہر ہے۔ اور اس ابدی حقیقت کا ثبوت ہے کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ خواہ ان کا تعلق کسی بھی نسل و قومیت سے ہو۔

عیدالاضحیٰ جسے عید قرباں بھی کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کا مقدس مذہبی تہوار ہے۔ جو ایک ایسے عظیم واقعے کی یادگار ہے جس کی نظیر تاریخ انسانی پیش کرنے سے قاصر ہے۔

باری تعالیٰ نے خواب کے ذریعے حضرت ابراہیمؑ کو اپنے محبوب فرزند اسمٰعیلؑ کی قربانی کا حکم دیا تو آپؑ تہہِ دل سے تیار ہو گئے اور سعادت مند بیٹے نے بھی ارشادِ الٰہی کی تعمیل کے لیے خود کو پیش کر دیا۔ یہ بہت کڑا امتحان تھا جس پر حضرت ابراہیمؑ پورے اترے۔ اللہ تعالیٰ کو قربانی کا یہ جذبہ اتنا محبوب ہوا کہ رہتی دُنیا تک ہر صاحبِ استطاعت پر قربانی فرض کر دی۔

لیکن اسلام کی ہر عبادت کی طرح اس کی روح بھی اخلاصِ نیت پر ہے۔ یعنی ہر نیک عمل کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے حکم کی تعمیل ہو نا کہ دُنیا میں بڑائی اور تعریف و توصیف کا جذبہ۔ بخلوصِ نیت سے کیا جانے والا عمل ہی بارگاہِ الٰہی میں قبولیت کا درجہ پاتا ہے۔

عیدالاضحیٰ کے موقع پر ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے دلی عید مبارک قبول کیجیے۔

اس شمارے میں،

- عیدالاضحیٰ کے موقع پر قارئین سے خصوصی سروے،
- "عید قرباں کی لذتیں"، عیدالاضحیٰ کے موقع پر قارئین سے خصوصی سروے،
- "جو بچے ہیں سنگ" فرحت اشتیاق کا مکمل ناول،
- "تم میرے ہو"، نایاب جیلانی کا مکمل ناول،
- بشریٰ سعید اور آسیہ رزاقی کے ناولٹ،
- راشدہ رفعت، قراۃ العین چنا، سائرہ رضا اور سعدیہ رئیس کے افسانے،
- رفعت ناہید سجاد اور نگہت عبداللہ کے سلسلے وار ناول،
- "مجھ سے ملیے"، میں ابھرتی ہوئی فنکارہ ثناء عسکری سے ملاقات،
- عالمی ایوارڈ یافتہ پاکستانی ایمپائر علیم ڈار سے گفتگو،
- کرن کرن روشنی، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

خواتین کا "عید نمبر" آپ کو کیسا لگا۔ بذریعہ خط یا ای میل ہمیں اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دینِ اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امتِ مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگانِ دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

قربانی کا بنیادی واقعہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، میری راہ میں قربانی کرو۔ حضرت ابراہیمؑ کے لیے خاص طور پر قربانی کا حکم آیا ہے۔ واقعہ اس طرح ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے آتشِ نمرود سے نجات دی اور اس کے مکروفریب سے بچا لیا تو اس کے بعد آپؑ نے فرمایا۔ اب میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے بیت المقدس جاؤں گا اور یہ ہجرت میں اس لیے کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے دین کی ہدایت دے۔ چنانچہ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کی طلب کے لیے ہجرت کی ان میں سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ ہی ہیں۔ آپ کے ساتھ حضرت لوطؑ اور آپ کی بیوی حضرت سائرہ اور حضرت لوطؑ کی ہمشیرہ بھی تھیں۔ حضرت لوطؑ حضرت ابراہیمؑ کے خالہ زاد بھائی تھے۔ آپ نے اپنے ان ہمراہیوں کے ساتھ ہجرت کی اور بیت المقدس جا کر دُعا کی۔ کہ اے اللہ! مجھے ایک صالح فرزند عطا کر۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دُعا قبول فرمائی اور خوشخبری دی کہ اے ابراہیمؑ! ہم نے تمہیں حلیم اور دانا فرزند عطا کیا اور اللہ تعالیٰ بڑا ہی دانا ہے۔ چنانچہ آپ کو ہاجرہؑ کے پیٹ سے فرزند عطا فرمایا، جس کا نام اسماعیلؑ رکھا گیا۔

بالغ ہونے پر وہ اپنے والد کے ساتھ کوہِ عرفات پر گئے تو حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے سے کہا۔

"میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں یہ حکم مجھے اللہ نے دیا ہے کہ میں تمہیں ذبح کروں۔"

حضرت ابراہیمؑ نے ایک منت مانی ہوئی تھی، اس سلسلے میں آپ کو یہ حکم دیا گیا تھا۔ آپ نے بیٹے کو یہ حکم سنا کر کہا۔

"بیٹے! اب تم سوچ سمجھ کر جواب دو کہ تمہاری کیا مرضی ہے؟"

حضرت اسماعیل ؑ نے کہا۔
"آپ اپنے پروردگار کو خوش کرنے کے لیے کوئی کوتاہی نہ کریں۔ مجھے آپ ہر حال میں صابر و شاکر پائیں گے۔"
چنانچہ حضرت ابراہیم ؑ نے یہ خواب متواتر تین رات دیکھا۔ جب آپ اس ارادہ میں پختہ ہوگئے تو اسے انجام دینے کے لیے تیار ہوگئے۔ روزے رکھے، نماز پڑھی۔ پھر فرمایا۔
"اے اللہ! تو مجھے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے میں ان شاء اللہ صابر پائے گا۔"

حضرت اسماعیل ذبیح اللہ کا واقعہ

جب باپ بیٹا ارشاد الٰہی کی تعمیل کے لیے تیار ہوگئے تو حضرت ابراہیم ؑ نے حضرت اسماعیل ؑ کو منہ کے بل زمین پر لٹا دیا۔ ذبح کرنے کے لیے بیٹے کی پیشانی پکڑ لی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ اپنے عاشقوں کے خلوص کا مظاہرہ دیکھ رہا تھا۔ فرمایا۔
"اے ابراہیم ؑ! تو نے واقعی اپنا خواب سچا کر دکھایا اور ہم نے تجھے راضی بہ رضائے مولا پایا۔ اب ہم حکم دیتے ہیں کہ بیٹے کے بجائے اس دنبہ کو ذبح کر دو۔ فرمایا۔ "ہم نے اسماعیل ؑ کے عوض تجھے مبارک ذبیحہ عطا فرمایا۔"

یہ دنبہ حضرت اسماعیل ؑ کے عوض ذبح کیا گیا۔ اس کا نام وزیر تھا اور ان بکریوں میں سے تھا جو چالیس برس تک بہشت میں چرائی گئی تھیں مگر بعض کہتے ہیں یہ وہ دنبہ تھا جسے حضرت آدم ؑ کے فرزند ہابیل نے جو شہید کیا گیا تھا، اللہ کی راہ میں قربان کیا گیا تھا۔ اس وقت سے یہ بہشت ہی میں پرورش پا رہا تھا۔ اور جب حضرت ابراہیم ؑ نے حضرت اسماعیل ؑ کو ذبح کرنا چاہا تو ان کی جگہ بہشت سے یہ دنبہ بھیج دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "نیکو کاروں کو ہم یہی جزا دیتے ہیں جیسی حضرت ابراہیم ؑ کو اس نیک کام اور تعمیل کے تحت دی گئی۔"

ان کے لیے خوشخبری ہے، کیونکہ انہوں نے اللہ کے حکم کی تعمیل میں اپنے بیٹے کو قربان کرنے سے دریغ نہ کیا تھا۔ حضرت ابراہیم ؑ کا یہ خواب دراصل اللہ کا حکم تھا۔ تعمیل حکم کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا یہ تمہارے لیے ظاہر نعمت ہے۔ یعنی معافی کے بعد فدیہ میں دنبہ عطا فرمایا۔ اسی کو ظاہر نعمت سے تعبیر کیا گیا۔
بعض کہتے ہیں۔ جب حضرت ابراہیم ؑ اپنے فرزند کو ذبح کرنے لگے اور ان کے گلے پر چھری رکھی تو غیب سے آواز آئی کہ اے ابراہیم ؑ اپنے بیٹے کو ذبح نہ کر، چھوڑ دے ہماری منشا پوری ہوئی۔ ہمارا مطلب یہ نہ تھا کہ تو اپنے بیٹے کو قربان کرے بلکہ ہمارا مطلب یہ ہے کہ بیٹے کی محبت کو دل سے نکال دے۔
بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم ؑ نے بیٹے کو ذبح کرنے کا ارادہ کیا اور دل میں کہا۔
"یا اللہ! اگر یہ ذبیحہ کسی دوسرے کے ہاتھ سے ہوتا تو اچھا تھا۔
حکم ہوا۔ نہیں تجھے خود کرنا ہوگا۔"
فرشتوں نے اللہ تعالیٰ سے اس کا سبب پوچھا تو ارشاد ہوا یہ اس لیے کہ بلا پر اور زیادہ بلا ہو فرشتوں نے پھر اس کا سبب پوچھا۔ تو ارشاد ہوا۔
"یہ اس لیے کہ حضرت ابراہیم ؑ میرے سوا کسی کو دوست نہ بنائیں۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا وہ میری دوستی میں کسی کو شریک کریں۔"
چونکہ ابراہیم ؑ کو اپنے بیٹے سے بے حد محبت تھی اور یہ محبت میری اور ان کی محبت میں مخل ہوتی تھی، اس لیے میں نے انہیں بیٹے کو ذبح کرنے پر مجبور کیا۔ جیسا کہ حضرت یعقوب ؑ اپنے بیٹے یوسف ؑ سے محبت کرتے تھے۔ جس کی سزا کے طور پر وہ چالیس سال تک اپنے بیٹے سے الگ رہ کر اس کے فراق میں دن رات روتے رہے اور جیسا کہ حضرت محمد ﷺ کو حضرت امام حسن ؓ اور امام حسین ؓ سے بہت محبت تھی اور وہ انہیں دل سے چاہتے تھے۔ اس کی جزا انہیں یہ دی گئی کہ جبرائیل ؑ کے ذریعے اطلاع بھیجی گئی کہ ان میں

ایک کو زہر دیا جائے گا اور دوسرا شہید کیا جائے گا یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ میرا حبیب میرے سوا کسی اور کی دوستی اختیار نہ کرے۔

قربانی کا ثواب

حضرت عبداللہ بن فطرت فرماتے ہیں، کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا۔
"عید الضحیٰ کا دن سب دنوں سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے حضرت فاطمہ رضی سے فرمایا کہ قربانی کے جانور کے قریب کھڑی رہو، اس لیے کہ قربانی کے جانور کی گردن سے جب خون کا پہلا قطرہ گرے گا تو اس کے بدلے میں تمہارے سب گناہ معاف کیے جائیں گے۔ اس وقت یہ کہنا چاہیے۔
إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ
روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا۔
"حضرت داؤد ؑ نے بارگاہ الٰہی میں سوال کیا اے اللہ! محمد ﷺ کی امت میں کسی کو قربانی کرنے کا ثواب ملتا ہے؟"
ارشاد ہوا۔ "ہر بال کے عوض دس نیکیاں ملتی ہیں، دس برائیاں دور ہوتی ہیں اور اس کے دس درجے بلند کیے جاتے ہیں۔"
آپ نے پھر پوچھا۔ "قربانی کا پیٹ چاک کرنے پر کس قدر ثواب ملتا ہے؟"
ارشاد ہوا۔ "قربانی دینے والا جب اپنی قبر سے اٹھے گا تو نہ بھوک اور پیاس سے پریشان ہوگا نہ ہی قیامت کا خوف لاحق ہوگا۔" فرمایا۔
"قربانی کرنے والے کو قربانی کے ہر ٹکڑے کے بدلے میں بہشت میں ایک نور عطا ہوتا ہے اور ہر ٹکڑے کے بدلے ایک گھوڑا عنایت ہوتا ہے۔ جانور کے ہر بال کے بدلے میں جنت میں ایک محل ملتا ہے۔" فرمایا۔
"اے داؤد ؑ! تمہیں علم نہیں کہ قربانی کرنے والوں کے لیے ان کی قربانیاں سواریاں ہیں۔ یہ گناہوں کو مٹاتی اور آفات کو دور رکھتی ہیں لہٰذا لوگوں کو قربانی کا حکم دے۔ قربانی مومنوں کے لیے صدقہ ہے، جیسے اسماعیل ؑ کا ذبیحہ صدقہ تھا۔
آنحضرت صلعم نے فرمایا۔
"لوگو! اچھی طرح قربانیاں کرو کیونکہ قیامت کے دن یہ تمہاری سواریاں ہوں گی۔ جب حضرت علی ؓ نے اس آیت کو پڑھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پرہیزگاروں کا یہ حال ہوگا کہ وہ اچھے اچھے اونٹوں پر سوار ہوں گے جو ان کی دی ہوئی قربانیاں ہوں گی۔ قیامت کے دن قربانیوں کے بدلے میں ان لوگوں کو ایسے ایسے اونٹ ملیں گے جو انہوں نے کبھی دیکھے نہ ہوں گے۔ ان پر سونے کے پالان ہوں گے، زبرجد کی نکیلیں ان کی ناک میں ہوں گی۔ جب یہ لوگ ان پر سوار ہو کر بہشت کو جائیں گے تو بہشت کے دروازے پر پہنچ کر نکیلوں کو ہلائیں گے،
ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا۔
"مسلمانو! قربانی دو اور خوشی خوشی دو، جو شخص جانور کا منہ قبلہ کی طرف کر کے قربانی دے اس قربانی کے تمام بال اور خون کے سب قطرے قیامت کے دن تک محفوظ رکھے جائیں گے۔"
"یہ بھی فرمایا کہ تھوڑا خرچ کرو، اس کا اجر زیادہ ملے گا۔"
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص قربانی کے دن اپنی قربانی کے پاس جاتا ہے، اور اسے اللہ کی راہ میں قربان کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے بہشت کے قریب کر دیتا ہے۔ جب قربانی کے خون کا پہلا قطرہ گرتا ہے تو قربانی کرنے والا بخش دیا جاتا ہے قیامت میں یہی قربانی اس کی سواری ہوگی۔ جانور کے بال اور پشم کے برابر اسے نیکیاں ملتی ہیں۔
قربانی دینا سنت ہے، جو قربانی دینے کی طاقت رکھتا ہو امام احمد، امام مالک، امام شافعی کے نزدیک اس کی قربانی ترک کرنا اچھا نہیں۔ ان ائمہ کے سوا

باقی سب نے قربانی کو واجب قرار دیا ہے۔ مستحب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے۔

"مجھے قربانی کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور تمہارے لیے قربانی سنت ہے۔ ایک اور حدیث کے مطابق آپ کا ارشاد ہے کہ تین چیزیں میرے لیے فرض ہیں اور تمہارے لیے نفل، قربانی کرنا، وتر کی نماز اور نمازِ فجر سے قبل دو رکعت نماز۔

اُم سلمہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا۔

"قربانی دینے والے کے لیے ضروری ہے کہ ذوالحجہ کا عشرہ شروع ہونے کے بعد اپنے بدن سے بال نہ اُتروائے۔

ان روایتوں سے معلوم ہوا کہ آنحضرتؐ نے قربانی کو ہر آدمی کی خواہش پر رکھا ہے اور جب یہ واجب کی گئی ہے تو اس کا ارادے سے کوئی تعلق نہیں۔

قربانی کے جانور

قربانی کے جانوروں میں اونٹ سب سے افضل ہے، پھر بکری اور چھ ماہ کا بھیڑ کا بچہ۔ اس کے سوا دو دانت والے قربانی کے لیے جائز ہیں۔ جذع چھ ماہ کا کامل ہوتا ہے اور ثنی ایک سال کا۔ گائے دو سال سے کم نہیں ہونی چاہیے۔ اونٹ پانچ سال کا جائز ہے۔ ایک آدمی کو ایک بکری دینی چاہیے۔ اونٹ یا گائے سات آدمی مل کر دے سکتے ہیں۔ جانور کا رنگ سفید ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ زرد اور سیاہ رنگ دوسرے اور تیسرے درجہ پر ہیں۔ اوّل تو اپنے ہاتھ سے قربانی کرنی چاہیے۔ خود نہ کر سکے تو پاس کھڑے ہو کر دیکھنا ضروری ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ

منصور نے شعبی سے، انہوں نے براء بن عازب سے روایت کی ہے کہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے روز ہمیں خطبے میں فرمایا۔

"جو شخص ہماری طرح نماز پڑھتا اور قربانی کرتا ہے، وہ ہمارے ان صحابہ میں سے ہے، جو قربانی دیتے ہیں اور جو شخص نماز سے پہلے قربانی کرتا ہے اس کی قربانی عام بکری کے گوشت کی مانند ہے۔"

یہ سن کر ابو بردہؓ نے عرض کیا۔

"میں تو نماز سے پہلے ہی قربانی دے آیا ہوں، چونکہ آج کھانے پینے کا دن تھا اس لیے میں نے قربانی دینے میں جلدی کی۔ قربانی کے بعد خود بھی کھایا اپنے اہل اور ہمسایوں کو بھی کھلایا۔"

اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تیری یہ قربانی عام بکری کے گوشت کے برابر ہے۔"

تب ابو بردہؓ نے عرض کیا۔

"میرے پاس چھ ماہ کا بکری کا بچہ ہے، مگر وہ توانائی میں دو بکریوں کے برابر ہے۔ کیا میں اس کی قربانی کر دوں؟"

آپؐ نے فرمایا۔ "ہاں ایسی قربانی کے لیے کافی ہے مگر آئندہ کوئی ایسا نہ کرے۔"

اسود بن قیسؒ سے روایت ہے کہ میں نے دیکھا قربانی کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے لوگوں کے پاس سے گزرے جو نماز سے پہلے قربانی کر چکے تھے۔ آپؐ نے اُن سے فرمایا۔

"جس نے نماز سے پہلے قربانی کی ہے۔ اس کی قربانی نہیں ہوئی۔ وہ دوبارہ نماز کے بعد قربانی کرے۔"

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ جو نماز سے پہلے قربانی کرے اس کے لیے یہی بہتر ہے کہ نماز کے بعد پھر قربانی کرے اور جس نے نماز سے پہلے قربانی نہ کی ہو۔ وہ بعد نماز ذبح کرے۔"

قربانی کا طریقہ

جب آپؐ قربانی کے لیے بکری کو ذبح کرتے تو اپنا پاؤں اس کے مونڈھے پر رکھتے پھر بسم اللہ اللہ اکبر کہتے اور ذبح کرتے۔

آپؐ نے لوگوں کو حکم دیا کہ جب ذبح کریں تو اچھے انداز سے کریں یعنی چھری تیز ہو اور جلدی ذبح کریں۔ (زاد المعاد)

ابو داؤد میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ وہ عیدگاہ میں عیدالاضحیٰ کے دن آپؐ کے ہمراہ حاضر ہوئے۔ جب آپؐ نے خطبہ مکمل کر لیا تو ایک مینڈھا لایا گیا آپؐ نے اسے اپنے ہاتھ سے ذبح کیا اور بسم اللہ اللہ اکبر پڑھا اور فرمایا کہ یہ میری طرف سے اور میری امت کے ہر آدمی کی جانب سے ہے۔ جس نے ذبح نہیں کیا اور صحیحین میں مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عیدگاہ میں نحر اور ذبح کیا کرتے۔ (زاد المعاد)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قربانی کے دن یعنی عید قرباں کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاہ سفیدی مائل سینگوں والے دو خصی مینڈھوں کی قربانی کی۔ جب آپؐ نے اُن کا رُخ صحیح یعنی قبلہ کی طرف کر لیا تو یہ دعا پڑھی۔

"اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ عَلٰی مِلَّةِ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ اَللّٰهُمَّ مِنْكَ وَلَكَ عَنْ مُحَمَّدٍ وَّاُمَّتِهٖ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَرُ ۝"

پھر ذبح کیا۔

ترجمہ:۔ میں نے اس ذات کی طرف اپنا رُخ موڑا جس نے آسمانوں کو اور زمینوں کو پیدا کیا، اس حال میں کہ میں ابراہیم (علیہ السلام) حنیف کے دین پر ہوں اور مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔ بیشک میری نماز اور میری عبادت اور میرا مرنا جینا سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو ربّ العٰلمین ہے۔

جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ اے اللہ یہ قربانی تیری توفیق سے ہے اور تیرے ہی لیے ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کی امت کی طرف سے۔ شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے، اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے۔

(احمد و ابو داؤد۔ ابن ماجہ۔ والدارمی)

ذبح کرنے کے بعد پڑھنے کے لیے یہ دعا ماثور ہے

اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْهُ مِنِّیْ كَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ حَبِیْبِكَ مُحَمَّدٍ وَّخَلِیْلِكَ اِبْرَاهِیْمَ عَلَیْهِ السَّلَامُ۔

ترجمہ: اے اللہ! اسے میری جانب سے قبول فرمایئے جیسے کہ آپ اپنے حبیب سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے خلیل سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی قربانیاں قبول فرما چکے ہیں۔

اگر یہی دعا دوسرے کی طرف سے پڑھی جائے تو دعائے مذکورہ میں مِنِّی کے بجائے مِنْ کہے اور پھر اس کا نام لے۔

عیدگاہ جانا

عیدگاہ میں عید کی نماز کے لیے جانے والے کے لیے مستحب یہ ہے کہ نماز کے بعد دوسرے راستے سے واپس آئے۔

بعض کہتے ہیں کہ آنحضرت صلعم جس راستے سے گئے تھے، اس کی زمین آپؐ کے حق میں گواہی دیتی تھی اس لیے آپؐ اس راستے سے عیدگاہ تشریف لے گئے مگر بعض کا کہنا ہے کہ آپؐ جاتے وقت ایک قبیلہ کے راستے سے گئے اور واپس دوسرے قبیلہ کے راستے سے ہوئے تاکہ دونوں قبائل آپؐ کے دیدار کا شرف حاصل کر سکیں اور دونوں کو برابر کا ثواب حاصل ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"اے نبی! ہم نے تمہیں جہاں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔"

بعض کا کہنا ہے کہ آنحضرت صلعم پیغمبروں اور ولیوں کے نیچے جو زمین آتی ہے وہ چونکہ سب سے زیادہ فخر کرتی ہے اس لیے آپ مختلف راستوں سے جاتے تھے تاکہ ہر طرف کی زمین کو برابر کا ثواب ملے۔





غزل

انشا جی

شامِ غم کی سحر نہیں ہوتی
یا ہمیں کو خبر نہیں ہوتی

چاند ہے، کہکشاں ہے تارے ہیں
کوئی شے نامہ بر نہیں ہوتی

ہم نے سب دکھ جہاں کے دیکھے ہیں
بے کلی اس قدر نہیں ہوتی

اک جاں سوز و نامراد خلش
اس طرف ہے، ادھر نہیں ہوتی

نالہ یوں نارسا نہیں ہوتا
آہ یوں بے اثر نہیں ہوتی

رات آ کر گزر بھی جاتی ہے
اک ہماری سحر نہیں ہوتی



حُسن سب کو خدا نہیں دیتا
ہر کسی کی نظر نہیں ہوتی

بے قراری سہی نہیں جاتی
زندگی مختصر نہیں ہوتی

دل پیالہ نہیں گدائی کا
عاشقی در بہ در نہیں ہوتی

ایک دن دیکھنے کو آ جاتے
یہ ہوس عمر بھر نہیں ہوتی



باتیں ثنا عسکری سے

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"
"ثنا عسکری۔"
2 "پیار کا نام؟"
"کوئی خاص نہیں۔ ابا مجھے "سنی" بولتے ہیں۔"
3 "سن پیدائش / شہر؟"
"23 اپریل 1987ء / کراچی۔"
4 "قد / ستارہ؟"
"5 فٹ 3 انچ / ٹورس۔"
5 "بہن بھائی / آپ کا نمبر؟"
"ایک بہن ایک بھائی / میں آخری ہوں۔"
6 "تعلیمی قابلیت؟"
"فائن آرٹس میں گریجویٹ ہوں۔"
7 "شادی؟"
"ڈھائی سال ہو گئے ہیں اور میری لو میرج ہے۔"
8 "شوبز میں آمد؟"
"میاں صاحب جن کا نام منہاج عسکری ہے' ان کے کہنے پہ آئی۔"
9 "پہلا پروگرام؟ / وجہ شہرت؟"
"آر کی آئے گی بارات" اور یہی سیریل وجہ شہرت بنا۔"
10 "پہلی کمائی؟"
"بہت کم تھی۔ نہ ہی لکھیں تو بہتر ہے۔ بس کھانے پینے میں اڑا دیے تھے۔"
11 "صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"
"کافی پیتی ہوں' کیونکہ کافی پینے کا ہی دل چاہتا ہے۔"
12 "اپنے چہرے کے نقش و نگار میں کیا پسند ہے؟"
"اپنی Skin اور نقش ٹھیک ہیں۔"
13 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
"صرف اور صرف اپنے کمرے میں۔"
14 "شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟"
"بہت غصہ آتا ہے۔"
15 "اپنے مسائل کس سے شیئر کرتی ہیں۔"
"اپنے میاں صاحب سے....."
16 "کوئی گہری نیند سے بیدار کر دے تو؟"
"بہت چڑ ہوتی ہے' خواہ وہ میاں صاحب ہی کیوں نہ ہوں۔"
17 "پہلی ملاقات میں شخصیت میں کیا دیکھتی ہو؟"
"جوتے اور پاؤں۔"
18 "آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟"
"بال کم ہو رہے ہیں۔ کڑوا کر اور بھی افسوس ہوتا ہے۔"
19 "اگر اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کی اجازت ہو تو؟"
"میں ابھی بھی اپنی مرضی کی ہی زندگی گزار رہی ہوں۔ کوئی ٹینشن نہیں ہے۔ میری ساس بہت اچھی ہیں۔"
20 "اپنے آپ کو کب بے بس محسوس کرتی ہیں؟"
"جب کام پہ ہوتی ہوں اور بہت تھک جاتی ہوں تو کام کرنے کو بالکل بھی دل نہیں چاہتا۔"
21 "زندگی میں کس چیز کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے؟"
"میرا خیال ہے اپنے لیے۔"
22 "آپ کے لیے کون جان دے سکتا ہے؟"
"میرے خیال سے کوئی نہیں اور کیوں کوئی جان دے۔ جب میں کسی کے لیے نہیں دے سکتی تو کوئی میرے لیے کیوں دے گا۔"
23 "اگر دعا سے کچھ مل سکتا تو کیا مانگتی؟"
"اپنے شہر کراچی کا سکون۔"
24 "کوئی شخص جس نے آپ کی زندگی بدل دی ہو؟"
"میرے میاں منہاج عسکری۔"
25 "جب آپ پہلی مرتبہ نیا پین استعمال کرتی ہیں تو کیا لکھتی ہیں؟"
"اپنا نام سائن کرتی ہوں۔"
26 "کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"
"نہیں نہیں' کھانا نہیں چھوڑ سکتی۔ خواہ کتنا ہی غصہ کیوں نہ آ رہا ہو۔"
27 "کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟"
"مجھے مختلف لوگوں کے ہاتھوں کی مختلف ڈشیں پسند ہیں۔ امی کے ہاتھ کے بہاری کباب' ساس کے ہاتھ کی بریانی۔ میری نانی ساس پلاؤ بہت مزے کا پکاتی ہیں۔ میری بہن کڑاہی اور میری نند حلیم بہت مزے کی پکاتی ہے۔"
28 "پسندیدہ ناشتہ / کھانا؟"
"چائے پراٹھا / اور کھانے تو سب ہی پسند ہیں۔"
29 "موڈ کب خراب ہوتا ہے؟"
"جب نیند ڈسٹرب ہو جائے اور کوئی بدتمیزی کرے تو۔"
30 "پہننے اوڑھنے میں کیا پسند ہے؟"
"مجھے جوتے بہت پسند ہیں اور بیگز۔"
31 "ملک میں کون سی تبدیلی بہت ضروری ہے؟"
"دہشت گردی کے خلاف کوئی ٹھوس قانون بننا ضروری ہے۔"
32 "پسندیدہ چینل؟"
"میں ٹی وی بہت کم دیکھتی ہوں۔ موویز زیادہ دیکھتی ہوں۔"
33 "کیا اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہیں؟"
"بالکل' پہلے ایسا نہیں تھا۔"
34 "پسندیدہ صحافی؟"

"کوئی نہیں۔"

35 "کبھی مانگ کر تحفہ لیا؟"

"میں ہمیشہ مانگ کر تحفہ لیتی ہوں۔"

36 "کیا محبت ایک بار ہوتی ہے؟"

"ہاں، مجھے تو ایک ہی بار ہوئی اور پھر انہی سے شادی ہو گئی۔"

37 "کس بات پر غصہ آتا ہے؟"

"اگر مجھے بار بار کسی بات کو دہرانا پڑے۔"

38 "فقیر کو کم سے کم کتنا دیتی ہیں؟"

"کوئی تعداد مقرر نہیں ہے۔ جیسا فقیر ہو گا اسی حساب سے دوں گی۔"

39 "غصے میں آپ کی کیفیت؟"

"چیختی ہوں۔ مگر ببل اپ کی بوتل کی طرح ہوں۔ غصہ آتا ہے پھر جھاگ کی طرح بیٹھ بھی جاتا ہے۔"

40 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"

"میرے بابا ایک بات بہت بولتے ہیں۔ شا' کھانا کھالو تو میں چڑ جاتی ہوں کہ بھوک لگی تو کھالوں گی۔"

41 "کس لمحے نے زندگی بدل دی؟"

"شادی' شادی میری زندگی میں بہت بڑا چیلنج ہے اور بہت اچھا بھی۔"

42 "کس پر چیخنے چلانے کو دل چاہتا ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ کسی پہ بھی نہیں۔"

43 "سارا دن میں آپ کا پسندیدہ وقت؟"

"رات کا' جب میں گھر آتی ہوں۔"

44 "کوئی لڑکا مسلسل گھورے تو؟"

"تو اسے سنا دوں گی۔"

45 "انٹرویو کے دوران کوئی سوال جو برا لگتا ہے؟"

"کہ کیا آپ کی "لو میرج" ہے؟ بھئی کتنی مرتبہ بتا چکی ہوں کہ لو میرج ہے۔"

46 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"

"جس دن ہڑتال ہوتی ہے اور بندہ گھر میں قید ہو کر رہ جاتا ہے۔"

47 "شہرت کیسی لگ رہی ہے؟"

"ابھی کہاں؟..... ابھی تو لمبا سفر طے کرنا ہے۔"

48 "موبائل فائدہ مند یا نقصان دہ؟"

"جب رانگ کالز آتی ہیں تو دل چاہتا ہے کہ پھینک دوں۔ ویسے بہت فائدہ مند ہے کہ گھر والوں سے رابطہ رہتا ہے۔"

49 "چھٹی کا دن کیسے گزارتی ہیں؟"

"آدھا دن سوتی ہوں اور باقی کا آدھا دن منہاج کو اور اپنے ماں باپ کو دیتی ہوں۔"

50 "شوبز کی سب سے بڑی برائی؟"

"ایسی کوئی برائی نظر نہیں آ رہی۔ میں بہت انجوائے کر رہی ہوں۔"

51 "تہوار' جو شوق سے مناتی ہیں؟"

"اپنی برتھ ڈے اور عید۔"

52 "جھوٹ کب بولتی ہیں؟"

"جب بہت زیادہ پھنس جاتی ہوں۔"

53 "سائنس کی بہترین ایجاد؟"

"ٹی وی۔"

54 "کون سی تقریبات میں جانا پسند نہیں؟"

"کسی انجانے کی شادی میں۔"

55 "موت سے ڈر لگتا ہے؟"

"نہیں بالکل نہیں۔"

56 "گھر آ کر پہلی خواہش کیا ہوتی ہے؟"

"اپنا کمرہ دیکھتی ہوں کہ صاف ستھرا ہے یا نہیں۔"

57 "کبھی چھٹی حس ایکٹو ہوئی؟"

"کبھی اپنے بارے میں ایکٹو نہیں ہوئی البتہ دوسروں کے بارے میں ایکٹو رہتی ہے۔"

58 "قسمت پہ کتنا یقین ہے؟"

"بہت زیادہ 100 فیصد۔"

59 "اپنی شخصیت میں کیا بدلنا چاہتی ہیں؟"

"تھوڑا غصہ کم کرنا چاہتی ہوں۔"

60 "کیا دعا سے قسمت بدل سکتی ہے؟"

"بالکل۔"

61 "بھروسے کے قابل کون ہوتا ہے لڑکے یا لڑکیاں؟"

"لڑکے۔"

62 "تنہائی میں کس سے ہمکلام ہوتی ہیں؟"

"اللہ تعالیٰ سے۔"

63 "اپنا موبائل نمبر کتنی مرتبہ تبدیل کر چکی ہیں؟"

"بہت کم..... ایک آدھ دفعہ ہی تبدیل کیا۔ کیونکہ بار بار بدلنے سے مشکل ہوتی ہے۔"

64 "سفر کس پہ کرتی ہیں، رکشا پہ' بس پہ یا اپنی کار پہ؟"

"اپنی کار پہ' میرے میاں کو یہ بات پسند نہیں کہ میں رکشہ' ٹیکسی یا بس میں سفر کروں۔"

65 "ایک انوکھی خواہش؟"

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری ساری خواہشیں پوری ہو جاتی ہیں۔"

66 "گھر والوں کی کس بات سے موڈ آف ہو جاتا ہے؟"

"کسی بات سے نہیں۔ سب بہت خیال رکھتے ہیں۔"

67 "کن چیزوں پہ خرچ کرتی ہیں؟"

"گھومنا پھرنا' کھانا پینا' جوتے لینا' بہت کھلا ہاتھ ہے میرا۔"

68 "فٹ پاتھ پہ کھڑے ہو کر کن چیزوں کا جائزہ لیتی ہیں؟"

"روڈ کتنا خراب ہے۔ ٹریفک کتنی زیادہ ہے۔"

69 "کس چیز کے بغیر نہیں رہ سکتیں؟"

"فیملی کے بغیر۔"

70 "کس شخص سے خوفزدہ رہتی ہیں؟"

"انسانوں میں تو میں کسی سے خوفزدہ نہیں رہتی۔ بس اللہ تعالیٰ سے ڈر لگتا ہے۔"

71 "اپنی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟"

"بری عادت مجھے صبح سونا اچھا لگتا ہے میں پوری رات جاگتی ہوں اور صبح 5 بجے سوتی ہوں۔ اچھی بات یہ کہ سب سے دوستی ہو جاتی ہے۔"

72 "دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو ترو تازہ محسوس کرتی ہیں؟"

"رات کے وقت۔"

73 "آدھی رات کو آنکھ کھل جائے تو؟"

"آدھی رات کو آنکھ کیا کھلے گی، کیونکہ میں تو سوتی ہی صبح 5 بجے ہوں۔"

74 "ایک شام جو اپنی پسندیدہ شخصیت کے ساتھ گزارنا چاہتی ہیں؟"

"کوئی خاص شخصیت نہیں' صرف اپنی فیملی کے ساتھ۔"

75 "کس ملک کے لیے کہتی ہیں کہ کاش یہ ہمارا ہوتا؟"

"کسی کے لیے بھی نہیں۔ اپنا ملک بہترین ہے۔"

76 "اچانک چوٹ لگنے پہ بے ساختہ جملہ؟"

"جو پیچھے کھڑا ہوتا ہے اس پہ الزام لگاتی ہوں اور وہ میرا میاں ہوتا ہے۔" (قہقہہ)

77 "بستر پہ لیٹتے ہی سو جاتی ہیں یا کروٹیں بدلتی ہیں؟"

"مجھے نیند بہت مشکل سے آتی ہے۔ دن میں سلا لیں' رات میں نہیں سو سکتی۔"

78 "انسان کا بہترین روپ/ مرد یا عورت؟"

"آپ کے کردار پر منحصر ہے۔ جس کا کردار اچھا ہے' خواہ وہ مرد ہو یا عورت' وہ اچھا ہے۔"

79 "کھانے کے لیے بہترین' جگہ ڈائننگ ٹیبل یا چٹائی؟"

"ڈائننگ ٹیبل۔"

80 "کون سے الفاظ بہت زیادہ استعمال کرتی ہیں؟"

"او گاڈ..... شٹ اَپ اُف۔"

"اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"

"کوئی بات نہیں' میں کچھ اور کر لوں گی۔"

☼

عیدِ قرباں کی خوش کن گھڑیاں آپ کے در پر دستک دینے کو ہیں۔ رنگین مہکتے آنچل، کھنکتی چوڑیاں اور خوشی سے دمکتے سجے سجائے چہرے تو عید کی رونقیں بڑھاتے ہی ہیں، تاہم عید قرباں کا اصل حسن بلاشبہ لذت کام و دہن کے پُر تکلف اہتمام اور آپ کے سلیقہ و مہارت سے وابستہ ہے اور یہی خوبیاں ایک خاتون کا اصل سنگھار بھی ٹھہریں۔

مہمان نوازی ہماری حسین مشرقی روایات میں سے ایک ہے۔ عید پر یہ روایت اور بھی دل نشیں انداز میں سامنے آتی ہے کہ عید کے دن خاتون خانہ عام دنوں سے کہیں بڑھ کر تعریفیں سمیٹنا چاہتی ہے۔ حسب سابق ہم نے عید قرباں کے موقع پر قارئین بہنوں سے سروے کیا ہے۔ ہمارا سوال تھا کہ:

(1) "عید کے موقع پر اگر آپ کو کچھ دوستوں، عزیزوں کی دعوت کرنے کو کہا جائے تو آپ کیا مینو ترتیب دیں گی؟ میٹھا اور گوشت کی کیا ڈشز بنائیں گی؟ ایسی کون سی چیز شامل کریں گی کہ مہمان آپ کی ہنرمندی اور سلیقہ کی داد دیتے ہوئے خوش خوش رخصت ہوں؟"

عیدِ قرباں کی لذتیں

ادارہ

شبانہ نوید...... ملتان

بقر عید پہ جہاں گوشت کی نئی نئی ڈشز بنائی جاتی ہیں، وہاں یہ بھی سننے کو ملتا ہے کہ گوشت (یعنی مٹن، بیف) دیکھ دیکھ کر دل بھر گیا ہے۔ کھانے کو دل نہیں چاہتا۔ اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں اپنے گھر دعوت میں جو مینو ترتیب دوں گی، اس میں گوشت کی جو بھی ڈش بناؤں گی، اس میں آئل کی مقدار کم رکھوں گی کیونکہ عید کے گوشت میں چکنائی کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔

میں دھواں گوشت بناؤں گی۔ جن لوگوں کو قربانی کے گوشت سے بُو آنے کی شکایت ہوتی ہے، وہ بھی شوق سے کھاتے ہیں۔ فرائیڈ چانپیں بناؤں گی۔ پلاؤ چکن کا ہوگا۔ بیف کے شامی کباب بناؤں گی۔ مچھلی فرائی کروں گی، جسے عید سے پہلے مسالا لگا کر فریز کر دوں گی۔ گاجر کا حلوہ بھی عید سے پہلے تیار کر لوں گی۔ دو قسم کے سلاد بناؤں گی۔ دو تین قسم کے پھل جیسے سیب، کیلا، انگور، انار میں مایونیز یا کریم ڈال کر سلاد بنایا جاسکتا ہے۔ دوسرا میکرونی ابال کر نتھار لیں۔ بند گوبھی، گاجر، شملہ مرچ اور ہری پیاز اگر چاہیں تو تھوڑا سا ابلا ہوا چکن یا قیمہ لیں۔ ان کو ہلکے آئل میں فرائی کر لیں۔ نمک، کالی مرچ ملا کر میکرونی شامل کریں۔ سویا سوس ڈال کر اتار لیں۔ اس کے ساتھ ساتھ روایتی سلاد پیاز، ٹماٹر، کھیرا والا بھی ضروری ہے۔

دہی میں ہری مرچ، ہرا دھنیا، پودینہ، نمک ڈال کر مزیدار رائتہ بناؤں گی۔ میرا خیال ہے اتنا سب کچھ کافی رہے گا۔ اب دھواں گوشت کی ترکیب بتاتی ہوں۔

دھواں گوشت

بکرے کے گوشت میں پیاز، لہسن، ادرک، نمک، مرچ، ثابت دھنیا، ہلدی ڈال کر گلا لیں۔ آئل بھی شامل کر دیں۔ اچھی طرح بھوننے کے بعد ایسے ڈونگے میں نکال لیں جس کا ڈھکن شیشے کا ہو، یعنی دھواں باہر نہ نکلے۔ اب دہی (جو زیادہ کھٹا نہ ہو) کو پھینٹ کر اس کے اوپر ڈالیں۔ باریک چھلے والی پیاز، ہری مرچیں، ہرا دھنیا اور پودینہ کاٹ کر اس کے اوپر ڈالیں۔ پھر روٹی کا ٹکڑا رکھ کر اس پر دہکا ہوا کوئلہ رکھیں۔ آئل ٹپکا کر ڈھکن بند کر دیں۔ پندرہ منٹ بعد روٹی اور کوئلہ نکال کر سرو کریں۔

چانپیں بنانے کے لیے پہلے ان کو نمک ڈال کر اپنے پانی میں گلا لیں۔ پھر مسالہ لگا کر فرائی کریں۔ اب اس میں بھی بُو نہیں آئے گی۔ روٹی بازار سے منگواؤں گی۔ آخر مجھے خود بھی تو تیار ہونا ہے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے مہمان آپ کے گھر سے خوش ہو کر جائیں تو کوشش کریں اپنا تمام کام ان کے آنے سے پہلے مکمل کر لیں تاکہ آپ ریلیکس ہو کر ان کو ٹائم دیں۔ آپ کی خوش اخلاقی، صاف ستھرا گھر اور محبت سے بنایا ہوا کھانا یقیناً" مہمانوں کو خوش کرنے کا باعث بنے گا۔ چاہے آپ بہت زیادہ اہتمام نہ بھی کریں۔ آخر میں آپ سب کو عید مبارک۔

عظمیٰ حیدر...... لانڈھی کراچی

عید پر اپنے دوستوں اور عزیزوں کو دعوت دینے اور مینیو ترتیب دینے میں مجھے ہمیشہ ہی بہت مزا آتا ہے۔ مینیو میں بریانی کا ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ میرے نزدیک اس کے بغیر دعوت مکمل نہیں ہوتی۔ چونکہ عید کی دعوت ہے لہٰذا مٹن بریانی کے ساتھ چپلی کباب اور فرائی مغز تو ضرور ہوگا۔ ساتھ میں سیخ کباب رکھوں گی۔ اس کے ساتھ نان یا تندوری روٹی کے بجائے گھر پر ہی سادہ پوریاں بناؤں گی۔ ساتھ میں رائتہ



اور سلاد لازمی ہے۔ اور ہاں، فرائی قیمہ بھی ضرور ہو گا۔ جبکہ میٹھے میں شیر خرما تو عید کا لازمی جزو ہے، اس کے ساتھ میں گھر پر ہی گلاب جامن تیار کروں گی اور آخر میں موسم کے اعتبار سے کافی سرو کروں گی اور ہنر مندی تو اسی میں ہے کہ ہر چیز کو سلیقے سے پیش کیا جائے تو یقیناً" مہمان ضرور خوش ہوں گے۔ اب میں چپلی کباب اور گلاب جامن کی ترکیب لکھوں گی۔

چپلی کباب

ضروری اجزا :

قیمہ	300 گرام
پیاز	1 عدد
ٹماٹر	2 عدد
پودینہ	تھوڑا سا
ہرا دھنیا	تھوڑا سا
ہری مرچ	3 عدد
ادرک لہسن (پسا ہوا)	2 چائے کے چمچے
انار دانہ	2 چائے کے چمچے
کٹا ہوا ثابت دھنیا	تھوڑا سا
کٹا ہوا زیرہ	تھوڑا سا
کٹی لال مرچ	تھوڑا سا
انڈا	1 عدد
بیسن	2 کھانے کے چمچے
ادرک	1 انچ کا ٹکڑا
گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ضرورت
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

تمام چیزوں کو فائن چوپ کر لیں۔
تمام اجزاء کو ملا کر چپٹے اور بڑے سائز کے کباب بنا لیں اور درمیانی آنچ پر شیلو فرائی کر لیں۔

گلاب جامن

ضروری اجزا :

کھویا	1 پاؤ
سوجی	1 چائے کا چمچہ
انڈا	آدھا چائے کا چمچہ
میدہ	1 چائے کا چمچہ
بیکنگ پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
چینی	آدھا کلو
پانی	ڈیڑھ گلاس
کیوڑہ	تھوڑا سا
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

کھویا میں سوجی، انڈا اور بیکنگ پاؤڈر شامل کر کے مکس کر لیں پھر اس میں تھوڑا سا میدہ ڈال کر ہاتھ سے گوندھیں۔ جب یہ نرم ہو جائے تو ہاتھ میں ذرا سا تیل لگا کر چھوٹی چھوٹی گولیاں بنا لیں اور انہیں کم گرم تیل میں ڈال دیں اور گولڈن ہونے پر اتار لیں۔ ایک برتن میں شکر اور پانی ڈال کر شیرہ بنا لیں۔ شیرہ تیار ہو جائے تو گولیاں شیرے میں ڈال دیں اور درمیانی آنچ پر پانچ منٹ پکائیں۔ مزیدار گلاب جامن تیار ہیں۔

اسما اقبال عمران...... لاہور

سب سے پہلے ذرا اپنے دوستوں عزیزوں کی پسند و ناپسند پر نظر دوڑاؤں گی پھر بچوں کو بھی ذہن میں رکھ کر مینیو بناؤں گی۔ اور وہ یہ ہو گا۔

مٹن پلاؤ
چانپ فرائی ود فرائی ویجی ٹیبل
مٹن بون لیس ہانڈی ود گریوی
نان، روٹی
چکن میکرونی
فروٹ سلاد
دہی بڑے
پودینہ کی چٹنی
رائتہ (آلو، چنوں کا)
میٹھے میں فروٹ ٹرائفل
کولڈ ڈرنک

اس مینیو میں، میں نے مرد حضرات کے لیے مٹن کا انتخاب کیا کیونکہ وہ شوق سے تناول کرتے ہیں۔ عورتیں پلاؤ اور دہی بڑے شوق سے کھاتی ہیں اور بچے میکرونی، فروٹ سلاد شوق سے کھا لیتے ہیں۔ اس لیے جب بھی مینیو ترتیب دیں، ہمیشہ ان چیزوں کا خیال رکھیں۔

سب سے ضروری بات جو میں ہمیشہ یاد رکھتی ہوں دعوت ہمیشہ خلوص نیت سے کریں اور خدا کا شکر ادا کریں کہ ہم اس قابل ہیں کہ کسی کی مہمان نوازی کر سکیں۔

راشدہ مریم...... جلال پور

ہاں جی ایک خاص ڈش ہے جو گھر والوں کے علاوہ محلے والے بھی شوق سے کھاتے ہیں کیونکہ یہ ہمارے گھر ہی بنتی ہے چونکہ ہم پنجابی ہیں اور ہمارے ارد گرد سرائیکی رہتے ہیں، سو یہ ڈش پنجابیوں ہی کی مخصوص ہے، جسے "بورے والی سویاں" کہتے ہیں۔ اس کی ترکیب کچھ یوں ہے کہ
پہلے کڑاہی میں ایک کلو چینی میں آدھا لیٹر پانی ڈالیں۔ اور خوب پکائیں پھر اس میں الائچی ڈالیں۔ جب یہ خوب گاڑھا سا آمیزہ بن جائے تو اس کو ایک بڑے چمچے کے ساتھ خوب پھینٹیں کہ وہ ایک سفید شکر پاؤڈر سا بن جائے۔ پھر سویوں کو ابال کر ان کا پانی خشک کریں۔ اس کے بعد اس پاؤڈر کو خوب اچھی طرح سویوں میں مکس کریں۔ اس کے بعد دیسی گھی گرم کر کے تھوڑا سا اوپر ڈال دیں۔
اب تو ہم جیسے کام چوروں نے اس کا آسان حل نکالا ہے کہ چینی اور الائچی کو گرینڈ کر لیتے ہیں، مگر جو مزا اس کو پکا کر آتا ہے، وہ اس طرح تو نہیں آتا ناں!
جی جناب! یہ تھا ہمارا جواب جو پتا نہیں شائع بھی ہوتا ہے یا نہیں، مگر کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔

مسز ناہید نور الٰہی...... کراچی

مجھے دعوت پارٹی وغیرہ کرنے کا بے حد شوق ہے۔ کوئی بھی تہوار ہو میری کوشش ہوتی ہے کہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو بلاؤں میرے سلیقے کی داد دیے بغیر کوئی نہیں رہتا۔ کراچی سے لے کر پنڈی تک میرے کھانے مشہور ہیں۔ امی چونکہ دہلی کی رہنے والی ہیں، اس لیے دہلی کی سارے کھانے مجھے بنانے آتے ہیں۔

دعوت وغیرہ پر زیادہ تر بریانی، تکہ بوٹی، شامی کباب، دم والا قیمہ، بھنا ہوا گوشت، کوفتہ، کھڑا مسالا اور دم والے قیمہ کی فرمائش ضرور ہوتی ہے۔ میٹھے میں شیر خرما، کسٹرڈ ٹرائفل یا پھر پستا سویاں بناتی ہوں میٹھے پر بادام اور پستے سے "عید مبارک" لکھتی ہوں۔ میں اپنے مینیو میں کوفتہ کھڑا مسالا کی ڈش ضرور رکھتی ہوں چونکہ یہ میری اپنی ایجاد ہے یہ ڈش کھا کر میری دوستیں اور عزیز احباب بہت خوش ہوتے ہیں لہٰذا اس کی ترکیب لکھتی ہوں آپ سب ٹرائی ضرور کیجیے گا۔

کھڑے مسالے کے کوفتے

اجزا :

قیمہ باریک مشین کا	ایک کلو
تیل	ڈیڑھ پاؤ
ثابت لال مرچ (باریک کاٹ لیں)	20-25 عدد
ہلدی	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
پسی ہوئی لال مرچ	حسب ذائقہ
ثابت گرم مسالا (لونگ، دار چینی، کالی مرچ، بڑی الائچی)	ہر ایک، ایک چائے کا چمچہ
بھنے ہوئے چنے	کھانے کے چار چمچے

خشخاش	کھانے کے چار چمچے

(چنے اور خشخاش پانی میں علیحدہ علیحدہ بھگودیں)

ہرا دھنیا	ایک گڈی
ادرک	ایک موٹا ٹکڑا
پیاز درمیانی	چار عدد
ہری مرچ درمیانی	چھ سے سات عدد

ترکیب :

سب سے پہلے قیمہ کو سل پر باریک پیس لیں۔ اس میں ایک چھلا ہوا لہسن ایک عدد پیاز درمیانی پسی ہوئی لال مرچ، دار چینی کا ایک ٹکڑا ایک چمچ کالی مرچ لونگ بڑی الائچی ایک عدد، سفید زیرہ کھانے کے دو چمچے ان سب کو قیمے کے ساتھ سل پر پیس لیں۔ بھنے ہوئے چنے اور خشخاش کو بھی باریک پیس کر قیمے میں ملا دیں اب پسے ہوئے قیمہ کو ایک گہری پرات میں نکال کر اس میں چوپ کیا ہوا ہرا دھنیا ادرک پیاز ہری مرچ مکس کر لیں۔ نمک بھی حسب ذائقہ ملا دیں۔ پھر چھوٹے چھوٹے بالز بنا کر ہتھیلی کے درمیان میں رکھ ان کو ہلکا سا دبائیں یہ چپٹے ہو جائیں گے۔ اب ایک دیگچی میں تیل گرم کریں پیاز براؤن کر کے ادرک لہسن پیسٹ شامل کر کے 2 منٹ بھونیں پھر اس میں ہلدی لال مرچ نمک، ثابت لال مرچ باریک کٹی ہوئی ثابت گرم مسالا شامل کر لیں کٹے ہوئے ٹماٹر اور کٹی ہوئی پیاز بھی شامل کر لیں پھر پانی ڈال کر گلائیں جب پیاز اور ٹماٹر گل جائیں تو مسالے کو اچھی طرح بھون لیں۔ اب اس میں ترتیب سے کوفتے رکھتی جائیں۔ پہلے تیز آنچ پر پھر ہلکی آنچ پر پکائیں کوفتوں میں پانی نہیں ڈالیں یہ اپنا پانی خود چھوڑیں گے، جب دیکھیں کہ کوفتہ کھڑا مسالا تیار ہو گیا ہے تو اس میں باریک کٹی ہوئی ادرک اور ثابت ہری مرچ شامل کر کے پانچ منٹ دم پر لگا دیں۔ لیجیے کوفتہ کھڑا مسالا تیار ہے۔ ہرا دھنیا سے گارنش کر کے چپاتیوں کے ساتھ یا نان کے ساتھ نوش فرمائیں۔

چاہیں تو ایک کھانے کا چمچہ ثابت دھنیا ہلکا سا کوٹ کر ادرک اور ہری مرچ کے ساتھ ڈال کر دم پر لگائیں۔

ترنم اعجاز...... کراچی

ہماری اسلامی اور تہذیبی اقدار میں جہاں اور بہت سی چیزیں شامل ہیں، وہیں مہمانداری کو بھی ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسی گھر میں مہمان بھیجتا ہے، جہاں کے لوگوں سے وہ خوش ہوتا ہے، اسی لیے میں مہمانوں کو خاص اہمیت دیتی ہوں اور آنے والے مہمانوں کو نہ صرف دل سے خوش آمدید کہتی ہوں، بلکہ میرے بارے میں تو یہاں تک مشہور ہے کہ اگر ہمارا مذہب انسانی گوشت کو حلال قرار دیتا تو یہ واقعی اپنا دل نکال کر مہمانوں کو کھلا چکی ہوتی۔

ویسے تو عید اور بقر عید کے موقع پر مہمانوں کی آمدو رفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور ہر ایک موقع کی مناسبت سے مہمانوں کی خاطر تواضع بھی کرتا ہے، لیکن دعوت کا مینیو ترتیب دیتے ہوئے میری یہ کوشش ہوتی ہے کہ کھانے کی لذت، چاوٹ اور دستر خوان پر پیش کرنے کے انداز کے ساتھ ساتھ متوازن غذا کا بھی اہتمام ہو اور سادے کھانوں کے ساتھ کچھ میٹھا اور کچھ چٹ پٹے کھانوں کی بھی نمائندگی ہو جائے جیسے اگر یخنی کی سادہ بریانی ہو تو اس کے ساتھ چٹ پٹا دھواں گوشت یا کڑاہی گوشت ہو اور اگر ساتھ میں کچھ ڈرم اسٹکس یا کباب بھی ہو جائیں تو کیا ہی بات ہے۔ اور ہاں میٹھے کے بغیر تو دعوت مکمل ہی نہیں ہوتی کہ یہ سنت بھی ہے اور کھانے کو ہضم بھی کرتا ہے۔

اس عید پر ہم ایک بڑی دعوت کا اہتمام کریں گے اور اس میں چپلی کباب، سادہ پلاؤ اور چٹ پٹی کڑاہی کے علاوہ چیز کوفتہ ود کریمی سوس اور شکر قند کی کھیر بطور خاص بنائیں گے۔ چپلی کباب، پلاؤ اور کڑاہی وغیرہ کی ترکیبیں تو بہت سے لوگوں کو معلوم ہوں گی، اس لیے

میں یہاں آپ سے کوفتوں اور شکر قندی کی کھیر کی ترکیب شیئر کروں گی۔

کوفتہ ود کریمی سوس

اجزا :

کاٹیج چیز (کیوبز کاٹ لیں)	1/2 کپ
قیمہ (بکرے کا)	1/2 کلو
بیسن (بھون لیں)	1/2 کپ
پودینہ	1/2 گڈی
ہری مرچیں (کٹی ہوئی)	6-8 عدد
لال مرچ پاؤڈر	1 چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
میٹھا سوڈا	ایک چٹکی
گرم مسالا پاؤڈر	1/2 چائے کا چمچہ
پیاز (چوپ کر لیں)	1 عدد
تیل	دو کپ

ترکیب :

کاٹیج چیز، قیمہ، بیسن، پودینہ، ہری مرچیں، لال مرچیں، نمک، میٹھا سوڈا، گرم مسالا پاؤڈر اور پیاز سب کو خوب اچھی طرح مکس کریں اور کوفتے بنا کر فرائی کر لیں۔

کریمی سوس کے لیے

میدہ	3 کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
سرکہ	1 کھانے کا چمچہ
سیاہ مرچ پاؤڈر	1/2 چائے کا چمچہ
سفید مرچ پاؤڈر	1/2 چائے کا چمچہ
مکھن	2 کھانے کے چمچے
فریش کریم	1/2 کپ
پیاز (چوپ کر لیں)	1 عدد
دودھ	1/2 کپ
یخنی	1 کپ

ترکیب :

تیل گرم کریں۔ میدہ بھون کر ہلکا گلابی ہونے پر پیاز شامل کر کے نرم کر لیں۔ اب نمک، سرکہ، سیاہ مرچ، سفید مرچ پاؤڈر، دودھ، یخنی اور مکھن ڈال کر ہلکی آنچ پر مکس کر لیں۔ خیال رہے کہ گٹھلی نہ بنے۔ سرونگ ڈش میں فریش کریم ڈالیں اور کریمی سوس ڈال کر کوفتے سجا کر پیش کریں۔

شکر قند کی کھیر

اجزا :

شکر قند	ایک کلو
دودھ	3 لیٹر
چینی	حسب ذائقہ
کھویا	250 گرام
پسا کھوپرا	250 گرام
الائچی پاؤڈر	دو چائے کے چمچے
پستہ، بادام	سجاوٹ کے لیے

ترکیب :

سب سے پہلے شکر قند کو ابال لیں، پھر چھیل کر اس کے ریشے وغیرہ الگ کر کے اس کا پیسٹ بنا لیں، پھر دودھ کو ابال لیں۔ ابال آنے پر شکر قند کا پیسٹ شامل کر لیں اور چمچہ چلاتی رہیں۔ جب خوب پک چکے اور شکر قند اور دودھ یک جان ہو کر گاڑھا ہو جائے تو چینی، پسا کھوپرا، کھویا اور الائچی پاؤڈر شامل کر دیں۔ من پسند گاڑھی کھیر تیار ہونے پر ڈش میں نکال لیں۔ پستہ، بادام کی ہوائیاں کاٹ کر سجاوٹ کر دیں اور ٹھنڈی ہونے کے بعد پیش کریں۔

یقین جانیں! اس مینیو اور اس کھانے کے ساتھ مہمان آپ کی سلیقہ مندی اور ہنر مندی کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکیں گے اور یہ ہوائیاں صرف کھیر کے اوپر ہی محدود رہیں گی۔ آپ کے چہرے پر ہرگز ہرگز نہیں آئیں گی۔

حرا قمر...... کراچی

عید پر ہمارے گھر میں خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ رشتے داروں کی آمد کا سلسلہ قربانی کے بعد شروع ہو جاتا ہے۔ عید پر میٹھا تو ہر گھر میں بنتا ہے مگر عیدالاضحیٰ میں گوشت کی ڈشز نہ ہوں تو دستر خوان مکمل نہیں ہوتا۔ مہمانوں سے داد وصول کرنے کے لیے میں جو خاص ڈش بناتی ہوں، آپ لوگوں کی نذر کر رہی ہوں۔ امید ہے آپ بھی اسے بنا کر داد وصول کریں گے۔

کھٹا میٹھا قیمہ

اجزا :

قیمہ	آدھا کلو
تیل	ایک کپ
پیاز	ایک پاؤ
املی پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
ہلدی پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
ہری مرچ	دس عدد (پیس لیں)
کالی مرچ	دس عدد (پیس لیں)
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ (کٹی ہوئی)
نمک	حسبِ ذائقہ
گرم مسالا پاؤڈر	حسبِ ذائقہ
زیرہ	ایک کھانے کا چمچہ
پودینہ، ہرا دھنیا	آدھا کپ (باریک کٹا ہوا)

ترکیب :

تیل گرم کریں۔ تیل میں پیاز براؤن کر کے نکال لیں اور چورا کر کے رکھ دیں۔ اسی تیل میں قیمہ ڈال کر دو منٹ فرائی کریں۔ اس کے بعد نمک، ادرک، لہسن ہلدی ڈال کر بھونیے۔ کچھ دیر بعد اس میں املی پیسٹ، ہری مرچ، کالی مرچ، لال مرچ ڈال کر پانی کا چھینٹا دے کر قیمہ گلنے تک پکائیں۔ اس میں زیرہ، گرم مسالا، ہرا دھنیا، پودینہ، براؤن پیاز ڈال کر بھونیں۔ تیل الگ ہو جائے تو پراٹھے کے ساتھ پیش کریں۔

ویسے تو ماں کے ہاتھ کا ذائقہ کہیں نہیں ملتا مگر اللہ کا شکر ہے کہ ما بدولت کے ہاتھ میں بھی ذائقہ ہے۔ کھانے والے کہتے ہیں کہ میں نے مما کے ہاتھ کا ذائقہ چرایا ہے۔ عید ہو اور میٹھا نہ ہو، کچھ سوجھتا نہیں تو میں جلدی جلدی یہ ڈش بناتی ہوں۔

سوئیٹ نوڈلز

ضروری اجزا :

نوڈلز	آدھا کپ
چینی	حسب ذائقہ
جیلی	ایک پیکٹ
کیوڑہ	چند قطرے
پستا، بادام (کٹا ہوا) ناریل (پسا ہوا)	
کشمش	بارہ عدد
الائچی سبز	پانچ عدد
دودھ	ایک کلو

ترکیب :

نوڈلز ابال لیں۔ دودھ کو اتنا گرم کریں کہ آدھا کلو رہ جائے۔ اس میں چینی ڈال کر ایک جوش دے دیں اور ساتھ ہی الائچی، کیوڑہ، کشمش اور نوڈلز ڈال لیں۔ مزید تھوڑی دیر پکائیں اور باؤل میں نکال کر ٹھنڈا کرلیں۔ جیلی تیار کر کے ٹھنڈی کریں۔ جیلی کی ڈیزائننگ کر کے سوئیٹ نوڈلز پر ڈیکوریٹ کر دیں اور ساتھ ہی ناریل، پستا اور بادام بھی چھڑک دیں۔ مزیدار ڈش تیار ہے۔

یہ دو خاص ڈشز ہیں، جن کو بنا کر میں عید پہ مہمانوں سے داد وصول کرتی ہوں۔ میری طرف سے دلی عید مبارک۔

ایزا حسن...... خانیوال

ہم لوگ خانیوال کے رہنے والے ہیں اور زیادہ تر رشتے دار یہیں مقیم ہیں، اس لیے کھانے کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے قربانی کے بعد سب سے پہلے جس ڈش کا اہتمام کیا جاتا ہے، وہ پیش خدمت ہے۔

سفید تل کے کوفتے

ضروری اجزا :

قیمہ	ایک کلو
دہی	ایک پاؤ
پیاز	پانچ عدد
سفید تل	تین کھانے کے چمچے
چنا (بھون کے پیس لیں)	دو کھانے کے چمچے
خشخاش	دو کھانے کے چمچے
(بھون کے پیس لیں)	
ادرک (پسا ہوا)	دو کھانے کے چمچے
لہسن (پسا ہوا)	دو کھانے کے چمچے
سفید زیرہ	دو کھانے کے چمچے
(بھون کے پیس لیں)	
لال مرچ پاؤڈر	دو کھانے کے چمچے
ہرا دھنیا	ایک گڈی (کٹا ہوا)
دھنیا پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
ہری مرچ	آٹھ عدد (باریک پیس لیں)
ٹماٹر (کاٹ لیں)	دو عدد
گرم مسالا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
انڈے	تین عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	ڈیڑھ کپ
زعفران	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ

ترکیب :

ایک پتیلی میں چار بڑے سالن والے چمچے تیل ڈال کر گرم کریں اور درمیانے سائز کی ایک کٹی ہوئی پیاز براؤن کرلیں۔ پیاز براؤن ہو جائے تو اس میں آدھا کلو قیمہ ڈال کر تین سے چار منٹ تک اچھی طرح کفگیر چلائیں۔ اس میں ایک کھانے کا چمچہ ادرک، ایک کھانے کا چمچہ لہسن، ایک کھانے کا چمچہ لال مرچ پاؤڈر، نمک اور ٹماٹر ڈالیں اور تھوڑا پانی چھڑک کر ہلکی آنچ پر پکنے دیں یہاں تک کہ قیمہ گل جائے اور پانی خشک ہو جائے۔ اب اس کو ٹھنڈا ہونے دیں۔ پکا ہوا قیمہ ٹھنڈا ہو جائے تو اسے کچے قیمہ میں ملا کر چوپر میں ڈال کر پیس لیں اور اس میں، نمک، لال مرچ آدھا کھانے کا چمچہ گرم مسالا، چنا، خشخاش، تل زیرہ، ہری مرچ، ہرا دھنیا، درمیانی سائز کی دو پیاز اور تین انڈے توڑ کر پھینٹ کر اس میں ملا دیں اور اس آمیزے کے کوفتے بنالیں اور تیل گرم کر کے تل لیں۔

اب ایک گہری دیگچی میں بچا ہوا تیل گرم کریں اور دو پیاز تل کے براؤن کرلیں اور نکال لیں۔ تیل دیگچی میں ہی رہنے دیں۔ تلی ہوئی پیاز کچل کر دہی میں مکس کرلیں اور ادرک لہسن کا ایک ایک چمچہ، لال مرچ، دھنیا پاؤڈر اور نمک حسب ذائقہ ڈالیں۔ اچھی طرح بھونیں۔ مسالا، تیل چھوڑنے لگے تو اس میں ڈیڑھ گلاس پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر گاڑھا شوربہ تیار کریں۔ پھر کیوڑہ میں حل کیا ہوا زعفران اور تلے ہوئے کوفتے اس میں ڈال لیں اور دس منٹ تک ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔ اوپر سے آدھا چمچہ گرم مسالا چھڑک کر نان کے ساتھ پیش کریں۔

میٹھے میں بہت جلد تیار ہونے والی ڈش فروٹ کریم ہے، جسے بنا کر بہت دفعہ داد سمیٹ چکی ہوں۔

فروٹ کریم

ضروری اجزا :

تازہ کریم	ایک پاؤ
چینی	ایک چوتھائی کپ
انار کے دانے	ایک چوتھائی کپ
سیب	ایک عدد (چھوٹے ٹکڑے کاٹ لیں)
کیلا	ایک عدد (سلائس کاٹ لیں)
بادام	چند دانے
چیری	چند عدد
کشمش	چند دانے
چھوٹی الائچی	ایک دو عدد (پسی ہوئی)

ترکیب :

چینی اور کریم کو اچھی طرح پھینٹ لیں پھینٹنے کے دوران تھوڑا سا دودھ ملا دیں۔ اس کے بعد انار کے دانے 'سیب' کیلا' بادام' چیری' کشمش شامل کردیں

آخر میں الائچی پاؤڈر چھڑک دیں اور ٹھنڈا کر کے سرو کریں۔ یہ تو میری مقبول ڈشز ہیں۔ امید ہے آپ کو پسند آئیں گی میری طرف سے سب کو عید مبارک۔

حجاب اظفر۔۔۔ کراچی

عید کا تہوار خوشیوں' امنگوں چاہتوں کا دن ہے۔ سب کا ایک جگہ اکٹھا ہو کر اللہ کی رہ میں قربانی دینا ایثار اور فرمانبرداری کی بہترین مثال ہے۔ عید الاضحیٰ منسوب ہے روایتی کھانوں سے روایتی کھانوں کے علاوہ نئے تجربات کرنا میری عادت ہے۔ اس حوالے سے مہمانوں کو میری جو کاوش پسند ہے' سوچا اوروں سے ماہنامہ خواتین کے ذریعے شیئر کی جائے۔

سیخ کوفتہ

ضروری اجزا :

لال مرچ پاؤڈر	ایک چوتھائی کھانے کا چمچہ
ہری پیاز	دو عدد (چوپ کرلیں)
ہرا دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
لیموں	ایک عدد
(چھلکوں کو باریک چوپ کرلیں)	
انڈا	ایک عدد (سفیدی الگ کرلیں)
نمک	حسب ذائقہ
سیاہ مرچ پاؤڈر	حسب ذائقہ
بریڈ کرمز	حسب ضرورت
ہرا دھنیا کے پتے	حسب پسند
لیموں کا چھلکا	حسب ضرورت

ترکیب :

ایک کلو گوشت میں ہری پیاز' ہرا دھنیا' لیموں کا چھلکا' انڈے کی سفیدی نمک' سیاہ مرچ اور بریڈ ڈال کر پیس لیں' پھر اسے کوفتوں کی شکل دے دیں۔ کسی کھلی جگہ پر انگیٹھی میں کوئلے دہکا لیں۔

کوفتوں کو سیخوں میں لگا کر کوئلوں پر رکھ دیں اور گولڈن براؤن ہونے تک سینک لیں۔ مزیدار سیخ کوفتے تیار ہیں۔ آپ لوگوں نے فرنچ ٹوسٹ تو سنا ہوگا' ہمارے گھر میں اس سے نہایت مزیدار ڈش تیار کی جاتی ہے اور رشتے دار بہت پسند بھی کرتے ہیں۔ آپ بھی بنائیں اور کھانے کے بعد مجھے ضرور یاد کریں گے۔

فرنچ ٹوسٹ ود کسٹرڈ

ضروری اجزا :

بریڈ سلائس	چار عدد
دودھ	ڈیڑھ کپ
ونیلا کسٹرڈ	دو کھانے کے چمچے
چینی	چار کھانے کے چمچے
انڈے	دو عدد
کافی	ایک چائے کا چمچہ
گھی تلنے کے لیے	حسب ضرورت
زردے کا رنگ	ایک چٹکی

ترکیب :

ایک کپ دودھ میں دو کھانے کے چمچے چینی اور کسٹرڈ پاؤڈر ڈال کر پکالیں۔ آدھا کپ دودھ میں بقیہ چینی' زردے کا رنگ اور انڈے ڈال کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔ بریڈ کے سلائس اس میں ڈبو کر فرائی کرلیں اور ٹرے میں رکھتے جائیں' پھر اس پر تیار شدہ کسٹرڈ ڈال کر کافی چھڑک دیں اور فریج میں رکھ کر ٹھنڈا کرلیں۔ مزیدار میٹھا تیار ہے۔ یہ ہے میری مقبولیت کا راز جو میں نے آپ سب سے شیئر کیا۔ امید ہے آپ کو پسند آئے گا۔ سب پڑھنے والوں کو میری جانب سے عید مبارک۔



رفعت ناہید سجاد

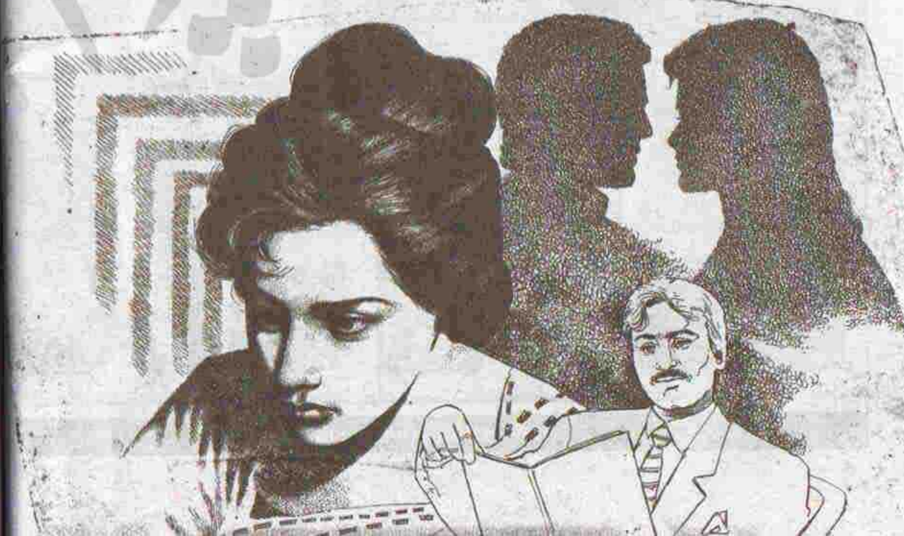
چراغِ آخرِ شب

پروفیسر عباس رشید کا گھرانہ علمی و تہذیبی اعتبار سے مڈل کلاس روایات کا امین ہے۔ پروفیسر صاحب کی قابلیت اور نیک نامی مثالی ہے۔ وہ تاریخ کے مضمون کے استاد رہ چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں' ان کا دروازہ ہر طالب علم اور خاص و عام کے لیے کھلا رہتا ہے۔ شاگرد' ان کے علمی خزینے سے فیض حاصل کرنے آتے رہتے ہیں۔ گھر کا تمام نظم و نسق پرانی گھریلو ملازمہ کریم بی کے ذمہ ہے۔ جو بڑی جانفشانی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کی بیگم کے ساتھ اولادوں کو بھی آزادی اظہار کی مکمل اجازت ہے۔ ان کی تین اولادیں ہیں۔ تنویر' عثمان اور عبیر۔

بڑی بیٹی تنویر ماں کی لاڈلی ہے۔ دوران تعلیم غیر نصابی سرگرمیوں میں خاصی سرگرم رہی۔ وہ مقامی کالج میں پڑھاتی۔ شادی کے بعد اس کی صلاحیتیں جیسے گہنا گئی ہیں۔ سسرال میں علم اور تہذیب دونوں کی کمی ہے۔ ساس گھر پر حاوی ہیں' اپنے آگے وہ شوہر سمیت کسی کی چلنے نہیں دیتیں۔ تنویر کا شوہر نعیم روایتی مرد ہے۔ وہ ایک مقامی روزنامے میں صحافی ہے لیکن ایک پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی بے حسی لیے ہوئے ہے۔ ایک بیٹی گڑیا ہے۔ جس کی نگرانی کریم بی کے سپرد ہے۔ پسند کی شادی اور نوکری کرنے کے باوجود سسرال میں اس پر زبان بندی کا اصول سختی سے لاگو ہے۔

عثمان عباس کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا ہے۔ جو قابلیت اور ڈگری کے باوجود معقول نوکری حاصل نہیں کر پاتے۔ تاہم گھر کے ماحول اور پر اعتماد فضا نے اسے مکمل مایوس نہیں کیا ہے۔ وہ مختلف آئی ٹی یونی ورسٹیز کے لیے پروگرامنگ کر کے اتنا کما لیتا ہے کہ گزر اوقات اچھی ہو جائے۔

عبیر آج کے دور کی لڑکی ہے۔ جو اپنے ذہن سے فیصلہ کرنا جانتی ہے۔ گھر میں باپ سے قریب ہونے کے باعث ان کی



علمی تجربے سے فیض اٹھانے کا موقع اسے زیادہ ملا ہے۔ وہ ماسٹرز کی طالبہ ہے' وہ حالات کو حساس انداز میں لیتی ہے۔ عبیرہ اپنی بڑی بہن سے زیادہ بچپن کی سہیلی حمیرا سے قریب ہے۔ اونچے طبقے کی پروردہ ثریا بھی عبیر کی دوست ہے لیکن، وہ صرف عثمان کی وجہ سے اس گھر میں آتی جاتی ہے۔ عبیر اسے خاص وجہ سے عزیز رکھتی ہے۔

گھر میں چچا عبدالعزیز اور ماموں کریم بخش اپنے اسرار کے ساتھ بہ وجوہ رہائش پذیر ہیں۔ بڑی تائی بے اولاد ہیں اور بیوگی کے بعد سے کچھ دن قیام کے لیے پروفیسر صاحب کے یہاں آتی ہیں۔ جہاں ان کی ساس بھی رہتی ہیں۔

عبیر کا گروپ یوم پاکستان کے حوالے سے اسٹیج شو کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ لوگ وطن سے محبت قوم کے دل میں اجاگر کرنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ناکامیوں سے عبیر دل برداشتہ ہوتی ہے تو وہ کچھ دیر کے لیے حمیرا اور رضا کے یہاں چلی آتی ہے' جہاں ان دونوں کی والدہ آپائی اپنے خلوص اور ڈھیر ساری محبت سے ان کا سواگت کرتی ہیں۔ یہ محبتیں اسے روح تک سرشار کردیتی ہیں۔

ان کے گروپ میں ان کی کوششیں رنگ لاتی ہیں اور شو کرنا صرف اسپانسر مل جاتا ہے بلکہ ڈراما آڈینس میں بے حد پسند کیا جاتا ہے۔ عبیر کو سب سے زیادہ شو میں کزن شہریار کی موجودگی مسرور کرتی ہے' جو محض عبیر کی خاطر طویل سفر طے کر کے شو دیکھنے آتا ہے۔ دونوں میں لفظوں سے زیادہ دل کا رشتہ ہے' اس لیے ایک دوسرے کی بات فوری سمجھ لیتے ہیں۔ عثمان' شہریار کے لیے عبیر کے جذبات سے آگاہ ہے۔

ان ہی دنوں بابا جان کی عدم موجودگی میں ایک واقف کار سے عبیر کی ملاقات ہوتی ہے' جن کی مختلف سی شخصیت اسے کچھ الجھادیتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۲۵
پچیسویں قسط

"مجھے بہت تواتر سے ایک خواب آتا ہے۔" عبیر جیسے نیند کی سی حالت میں بولی۔ 80F کی تھیٹر کے ہال ایسی سیڑھیوں پر بیٹھے سب تماش بین تالیاں بجانے کے بجائے اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔

آخری سیڑھی پر سر نیہوڑے جمال بھائی پبلک سے بے نیاز' خود سے الجھتے ہوئے..... گڑیا کی فراک سے نہ نظر آنے والی گرد اور سلوٹیں جھاڑتی تنویر گود میں زبردستی اپنی بیٹی کو بٹھائے جو کبھی اس گروپ کا حصہ نہیں تھی لیکن موجود تھی۔

مقرر کی طرف دھیان اور توجہ دیے رضا' ہر ایک کی طرف متوجہ رہنا جیسے اس نے از خود اپنے فرائض میں شامل کرلیا تھا۔ پہلی سیڑھی سے آخری سیڑھی تک نیم دراز عثمان' سر کے پیچھے ہتھیلیوں کی قینچی کے سہارے گردن کو کچھوے کی سری کی طرح اٹھائے' چچا عبدالعزیز کے کوارٹر سے بجنے والے گانوں میں سے کوئی ایک زیر لب گنگناتا' چاند سے پریت لگائے..... اپنے دونوں گھٹنوں کو بازوؤں کے حلقے میں لیے کلائیوں پر ٹھوڑی ٹکائے حمیرا جو عادتاً "عبیر کے ساتھ آبیٹھی تھی یا عبیر عادتاً" اس کے نزدیک جاکر بیٹھ گئی تھی۔

ذرا سے فاصلے پر تیسری سیڑھی پر اپنے آپ میں مسکراتا شہریار..... شمع عبیر کے سامنے تھی سو وہ ہی محو سخن تھی۔

"سال دو سال بعد' کبھی ہر روز لیکن میں اس خواب کے اندر خود کو کسی ڈرامے کے ایک کردار کی طرح دیکھتی ہوں۔ کبھی یہ خواب لمحوں کا ہوتا ہے' کبھی طول پکڑ جاتا ہے۔ تم لوگوں نے کبھی نوٹ کیا۔ خوابوں کے وقت ہماری دنیا کے وقت سے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ایک وقت ہمارے دسترس میں ہے ایک ہماری پہنچ سے باہر اس میں ساٹھ سیکنڈ کا ایک منٹ ہو' ضروری نہیں۔ جب جاگتی دنیا میں آپ کے وال کلاک پر منٹ ہی گزرا ہو تو خوابوں

میں آپ زمانے گزار آتے ہیں۔ اس وقت سے ہماری آشنائی نہیں ہے۔ خیر یہ قدیم زمانے کا گھر ہے' باریک چھوٹی' سرخ اینٹ کا بنا ہوا' محرابوں والے دالان اور برآمدے ہیں۔ میں یہ خواب کسی مووی کی طرح..... محراب سے لٹکتے ایک گملے کے نیچے..... کھڑی دیکھ رہی ہوں۔ ستونوں سے بیلیں لپٹی ہیں جن سے نارنجی رنگ کے پھول الٹے لٹک رہے ہیں۔ ان پھولوں سے اٹھنے والی مدہوش مہک مجھے جاگ جانے کے بعد بھی سنگھائی دیتی ہے۔ برآمدوں کے پار ایک کچا صحن ہے' جس پر اینٹ سیمنٹ ٹائل کچھ نہیں ہے۔ بس ایسے ہی چھوڑ رکھا ہے جیسے زمین اپنی اصلی حالت میں ہوتی ہے۔ بہت بڑا' بہت ہی طویل صحن ہے۔ غیر معمولی بلند چار دیواری' چار دیواری کے ساتھ ساتھ شوخ' آتشی گلابی پھولوں کی کیاریاں ہیں جن کے منہ سورج ڈھلنے کے بعد بند ہوچکے ہیں۔"

"خواب دیکھ رہی ہو کہ باٹنی کی کلاس لے رہی ہو؟" عثمان اپنی بلند سری اس کی طرف گھما کر بڑبڑایا۔ غنیمت ہوا' اس کی بذلہ سنجی کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوا کہ خواب کسی جھوٹی کہانی کی طرح دلکش تھا۔

"صحن کے خاتمے پر چار لکڑی کے تنوں پر پھونس کی ایک چھت پڑی ہے' جس کے تنکے دھوئیں سے کالے ہوگئے ہیں اور جس میں سے چکنائی کے سیاہ جالے لٹک رہے ہیں۔ وہیں ایک لکڑی کے ستون پر کنڈے میں لٹکی مٹی کے تیل والی لالٹین ہوا کے نامحسوس جھونکوں سے لرز رہی ہے اس کے ہلنے کی وجہ سے دیوار پر سایوں سے بھوتوں جیسی شکلیں بن رہی ہیں۔ پھونس کی چھت تلے زبان نکالتے شعلوں پر روٹیاں پکائی جارہی ہیں۔ ایک میں دور کھڑی' دوسری "میں" کو دیکھ رہی ہوں لالٹین کی روشنی بہت کم ہے۔ اتنی تھوڑی روشنی اتنی بہت ساری تاریکی کو بالکل ختم تو نہیں کرسکی لیکن کم ضرور کردیا ہے۔

درمیان میں اپنے وسعت میں پھیلے صحن میں روشنی کے بہت سے دائرے ہیں۔ اس سارے خواب میں جو بہت تکلیف دہ چیز ہے وہ اداسی کی ایک مجموعی سی فضا ہے۔ روٹیاں پکاتی اس عورت پر' محراب تلے کھڑی لڑکی پر جو دراصل میں ہوں' صحن' برآمدوں پر' اداسی' خاموشی' ویرانی اور دکھ سے بوجھل نیم اندھیرا اور سناٹا دونوں ہتھیلیوں کے درمیان بڑھائی جانے والی روٹی کی تھپ تھپ کے سوا ایک مکمل سکوت۔

کبھی خواب طویل ہوجاتا ہے اور میں روٹیاں پکتی دیکھتی رہتی ہوں اور سوچتی رہتی ہوں کہ فضا میں اتنی خوفناک اداسی کیوں ہے' کبھی اتنا مختصر کہ پہلی روٹی ہاتھوں میں مکمل بھی نہیں ہوپاتی کہ آنکھ کھل جاتی ہے۔ اداسی کی کیفیت اتنی Over whelming ہے کہ جاگنے کے بعد بھی دل پر جیسے بھاری سل رکھی محسوس ہوتی ہے۔"

جمال بھائی نے جھکا ہوا سر اٹھایا "لوگو! سنو۔" وہ قصہ چہار درویش کے کسی فقیر کی طرح مخاطب ہوئے۔

"انسانی ذہن بڑی عجیب مشین ہے۔ جس طرح خواب آنے والے اندیشوں سے خبردار کر۔۔ آتے ہیں' کبھی کبھی ماضی بیان کرنے بھی آجاتے ہیں۔ یہ کوئی fantacy (تخیلاتی) نہیں ہے۔ جدید ریسرچ بتاتی ہے ایسا واقعہ کبھی کہیں گزرا ہے۔

آپ پر نہیں گزرا' ہوسکتا ہے۔ سو پچاس سال پہلے کبھی گزرا ہو لیکن آپ کو علم نہ ہو۔ ہندو جس کو آواگون کہتے ہیں وہ دراصل خون کی شریانوں میں لتھڑے' کھوپڑی میں قید اسی لج لجے مغز کا کارنامہ ہے جسے آپ بصد شوق تناول فرماتی ہیں۔ آپ کسی بالکل اجنبی جگہ پہنچ کر کہتے ہیں' میں تو یہاں پہلے بھی آیا تھا۔ پھر کوئی جملہ بولتا ہے تو آپ کو لگتا ہے۔ ہاں یہ بات پہلے بھی کہی گئی تھی۔ بعض اوقات آپ کو یہ بھی پتا ہوتا ہے کہ اس سے اگلا جملہ کون سا آنے والا ہے۔ یہ بھی دماغ کی ایک کارستانی ہے۔ دماغ کا وہ حصہ جو کب سے خالی بیٹھا مکھیاں مار رہا تھا' ایک لمحے کے لیے کام کرنا شروع کردیتا ہے۔" انہوں نے اس کے ہاتھ تھپتھپاتے بڑی شفقت سے کہا۔

"اور اس بیچارے اپنے ذہن کو مت تھکاؤ تم تو خوش نصیب شہزادی ہو سات بھائیوں والی۔ جیسی کہانیوں میں

ہوتی ہے۔ اپنے بوجھ ہمیں اٹھانے دو۔"

اس کے سر پر کوئی بوجھ تھا نہ سینے پر۔ لیکن پھر بھی اسے لگا' کوئی بھاری سِل سرک گئی ہے۔

"میں جب خواب دیکھتا ہوں' ان سیڑھیوں کا دیکھتا ہوں۔" رضا نے اپنی باری کا انتظار کیے بغیر اعلان کیا۔

"واقعات بدلتے رہتے ہیں' ہم پڑھ رہے ہیں' ہم کھیل رہے ہیں' کوئی اسٹیج شو کر رہے ہیں' یہاں بیٹھ کر بالکل اسی طرح بے معنی بک بک کر رہے ہیں مگر خواب کا مرکز صرف یہ سیڑھیاں ہوتی ہیں۔ شاید اس لیے بھی کہ میری زندگی کا بیشتر وقت ان کے اردگرد ہی کٹتا ہے۔ مجھ سے یہ سیڑھیاں چھین لی جائیں تو مجھے لگے گا کسی نے میرے نیچے سے زمین گھسیٹ لی ہے۔"

"مجھے خواب میں اسکول نظر آتا ہے۔" حمیرا نے خواب کی دہشت سے لرز کر کہا۔

"بلکہ اسکول کا بھی Examination Centre (امتحان گاہ) میں ہمیشہ امتحان دینے اس وقت پہنچتی ہوں جب پیپر واپس لیا جا رہا ہوتا ہے۔ مجھے حسرت ہی رہی مگر کبھی کسی خواب میں آج تک پیپر نہیں دے سکی۔ آنکھ کھل کر ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ خواب تھا ورنہ فیل ہونے میں کوئی کسر نہیں تھی۔"

"میرا سب سے دلچسپ خواب وہ ہوتا ہے جب میں اڑتا ہوں' بغیر پروں کے' کاغذی جہاز کی طرح' کبھی زوں کر کے ادھر نکل گیا' کبھی زوں سے دوسری طرف' خواب میں ہی مجھے خیال آتا ہے' بے شک یہ خواب ہے مگر میرے پر کہاں ہیں۔ جوں ہی مجھے احساس ہوتا ہے' میرے پر نہیں ہیں' میں دھڑام سے نیچے گر جاتا ہوں۔"

"یاد رکھنا بچو! جو ہواؤں میں اڑتے پھرتے ہیں۔ ایک دن اوندھے منہ ضرور گرتے ہیں۔ اس دلچسپ خواب کا سب سے تکلیف دہ عمل وہ فری فال ہے۔ مسلسل نیچے گرتے رہنے کا عمل۔ کئی دفعہ سوچتا ہوں اوفوہ یا یا خواب ہی ہے نا' ابھی آنکھیں کھول لیتا ہوں۔ لیکن آنکھ اس وقت تک نہیں کھلتی جب تک میں کسی اسکائی لیب کی طرح ایک دھماکے سے زمین سے ٹکرا کر پاش پاش نہ ہو جاؤں۔"

"میں بہت زیادہ خواب نہیں دیکھتا۔" شہریار نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے یاد نہیں' میں نے آخری خواب کب دیکھا تھا۔"

"یہ خواب نہ دیکھنا تمہاری خواہش کے حساب سے ہے یا کسی مجبوری میں۔" عثمان آج اینکر پرسن بننے کے موڈ میں لگتا تھا۔

"نہیں جانتا۔" اس نے سابقہ سنجیدگی برقرار رکھی۔ "میں اس قدر تھک چکا ہوتا ہوں کہ لیٹتے ہی سو جاتا ہوں۔ الارم بجتا ہے تو جاگتا ہوں۔ جب غور کرتا ہوں تو مجھے کوئی خواب یاد نہیں آتا۔"

"چلو بھئی تنویر...." عثمان نے اپنی اینکری برقرار رکھی۔ "اب تم اپنا خواب سناؤ۔"

کچھ دیر کے لیے لوگ تھم گئے تھے۔ وہ ان سب کے درمیان موجود ہو کر بھی غائب تھی۔

"میں نے خوابوں پر بھروسا کرنا چھوڑ دیا ہے۔" اس نے ٹھہری ہوئی لیکن مضبوط آواز میں کہا۔

"آپ بڑے اہتمام سے اور بڑی محبت سے انہیں دیکھتے ہیں لیکن ایک معمولی سی غفلت سے وہ چھنا کے سے چُور چُور ہو جاتے ہیں۔" اس نے کتنی سخت بات کس نرم لہجے میں بیان کی تھی۔ لوگوں پر سکوت طاری ہو گیا۔ سارا تفریحی موڈ ہوا میں تحلیل ہوا' شاید یہ سکتہ دیر تک رہتا کہ چچا عبدالعزیز کھنکارتے عثمان کی پشت پر آ ٹھہرے۔ وہ کسی کو آواز نہیں دیتے تھے۔ اپنے وجود کا احساس دلانے کے لیے ایک مصنوعی کھانسی جو بیڑی کے مستقل استعمال سے ان کے لیے نہایت سہل تھی' ذرا سا جھک کر اپنے دھیمے لہجے میں عثمان سے کچھ کہا۔

وہ سیڑھیوں پر نیم دراز شاہانہ انداز میں استراحت فرماتے ہوئے بولا۔ "یہیں لے آؤ۔"

وہ تھوڑا سا چیں بہ جبیں ہوئے، اپنے بیان کے دفاع میں کچھ کہنا چاہا۔

"کوئی بات نہیں چچا! سب یہیں بیٹھے ہیں۔" چچا عبدالعزیز کو عثمان کی یہ آزاد خیالی کبھی بھلی نہیں لگی تھی۔ ایک لمحے کو رک کر انہوں نے سوچا کہ اس کو جھاڑ کر رکھ دیں لیکن وہ بڑا ہو چکا تھا اور شاید ان کے اختیار سے باہر بھی۔ وہ بیزاری سے پلٹے اور گیٹ کی طرف نکل گئے۔

عبیر کو گمان نہیں تھا جو شخص چچا کی ہمراہی میں اندر داخل ہوگا اس کو دیکھ کر اس کے چہرے کی رنگت کسی وجہ کے بغیر اس تیزی سے بدلے گی۔

"آؤ بھئی، اس وقت ہم "آپ کے خواب اور ان کی تعبیر" پر بحث کر رہے تھے۔" رضا نے اس کا استقبال کیا اور غالباً "تمہارا شہریار سے تعارف بھی نہیں۔ یہ لیفٹ رائٹ کرتے دوائے درد دل بیچتے ہیں اور شہریار! یہ فاروق ہیں، ایک دوسرے کا ذکر تو تم نے سنا ہی ہوگا ہم سے۔"

شہریار اپنی حاصل کردہ ٹریننگ کے تحت کھڑا ہوا بڑی بشاشت سے ہاتھ بڑھاتے ہوئے مسکرایا۔

"آپ کے بھی کچھ خواب ہیں تو بیان کیجئے۔"

"واہ! ماشاءاللہ۔" فاروق نے ایک سرسری نظر چاروں طرف ڈالی۔

"تو یہاں خوابوں کی سیل لگی ہے، نہیں بھئی میرے خواب برائے فروخت نہیں۔ وہ میری اس قدر ذاتی جاگیر ہیں کہ میں برائے نمائش شیلف پر رکھنے کو بھی تیار نہیں۔"

"تو گویا تم جاگیرداری نظام کے حامی ہو۔ آؤ فاروق کے خلاف نعرے لگائیں۔" رضا نے گھُرکا۔

"کوئی جگہ تلاش کرو اور بیٹھ جاؤ۔"

"گرتی پڑتی دیواروں کو ایک دھکا اور دو۔"

حمیرا نے ہاتھ اٹھا کر مشینی انداز میں نعرہ بلند کیا۔ یونیورسٹی کی تربیت ابھی جاری تھی گو وہاں نعروں پر اجارہ داری بھی اکثریتی تنظیم نے اپنے ہاتھ میں لے رکھی تھی۔ کسی کو ان کی مرضی کے برخلاف آواز اونچی کرنے کی آزادی نہیں تھی۔ سو جو نعرہ حمیرا کو یونیورسٹی کے کمپاؤنڈ میں لگانے کی اجازت نہیں ملی تھی، اس نے حلق پھاڑ کر لگالیا۔

نیم تاریک راتوں میں جب چاند بھی چمک کر کسی کونے کھدرے میں جا چھپا تھا، پیچھے برآمدے سے آتی ٹیوب لائٹ کی روشنی ان سیڑھیوں پر پہنچ کر دم توڑ رہی تھی۔ فاروق نے ایک نظر مجمع پر ڈالی۔ قوال پارٹی اکٹھے بیٹھنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کرتی۔ روشنی چونکہ پیچھے سے آرہی تھی جس سے ان کے چہرے اتنے نمایاں نہیں تھے لیکن پھر بھی بیٹھنے سے پہلے بڑی تہذیب سے ایک ایک چہرے پر لمحوں کی نظر اور ڈالی تھی۔ محض سر کی جنبش سے سلام کرتا یا قبول کرتا جیب سے ایک رومال نکال کر اس نے ایک سیڑھی پر قرینے سے رکھا اپنی پتلون کی کریز بچاتا، ایک طرف مؤدب بیٹھ رہا۔

"اوہ اچھا! تم نے جیب سے رومال نکال کر جھٹکا تو میں سمجھا اس میں سے کبوتر اڑے گا۔" عثمان نے خوشدلی سے کہا۔ "اگر تنگ ہو رہے ہو تو اندر چلے چلیں؟"

"نہیں، یہاں بھی ٹھیک ہے۔ میٹنگ سے آرہا ہوں۔ زیادہ دیر نہیں بیٹھوں گا واپس جانا ہے۔ اگر علم ہوتا یہاں عوامی میلہ لگا ہوگا تو کسی بہتر حلیے میں آتا۔"

بیٹھنے سے پہلے اس نے غور بھی نہیں کیا۔ وہ تنویر کے برابر بیٹھ رہا تھا۔ نہ اس نے اس کی بدلتی تیوریوں پر دھیان دیا۔ آزاد خیالی کے بارے میں تنویر کے نظریات بھی چچا عبدالعزیز سے مختلف نہیں تھے۔

"کہیں دیکھا ہے آپ کو پہلے بھی۔" تنویر نے شک سے اس کی طرف دیکھا۔ محفل کا چونچال پنا ایک دم بجھ

گیا۔ لوگوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا وہ اگلا جملہ کیا بول دے گی۔

"صحیح پہچانا آپ نے، آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔" اس نے مؤدب انداز میں رسان سے کہہ کر اپنی توجہ دوسری طرف بیٹھے شہریار کی طرف منتقل کردی۔

"میں جب بھی آیا پتا چلا آپ آئے تھے اور چلے گئے۔ یا آنے والے ہیں مگر میرے جانے کے بعد۔"

"ہاں آپ سے ملاقات نہ ہوسکنے کا مجھے بھی افسوس رہا۔" دونوں نے رسم دنیاداری نبھادی تھی۔

جمال تھوڑا سا جزبز ہوا۔ دونوں کی پہلی ملاقات تھی لیکن دوسری اور تیسری ملاقات بھی اسی قدر کلف لگی، اکڑی اکڑی سی رہی تو شاید گروپ تکلیف اٹھائے گا۔ نیا آنے والا بے ضرر سا مخلص آدمی ہے۔ اس کے لیے گنجائش نکالنی پڑے گی۔ کیونکہ باقی سب نے اس کو اس طرح قبول کیا ہے جیسے وہ یہاں ہمیشہ سے موجود تھا۔ مگر وہ کیوں موجود تھا؟ جمال نے لمحہ بھر کو سوچا۔ گو اس کے پاس اپنے ہی سوال کا کوئی یقینی جواب نہیں تھا۔

"کیا آپ سب ہی اپنے اپنے خواب سنا بیٹھے ہیں؟" فاروق نے حاضرین میں سے کسی کو بنا مخاطب کیے کہا۔

"ہاں..... جمال کے سوا۔ لیکن اگر تم کوئی خاص خواب دوبارہ سننا چاہتے ہو تو repeat telecast (نشر مکرر) کا اہتمام بھی ہوسکتا ہے۔ اور اگر خوابوں کی شراکت کے بارے میں تم نے اپنا سابقہ نظریہ تبدیل کرلیا ہے تو ہم منتظر ہیں۔" عثمان نے کہا۔

فاروق نے ایک اچٹتی سی نظر ہجوم پر ڈالی۔ حمیرا اپنی ذات میں گم کوئی نہایت غیر دلچسپ قصہ بہت دلچسپ انداز میں سنا رہی تھی۔ اس کی ہم زاد کی مکمل توجہ قصہ گو کی طرف تھی لیکن لگتا تھا وہ غائب دماغی کی کیفیت میں بیٹھی ہے۔ شاید متوجہ تو ہے لیکن اس کے کانوں تک کچھ نہیں پہنچ رہا۔ آخری مرتبہ جب اس نے اس کو دیکھا تو اس کے مزاج پر کوئی برہمی طاری تھی۔ آج اپنوں کے بیچ بیٹھی اس انتشار سے خالی خالی لگتی ہے۔ رضا اچھے ٹی وی ہوسٹ کی طرح باری باری سب کی طرف اپنی توجہ تقسیم کیے ہوئے، مسکراتا، بیچ بیچ میں دخل اندازی کرتا۔ عثمان خوش نظر آتا ہے، وہ جب اپنے دوستوں کے حلقے میں بیٹھتا ہے تو اطمینان اس کے روم روم سے برستا ہے۔ شاید وہ سنڈریلا کے جوتے پھینک جانے والے وا سے نکل آیا ہے اور کسی بھی کیفیت سے نکل آنا اتنا آسان ہوتا ہے؟

ان سب کے درمیان ایک ایسا شخص بھی بیٹھا تھا جس سے آج اس کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اس کو باقاعدہ ملاقات بھی نہیں کہتے لیکن وہ ایک دوسرے کے ذکر سے خوب واقف تھے۔

"نہیں بھئی۔" وہ لوگوں کا مطالعہ کرتا رکا۔ "جمال صاحب اپنا خواب بیان کیجیے۔"

"میرے پاس بیان کرنے کو کچھ نہیں بچا لیکن میں نے جو خواب دیکھے تھے ان کی تعبیر پالی ہے۔" اس نے ایک وقفہ دیا۔ "بھیانک تعبیر' مجھے آج ملازمت سے برخاست کردیا گیا ہے' میرے خلاف ایک انکوائری چل رہی تھی' جس کا فیصلہ میرے حق میں نہیں ہوا۔"

چہکتے ہوئے لوگ اچانک خاموش ہوگئے۔ اس قسم کے بہت سے واقعات آئے دن ہو رہے تھے۔ لیکن اب یہ حادثہ گھر میں گھس آیا تھا۔ فضا پر چھایا سکوت اس خبر سے زیادہ بوجھل تھا۔

شاید یہ وہ واحد بات تھی جو تنویر کی سمجھ میں آگئی۔ وہ ان لوگوں کے درمیان ٹھہر نہیں سکی۔ ایک جھٹکے سے اٹھی گڑیا کا ہاتھ گھسیٹا اور اندر چلی گئی۔ لوگ باگ جیسے بات شروع کرنے کے لیے سرے پکڑتے رہے، جو ان کے ہاتھ لگے ہی نہیں۔ پھر اس طویل خاموشی کو فاروق نے ہی توڑا۔

"الزام کیا تھا؟"

"الزام تھا میں نے اپنے D.D.O Power کا غلط استعمال کیا ہے' بجٹ میں گھپلے کیے ہیں' ایک فارم ہاؤس خریدا کسی اور کے نام سے' اور بیچ دیا اپنے دوست کے نام سے۔ مرسڈیز منگوائی جس کی ڈیوٹی نہیں دی۔ اٹھارہ پوائنٹس پر مشتمل ایک طویل چارج شیٹ ہے۔"

"لیکن یہ سب تو بے بنیاد باتیں ہیں، جمال بھائی!" حمیرا نے حیرت سے کہا۔ "آپ کے پاس یہ سب کہاں ہے؟ کیا ان کو پتا نہیں چلتا یہ سب غلط الزامات ہیں؟"

"الزام تو لگانے پڑتے ہیں بی بی! کسی کو ملزم ٹھہرانے کے لیے۔" جمال بھائی ظالموں کا دفاع کرتے نظر آئے۔

"اور اصل وجہ کیا تھی؟" فاروق نے آہستگی سے پوچھا۔

"وجہ ایک شخص تھا۔ مجھے اس کے بارے میں ایک رپورٹ تیار کرنا تھی۔ رپورٹ تقریباً" مکمل ہوچکی تھی۔ دراصل مجھے یہ ڈیوٹی دی اس لیے گئی تھی کہ میں اس کو باعزت بری کردوں۔ مجھے پے در پے گھٹیا قسم کی دھمکیاں بھی ملتی رہیں۔ لوگوں نے سمجھایا اس پر ہاتھ ڈالنا کھیل نہیں کیونکہ اس کی پشت پر تینوں بدنام زمانہ غیر ملکی ایجنسیاں کھڑی تھیں مگر میں نے اپنی تمام تر ہوشیاری اور چالاکی کے باوجود یقین رکھا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جو شخص پاکستان کا اس قدر کھلا دشمن ہو۔ جس کے رابطے علم میں آگئے ہوں اس کی پردہ داری میں کون دلچسپی لے سکتا ہے۔ اپنی طرف سے تو میں نے اس کا پول کھول کر بڑا کارنامہ انجام دیا تھا لیکن شاید یہ خبران کے لیے نئی نہیں تھی سو یہ رپورٹ Submit (جمع) ہونے سے پہلے واپس لینے کے لیے ایک ایسی رقم کی پیش کش کی گئی جو لاکھوں والے فگر سے اوپر تھی۔ پھر یہ طویل تازہ چارج شیٹ تیار ہوئی۔ جس کا مجھے ترتیب سے نکتہ وار جواب دینا ہے۔ اس کو ایک نظر دیکھتا ہوں تو یہ اس مہارت سے تیار کی گئی ہے کہ مجھے خود — پر شک ہونے لگتا ہے۔ جواب کیا دوں؟"

"کون شخص تھا وہ؟" عنبر جیسے ہچکچاہٹ سے بولی تھی۔

"اس سے کیا فرق پڑے گا وہ کون تھا بی بی! چھوڑو اس کو۔" اس نے لاپروائی سے ہاتھ جھٹکے۔

"اور کورٹ؟"

"ہاں کورٹ بھی ہے' مزید انکوائریاں بھی' ہوسکتی ہیں۔ انجام کار میں بری ہوجاؤں' آج نہیں تو کل Not guilty (بے گناہی) کا ٹھپہ لگوالوں لیکن یہ تو سمت ہی تبدیل ہوگئی۔ اب فوکس میری ذات ہوگئی ہے۔ وہ تو صاف

بچ نکلا نا! اس کو اور اس جیسے بہت سے لوگوں کو حق حاصل ہے کہ ان پر ہاتھ نہ ڈالا جائے۔"

"یہ لو۔" جمال نے یک لخت خوشگوار لہجے میں فضا کا جمود درہم برہم کردیا۔ "کریم بی مع اپنی ڈوئی باہر آگئی ہیں۔" وہ تیزی سے اٹھ کر ان کی طرف لپکا۔

"میں کب سے ان سے کہہ رہا تھا' کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے' اندر چلو پر سب کے سب غیر ذمے دار' لاپروا۔"

وہ مجمع وہیں چھوڑ کر تیز تیز قدم اٹھاتا کریم بی کی ہمراہی میں اندر کی طرف چلا گیا۔ لمبی راہداری کے ایک کونے میں کسی بند دروازے سے ٹیک لگائے سہمی خوفزدہ تنویر نے اس کا راستہ روک لیا۔ کمرے میں جانے سے قبل اس نے ٹھٹھک کر اسے دیکھا۔ اپنی بچی کو ٹانگوں سے چپکائے خوف سے لرزتی' کانپتی' غیر محفوظ' اجڑی کھسٹی جمال کو پچھتاوے نے گھیر لیا۔ کیا ضرورت تھی اس کے سامنے یہ سب کہنے کی' حالانکہ اس نے سوچا بھی تھا وہ کسی سے کچھ نہیں کہے گا۔

"اب کیا ہوگا؟" تنویر کی آواز سرگوشی سے ذرا ہی بلند تھی۔ "مجھے پتا ہے یہ سارا حادثہ میری وجہ سے پیش آیا ہے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہے۔" وہ تھوڑی دیر کو جم کر اس کے سامنے کھڑا ہوا۔ "آپ کو یاد نہیں شاید میں نے بہت پہلے بھی آپ سے کہا تھا' اگر کبھی میں اور وہ مقابل ہوئے تو وجہ آپ نہیں ہوں گی۔"

جواب کے انتظار کے لیے وہ ٹھہرا نہیں' انہی قدموں پلٹ کر سر عباس کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ مجھے خود یاد ہے۔ تنویر نے سوچا' اتنے فرق کے ساتھ کہ یہ جملہ بولتے اس نے "آپ" نہیں "تم" کہا تھا۔ اب اگر وہ "تم" نہیں رہی "آپ" ہوگئی تھی تو ان الزامات کی چارج شیٹ کس پر عائد کی جائے؟



بڑے کوئی بچے تو نہیں تھے لیکن اپنے مسائل بڑوں تک نہ پہنچانے کا ان کا از خود ایک معاہدہ تھا۔ شہریار اندر آیا تو کھانے والا کمرا آباد تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب مجمع اپنے ہائیڈ پارک کارنر میں اپنے دکھوں اور سکھوں کا کھل کر اعلان کر رہا تھا' وہ دکھ سکھ جو وہ جاگتی آنکھوں بھی دیکھ نہیں سکتے تھے جن میں قصے کہانیاں تھیں' امیوزمنٹ پارک کے جھولے تھے' اسٹیبلشمنٹ اور بیوروکریسی کے گھپلے تھے۔ سیاستدانوں کی ریشہ دوانیاں تھیں۔

وہ شام سے ان کے درمیان بیٹھا تھا' بہت دن بعد آیا تھا اور بہت کچھ بدلا بدلا لگ رہا تھا۔ ایک دن اسے اچانک دنیا سے عدم دلچسپی کا احساس ہوا اور خود کو دیر تک تولنے اور پرکھنے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ وہ کچھ عرصے سے غیر اہم سا ہوگیا تھا۔ کچھ وقت گزرا ضرور تھا۔ زمانے کی طوالت کا پیمانہ ہر نسل کے لیے مختلف ہوتا ہے۔ ابا بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں۔ زیادہ پرانی بات نہیں ابھی دس پندرہ سال پہلے کا قصہ ہے۔ وہ پلٹ کر دیکھتا ہے تو تین چار سال بھی بہت پیچھے...... بہت دور نظر آتے ہیں۔ دھندلائے دھندلائے سے..... بڑوں کی زندگی میں تبدیلیاں جلدی جلدی نہیں آتیں۔ وقت ٹھہر ٹھہر کر رک جاتا ہے نوجوانوں کی زندگی میں تبدیلیاں تیزی سے آتی ہیں۔ ایک کلاس' اگلی کلاس' پڑھائی ختم۔ نوکری شروع' ایک جگہ تبادلہ دوسری جگہ ٹرانسفر' ترقیاں' نئے نئے لوگ زندگی میں آتے ہیں۔ جو چلے جاتے ہیں وہ بھی بہت دور نہیں جاتے متحرک' گرم جوش جوانی اور ٹھٹھری ہوئی جامد بزرگی میں گھڑیوں اور کلینڈروں کو ماپنے کا پیمانہ الگ الگ ہوجاتا ہے۔

تو اس ایک علیحدہ اسکیل میں اسے احساس ہوا تبدیلی بہت تیزی سے آئی ہے۔ وہ ان سب سے بچھڑا تو یہ ایک ٹھرکی مگر بچھڑے اتنا زمانہ گزرا کہ اب بچھڑنا بھی تاریخ کا حصہ ہوگیا تھا۔ سب کے سب چھوٹے سے بڑے ہو

گئے۔ لاابالی پن سے ذمہ داری میں داخل ہوئے۔

تنویر کی شادی ایک حادثہ تھی' اس کے بعد اس کی زندگی جس طرح درہم برہم ہوئی' خاندان کو اپنے حصے کا اس کا بہت سا بوجھ سہارنا پڑا۔ ہر شخص نے اپنے اپنے حصے کے دکھ اٹھائے۔

ایسا ہی ایک واقعہ عثمان کے ساتھ گزرا۔ وہ اچانک بڑا ہو گیا اور اپنے ذاتی غموں سے نکل کر بکھر گیا۔ جیسے پہاڑی سے اترنے والا پرشور تند نالہ زمین کی وسعت میں آکر پھیل جاتا ہے۔ پرسکون ہو جاتا ہے' سست رو ہو جاتا ہے اور وہ جو تیسری تھی جو ہر نئی خبر سنانے کو بے تابی سے اس کی طرف بھاگتی تھی' وہ جس کے رزلٹ اچھے نہیں آئے اور اپنی منصوبہ بندی چھوڑ کر وقت کے دھارے کے ساتھ نہ چاہتے بھی بہنا پڑا گو آج بھی اس کی ای میل اسی باقاعدگی سے آتی ہے لیکن اس میں بچپن والا خروش ماند پڑ گیا ہے۔ اس کا نشریہ ڈائری سے خبرنامے کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔ وہ بھی بڑی ہو گئی تھی اور نکل آئی تھی' حمیرا رضا بھی۔ اس کی اپنی بہن میں بھی بڑی تبدیلی آئی تھی۔ اس کی باتوں سے زہر بالکل ختم تو نہیں ہوا لیکن اس کے نشتر کند پڑنے لگے تھے۔ وہ بھی تھک چکی تھی شاید۔ لمحے بھر کو اسے رنج ہوا' وہی تبدیل ہونے سے کیوں رہ گیا؟

کھانے والا کمرا کھچا کھچ بھرا لگ رہا تھا۔ وہ دادی اماں کے پاس سے اٹھ کر آیا' اس کو اپنے بہادر دوست اچھے لگے۔ جمال سمیت سب ہی مسکرا رہے تھے۔

"ڈیوک کہاں رہ گیا؟" کسی نے آواز بلند کی۔

"ادھر کھڑا ہے۔" اس نے جواباً" دروازے سے ہانک لگائی۔

کرسی سنبھالنے سے پہلے اس نے یوں ہی ادھر ادھر دیکھا۔ "فاروق صاحب کہاں گئے؟"

"وہ تو چلا گیا۔ وہ جب لاہور آیا ہو تو کھانا عموماً" اپنے والد کے ساتھ ہی کھاتا ہے۔"

ان کو اپنے نئے دوست پر بھی ویسا ہی فخر تھا جیسے وہ پرانوں پر رکھتے تھے۔

رات گئے وہ سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو فوزیہ اس کی سائیڈ والی تپائی پر گرم دودھ کا گلاس رکھ گئی تھی۔ شہریار نے پردے سرکائے' فضا رات گئے بھی Pollution (آلودگی) اور مرکری بلبوں سے دھندلا کر آلودہ ہو رہی تھی۔ آسماں پر ایک ستارا نظر نہیں آ رہا تھا۔ جب سے احمد پور چھوٹا وہ ستارے دیکھنے کو بھی ترس گیا تھا۔ اس کی طبیعت بوجھل تھی۔

شام سے وہ اس بوجھ سے نجات پانے کے جتن میں تھا لیکن عجیب گورکھ دھندا تھا۔ جتنے ہاتھ پاؤں مارتا گنجلیں اس کو مزید الجھا دیتیں۔ کتنی دیر بجلی بند کیے وہ نیند کا انتظار کرتا رہا' پھر سونے سے مایوس ہو کر سائیڈ کا لیمپ سوئچ آن کیا تپائی پر رکھے دودھ پر ملائی کی جھلی آگئی تھی۔

عدم دلچسپی کے باوجود اس نے نیک نیتی سے سوچا تھا' اپنی ماں اور بہن کو خوش کرنے کے لیے وہ اس گلاس کو غٹ غٹ چڑھا جائے گا۔ لیکن پھر یہ گلاس بھی ماضی کی بھولی بسری چیزوں میں شامل ہو گیا۔

بستر پر ساتھ پڑے لیپ ٹاپ کا Lid اٹھا کر اس نے اپنی ای میل کھولی۔ عبید کی ساری ڈاک ترتیب وار اور تاریخ وار ایک فولڈر میں محفوظ تھیں۔ بس انسان اور لفظوں میں یہی ایک فرق ہوتا ہے کہ لفظ قید کیے جا سکتے ہیں۔ انسان سلاخیں توڑ کر آزاد ہو جاتا ہے۔ پتا نہیں کیوں' لیکن اسے یہ شغل خاصا دلچسپ لگا۔ پچھلی تاریخوں سے موجودہ تاریخوں تک آتے آتے وہ ایک ایک خط اہتمام سے پڑھتا رہا۔ یہ خط اسی کے نام تحریر تھے۔ مگر چوری کا عجیب احساس لیے وہ تاریخ وار اس ماضی سے گزرا۔ اس میں خوشی کی خبریں تھیں۔ خوف تھے' مایوسی تھی' غم و غصہ تھا۔ ایک دبی دبی امید تھی۔ لوگوں اور پاکستان سے محبت تھی۔

"ہم ایک ڈرامہ کرنے والے ہیں' تم ضرور آنا۔" یہ رسمی بلاوا نہیں تھا اور اس کو اس سے نیٹ پر بات کرنے

کے لیے بارہ کلومیٹر دور سفر کر کے جانا ہوتا' کبھی کبھی وہ افسران اعلا سے چھپ کر بڈی کی سائیکل کے کیریر پر ماسی پھاتاں کی طرح بیٹھ کر نہر کے کنارے کنارے سفر کرتا' ٹیٹ کیفے پہنچتا۔ وہ بے تابی سے منتظر ہوتی۔ بچوں کی طرح ضد کرتی' مچلتی "ضرور آنا شہریار۔" اس میں خوف تھے۔ "انہوں نے قیصر کو بری طرح پیٹا ہے۔ پتا نہیں وہ بچ بھی سکے گا کہ نہیں' میں اس کے پاس اکیلی بیٹھی تھی اور دعا کر رہی تھی' کاش اس وقت کوئی آجائے۔"

مایوسی تھی۔ "یہ سارا حق کیسی منافق عورت نکلیں۔ ان کو عورت کلچر سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مظلوم عورتوں کو صرف اپنی شہرت کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ ظلم ان کی آمدنی کا ذریعہ ہے۔ ہم کیسے لوگوں کے پیچھے جارہے ہیں۔"

غم و غصہ تھا۔ سب نے مل کر اسے C گریڈ دلوایا تھا۔ لوگ زیادتی کے خلاف کبھی متحد نہیں ہوتے' لیکن کسی کے ساتھ زیادتی کرنی ہو تو یہ سب مل جاتے ہیں۔

"دیکھنا! جمال بھائی' نعیم ملک کو جیل پہنچا کر دم لیں گے۔" عجب و غریب قسم کا فخر ہے اس کو اپنوں پر۔ "یہ کیسے ہوتا ہے شہریار' یہ سب غدار عزت کی زندگی کیسے گزارتے ہیں' کسی دن تو یہ تنگی ختم ہوگی' کبھی تو اس نظام کا خاتمہ ہوگا۔"

لوڈشیڈنگ ہے' گیس کے ناغے ہیں' لوگ بھوک سے خودکشیاں کر رہے ہیں' خوف ناک بیروزگاری ہے' دنیا ہی ہماری دشمن نہیں ہوئی' ہم خود بھی اپنے دشمن ہوئے ہیں' لیکن ایک دن یہ سب ٹھیک ہو جائے گا' کیونکہ "میرا حق ہے فصل بہار پر" وہ کیا کہتے ہیں بزرگ... "پاکستان اللہ کا حکم ہے اور اللہ کا حکم قائم رہنے کے لیے ہے۔"

اس نے ڈھکن واپس گرادیا۔ میل باکس پڑھا جاچکا تھا۔ وہ جب گھر خط لکھتا' اپنے آرام سے ہونے کا ذکر کرنا کبھی نہ بھولتا۔ وہ آرام سے تھا' کیونکہ وہ ایک نہایت آرام دہ مکان میں رہتا تھا۔ جو ایک انتہائی صاف ستھری سڑک پر واقع تھا۔ جس میں جگہ جگہ لکھا ہوتا۔

" Keep the cantt clean "(کینٹ کو صاف ستھرا رکھیں۔)

سڑک کے پار جہاں چھاؤنی ختم ہو جاتی' کوڑے' کرکٹ' غلاظت کے ڈھیر تھے۔ بھوک' ننگ' افلاس تھی۔ دھوپ سے جھلسائے سیاہ رنگتوں والے خانہ بدوشوں کے ننگ دھڑنگ بچے' مکھیاں بھنبھناتی خوراک کھاتے' چارپائیاں توڑتے' نشے میں دھت کام چور مرد' بھیک مانگتی اور گھروں سے چھوٹی چھوٹی چیزیں چراتی عورتیں' افسران کے aesthetics (جمالیاتی ذوق) پر گراں گزرتی۔ وہ جب گھٹنے پر کلف سے اکڑا نیپکن پھیلا کر دائیں ہاتھ میں چھری اور بائیں میں کانٹا پکڑے' احمق بیروں کو جھڑکتے اور ساری دنیا بھر کی دانشور کے ساتھ یہ ذکر کرنا بھی نہ بھولتے کہ ان بلڈی خانہ بدوشوں کو یہاں سے دفعان کرنا چاہیے۔

یہ Eye sores (آنکھوں کے لیے ناگوار) ہیں۔ بیچلر میس میں کھانا کھاتے اس کے کولیگز اکثر و بیشتر ایسے سوال ضرور کرتے جو کنواروں پر خوب جچتے ہیں۔ لیکن کالونی کے باہر رہائشیوں کو ان سوالوں اور جوابوں کی فرصت نہیں۔

"سچ بتاؤ' تم نے آخری محبت کب کی تھی؟"

"افسوس میرے پاس کبھی اتنا وافر وقت نہیں ہوا۔" شہریار اکتاہٹ سے کہتا۔

"ایسی کون سی مصروفیت ہے' جو تمہیں محبت نہیں کرنے دیتی۔"

ہال میں جگمگاتے فانوسوں کی روشنیاں ہیں' کٹلری کے پلیٹ سے ٹکرانے کی کھنکھناہٹ' بوتل سے گلاس میں گرتی پیپسی کی قلقل' روشنی' زندگی' توانائی۔

"میں محبت نہیں کرسکا' کیونکہ میں عشق کرتا ہوں۔ محبت ایک چوراہا ہے' جس میں آمدورفت جاری رہتی ہے۔ عشق کو دوام ہے۔ عشق جستجو ہے' جستجو جاری نہ رکھی جائے تو تلاش کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور ضروری یہ بھی نہیں کہ ان سب کا جواب تمہیں دیا جائے۔" اس نے خاموشی سے نیپکن اپنے ہونٹوں کے دہانے پر دباتے سوچا۔ "عشق واویلا نہیں کرتا' اصرار بھی نہیں کرتا' چپ چاپ اپنے اندر جھلستا رہتا ہے۔ آپ کو خود اپنے آپ سے دور کرتا جاتا ہے۔ جیسے اپنے گھر میں اچانک آدمی اجنبی ہو جائے۔"



اس کو بے اطلاع اچانک آنے کا بڑا مزا آیا تھا۔ گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی' جس نے عمر ہوسٹلوں اور کیمپوں میں بسر کی ہو' استقبالیہ خوشی کسے کہتے ہیں' صرف اسی کو پتا ہوتی ہے۔ بچپن کے پالے کا حق مانگنا بھی اسی کو آتا ہے' سو جب کریم بی' بڑی تائی اور دادی اماں صدقے واری جاتیں اور سر عباس نپے تلے قدموں سے اپنے کمرے سے باہر آتے تو طویل سفر کے بعد یہاں تک پہنچنے کا مقصد سمجھ میں آجاتا۔

تنویر نے ایک مدت سے دل کی بات کسی سے کہنی بند کردی تھی' لیکن اس کی منتظر رہتی کہ وہ بہت اچھا سامع تھا۔ اور "وہ" بھی تھی جو بچوں کی طرح خوشی سے اچھلنا شروع کردیتی۔ عبیرہ کو خوش کرنا بہت آسان تھا۔ وہ اسی سہولت سے اداس بھی ہو جاتی تھی۔

وہ گھر میں داخل ہوا تو اتفاقاً" اس کی پہلی نظر اس پر پڑی۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھی اپنے پسندیدہ گلاب کی جڑ میں گوڈی کر رہی تھی۔ اسے اپنے گھٹنوں پر لگے کاہی داغوں کی بھی پروا نہیں تھی۔

"کیا پرولتاری انداز ہے' واہ!"

وہ کھرپی رکھ کر اطمینان سے چوکڑی مار کر بیٹھ رہی۔

"محنت کش کا استحصال تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔"

"یاد رکھو کیاری کھودنے اور پتھر کوٹنے میں بہت فرق ہے' مگر اس قدر اداسی کس بات کی ہے؟"

"دیکھو تو ذرا! دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے ہو جیسے ابھی گئے تھے' ابھی پلٹ آئے ہو۔ اوپر سے اپنے بیانات ملاحظہ فرماؤ۔"

اسے لگا وہ جواب دینے سے کنی کترا رہی تھی۔ وہ اپنی پہچان پر مشکوک ہونے لگا۔ یہ وہی لڑکی تھی۔ اچانک اتنی سمجھ دار کیسے ہوگئی کہ مشکل جوابوں سے نظریں چرانا سیکھ لے۔ اس عبیرہ اور اُس عبیرہ میں کوئی فرق تو نہیں تھا۔ لیکن ایک دم وہ دو مختلف ہستیوں کی طرح لگی۔ انسان کے مسلسل تبدیل ہونے کا انکشاف اس لیے اس پر پہلی دفعہ ہوا تھا۔ وہ بات کا جواب دینے کے بجائے کیچڑ سے سنے ہاتھوں سے پتھر کی کنکریاں الگ کرتی خوامخواہ اپنے آپ کو مصروف ظاہر کر رہی تھی۔ شہریار کو یقین ہوا کوئی بات ایسی ضرور تھی جس کے لیے اس نے اپنے اور شہریار کے درمیان پردے حائل کردیے تھے۔ اس پردہ داری کی اس کو اچانک کیا ضرورت پڑی تھی' وہ تو ہمیشہ سے کھلی ڈلی تھی' کیا وہ کچھ چھپا پائے گی؟

اس کا جی نہیں چاہا' وہ اصرار کرے اور بے وجہ اس کے بھید کھولے۔ لفظ اداسیوں میں کمی نہیں کرتے۔ وہ وجہ جو خاموشی نگل کر بیٹھی ہے' حرفوں میں آئی تو اضافے کے ساتھ آئے گی۔

"چلو نہ بتاؤ۔" ان تین لفظوں کو بھی خاموشی نگل گئی تھی۔ یہ لفظ بھی محض دل نے سوچے تھے۔ "لیکن اگر تمہیں لگا کہ مجھے انجان رکھنے میں تم کامیاب رہیں تو بڑی حماقت کی۔"

وہ دیر سے چپ کھڑا تھا۔ عبیرہ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ بے تحاشا پچھتاوے نے اسے گھیر لیا۔

"ارے یہ تو اپنا شہریار ہی ہے نا!" گھاس کے قطعے پر دیوار کے نزدیک لگے نل سے اس نے ہاتھ دھوئے۔ کپڑوں سے گھاس اور مٹی جھاڑی' واپس آکر سکون سے پتھر کی بنی بینچ پر بیٹھتے کہا۔

"ایک بات کہوں شہریار؟ ہماری کالج کی لائبریری میں موٹی موٹی ڈکشنریاں میز پر کھول کر رکھی جاتی تھیں۔ یہ لائبریرین کا جبر تھا کہ ان کو پڑھا جائے۔ نہ چاہتے بھی لفظوں پر نظر پڑتی تھی۔ کیا میرا چہرہ لائبریری میں رکھی آکسفورڈ کی ڈکشنری ہے؟ ہر کوئی پڑھ سکتا ہے؟"

"ہر کوئی؟" اسے ایک ضرب لگی۔

"میں بہت اچھا قاری رہا ہوں' پڑھنا میری عادت ہے' میں خود پہ جبر کرتا ہوں' مجھ پر جبر نہیں کیا جاسکتا' کہاں ہیں سب لوگ؟" اس نے بھی موضوع ایک طرف پھینک عمارت کی طرف دیکھا۔ چھٹی کا دن اور ایسی خاموشی۔

"ہے ڈیوک۔" کمرے کی کھڑکی کھلی' عثمان نے بشاشت اور مسرت سے نعرہ بلند کیا۔ "چلے آؤ۔"

وہ خوشدلی سے مسکراتا چلا اندر ایک دنیا آباد تھی۔ اس کی دنیا' جہاں ہر طرف اس کے لیے جگہ تھی۔ اس کو فردا" فردا" ہر شخص کے ساتھ وقت اور توجہ بانٹنا تھی۔

سر عباس کے ساتھ' ان کی کتاب کی تفصیل میں جاتے ہوئے۔ تائی نائلہ کے ساتھ' گو ان کے ساتھ کی گفتگو میں اس کو کچھ خاص بحث کرنے کو ملتا نہیں تھا' وہ کم گو تھیں' عام ماؤں کی طرح ان کو اپنی اولاد سے گلے نہیں تھے۔ بہو ان کی کوئی تھی نہیں کہ شکوے شکایت کے دفتر کھولتیں' شاید ہوتی بھی تو وہ کمال کی راضی بہ رضا رہنے والی خاتون تھیں۔ بڑی تائی کے ساتھ' کہ کوئی مدت ہوئی انہوں نے ادھر ادھر کا سفر چھوڑا اسی گھر میں قیام کا ٹھکانہ بنالیا تھا۔ اب رنگ برنگی باتیں ان کے پاس بھی برائے نام ہی رہ گئی تھیں۔

کریم بی کے ساتھ اس زمانے کو یاد کرتے جب گنڈیریاں چونی سیر آتی تھیں اور دانت اس قدر مضبوط تھے کہ ذرا دیر میں گنے والی مشین کی طرح پھوک پھینک کر ڈھیر لگاتے جاتے تھے۔ پانی کا چھینٹا ڈالتی' اس کے لیے قیمہ بھونتی جاتیں۔ گھر میں لوگوں کی کمی تو نہیں تھی۔

اس نے سر عباس کے کمرے کی کھلی کھڑکی سے جھانکا۔ باہر اندھیرا تیزی سے پھیل رہا تھا۔

عبیو ابھی تک لان میں اترنے والی سیڑھیوں پر اکیلی بیٹھی تھی۔ گھر سے رخ موڑے' اپنی لائبریرین کے حکم کے برعکس کھلی کتاب بند کیے' شہریار چپ چاپ اس کے برابر آبیٹھا۔

"بہت دن سے میرا تم سے رابطہ نہیں رہا۔" وہ مجرموں کی طرح افسوس سے بولی۔

"دو چار ایسی باتیں ہوئیں جو تمہیں بتانی چاہیے تھیں۔ پتا نہیں کیوں میں سب کی سب تم سے کیوں نہیں کہہ سکی۔"

"کوئی بات نہیں۔" اس نے رسان سے کہا "کوئی تو وجہ ہوگی جو تم نہیں کہہ سکیں۔"

عبیو نے حیرت سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کو کبھی کسی سے گلہ نہیں ہوتا تھا۔

"میری ثریا سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"اچھا۔" اس نے بے توجہی سے کہا "خوش ہے وہ؟"

"پتا نہیں۔ یا شاید' نہیں۔"

"اس نے عثمان کو نقصان پہنچانا چاہا اور شاید پہنچایا بھی ہو۔ لیکن جوابا" اپنا بڑا نقصان کر بیٹھی۔ اپنی آزادی ہی داؤ پر لگادی۔ تم سوچ سکتے ہو وہ گاؤں میں زمین دار بنی سونے سے لدی' اپنی سوکن کے احکامات بجالاتی ہے۔ بس! اس نے جو بڑے بڑے خواب دیکھے تھے دنیا بدل دینے کے' آرٹ میں تہلکہ مچادینے کے اب اسے کچھ بھی یاد نہیں' اور حیرت ہے کہ اسے کوئی افسوس بھی نہیں' کیا ملا اس کو؟"

"میں نے اس کے ساتھ ساری شام اس کے گاؤں میں گزاری، نہ سہی معاشرہ وہ چاہتی تو گاؤں کے حالات تو بدل سکتی تھی۔ لیکن وہ کہیں سے بھی انقلابی طالب علم نہیں لگی، بھٹے نمبردارنی، اپنے محکوموں پر رعب جماتی۔"

"ہو سکتا ہے اس کو ایسی زندگی پر اعتراض نہ ہو اور یہ صرف تم ہی کو اچھا نہ لگا ہو، زندگی سودا ہے، کچھ لو، کچھ دو، اس نے جو لیا اس کی قیمت اس کو زیادہ عزیز ہو بہ نسبت اس کے جو اس نے دیا۔"

"تم اس کے ساتھ زیادتی کر رہے ہو، یہ خالصتاً "ایک مرد کی اپروچ ہے، دوست کی نہیں۔"

"ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔" اس نے پھر کسی بحث میں الجھے بغیر ہتھیار ڈالے۔

"یہ تو ہوئی ایک بات اور... باقی؟"

"تنویر اور ابا جان پر نعیم ملک نے کیس کر دیا تھا ہم لوگ کافی پریشان ہوئے۔"

"اس کا تو مجھے علم تھا، لیکن جھوٹے کیس بہرکیف ثابت نہیں ہو سکتے۔ وقتی تکلیف سے تو ہم گزرتے ہیں۔ رسوائی کا بھی احساس ہوتا ہے، لیکن پھر سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ جس تکلیف سے تنویر گزر کر آئی وہ بھی کچھ کم نہیں رہی ہوگی۔ اللہ نے اسے بچا لیا۔ وہ اب ہمارے ساتھ ہے اور محفوظ ہے۔ اللہ ہماری بھی حفاظت کرے گا۔"

"ایک مرتبہ میری سارا حق سے ملاقات ہوئی، میں وہ بھی نہیں بتا سکی، مجھے ان سے مل کر ہمیشہ جھنجلاہٹ ہوتی ہے۔ میرے سامنے ایک عورت ان کے گھر بھوکی پیاسی مر گئی، حالانکہ اس وقت ان کے گھر کی میزوں پر سو، سوا سو لوگوں کا کھانا لگا ہوا تھا۔"

"ہاں یہ بات تو تم نے بتائی تھی، دیکھو عبیر! ہم بہت سے کام صرف ناموری حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں، کسی کے کام آنا ہماری نیت نہیں ہوتی، سیاست کے اپنے اصول ہیں، جاگیرداروں کے اپنے کھیل، عام لوگوں کی پہنچ سے پرے، نہ شکوہ لے کر کوئی نکلے، نہ دادرسی ہو، اور یہ اتنی پرانی بات تمہیں اب دکھی کر رہی ہے؟"

وہ ہچکچائی، لیکن ایک دم ایسے رکی جیسے اس نے خود کو کچھ مزید کہنے سے جھڑک دیا ہو۔

"کیا تھا ایسا؟" شہریار نے تشویش سے سوچا۔ جس کو ادا کرتے اس کے الفاظ اور ان کے معنی سلب ہو جاتے ہیں۔

"تم بتاؤ، تم اتنے بہت دن کیا کرتے رہے؟"

شہریار نے کچھ دیر ٹھہر کر اس کا چہرہ دیکھا۔ اپنے گمان میں وہ اتنی ماہر ہو گئی تھی۔ حالانکہ جس پھرتی سے اس نے بات کا رخ پلٹا اس کا بھونڈا پن چھپا نہیں رہ سکا تھا۔

"میں؟ میں کچھ خاص نہیں کرتا، وقت کی فراوانی، کام کی کمی اور فیلڈ ایمبولینس میں ہوں، تو عموماً" کئی دن بے کام کیے گزر جاتے ہیں۔ مریض کی شکل کو بھی انسان ترس جاتا ہے۔ زندگی میں ایسی تنہائی عذاب بھی ہوتی ہے، رحمت بھی۔ عذاب اس وقت ہوتی ہے جب آپ خود کو تنہا محسوس کریں اور رحمت اس وقت ہو جاتی ہے جب آپ کو اپنے آپ سے ملنے کی فرصت مل جائے۔ ورنہ اس بے پناہ ہجوم میں انسان کی حیثیت ہی کیا ہے۔ پھر آپ اپنی زندگی بھر کی غلطیوں کی ایک لسٹ تیار کرتے ہیں۔ اکیلے بیٹھ کر آپ کو پتا چلتا ہے کہ آپ کی "وش" اور اس کی "ول" میں کتنا فرق ہے۔" اس نے آسمان کی طرف انگلی بلند کی۔ "اگر آپ ان دونوں کے درمیان فاصلوں کو کم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو سفر آسان ہو جاتا ہے، لیکن ان فاصلوں کو ختم کرنا انسانی بس کا روگ نہیں۔"

گیٹ کھلا، تیزی سے اندر آتی سوزوکی ان کے قدموں میں پارک ہوئی۔ آپائی مع اپنے قبیلے کے برآمد ہوئی

ہیں۔ ایک کھنکھناتے قہقہے نے شہریار کا استقبال کیا۔ حال پوچھا' آنے پر خوشی کا اظہار کرتا گھر سے اٹھ کر بھاگتے چلے آنا' سب اس ایک قہقہے میں سمیٹ کر وہ اندر جا چکی تھیں۔ رضا' حمیرا نے اپنی اپنی جگہ سنبھالی۔ پھر لوگ باری باری آتے گئے اور ان سنگی' سرخ سیڑھیوں پر اپنی اپنی نشست سنبھالے براجمان رہے۔

کورم پورا ہو گیا' خوشی کی معراج بھی بس اتنی معمولی ہی تھی' نہ اقتدار کی جنگ' نہ نمبرداری بننے کی آرزو' نہ عورت کے دکھ میں ہلکان۔

"آؤ خواب خواب کھیلیں۔" عثمان کو اچھوتا آئیڈیا آیا۔ سب اپنا اپنا بہترین خواب سنائیں۔

"ارے واہ! عبیر عادتاً" خوشی سے اچھلی' وہ سب اس کے گرد جمع تھے۔ جن کی صحبت میں وہ ممکنہ مکمل خوشی پالیتی تھی۔ لیکن عبیر کو گمان بھی نہیں تھا اتنے بہت سے لوگوں کے ہوتے بھی جو شخص چچا کی ہمراہی میں داخل ہو گا اس کو دیکھ کر کسی وجہ کے بغیر اس کی رنگت اس تیزی سے بدلے گی۔ اس کو یہ علم بھی نہیں تھا کہ اس کا یوں لحظہ بہ لحظہ بدلتا رنگ کسی کے فوکس میں تھا۔

"تو یہ یوں تھا۔" شہریار نے ایک طویل گہرا سانس لیا۔ "اچھی بات ہے۔"

"میں برضا و رغبت اپنی خواہش اس کے ارادے کے سامنے سرینڈر کرتا ہوں۔"



"میری یہ یادداشت کل بیالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ فوٹو اسٹیٹ اٹیسٹڈ بشمول چار صفحات بیان حلفی۔

مجھے نہیں معلوم پاکستان کیسے بنا تھا' میں نے پاکستان کو بنتے نہیں دیکھا۔ اتفاق سے میرا تعلق اس نسل سے ہے جس کے والدین بھی آزادی کے بعد پیدا ہوئے اور اس پر فخر کرتے رہے کہ ان کے خون کا ایک قطرہ بھی غلامی کی خوراک سے آلودہ نہیں ہے۔ البتہ میرے دادا جن کا پیراں سالی کے باعث حال ہی میں انتقال ہوا' بہت سارے واقعات کے چشم دید گواہ تھے۔

تراسی سال کی عمر میں کہ جب انہوں نے وفات پائی بلکہ ابھی ان کے تراسی مکمل ہونے میں دو ماہ باقی تھے' ان کے سر پر بال تھے' منہ دانتوں سے خالی نہیں تھا اور حافظہ کسی گوگل سرچ سے کہیں تیز اور مستند تھا۔

وہ جب کوئی واقعہ بیان کرتے تو پوری صحت سے دن' تاریخ' وقت اور راوی درست بیان کرتے' جملوں کے سلسلے میں ان کی یادداشت اس قدر قابل رشک تھی کہ اگر کسی کتاب سے ان کا بیان لگا نہ کھاتا ہو تو یقینی طور پر وہ کتاب پھاڑ دیے جانے کے لائق قرار دی جا سکتی تھی۔ وہ عاشق قائداعظم تھے اور مرتے دم تک ان کے نام کے ساتھ رحمتہ اللہ علیہ ادا کرنا کبھی خطا نہیں کرتے تھے۔ جیسا کہ ان کی نسل کے بیشتر لوگ تھے' اور ایسا ہی کرتے تھے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے بیشتر اہم واقعات گزرے' وہ ان واقعات کو مطالعہ پاکستان کی لکھی ہوئی سرکاری اعداد و شمار والی کتابوں کی اصطلاحات سے مختلف بیان کرتے تھے۔ ہم اپنی تین نسلوں میں یہ فرق پاتے ہیں۔

دادا' آزادی کی جدوجہد کر رہے تھے' ابا عبوری عہد کے لوگ تھے اور یہ عبوری عہد نصف صدی پر محیط رہا۔ ہم تماش بین نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم دنیا کو اپنی نہیں ٹی وی کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ یہ شب و روز کا تماشا ہماری ذہنی تفریح ہے۔

جب پہلا مارشل لاء لگا' جب دوسرا آیا' جب ضیاء والا مارشل لاء آیا اور جب مشرف آیا' جلیانوالہ باغ کا مارشل لاء بھی میرے دادا کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوا تھا۔ 1965-1971ء اپنی ذات کے ساتھ دھوکہ سہی' لیکن وہ مشرقی پاکستان کے لیے سابق لفظ لگا سکے' نہ بنگلہ دیش کہہ سکے۔ پاکستان' جلسے' جلوسوں' نعروں' جیل اور قید سے بڑھ کر ایک جھنڈے اور ایک لیڈر تلے متحد ہو کر بنا تھا۔ صاف صاف' کھلے اور واضح ارادوں کے ساتھ۔

اب جو تاریخ بیان کرتے وقت مورخ ڈنڈی مارتے ہیں۔

واقعات کی توڑ موڑ سے گھپلے پیدا کرتے ہیں۔ وہ موجودہ مورخین پر الزام تراشی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اب تک جو تاریخ تحریر ہوتی رہی تھی وہ غلط اور جھوٹ کا پلندہ تھی۔ سابقہ نسلوں میں ابہام موجود تھا۔ ہاں البتہ ان کو خواب دیکھنے کی آزادی تھی۔ سو میرے دادا جب اپنے ہم عصروں کے ساتھ اکٹھے ہوتے تو اپنے اپنے خواب بیان کرتے تھے۔ آزادی کے خواب، مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے خواب، انصاف، امن، بھائی چارہ..... کیونکہ خوابوں پر کسی قسم کی کوئی بندش نہیں ہوتی۔ لہٰذا لغت میں درج تمام بھاری بھرکم لفظوں کو تصور میں لا کر طاق پر سجا دینے کا انہیں مکمل حق حاصل تھا۔

جب پاکستان بنے گا' وہاں ہم سب مسلمان متحد ہوں گے' یہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت ہوگی۔ ہندو کی چالاکی اور انگریز کی عیاریوں سے محفوظ' ظلم زیادتی سے دور' جب حق دار اپنا حق حاصل کرلے گا۔ اور ظالم کیفر کردار تک پہنچے گا۔

جب پاکستان ترقی کے اس زینے پر پہنچ جائے گا کہ دنیا بھر کی قومیں سر اٹھا کر دیکھیں گی' جب..... جب..... ان کے پاس بہت سے جب تھے۔ اور وہ ان سب پر یقین رکھتے تھے۔ کیونکہ ان کی نسل نے یقین کامل کے راستے ہی میں جدوجہد کی تھی۔

جناب اعلا! میں نے اپنے دادا کو اس خطہ زمین سے کبھی مایوس نہیں پایا۔ میں یہ بھی نہیں جانتا ان کو کچھ حسب خواہش ملا یا نہیں' مگر میں اس بات پر بہت خوش ہوں کہ عرصہ بیس سال سے وہ اس ذہنی عارضے میں مبتلا ہو گئے تھے۔ جس کو Dis - orientation کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں اس مرض میں مریض ماضی کے کسی خاص حصے میں اٹک کر رہ جاتا ہے۔ نام' مقامات اور کردار آپس میں اس طرح گڈمڈ ہو جاتے ہیں جیسے آپ کسی رولر کوسٹر میں بیٹھ کر آسمان پر جھلملاتے ستارے گننے کی کوشش کرتے ہوں۔

پہلی مرتبہ جب ایک آمر نے سیاست کی بساط لپیٹ دی اور ایک مارشل لا ایڈمنسٹریٹر گورنر جنرل ہاؤس میں داخل ہوا تو میرے دادا بیان کرتے ہیں وہ ایوب خان نہیں تھا۔ اور وہ دراصل 1956ء بھی نہیں تھا۔ دراصل یہ تحریک خلافت کا عہد تھا' جب انگریز گورنر جنرل نے کالوں سے جیلیں بھر دی تھیں۔ اس تعداد میں جیلیں بھری گئیں کہ ان میں جگہ نہیں بچی۔

وہ بھول جاتے تھے کہ وہ حبیب جالب کا ذکر کر رہے ہیں یا حسرت موہانی کا۔ ان کو گرفتار کرنے والا انگریز تھا یا دیسی۔ وہ برہم ہو کر کہتے تھے۔

"مشرقی پاکستان علیحدہ نہیں ہوا۔ اس نے تو علیحدہ ہونے کے باوجود پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔" کتنی مرتبہ وہ آمر کا نام لینا چاہتے' مگر ان کی زبان غوطہ کھا جاتی اور وہ اس کو جنرل ڈائر کہہ جاتے۔

وہ تو اچھا ہوا کہ جب پاکستان ریمنڈ ڈیوس اور اس قسم کے حادثات سے گزرا تو وہ اس جہان فانی سے کوچ کر چکے تھے۔ صد شکر کہ انہوں نے وہ لیڈر نہیں دیکھے جنہوں نے پاکستان کی خود مختاری اور سالمیت کو خطرات سے دوچار کر دیا۔ اور کرپشن کے کارناموں سے قوم کو عالم اقوام میں بے توقیر کر دیا۔

نعیم ملک ایک "عزت دار" شہری ہے۔ میں اب اس بات سے بھی متفکر نہیں کہ وہ اور اس کے ساتھی کون لوگ ہیں' نہ ہی ان تمام واقعات سے اپنی اعلا نسبی اور بے گناہی ثابت کرنا مقصود ہے۔ بیالیس صفحوں کی یہ رپورٹ اس یادداشت کے ساتھ منسلک ہے۔ میں شرمندہ ہوں کہ ایک غدار وطن کی نشاندہی کرکے آپ سب کی ذہنی کوفت کا سبب بنا۔ اور افسوس سے وعدہ کرتا ہوں اگر زندہ رہا تو آپ کے لیے عمر بھر اس کوفت کا سبب بنا رہوں گا۔ تاوقتیکہ کہ ہم نہ رہیں یا آپ نہ رہیں۔"

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)



سائرہ رضا

چھلا لے گی عید

مرے یہ سودا ہے..... شاہد حسین بالکل بے جان ہوتے جسم اور کانپتے قدموں کے ساتھ زمین پر اکڑوں ڈھے گیا۔ کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائیں اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ جس مصیبت میں وہ گرفتار ہو گیا تھا' اس سے نکل ہی جاتا' بے گناہی ثابت ہو ہی جاتی۔ مگر ایسے موقع پر..... پریشانی' شرمندگی اور بے چارگی نے چہرے کی رنگت سیاہی مائل کر دی تھی۔

اسے صبح کی روشنی کی طرح یقین تھا کہ اس کی سچائی ثابت ہو جائے گی' مگر ایسے موقع پر.....

ریحانہ نے اپنی عید کی شاپنگ پر طمانیت بھری نگاہ ڈالی۔ ابھی چوڑیاں' مہندی' اور چھوٹی شفق کی کچھ چھوٹی موٹی چیزیں باقی تھیں۔ مگر خاصی شاپنگ وہ کر چکی تھی۔

اپنا کاٹن کا سوٹ' اماں کا سادہ سوٹ' شوہر کا سوٹ درزی سے اٹھانا باقی تھا۔ شرجیل اور راحیل کے کپڑے' جوتے تھے۔ کچھ چیزیں شوہر صاحب نے دلانا تھیں۔ عید سے ایک روز پہلے اس کے شوہر نے آجانا تھا' سو باقی تیاری ان کی آمد تک ملتوی تھی۔

ریحانہ نے سب تھیلے بہت احتیاط سے الماری میں رکھے اور کچن میں آگئی۔

آج آٹھ ذی الحج تھی اور کل تو کو سب یوٹیلیٹی اسٹور بند ہو جانے تھے۔ اماں' پڑوسن کی دیکھا دیکھی' کافی راشن لے آئی تھیں۔ وہ عادی نہیں تھیں ایسی خریداری کی سو اب تھکی ہوئی بیٹھی تھیں۔

ریحانہ شہر سے اتنا واقف نہیں تھی۔ اس نے یہ ساری خریداری پچھلے گراؤنڈ میں لگنے والے بچت بازار سے کی تھی۔ بچے گھر چھوڑے' تین ہزار روپے لیے اور سب ختم کر کے لوٹ آئی۔

"ریحانہ! فون بج رہا ہے' سن لو بیٹا۔" اماں نے تھکن زدہ آواز میں اسے پکارا۔

"جی اماں! آئی۔" وہ بھاگی۔

"جی' ہیلو' وعلیکم السلام... سب ٹھیک ہیں... ہاں جی' کرلی سب خریداری... خوش ہوں' ناخوش کیوں ہونا بھلا... چوڑیاں تو آپ کے ساتھ ہی جا کر پہننا ہیں۔ بس' مجھے اچھا لگتا ہے۔ ہاں' ابھی سلائی کرنے لگی ہوں' میں نے زرد اور سرخ لیا ہے' اماں کے لیے پیازی اور سفید' شفق کا ایک گلابی فراک ہے' میرے اور اماں کے سوٹ سے بھی اس کے لیے پیس نکل آئیں گے... ہاہاہا' میں نکال لوں گی جناب... !نہیں' نہیں اپنے تنگ نہیں کروں گی۔ آج کل تو کھلے کپڑے چل رہے ہیں۔" وہ کھلکھلا رہی تھی۔

"ایسے مت کہیں... جب موسم بدلتے ہیں تو حالات ایک جیسے کیسے رہ سکتے ہیں۔ جو کڑا وقت تھا وہ گزر گیا' بس اللہ ہمت دے... نہیں' نہ آپ سے گلہ' نہ اللہ سے۔" اس کی آنکھیں جھلملا گئیں۔

"اچھا' یہ پریشان کرنے والی باتیں چھوڑیں' آپ کب آرہے ہیں' کل دوپہر تک؟ بس جتنا کما لیا کافی ہے' آپ آئیں گے تو باقی راشن آئے گا۔ میرا وقت کٹ جائے گا' کپڑے سینے میں' بچوں کے کرتے' شفق کے کپڑے اور باقی ہم دونوں کے... اچھا اچھا "شرم کریں۔" اس کے رخسار سرخ پڑ گئے۔

"کوئی آپ کو دیکھے گا تو سب بجھ جائے گا۔ اچھا بس! خدا حافظ۔" وہ زور سے ہنسی پھر فون بند کر دیا۔

"کیا کہتا ہے' کب آئے گا؟" اماں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"اماں! کل دوپہر تک۔" وہ کھلکھلاتی ہوئی باورچی خانے کی سمت بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"اوئے! میں تمہاری ایک کی بات مانوں یا ان اسی نوے بندوں کی؟" تھانے دار نے ٹوپی سر سے اتاری اور بیٹھنے سے پہلے پینٹ کی بیلٹ ڈھیلی کی۔

شاہد حسین نے جگ کی بیرونی سطح پر ٹھنڈے پانی کے قطرے حسرت سے دیکھے۔ اس کے حلق میں کانٹے اگ رہے تھے۔

"جناب! میں تقریباً" بیس سال سے بس چلا رہا ہوں۔ میں ایسا کر ہی نہیں سکتا' میری اپنی بس تھی جناب! وہ کراچی ہنگاموں میں جل گئی... تو... تو... میں دوبارہ کمپنی کی بس میں آگیا۔ روزی روٹی تو کمانی ہے نا جی۔" وہ رونکھا ہو گیا۔

"ویری گڈ! تو تم نے سوچا' اپنی ذاتی بس دوبارہ مل جانا چاہیے' کیوں جگر شارٹ کٹ... ہوں؟" تھانے دار نے بے حد دبلے پتلے اپنے سپاہی سے تائید چاہی۔

"جی... جی سر!"

"اللہ کی قسم لے لیں جی! میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

وہ تقریباً" رو پڑا۔ سارا راستہ وہ صفائی دیتا رہا۔ بول بول کے قائل کر کے اس کا منہ دکھ گیا مگر تھانے دار چکنا گھڑا تھا۔ اس کے اتنا زیادہ بولنے پر بھی کچھ نہ بولا۔

"سر! آپ جس سے چاہیں گواہی لے لیں۔ سارے اڈے والے' میری پوری کمپنی' سر! میرے بس مالکان بھی گواہی دیں گے جناب! میری ضمانت دیں گے' آپ موقع تو دیں۔ سر! کل عید ہے۔ مجھے گھر جانا ہے' سر! پلیز مہربانی کریں۔" وہ گڑگڑانے لگا۔

"تمہارے چکر میں دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ اوئے دلدار! روٹی پانی حاضر کردے۔" وہ دھاڑا' شاہد حسین لکڑی کی بینچ پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ کڑ کڑ کر کے مرغ کی ہڈیاں چبا رہا تھا اور شاہد حسین کو اپنی ہڈیاں ٹوٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ جیل کاٹ سکتا تھا۔ پہاڑ توڑ سکتا تھا۔ وہ سب کچھ کر سکتا تھا مگر اس وقت...

"یا اللہ!" اس نے کوئی دعا مانگنا چاہی' مگر دماغ سن تھا۔ اسے کچھ یاد نہ آیا۔

☼ ☼ ☼

بچے سو گئے تو ان کی نیند خراب ہو جانے کے خیال سے وہ برآمدے میں سلائی مشین لے کر بیٹھ گئی۔ پہلے اماں کا سوٹ سلائی کیا' پھر اپنا کاٹنے لگی۔ احتیاط سے کاٹنا تھا' تاکہ شفق کا جھبلا نکل آئے۔

گزشتہ آٹھ ماہ میں یہ بننے والے پہلے کپڑے تھے۔ بچے چونکہ بڑھوتی کی عمر میں تھے سو' جو تھوڑے بہت پرانے کپڑے تھے وہ چھوٹے اور تنگ ہو گئے تھے اور کچھ کثرت استعمال سے پھٹنے لگے تھے۔ بوسیدہ ہو گئے تھے

اچھی خاصی زندگی گزر رہی تھی کہ ایک ذرا سے حادثے نے سب تہس نہس کر دیا۔ کوئی لینڈ لارڈ تو تھے نہیں کہ فرق نہ پڑتا۔ جو تھوڑا بہت جمع جتھا تھا' وہ ساتھ دیتا رہا' پھر کرائے کا گھر' جب کرایہ نہ دے سکے تو مالک مکان بپھر گیا۔ اس نے بیعانے کی رقم سے تین ماہ کا کرایہ کاٹا اور گھر خالی کرنے کا نوٹس دے دیا۔ بہت کڑا وقت تھا' دونوں نے بلکہ تینوں نے ہمت نہ ہاری۔ اماں کی دعائیں' ریحانہ کی ہمت اور شاہد حسین کی محنت' وہ کسی سے ادھار لے کر حیدر آباد سے کراچی آگئے۔ بڑے جتنوں سے یہ گھر مل سکا۔ ایک سو بیس گز کے اچھے خاصے گھر کے اوپر ایک کمرا' برآمدہ' کچن اور آدھی چھت۔ پہلے دو' تین ماہ تو ادھار چکانے میں گزرے اور اب یہ پہلی تنخواہ آنے والی تھی' جو بے فکری سے خرچ کی جاسکتی تھی۔

ریحانہ کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے اور اتنی ہی تیزی سے ذہن کے پردے پر گزشتہ دنوں کے تمام واقعات... نہ جانے کون سی یاد نے آنکھوں میں نمی بھر دی۔ کپڑا کاٹتے وہ ہاتھ روک کر کہیں کھو سی گئی۔ تب ہی زوردار میوزک نے اس کی محویت کو توڑا۔

ساتھ والی پڑوسن ساٹھ برس کے قریب تھیں۔ ان کی اپنے نواسے سے آج پھر بحث — شروع ہو چکی تھی۔

"دم مارو دم... مٹ جائے غم... بولو صبح و شام..."

گانے کا ری مکس ورجن بہت بڑے میوزک سسٹم پہ بج رہا تھا۔ ریحانہ کو دیواریں ہلتی محسوس ہوئیں۔

"اف خدایا!" "ارے لڑکے! ارے تو سدھرتا کیوں نہیں۔ آتے ہی یہ "ہرے کرشنا ہرے رام" لگا دیتا ہے۔ یہ مسلمانوں کا گھر ہے۔ ارے میرے اللہ! فوزیہ!

تو نے کیا کھا کر یہ لڑکا پیدا کیا تھا۔"
"اوہ نو نانو! سارا ردھم توڑ دیا۔"
"ارے میرے خدا!" نانو نے لمبا سانس کھینچا۔ "یہ تو کیسے کپڑے پہنتا ہے' بلکہ انہیں سیتا کون ہے؟ اور یہ رنگ برنگے موزے لال اور نیلے... اور تو ناچ رہا تھا نا' یہ ڈانس ہے بھلا' جیسے کپڑوں میں مینڈک گھس گیا ہو' میرے خدا۔"

ان کی بے چارگی اور حیرت ریحانہ کو بخوبی محسوس ہو رہی تھی۔

ریحانہ نے چند روز قبل اسے دیکھا تھا۔ اپنے نانا کے ساتھ بکرا لینے جا رہا تھا' پھر واپس آکر نانو سے جو گفتگو ہوئی' ریحانہ نے وہ بھی سُنی تھی۔
"تو ان کپڑوں میں بکرا لینے گیا تھا اپنے نانا کے ساتھ؟"
"کہاں گیا؟ پہلے تو وہ مجھے گھورتے رہے' پھر گلی کے کونے میں مجھے اتار دیا کہ گاڑی میں ایک وقت میں ایک ہی بکرے کی گنجائش ہے۔"
"میں نے بھی کہا او کے اولڈ مین! بائے' میں نے ساتھ جا کے کیا کرنا ہے۔" وہاں بھی لاپروائی تھی۔
"جو کرتا شلوار میں نے پہننے کے لیے کہا تھا' وہ کیوں نہیں پہنا۔ بس سلوا کر الماری میں رکھنا ہے کیا؟"
"اچھا وہ کرتا جو بغیر کالر کے ہوتا ہے اور جس کے کھلے کھلے بازو ہوتے ہیں؟"
"ہاں وہ ہی کرتا' ایک بار بھی نہیں پہنا تو نے۔"
"اسے پہن کر میں ذاکر حسین (طبلہ نواز) لگ رہا تھا۔" وہ جھنجلایا۔
"یہ ذاکر حسین کون ہے؟" نانو حیران ہو گئیں۔
"آپ ذاکر حسین کو نہیں جانتیں؟ مائی گاڈ! پھر تو آپ اے آر رحمان کو بھی نہیں جانتی ہوں گی؟"
"اے آر رحمان! یہ کون ہے' کوئی اسکالر ہے کیا؟" نانو الجھ گئیں۔
"اسکالر... ہاہاہا۔" اس نے جناتی قہقہہ لگایا۔ "اسکالر ہی سمجھیں' مگر میوزک اسکالر' پھر تو آپ نے "چھیاں چھیاں" بھی نہیں سنا ہو گا۔"

وہ اونچے سُروں میں گانے لگا۔ ریحانہ کو یقین تھا کہ وہ ناچ بھی رہا ہو گا۔
"چھیاں چھیاں نہیں تھیا تھیا... وہ جو عابدہ پروین نے گایا ہے۔" ۔ "گا کر سنائیں نا۔" فرمائش کی گئی۔ اور نانو نے پوری کر دی۔

"تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا
چھیتی بوڑی وے طبیباں! نئیں تے میں مر گئی آں

تیرے عشق..." نانو چپ ہو گئیں۔
"ویری گڈ پوئٹری... پورا سنائیں نا؟"
اسے بہت پسند آیا تو تسلی سے ان کے سامنے بیٹھ کر فرمائش کرنے لگا۔

"ایس عشق دی جھنگی وچ مور بلیندا
سانوں قبلہ نے کعبہ' سوہنڑاں یار دسیندا..."

"اوہ یس! یہ بلھے شاہ کا کلام ہے نا۔ جو کہتے ہیں۔
بلھیا کی جاناں میں کون۔"
اس نے اونچی آواز میں گایا — ریحانہ کی ہنسی نکل گئی۔ وہ دبے قدموں اٹھی اور سیمنٹ کی جالی — سے جھانکا۔

وہ صبح والے حلیے میں ہی تھا' جبکہ اس کی نانو ہلکے گلابی سوٹ میں سفید براق بالوں کا ننھا سا جوڑا بنائے بیٹھی تھیں اور حق دق ہونٹوں پر ہاتھ رکھے اپنے نواسے کو دیکھ رہی تھیں جو ہاتھ سے ایسے اشارہ دے رہا تھا' جیسے گٹار بجا رہا ہو۔
"بلھیا کی جاناں میں کون... بلھیا۔"
پھیپھڑوں کی ساری طاقت لگائے چلّا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کے بے حد منتوں ترلوں کے بعد رات بارہ بجے تھانے دار نے اسے گھر فون کرنے کی اجازت دی۔ دوپہر بارہ بجے تک وہ کتنا خوش تھا اور اب رات کے بارہ بج رہے تھے۔ اس نے اپنے مالکان کو اطلاع دے دی تھی۔ جواب صبح ہی پہنچ پاتے' مسئلہ تو گھر میں بتانے کا تھا۔ وہ موبائل ہاتھ میں لے کر کپکپا کر رہ گیا۔

وہ کیا کہے گا... کیسے کہے گا' یا اللہ۔

آخری بیل پر فون اٹھا لیا گیا۔ تھوک نگل کر اس نے حلق تر کیا اور وہ جملے دل ہی دل میں دہرائے' جو کل سے ترتیب دے رہا تھا۔ دوپہر کا سارا منظر من و عن آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ یتیم ویسیر لڑکا تھا۔ ماں کی امیدوں کا سہارا... میٹرک کر کے باپ کی چھوڑی ہوئی بس چلانے لگا۔ وہ ابا کے زمانے کی ناکارہ بس تھی۔ کمائی کم تھی اور کھاتی زیادہ۔ اس نے اپنی ہر خواہش پس پشت ڈال کر دن رات پیسہ جمع کیا۔ ایک اچھی نئی بس اور گھر بنانے کی خواہش تھی۔ مگر... بس کو شہر کے عمومی ہنگاموں میں نامعلوم افراد نے آگ لگا دی۔

"آگ لگا دی" ایک جملہ ہوتا ہے۔ کہنے والے نے کہہ دیا' سننے والوں نے سن لیا۔ بات ختم... مگر سہنے والوں نے کیسے سہا' اس پر کبھی کوئی غور نہیں کرتا۔ اس کے پاس کچھ بھی نہ بچا تھا۔

اب سوگ منا کر گھر تو بیٹھا نہیں جا سکتا تھا۔ سو' وہ کراچی اور حیدر آباد کے درمیان کوچ چلانے لگا۔ ایک نئے عزم' نئی ہمت کے ساتھ۔ اسے اپنے زور بازو' اپنے ارادوں پر یقین تھا کہ وہ پھر سے اپنے خوابوں کی تعبیر پا لے گا۔ مگر... دھچکوں پر دھچکے۔

حیدر آباد آنے سے تھوڑا پہلے ویرانے میں جب کھچا کھچ بھری بس میں کراچی شہر سے اپنے اپنے گوٹھوں کو روانہ ہونے والے جیبیں بھرے طمانیت سے سوتی جاگتی کیفیت میں تھے۔ عید' خوشی' آرام' اپنوں کا ساتھ... خوش کن تصورات میں گم تھے۔ بڑی بے فکری تھی۔ اے سی آن تھا اور گانے چل رہے تھے۔ اچانک گاڑی میں ہڑبونگ مچ گئی۔ مختلف سیٹوں پر بیٹھے پانچ لوگ باقی مسافروں پر گن تانے جیبیں خالی کرنے کا حکم دے رہے تھے۔ قطعی سفاکی' عجلت' بے رحمی۔

شاہد حسین کے بالکل پیچھے کسی نے بہت دھیمے مگر سفاک لہجے میں گاڑی چلاتے رہنے کا حکم دیا۔ طویل عرصے سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے شاہد حسین کے لیے یہ پہلا موقع تھا۔ وہ بری طرح گھبرا گیا۔ اسٹیئرنگ پر ہاتھ کپکپا گئے۔ گاڑی جھول گئی۔ وہ غائب دماغی سے ہدایت پر عمل کرنے لگا۔

ڈرے سہمے مسافر حکم کے غلام بنے ان کی ہدایت پر بلا چوں و چرا عمل کر رہے تھے۔ تب ہی نہ جانے کہاں سے ایک پولیس موبائل ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ وہ معمول کی گشت پر تھی۔ گاڑی کی آخری سیٹ پر ایک پولیس والا جو چھٹی پر اپنے گھر جا رہا تھا۔ اپنے ایک پولیس والے دوست سے فون پر بات کر رہا تھا جو اسی موبائل میں موجود تھا۔ منٹوں میں ساری کہانی واضح ہو گئی۔ اندر والے پولیس والے نے اپنے ساتھ والے کو ہلکا سا اشارہ دیا اور "مٹھی ہو جانے میں طاقت ہے" کہ مصداق محض ایک منٹ کے اندر مسافروں نے اندر سے قابو پایا اور باہر سے بھی فوراً" کمک پہنچی۔

شاہد حسین کے ساتھ غلط یہ ہوا کہ جب پولیس والے ٹھڈے مار مار کر ان ڈاکوؤں کو موبائل میں بھر رہے تھے' ان میں ایک داڑھی والے کو دیکھ کر وہ چونک گیا۔ آنکھوں میں شناسائی پیدا ہوئی تو منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ "ارے تم؟"

پولیس والے چوکنا ہو گئے اور لمحوں میں سب نے یہ فیصلہ دیا کہ شاہد حسین ڈرائیور' ان لٹیروں کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ اس نے اپنی صفائی میں بہت کچھ کہنا چاہا مگر بے سود... اس نے بتایا کہ یہ آدمی اس ہفتے مسلسل پانچ' چھ دفعہ اس کی گاڑی میں سفر کر چکا تھا۔ اس لیے وہ چونک گیا کہ ان لوگوں نے باقاعدہ منصوبہ بنا کر کارروائی کی ہے اور آدمی کا چہرہ اس لیے یاد رہ گیا کہ اس کے سانولے چہرے پر سرخ داڑھی اور بال بے حد برے معلوم ہوتے تھے۔ ان میں عجب بے ترتیبی اور وحشت سی تھی۔ بارہا اسے دیکھنے پر شاہد حسین نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ کراچی و حیدر آباد کے درمیان کوئی کام کرتا ہو گا اور اتفاق سے اس کی اور شاہد حسین کی بس ٹائمنگ ایک ہے۔

کچھ مسافروں نے اسے مارنے پیٹنے کی کوشش کی۔ وہ تو پولیس کی جلد بازی کی وجہ سے موبائل کے اندر گھسا دیا گیا۔ مگر اس کا کلینر بری طرح پٹ کر اسپتال پہنچ گیا تھا۔ اس کی جیب میں اس کی ساری تنخواہ تھی۔ اب اللہ جانے ان ڈاکوؤں کے ہاتھ لگی یا پھر...

وہ خالی ہاتھ بیٹھا اپنی صفائیاں پیش کرتا رہا۔

☼ ☼ ☼

ریحانہ کا رو' رو کر برا حال ہو گیا۔ وہ ہمیشہ سے بڑی صبر و قناعت والی عورت تھی۔ پچھلے چھ ماہ صرف قرضے اتارنے اور سنبھلنے میں لگے تھے اور شاہد حسین نے خود فون کرکے کہا تھا کہ وہ کل پہنچ رہا ہے تھوڑی بہت تیاری وہ کر لے باقی معاملات وہ خود دیکھ لے گا۔

سب کچھ ٹھیک تھا مگر یہ اچانک افتاد... اس نے پیسے گنے تو نقد صرف پانچ سو روپے تھے اور تھوڑا سا راشن' شاہد حسین کب اور کیسے آئے گا؟ تب تک وہ کیا کرے گی؟ کل عید کا دن کیسے گزرے گا؟ سوچ سوچ کر ریحانہ کا دماغ شل ہو رہا تھا۔

شاہد نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ عید کی تین چھٹیاں گزرنے کے بعد ہی کچھ ہو سکے گا۔ وہ سلاخوں کے پیچھے ہے' کچھ نہیں کر سکتا اور یہ نیا محلہ 'انجان لوگ' مالک مکان تین دن پہلے عید منانے اندرون سندھ چلے گئے۔ مین گیٹ پر جھولتا بڑا تالا دیکھ کر کسی کو کیا پتا چلے گا کہ اوپر بھی ایک کمرا ہے' جہاں پانچ نفوس ہیں اور جو سخت مشکل میں ہیں۔

"اگر میں ایک دن صبر کر لیتی تو۔" اسے اپنی شاپنگ کا ڈھیر انگارہ لگ رہا تھا۔ مگر اسے کیا خبر تھی کہ اتنا برا ہو جائے گا۔

"یا اللہ!" وہ بلک بلک کر رو پڑی۔ اماں جب تہجد کے لیے وضو کر رہی تھیں تو دیکھا۔ وہ جائے نماز پر ہی اوندھی سو رہی تھی اور آج عید کا دن تھا۔

☼ ☼ ☼

شرجیل' راحیل اور شفق کو تیار کرکے اس نے نیچے اتارا۔ بچے گلی میں اپنے دروازے کے ساتھ بندھے جانوروں کو دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔ ریحانہ نے زردہ بنا لیا۔ دماغ کے کسی کونے میں یہ دھیان رہا کہ عید کا دن ہے' پاؤ پاؤ بھی گوشت آئے تو وہ تین دن تک سنبھال لے گی۔

بچے ٹی وی کی رنگینیاں دیکھ کر تھکے ہارے سو گئے تھے۔ دوپہر کے بعد وہ صحن میں چکر پہ چکر کاٹنے لگی۔ اماں کی آنکھیں تھک گئیں اسے دیکھ دیکھ کر۔ وہ اس کی طرح روئی نہیں تھیں۔ بس جائے نماز بچھا کر بیٹھ گئیں۔ وہ میلے کچیلے کپڑوں میں تھی۔ اماں نے ڈانٹ کر نیا سوٹ بدلوایا۔

"وہ زندہ سلامت ہے' یہ اصل بات ہے' آزمائش آئی ہے' گزر بھی جائے گی۔ جب نیا کپڑا ہے تو پہنو' ورنہ ناشکری کہلاؤ گی۔"

وہ بہت تحمل سے اسے سمجھا رہی تھیں۔ پھر آنسو چھپاتے ہوئے خود بھی نئے کپڑے پہن لیے۔

ریحانہ کا اجڑا انداز انہیں ہولا رہا تھا۔ برے برے خیال آ رہے تھے۔ اسے سرخ کپڑوں میں دیکھا تو خود بخود دل کو بیٹے کی واپسی کا اور خیریت کا یقین ہو گیا۔

صبح سے چھائی ہڑبونگ اب مدھم ہو گئی تھی۔ ٹوکے چلنے کی آواز مسلسل کانوں میں آ رہی تھی۔ اس نے کھڑکی سے بارہا جھانکا۔ چھوٹی بڑی تھیلیاں پلیٹیں' آتی جاتی نظر آ رہی تھیں۔ لوگ پیدل' اسکوٹروں پر' گاڑیوں میں گوشت بانٹ رہے تھے۔ سہ پہر کا سناٹا چپ بولنے لگا اور تھکاوٹ بام و در سے لپٹ گئی' تب ریحانہ مرے مرے قدموں سے پلٹ آئی۔ اماں لیٹی ہوئی تھیں۔ ہاتھ میں تسبیح تھی۔ وہ ان کے پیروں کے پاس بیٹھ گئی۔ آہٹ پا کر انہوں نے آنکھیں کھولیں۔

"اماں... اماں! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" وہ کانپتے لہجے میں بولی تو اماں سیدھی ہو بیٹھیں۔ انہوں نے سینے سے لگایا تو اس کا ضبط جواب دے گیا' تڑپ کے رو پڑی۔

"ہمت کر ہمت... صبر... صبر۔" اماں کی آواز میں آنسو بھر گئے۔ "سمندر کے کیڑے کو رزق ملتا ہے تو ہم تو اشرف المخلوقات ہیں روٹی کے پیچھے مت رو۔"

"اماں! بچے... کسی نے بھی گوشت نہیں بھیجا۔" اس نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔

"ارے میری بچی! اللہ سب سے بہترین رزق دینے والا ہے۔ وہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ اس نے رزق دینے کا وعدہ کیا ہے اور وہ کبھی اپنے وعدے سے نہیں پھرتا۔"

اماں نے بہت سادہ لہجے میں اتنے یقین سے کہا کہ وہ ساکت رہ گئی۔ دل کو بھی جیسے سکون ملا۔

"اتنی مایوسی' ایمان کی کمزوری ہے۔ یہ کوئی تیرا میرا وعدہ تھوڑا ہی ہے' جو وفا نہ ہو پائے۔ آ' یہاں میرے پاس لیٹ جا۔"

اماں نے اپنے ساتھ جگہ بنائی اور وہ ان سے ایسے لپٹ گئی جیسے چھپ جائے گی ہر مصیبت سے' ہر مسئلے سے۔

☼ ☼ ☼

اس نے پیالیوں میں قہوہ نکال کر پاپوں کے ساتھ بچوں کے آگے دھر دی اور صحن میں تخت پر بیٹھ کر بچوں کو رغبت سے کھاتا دیکھ رہی تھی۔ رات کو کیا ہو گا اور صبح؟

ذہن میں طرح طرح کے خیال آ رہے تھے۔

"اگر میں ان کپڑوں میں کسی کے گھر جاؤں اور کہوں میرے گھر میں کھانے کو کچھ نہیں تو لوگ مجھے ڈھکوسلہ کہیں گے۔ مگر اتنے بہت سے مانگنے والوں میں کوئی کوئی سچا بھی تو ہوتا ہو گا۔ سارا گوشت لوگوں کے ڈیپ فریزر کے اندر چلا گیا ہو گا یا تعلقات بنانے کے لیے بھرے ہوؤں کو مزید بھرا گیا ہو گا مگر اسے کیا نام دیا جائے کہ چالیس سے زائد گھروں میں کوئی نہیں جانتا کہ اس ایک گھر میں کیا ہو رہا ہے... اور وہ کون لوگ تھے جو ہمسائے کی خبر رکھتے تھے۔ چالیس گھروں میں سے کسی ایک کو بھی دھیان نہیں آیا کہ بڑے گیٹ پر تالا لگا ہے مگر چھوٹا گیٹ تو کھلا ہے نا اور بچے اور میں سارا دن کھڑکی میں کھڑے رہے' کسی کو دھیان نہیں آیا کہ ان لوگوں کو بھی قربانی کا گوشت دے دیا جائے۔" وہ سوچوں میں گھری ہوئی تھی۔

آس پڑوس سے آتی کھانوں کی طرح طرح کی خوشبوئیں قوت شامہ پہ گراں گزر رہی تھیں۔

"امی! آپ نے کہا تھا' عید پہ ابو آئیں گے۔ عید تو آ گئی۔" شفق نے الجھ کر ماں کو دیکھا۔ ریحانہ بچی کی صورت دیکھے گئی۔

☼ ☼ ☼

"کر دیا ہے تیری ماں کو فون' لے جائے اپنے نمونے کو... تو چھٹیاں گزارنے آیا تھا یا ہمارا امتحان لینے۔"

"لیکن نانو! میں تو باقی کی ساری زندگی آپ کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔"

"باقی کی زندگی؟ کس کی باقی زندگی؟" نانو نے حیرت سے پوچھا۔

"ظاہر ہے آپ کی' مجھے تو ابھی اور جینا ہے۔" بڑے اطمینان سے جواب دیا گیا جبکہ نانو کی جان جل گئی۔

"تو ان ہی کپڑوں میں نماز پڑھنے گیا تھا نا' اس نیکر اور ٹی شرٹ میں؟" نانو نے اس کے شاٹ کو نیکر کہا تو وہ جل گیا۔

"شرعی اعتبار سے میری ستر پوشی مکمل تھی۔ مرد کا ستر اتنا ہی ہوتا ہے' ناف سے گھٹنے تک' میں نے تو پھر شرٹ پہنی ہوئی تھی۔"

نانو نے جواب نہ دیا' بس منہ دوسری طرف کر لیا۔

"نیچے کیوں آئی ہیں۔" جواب نہ ملنے پر خود سوال کر دیا۔

"میری دو تین سہیلیاں رہتی ہیں پڑوس میں' گوشت دے آؤں ان کو۔ وہی جن کی پوتیاں بہت نیک ہیں۔"

"ان کے گھر تو پہلے ہی چار' چار بکرے بندھے ہیں' انہیں کیا ضرورت ہے۔ گوشت انہیں دیں جو حق دار ہوں' یعنی غریبوں کو محتاجوں کو۔"

"اچھا تم جاؤ تو سہی۔"

"ان ہی کپڑوں میں جاؤں گا۔" اس نے شرط لگائی۔
"اس نیکر میں؟" نانو کو صدمہ ہونے لگا۔ "جینز ہی پہن لے۔ مگر وہ بھی تو جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی ہے' ہائے میرے ربّا" نانو نے سر پکڑ لیا۔
"ابھی تو بتایا تھا شرعی اعتبار سے میں اس سوٹ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اس کی معلومات مکمل تھیں۔
"ویسے ایک بات بتائیں۔" اس نے نانو کے گرد بازو حمائل کیے۔
"پہلے تم بتاؤ یہ شرعی حکم کہاں سے پڑھ لیا؟"
"پڑھنا کہاں سے ہے' وہ لائبریری میں نانا نے ساری ایسی ہی کتابیں رکھی ہیں۔ بائی دا وے یہ سارے احکامات عورتوں کے لیے ہی ہیں 'تحفہ خواتین' 'بہشتی زیور' عورت ایک درس گاہ... مردوں کو شرعی احکام بتانے کی کتابیں نہیں رکھیں آپ کے سرتاج نے۔ مجال ہے جو میں نے ایک کتاب بھی دیکھی ہو ایسی۔"
"ہائیں!" نانو حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔
"تو نے سب پڑھ لیں؟"
"جی! سب پڑھ لیں۔ آپ کہیں تو سنا دوں۔" اس نے مزے سے جواب دیا۔
"پھر بھی اپنی حالت درست نہیں کرتا' نانا ناراض ہیں تجھ سے۔"
"نہیں میں منالوں گا۔ آپ گوشت دیں' میں جاتا ہوں۔" اس نے کہا۔
"حلیہ بدل لے لڑکے!" نانو پھر ٹوکا۔
"اچھا بدل لیتا ہوں۔" اس نے بھی سعادت مندی دکھادی۔
"یہ اچانک اتنے فرماں بردار کیسے ہو گئے۔" نانو دو ماہ میں اس کے ہر انداز سے واقف ہو گئی تھیں۔
"واپس جانے والا ہوں نا' سوچا اب آپ کو اور کیا تنگ کروں۔"
"ایک بات تو تُو نے بتائی نہیں' تو چھٹیاں گزارنے ہمارے پاس کیوں آیا تھا اتنی دور سے۔" نانو کی آواز میں پیار نمایاں تھا۔
"میں نے کراچی دیکھنا تھا اور پھر میرے نانا اور نانو بھی تو یہاں ہیں۔ پھر اماں نے ڈیڈ سے کہا۔ اسے کراچی بھیج دیں' ورنہ یہ ڈانس کلب جوائن کر لے گا اور ڈیڈ کو میرا ڈانس کرنا بالکل پسند نہیں' حالانکہ ڈانس میری روح ہے' میرا پیشن ہے' میری..."
"بس کر... بس کر۔" نانو نے اسے پٹڑی سے اترتے دیکھ کر فوراً "ٹوکا" میں پیکٹ بنا چکی ہوں' اٹھالے۔ اور خدا کے لیے وہاں نام صحیح بتانا' قریشی صاحب کو "ڈان" بتا دیا' نانا کی ناک کٹوا دی۔ سلیمہ بہن کو "روکی" کہہ دیا اور قصائی کو "مائیکل" اور یہ "وین ڈیم" کون ہے۔ مجھے تو منگلا ڈیم اور تربیلا ڈیم کا پتا ہے۔" نانو روہانسی ہو گئیں۔
"چھوڑیں نانو! آپ کو کچھ نہیں پتا۔ لایے گوشت دیجیے۔"
اس نے ان کے ہاتھ سے پیکٹ لیے اور چل پڑا۔

☼ ☼ ☼

ریحانہ کے اعصاب پر نانی' نواسے کی گفتگو ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔ بے فکری' معاشی خوش حالی' لاڈ پیار... اس کا دل چاہا وہ جائے اور نواسے کا منہ تھپڑوں سے لال کر دے جو غریبوں اور محتاجوں کو گوشت بانٹنے کا گانا گا رہا تھا مگر عملاً" کچھ کرتا نظر نہیں آرہا تھا۔
وہ نماز مکمل کر کے یوں ہی گود میں ہتھیلیاں رکھے بیٹھی تھی۔ جب نمک' مرچ' اور گرم مسالے کی خوشبو نتھنوں سے ٹکرائی۔ ساری نقاہت ہوا ہو گئی۔ وہ تیزی سے باورچی خانے کے دروازے پر آئی۔
"اماں کیا کر رہی ہیں' کیا مل گیا' کیا پکا رہی ہیں؟" وہ متعجب تھی۔ صبح سے تین بار تو وہ خود بھی سارے ڈبے ٹٹول چکی تھی۔ کچھ نہ ملا' پھر اماں کو کیا مل گیا تھا۔
"کچھ نہیں۔ بچے نیند میں جانے والے ہیں۔ ٹھنڈا چولہا دیکھ حیران ہو رہے تھے۔ اب سوچیں گے کھانا پک رہا ہے تو سو جائیں گے۔ تم چینی پانی گھول لینا' رات کو دے دیں گے۔ باقی اللہ مالک ہے۔" اماں کی

آواز تحمل سے لبریز تھی۔
"اماں..." ریحانہ کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔
"اماں! یہ عمر فاروق" رضی اللہ تعالیٰ عنہ" کا دور نہیں اور ابلتے پانی میں پتھر پکنے کو پہچان گئے تھے۔ یہاں کوئی عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ" نہیں آئے گا۔ آپ... آپ۔" وہ جھنجلا کر رہ گئی۔
"عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو واقعی نہیں ہیں اللہ مگر وہ ہی ہے۔"
اماں نے ابلتے پانی میں بڑی مہارت سے ڈوئی گھمائی اور آنچ دھیمی کر دی۔ ریحانہ پتھر کا بت بنی اماں کے چہرے کا اطمینان دیکھ رہی تھی۔ اماں کی نگاہیں آنچ پر تھیں۔ ایک گہرا سناٹا' موت سی خامشی ہر شے سے ٹپک رہی تھی۔
"امی! مجھے سالن نہیں کھانا' مجھے پراٹھا دے دیں۔"
"اماں...!" ریحانہ نے بچوں کی شکل دیکھی اور دیوار کے ساتھ پھسلتی زمین پر بیٹھ گئی۔ اماں کی نگاہیں آنچ پر جمی تھیں' تب ہی دروازہ زور سے بجا۔

☼ ☼ ☼

اس سے پہلے کہ وہ دستک کا یقین کر کے اٹھتیں۔ شفق دھڑ دھڑ کرتی سیڑھیاں اتری اور اپنے جلو میں کسی کو لیے اوپر آئی۔
"ہائے!" اس نے شانے اچکاتے ہوئے ریحانہ کو دیکھا۔
"ہیلو ینگ لیڈی... آئی ایم... وہ ایکچوئلی..." اس نے ریحانہ اور اماں کی طرف دیکھا اور اپنے بھرے ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا۔
ریحانہ کا سکتہ ٹوٹا۔ وہ میکانکی انداز میں آگے بڑھی اور ایک بڑی سی ٹرے اور دو تین شاپرز پکڑ لیے۔
"نہیں آپ کا پڑوسی... اور تم شفق ہو' ہے نا؟ اور تم شرجیل؟" شفق دادی سے لپٹ گئی۔ شرجیل خود اعتمادی سے مسکرانے لگا۔ وہ آگے بڑھ کر تخت پر بیٹھ گیا۔
ریحانہ اور اماں بس اس کی صورت دیکھے جا رہی تھیں۔ وہ اپنے ہمیشہ والے اول جلول حلیے میں تھا۔
"آپ میرے برتن خالی کر دیں' ورنہ نانو خفا ہوں گی۔" اس نے حیران' پریشان کھڑی خواتین سے کہا۔
ریحانہ اور اماں دونوں چونکیں۔ بریانی' قورمہ' تکے' شیرمال' بڑی کولڈ ڈرنک' گوشت اور بیکری کا سامان۔
"تم سب کے گھروں میں عید پر اتنا سامان دے رہے ہو؟" ریحانہ کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔
"نہیں' صرف آپ کو۔ آپ ہمارے پڑوسی ہیں نا تو... اور یہ تو چھوٹے بچے ہیں' میں ان کے لیے چاکلیٹ بھی لایا ہوں۔" اس نے اپنی بے ڈھنگی نیکر کی جیب ٹٹولی۔
تخت پر اماں کے قریب رکھا موبائل فون بجنے لگا۔ اسکرین پر شاہد حسین کا نام جگمگا رہا تھا۔ اماں کو یقین تھا کہ یہاں بھی خوش خبری ہو گی۔ اماں کے چہرے پر اطمینان ہی اطمینان تھا۔
"جا رہا ہوں' کل نیچے آنا بائیک پر گھماؤں گا۔ کوئی چیز لینا ہو تو مجھے آواز دے لینا' میں ادھر ساتھ ہی رہتا ہوں۔"
وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا "بائے"۔
"رکو! سنو' تمہارا نام کیا ہے۔ تم نے نام تو بتایا نہیں۔" ریحانہ نے یوں ہی پکارا۔
"یار لوگ تو مجھے ڈان' روکی اور مائیکل کہتے ہیں۔ مگر آپ میرا اصلی نام لیجیے گا۔ میرا نام عمر فاروق ہے۔" وہ مسکرایا اور تیزی سے نیچے اتر گیا۔
گلی میں کہیں اونچا میوزک بج رہا تھا۔ "تیرے عشق نچایا..."
ریحانہ نے کھڑکی سے جھانکا' وہ نیچے اتر کر ناچ رہا تھا۔



آسیہ رزاقی

جیسے کچھ سوالیہ نشان

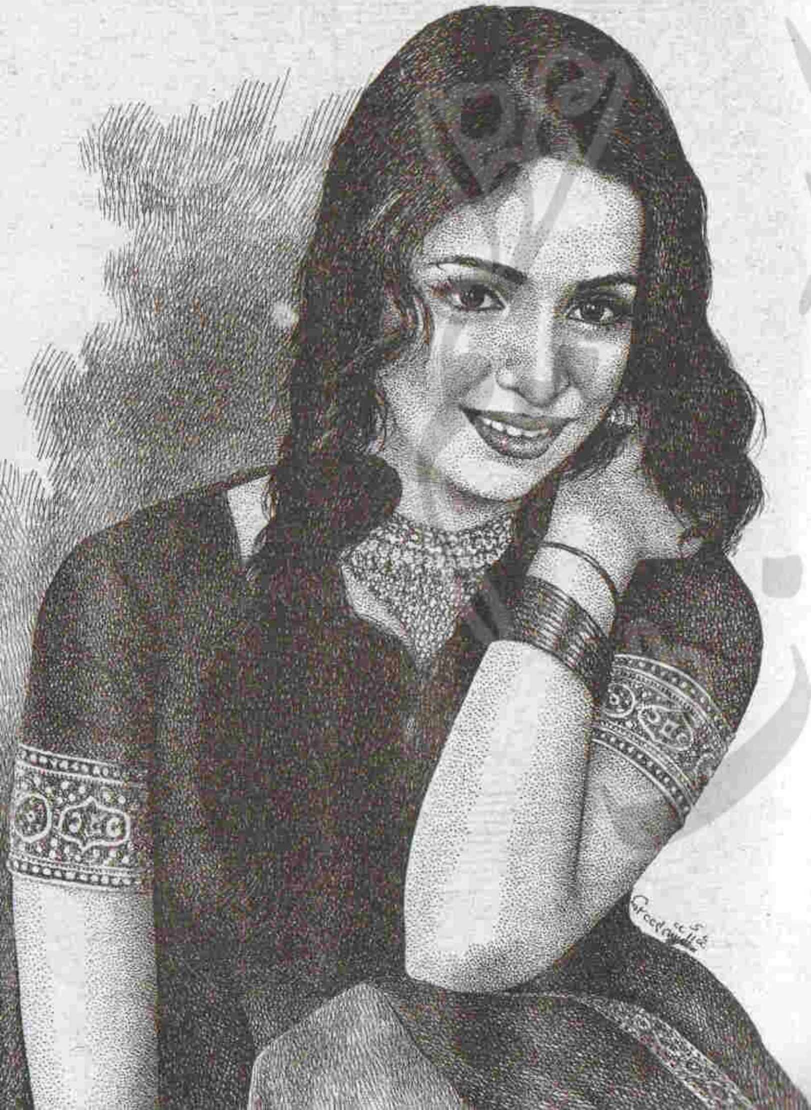
گہرے سبز رنگ کی ہموار کورین گھاس وسیع لان کی رونق تھی۔ درمیان میں خوش رنگ کاسنی رنگ کی پلاسٹک کی کرسیاں ان کے درمیان سفید بیضوی میز تھی جس پر چمپئی پھولوں والے گلاسوں میں سبز رنگ کے آئس کریم سوڈا کی موجودگی نے ماحول میں رنگینی کا تاثر بڑھا دیا تھا۔ اس پر مستزاد وہ دو پُربہار کھلکھلاتی خواتین کی گفتگو جن کی ہنسی کی جھنکار گیٹ تک سنائی دے رہی تھی۔

مہمان خاتون نے سفید ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ جس پر گلابی پھول اور سبز پتے بہار کا پتا دے رہے تھے۔ میزبان نے گہرے اودے دوپٹے کے ساتھ سفید سوٹ پہن رکھا تھا۔ سفید قمیص پر اودے ریشم کی کڑھائی سبز گھاس اور کاسنی کرسیوں کے ساتھ ہم آہنگ تھی۔ یہ میزبان مزنہ باجی تھیں اور مہمان خالہ



عرشیہ جو اکثر آکر اپنی بذلہ سنجی سے سب کو محظوظ بھی کرتی تھیں اور اپنے دل پسند کھانوں کی فرمائشیں کرکے خود بھی لطف لیتی تھیں اور دوسروں کو بھی بصد اصرار کھانے پر مجبور کرتی تھیں —— ان کی یہ فرمائش حلیمہ پوری کرتی تھی۔ حلیمہ کو نئی نئی ڈشز سیکھنے اور بنانے کا شوق تھا اور وہ عرشیہ خالہ سے پوری پوری داد وصول کرتی تھی۔ اس گھر میں عرشیہ خالہ ہی اس کی مداح تھیں، مگر وہ کبھی کبھی آتی تھیں۔ انہیں

ناولٹ



لڑکیوں کی شادیاں کرانے کا بہت شوق تھا۔ مزنہ باجی سے چند سال ہی بڑی تھیں اور ان دونوں میں بہت دوستی تھی۔ مزنہ باجی شادی کے بعد بھی زیادہ عرصہ میکے میں گزارتی تھیں۔ اب عرشیہ خالہ، روبی کے لیے رشتے لاتی تھیں، جن کو وہ فوراً "گھٹیا" حقیر، فضول کہہ کر انکار کردیتی تھی تو پھر وہ ہی پیش کش حلیمہ کے سامنے کی جاتی۔ جسے دادی صرف گردن سے انکار کرکے عرشیہ خالہ کو شرمندہ کردیتیں۔

آج صارم بہت تھکے ہوئے تھے، لیکن عرشیہ خالہ کی ہنسی کی آواز سن کر وہ لان میں ہی آگئے۔

"ہیلو، ہیلو السلام علیکم! مزاج بخیر؟ باتیں ہورہی ہیں، یا لطیفے بیان ہورہے ہیں۔ باہر تک آواز جارہی تھی۔ کس بات پر ہنس رہے ہیں آپ لوگ؟" وہ ان لوگوں کے پیچھے پڑی آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔

"بھئی، ہم تو ہیں ہی خوش مزاج، جہاں جاتے ہیں خوشیاں بکھیرتے اور ہنسی کے فوارے اچھالتے ہیں۔ آپ اپنی سنائیں، بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو؟"

"جی۔ واقعی بہت تھک گیا ہوں، ابھی کس ذات شریف کا ذکر خیر تھا، جس کا مذاق اڑا رہی تھیں آپ؟"

"مذاق؟ نہیں بھئی... بس باتیں ہی کررہے تھے اور خوش مزاج لوگ ہنس ہنس کر ہی عام باتیں کرتے ہیں۔" عرشیہ خالہ نے وضاحت کی۔ "ویسے میں مزنہ کو بتا رہی تھی، ابھی کل اشفاق احمد کی کتاب "سفر در سفر" میں، میں نے پڑھا تھا کہ..." "اشفاق احمد... تو شاید فوت ہوچکے ہیں۔"

"ہاں بھئی... مگر کتاب انہوں نے اپنی زندگی میں ہی لکھی تھی۔ انہوں نے ایک مضمون میں بتایا کہ کامنی کوشل ایک امریکن ڈائریکٹر کو لے کر ان کے پاس آئی تھی۔ اشفاق احمد کے لیے ہیرو کا رول لے کر۔"

"تو اس میں ہنسی کی کیا بات تھی۔ یا آگے کوئی لطیفہ بھی تھا۔ یا اشفاق احمد کو ہیرو کا رول دینا... کوئی انہونی... ناممکن العمل... یا محیر العقول واقعہ ہے۔"

"افوہ... بے ادب... جاہل انسان۔" عرشیہ خالہ، صارم کو بلا جھجک ڈانٹ دیتی تھیں۔ "وہ ایک مضمون تھا۔ بہرحال اس میں کامنی کوشل کا ذکر تھا تو ہمیں یاد آگئی کہ ایک زمانے میں ہم کامنی کوشل، دلیپ کمار کے کس قدر دیوانے تھے۔ ان کی ہر فلم دیکھنا ہم پر فرض تھا جیسے، یاد ہے مزنہ... جب ہم ان کی فلم "ندیا کے پار" دیکھنے گئے تھے۔ وہ خالہ کے گھر کی گلیاں، وہ خالہ کے محلے میں سواری کی دقت اور گلی میں گوبر جس پر تمہارا پیر چھپاک سے پڑ گیا۔ تم روتی ہوئی چلی گئیں۔ اگلے دن تانگہ بلوا کر پھر گئے تھے۔"

"کھو کھو، کھی کھی، ہو ہو۔" مزنہ باجی کی ہنسی کا ساتھ عرشیہ خالہ نے دل کھول کر دیا۔ مزنہ باجی تو ہنسی کے مارے دہری ہوگئیں۔

"اور وہ... جب دلیپ کمار اپنے دوست یعقوب کے ساتھ کامنی کوشل سے ملنے جاتا ہے تو یعقوب کا پیر بھی گوبر میں چھپاک سے پڑ جاتا ہے۔ بڑے مزے کے ڈائیلاگ تھے وہ۔" دونوں دل کھول کر ہنس رہی تھیں۔ ماضی کے واقعات دہراتے ہوئے وہ دونوں صارم کو بھلا چکی تھیں۔ وہ بھی کرسی کی پشت پر سر ٹکائے آنکھیں بند کیے سوچ میں گم ہوگئے اور اب وہ دونوں کسی دوسرے واقعے پر ہنس رہی تھیں۔

"ویسے خالہ! یہ کامنی کوشل بے چاری، خوامخواہ سود صاحب کے چنگل میں پھنس گئی، کتنی اچھی سی سادہ اور معصوم، دلیپ کمار کے ساتھ شادی کرکے مزے کرتی، کیسا اچھا، پیارا کپل ہوتا۔"

"اور سود صاحب تو شادی کے وقت بھی خاصی عمر کے تھے۔ اب تو بوڑھے کھپٹ، کھوسٹ، بلکہ پھسپھس ہوگئے ہوں گے، ہائے۔"

"تو کامنی کوشل کون سی جوان ہے۔ ایک بار ایک ڈرامے میں دیکھا، خاصی عمر رسیدہ لگی۔"

"ہاں... خیر، اب تو وہ بھی..."

"خالہ! آپ بھی کامنی کوشل کی عمر کی ہوں گی، ہیں؟ شاید، دو ایک سال کا ہی فرق ہوگا۔"

"ماروں گی، اچھا؟" عرشیہ خالہ چیخیں۔

"جب "ندیا کے پار" دیکھنے گئے تھے۔ یاد ہے خانیوال میں، آپ بی اے سے فارغ تھیں۔ میں اسکول میں تھی، پھر؟"

"تو... تب تو... اے اے میں خاصی کم عمر تھی اور ندیا کے پار خاصی پرانی تھی۔"

"جی، بس یہ تھا کہ دلیپ کمار کا ڈنکا بج رہا تھا اور خالہ! دلیپ کمار جب پاکستان آئے تو وہ بھی خاصے عمر رسیدہ لگے، ہائے بڑھاپا کیوں آتا ہے؟ دلیپ کمار پر تو بڑھاپا نہ ہی آتا۔" مزنہ باجی نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

"ہاں واقعی، کسی پر بھی بڑھاپا نہ آئے، کتنے مزے ہوں، زندگی کی گہما گہمی، بے فکری، شور شرابا، اور حلیمہ نے آج پتا نہیں کیا نئی ڈش بنائی ہے۔ بلاؤ ذرا۔"

صارم کی سماعت میں صرف بڑھاپے کا لفظ نقش ہوگیا۔ نہ جانے خالہ کو بھی صارم کی بڑھتی عمر نظر نہیں آتی۔ اماں کو تو ابھی تک ان کے بچپن کا یقین تھا۔ گوکہ خالہ بے شمار رشتے لیے پھرتی تھیں مگر... انہیں صارم نظر آتے نہ حلیمہ۔ حلیمہ کے لیے رشتے لاتی تو تھیں، مگر صارم کے لیے حلیمہ کا انہیں کیوں کبھی خیال نہ آیا، جبکہ وہ اس گھر کے لیے کتنی موزوں تھی۔ سب کا خیال رکھنے والی، خدمت گزار، بے غرض، ابا جان اور دادی کی لاڈلی، مگر آنکھیں بند کیے نیم غنودگی میں انہیں اندازہ ہی نہ ہوا کہ اچانک خاموشی طاری ہوگئی ہے، پھر چائے کی پیالی میں جلترنگ بجاتے چمچے کی آواز پر پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

حسب توقع حلیمہ چائے لے کر آگئی تھی۔ حلیمہ کی مسکراہٹ بہت اچھی تھی۔ اس کا چہرہ ہی نہیں تبسم سے پورا وجود جگمگا جاتا تھا، مگر وہ خود اس راز سے واقف نہ تھی۔ اس وقت بھی صارم کو ہڑبڑا کر اٹھتے دیکھ کر وہ بے ساختہ مسکرا دی تھی۔ صارم نے چائے کی پیالی اٹھائی، حلیمہ نے ٹرے ساتھ والی کرسی پر رکھ دی۔ ایک پلیٹ میں چند بسکٹ اور دو کباب تھے۔

"خالہ کے لیے کوئی چیز نہیں بنائی؟" انہوں نے بسکٹ اور کباب دیکھ کر کہا۔ حلیمہ پھر مسکرائی، چہرہ روشن ہوگیا۔

"بھلا ایسا ہوسکتا ہے؟ انہوں نے فرمائش کی اور مدد بھی کی، انڈے اور سبزی کے مکس رول بنوائے، سب کو بہت پسند آئے، ختم ہوگئے۔" آخری بات کہتے ہوئے لہجہ متاسف تھا۔

"کوئی بات نہیں، پھر کسی دن سہی، تم کو میرے آنے کی خبر کس نے دی؟"

"مزنہ باجی نے۔ چائے تو تیار ہی تھی، رول بنانے میں دیر ہوئی۔"

صارم نے کہا۔ "مجھے پتا ہی نہیں چلا، باجی اور خالہ کب اٹھ کر چلی گئیں۔" بسکٹ اٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے انہوں نے پوچھ لیا۔ "کیا خالہ ابھی رکیں گی؟" (اگر رک گئیں تو میں... ان کے سامنے حلیمہ کا نام پیش کروں گا، شاید وہ... تائید کریں، تب اماں کو...)

پتا نہیں حلیمہ نے کیا جواب دیا' وہ کرسی پر بیٹھ چکی تھی اور ہاتھوں کی پشت سہلا رہی تھی۔ انہیں لگا وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ (اور وہ سننا نہیں چاہتے تھے' اس پوزیشن میں وہ تب ہی ہوتی تھی جب.....)

"وہ..... میں کل گاؤں جانا چاہتی ہوں۔" صارم نے چائے ختم کرکے پیالی ٹرے میں رکھی تو اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ (دیکھا' وہی ہوا) ٹرے اٹھاتے ہوئے اس کی انگلیاں بھی کپکپا رہی تھیں۔ بسکٹ کی پلیٹ سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔

(یہ ہی بات وہ سننا نہیں چاہتے تھے۔ شاید..... آج کوئی بات پھر اسے بری لگی ہے' اس کی انا پر ضرب لگے' تب وہ اسی طرح مضطرب ہوتی تھی۔)

"کیا؟ کس لیے؟ اتنی جلدی؟ میں چھوڑ آؤں گا تمہیں۔" وہ ماتھا مسلنے لگے۔

"نہیں۔ وہ بھولا آیا ہے گاؤں سے' ابا نے بلایا ہے' چلی جاؤں گی۔" وہ پراعتماد تھی۔ پھر حلیمہ کے اٹھ جانے کے بعد' وہ اندر آئے۔ اماں مزنہ باجی سے راز و نیاز میں مصروف تھیں۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔

"خالہ..... کیا چلی گئیں؟ اتنی جلدی۔"

"ارے دوپہر سے آئی ہوئی تھی۔ نہ جانے کیا' کیا کچھ پکوا کر سب کو کھلوایا۔"

"اماں! آپ روک لیتیں انہیں' مجھے تو ان سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔" انہیں تاسف ہوا' ایک اچھا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔

"کیسے روک لیتی' دوپہر سے آئی ہوئی تھی' اور جاتے وقت تم کو خدا حافظ کہہ کر گئی' تم تو وہاں باغیچے میں مدہوش تھے۔ سنا ہی نہیں تم نے شاید۔"

"ہاں میں..... تھکا ہوا تھا' ذرا دیر کو نیند آگئی۔" وہ ماتھا مسلنے لگے۔

"ارے روبی! کدھر جم گئی ہو' بھائی کو چائے تو لادو۔"

"رہنے دیں' پی چکا ہوں۔" وہ بے زار ہو کر مڑے۔

"ارے ہاں' بھول ہی گئی' ایک جن بھی تو ہے گھر میں' جسے سب کی فکر رہتی ہے' بے کار مباش کچھ کیا کر' پاجامہ ادھیڑ کر سیا کر۔" اماں تند لہجے میں تلخی سے بولیں۔

"شہرت اور تعریف کی طلب' توبہ ہے' اس قدر ہوشیار۔"

وہ شدید بے زاری کے عالم میں دادی کی طرف آگئے۔ لیٹی تھیں' وہ ان کے ساتھ لیٹ گئے' دادی ان کا سر سہلانے لگیں۔ "تھک گیا میرا بچہ۔"

"جی دادی' تھک گیا ہوں۔" آنکھیں بند کرلیں' کہیں دادی اندازہ نہ کرلیں کہ وہ..... اماں کی طنز بھری نفرت انگیز گفتگو سے زیادہ تھک گئے' کام سے نہیں' حلیمہ کمرے میں نہ تھی۔ یقیناً" کچن میں ہوگی' یا پچھلے برآمدے میں کچھ سلائی کررہی ہوگی۔ ملازمائیں بھی اس کو اپنے کاموں میں مصروف رکھتی تھیں۔

"حلیمہ سے کہوں گی' صبح بادام کی ٹھنڈائی بنا کر نہار منہ تمہیں دیا کرے' طاقت آتی ہے' بادام مجھ سے لے لے۔" وہ دادی کی پُرشفقت بانہوں میں سیدھے لیٹے تھے۔ سکون مل رہا تھا' دادی کچھ بول رہی تھیں' مگر وہ حلیمہ' اماں اور گاؤں کے تصور میں گم تھے۔ چونک کر بولے۔

"حلیمہ گاؤں جانے کا کہہ رہی ہے' کیوں دادی اسے یہاں کوئی تکلیف ہے؟ یا چچا نے بلایا؟"

صارم کا سر سہلاتا ان کا ہاتھ رک گیا۔ "نہ کسی نے بلایا' نہ تکلیف' مگر اپنے گھر تو جانا ہوتا ہے نا بیٹے! کب تک مہمان رہے' پڑھائی کا بہانہ بھی اب تو نہیں رہا۔"

"اپنے گھر؟ دادی اپنے گھر جانا ہوتا تو کس کو اعتراض ہوتا۔" وہ کچھ بے چینی سے پیر ہلانے لگے۔

"آپ کا گھر..... جس طرح میرا ہے' اس کا بھی ہے' آپ سے بڑھ کر گاؤں میں کون ہے اس کا؟"

"باپ تو ہے۔" دادی نے ایک لمبی آہ بھری' ایک ٹھنڈی سانس کے سوا اور کیا تھا' اس بات کا جواب۔ دادی پوتے چپ ہوگئے' پھر چند لمحوں کے بعد صارم نے کہا۔

"اس کو بتا دیں' وہ یہاں سے کہیں نہیں جائے گی' گندم کی کٹائی ہو یا کپاس کی چنائی۔"

"چار پیسے کما لیتی ہے۔ باپ کے کھیتوں سے' کسی کا احسان بھی نہیں' تمہارا کیا حرج ہے۔" دادی کی آواز ہی نہیں لہجہ بھی بجھا بجھا تھا۔

"چار پیسے' کیا میں نہیں دے سکتا؟" وہ بھنا کر اٹھ گئے۔ "مگر وہ لیتی ہی نہیں۔"

"بہت خوددار ہے' کچھ اس کو حالات نے بہت سخت بنا دیا ہے۔" دادی افسردہ تھیں۔

"میں کیا غیر ہوں؟" وہ چڑ بولے۔ "مگر..... وہ شاید اپنے حالات کا ذمہ دار ہم سب کو سمجھتی ہے' ادھر اپنے ابا کے حکم کی پابندی اس قدر لازمی' وہ ہی ابا تو ہیں' اس کے سب سے بڑے ہمدرد قسمت کو الزام دیتے ہیں' مگر ذمہ دار تو خود ہوتے ہیں' یہ ہے ہمارے معاشرے کا رواج' بیٹی چونکہ گونگی ہے۔ اسے کنویں میں....."

"ایسا نہیں ہے بیٹا! قسمت بھی اٹل حقیقت ہے' کون اپنے جگر کے ٹکڑے کو کنویں میں پھینکتا ہے' خیر تم دل برا نہ کرو۔" دادی صارم کو پچکارنے لگیں۔ ان کی آواز بھاری ہوگئی تھی' آخری جملہ پورا نہ کرسکے تھے۔

"میں اسے سمجھاؤں گی' مگر بات یہ ہے کہ وہ بھی کب تک یہاں رہے' بلاجواز' اور سب کی باتیں سنے' برداشت کرے۔"

"تو ان باتوں کا جواب آپ تو دے سکتی ہیں دادی! کیوں چپ رہتی ہیں؟"

"لو بھلا' میری کیا مجال کہ تمہاری ماں کو جواب دوں' اپنی شامت بلواؤں' یوں بھی اس کے ساتھ یہاں لانے کا جرم بھی تو میں نے کیا تھا' اس جرم سے کیسے بری ہو سکتی ہوں۔" دادی اپنی بے چارگی پر بہت رنجیدہ تھیں۔ جواب دینے کو تو وہ بھی تیار تھے' مگر پھر حلیمہ کے لیے مزید مشکل کھڑی ہو جاتی جو خود ان کے لیے بھی تکلیف دہ تھی۔ اس لیے ماں' بہن کے طنز بھی وہ خاموشی سے سن کر پی جاتے' خود حلیمہ کو کسی بدمزگی سے بچانے کے لیے۔ ورنہ کوئی اسے اعتراض کا نشانہ بنائے یا کوئی بھی تلخی سے کی گئی بات' جس کی زد میں حلیمہ آتی ہو۔ خود انہیں تیر کی طرح لگتی۔

گاؤں میں اس کے لیے تلخ ترش یادوں کے سوا اور تھا بھی کیا۔ مگر وہ بھی مجبور تھی۔ ابا اسے بلاتے' وہ چلی جاتی' ابا بھی اماں کے اعتراضات اور واویلے سے دب جاتے اور گاؤں میں سوائے باپ کی محبت کے اور تھا بھی کیا' اماں کی تلخ باتیں' زہریلے جملے' مگر پھر دادی کے بلاوے پر وہ آ بھی جاتی۔ یہاں بھی اس کے لیے چچی اماں کی کڑوی زبان تھی' لیکن اماں کے زہریلے الزامات سے تو کم ہی اور پھر برداشت نہ کرے تو کیا کرے۔

"اور یہ ارشد منزل میں کیا تقریب ہے آج' زوبی کی منگنی؟ یا....." انہیں یاد آیا۔ ابھی باجی نے پکار کر انہیں بتایا تھا کہ آج شام ارشد منزل جانا ہے' خالہ بھی وہیں گئی ہیں۔

"پتا نہیں۔" دادی بے زار لہجے میں بولیں۔ "آئے دن یہ ہی تماشے ہوا کرتے ہیں وہاں اور لڑکیوں کی سیل بیر کنے میں نہیں آتی' بس نصیب کی بات ہے۔"

صارم کو ہنسی آگئی' پھر وہ ہی قسمت کو مورد الزام' جبکہ زوبی کی دو منگنیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ روشی کا نکاح آناً" فاناً" ہوا بھی اور ختم بھی ہوگیا۔ نصیب باہ زوبی کی بلند ترین جھوٹ کی عادت' روشی کی حد سے زیادہ آزاد روش سبب بنی' مگر بے چاری قسمت..... اب بھی اکثر ارشد منزل میں دعوتیں ہوتیں' جسے فنکشن کا نام دیا جاتا۔ فنکشن کا مطلب تقریب' مگر کسی تقریب کے بغیر ہی بلا سبب لوگوں کو بلایا جاتا۔ دولت و حشمت کے مظاہرے' شان و شوکت کی نمائش۔

ارشد منزل والوں کی دادی سے قریبی رشتے داری تھی۔ ایک شہر کے رہائشی ہونے کے سبب ملنا جلنا زیادہ ہوگیا۔ مگر اب دادی سے زیادہ باقی سب سے تعلقات بہت ہوگئے تھے۔ روبی کی زوبی سے دوستی تھی۔ روشی کی مزنہ باجی سے۔ ارشد چچی کی صارم کی اماں سے۔ ایک صارم ہی سب سے الگ تھا۔ ارشد منزل والوں

کے دو بیٹے ہونے کے باوجود اس کی ان کے بیٹوں سے دوستی نہ ہو سکی۔ صارم کو زیادہ شور شرابا' ہلا گلا پسند نہ تھا' جبکہ وہ لوگ زندگی کو رونق میلے سے گزارنے کے شائق تھے۔ عرشیہ خالہ نے دونوں لڑکوں کے رشتے کرائے تھے اور اب وہ روشی' زوبی کے لیے ان لوگوں کے من پسند رشتے تلاش کر رہی تھیں۔ صارم باہر آئے تو اماں نے انہیں روک کر بتایا۔

"بھابھی کا فون آیا تھا' تمہیں بہت اصرار سے بلایا ہے' میں بھی چلوں گی۔"

"اماں! پتا تو چلے کس سلسلے میں بلایا گیا ہے۔" وہ سخت بے زار تھے۔

"ارے بھئی' وہاں کوئی مشہور گانے والا آیا ہے۔ اس کا پروگرام ہے۔ اطہر' انور کا دوست ہے' بس بھابھی اور ارشد بھائی نے فوراً" پروگرام رکھ لیا۔"

"آپ کو گانے سننے کا شوق کب سے ہو گیا۔ آپ تو ٹی وی پر بھی گانے نہیں سنتی ہیں۔" صارم حیران ہو گئے۔

"مجھے کوئی شوق نہیں' میں تو بس ارشد بھائی اور بھابھی کے اصرار پر جا رہی ہوں' ذرا ماحول بدلے گا' کب سے گھر سے نہیں نکلی۔ سوچا چلو بھابھی سے گپ شپ ہی سہی۔"

"کیا... سب جائیں گے؟ حلیمہ اور دادی۔"

"نہیں بھئی' اماں جان رات میں کب کہیں جاتی ہیں اور حلیمہ کا انہوں نے نام لیا ہی نہیں۔ بغیر بلائے تو وہ بھی نہیں جائے گی۔" اماں خاصی بے زاری سے بولیں۔

"مگر... ان کا حلیمہ سے بھی وہ ہی رشتہ ہے' جو ہم سے ہے۔"

"تو اب میں ان سے زبردستی تو نہیں کر سکتی' وہ جانتی ہیں کہ حلیمہ یہیں ہے' پھر بھی۔"

سب جائیں گے اور حلیمہ کے بغیر' یہ کوئی انصاف تو نہیں' وہ جانتے تھے حلیمہ کو بھی اس قسم کی ہنگامہ خیز تقریبات سے لگاؤ نہ تھا۔ خود وہ بھی الجھتے تھے۔ لوگوں کا جم غفیر' مصنوعی قہقہے' فضول گفتگو' انہیں جلد بے زاری ہو جاتی تھی' مگر اب... اماں کے حکم پر انہوں نے تیار ہونے کے لیے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ روانگی سے پہلے دادی کے کمرے میں آئے۔ حلیمہ بہت مصروف نظر آئی۔ بیگ سامنے ہی تھا کپڑوں سے بھرا ہوا۔ اب وہ باقی چھوٹی موٹی چیزیں سمیٹ رہی تھی۔ صارم نے حیرت سے دیکھا۔ رات سر پر کھڑی تھی' یہ حلیمہ اتنی رات میں۔

"تو تم واقعی آج ہی جا رہی ہو' ابھی؟" دادی اس کی نقل و حرکت کو بغور دیکھ رہی تھیں۔ "اگر کچھ سامان رہ بھی جائے تو کیا حرج ہے؟"

"پتا نہیں' اب آ بھی سکوں گی کہ نہیں' اس لیے بہتر ہے کہ سب لے جاؤں۔" حلیمہ کے چہرے پر ملال کی سرخی تھی' آواز میں تھرتھراہٹ' وہ جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی مگر ناکام' صارم نے پریشانی سے یہ منظر دیکھا۔

"کیا ہوا' اچانک ہی... کیا مطلب؟" حلیمہ' صارم کی آواز پر چونک گئی۔

"وہ... بھولا کہہ رہا ہے' اسے آج ہی جانا ہے تو میں نے کہا' میں ساتھ ہی چلتی ہوں۔ ابا بس اسٹاپ پر تانگہ لے آئیں گے۔ فون کر دوں گی۔" صارم اس کی آواز سے اتنا سمجھ گئے کہ بات صرف اتنی نہیں' کوئی اور ہی معاملہ ہے' اس کا دل ٹوٹا ہے' انا زخمی ہوئی ہے یا...

"سنو بیٹی!" دادی نے اسے مخاطب کیا۔ وہ کنگھا' ٹوتھ پیسٹ برش وغیرہ بیگ میں رکھنے کے لیے آ رہی تھی۔ "میں تمہیں جانے سے روک نہیں سکتی' مگر آج مجھے رات میں کچھ ہو گیا' تو تم ساری زندگی پچھتاؤ گی۔"

حلیمہ کے ہاتھ سے کنگھا' برش ٹوتھ پیسٹ پھسل کر گرے' گھبرا گئی۔ "کیا ہوا دادی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ آپ اس طرح کیوں؟" آواز بھرا گئی۔

"ارے بیٹا! ہونے کو کچھ بھی ہو سکتا ہے' میری عمر ایسی نہیں کہ کوئی امید باندھوں' پیام اجل آ سکتا ہے کبھی بھی' آج رات سب گھر والے ارشد منزل جا رہے ہیں۔ تم بھی پابہ رکاب ہو۔ چنبیلی میرے

کمرے میں سو جائے گی مگر اس کی نیند اس قدر گہری ہے کہ میں تو اکیلی ہی رہوں گی۔ یہ لوگ بھی رات بارہ ایک بجے کے بعد ہی آئیں گے' سنا ہے وہاں کوئی گانے بجانے کی محفل ہے۔"

حلیمہ نے ان کے قریب آ کر لجاجت سے کہا۔ "ایسی باتیں نہ کریں' میں... اچھا دادی' پھر میں کل تک رک جاتی ہوں۔"

دادی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "اچھا خیر ویسے جانا تو ہے تمہیں' مگر تمہارے جانے کے خیال سے ہی میرا دل پتے کی طرح لرزنے لگتا ہے' چلی جاتی ہو' تو دل وہیں اٹکا رہتا ہے کہ پتا نہیں کیا ہو رہا ہو گا وہاں۔"

دادی افسردہ بھی تھیں اور اس کے نہ جانے کے ارادے سے کچھ مطمئن بھی۔ صارم جانتے تھے۔ دادی نے اسے روکنے کے لیے ہی پریشانی کا اظہار کیا ہے۔ ورنہ دادی اللہ کے فضل سے بالکل صحت مند تھیں اور ان کے رات میں تنہا رہنے کا بھی سوال نہ تھا۔ ابا جان ایسی صورت میں خود ان کے کمرے میں آ کر بیٹھ جاتے۔ رات گئے تک ان کو لکھنے پڑھنے کی عادت تھی۔ جب تک گھر والے آ نہ جاتے۔ وہ دادی کے کمرے میں ہی رہتے۔ انہیں بھی چنبیلی کا بھروسا نہ تھا۔

حلیمہ کی غیر موجودگی میں روبی ان کے کمرے میں سوتی تھی۔ کبھی ابا جان بھی وہیں سو جاتے۔ حلیمہ اس بات سے واقف تھی۔ پھر بھی دادی کے اندیشے کے اظہار کے بعد اس کا جانا' اسے خود گوارا نہ ہوا۔ اب دادی اسے روکنا چاہ رہی تھیں۔ یا ان کی طبیعت واقعی خراب بھی ہو سکتی ہے۔ چچا ابا کی موجودگی کے یقین کے باوجود وہ رکنے پر مجبور ہو ہی گئی کہ کیا پتا کل بلکہ رات میں ہی کچھ ہو گیا تو... وہ دادی کے ہاتھ سہلانے لگی جو اس کے رکنے کی خبر کے ساتھ مطمئن تو ہو گئی تھیں مگر ناراضی کا اظہار ضروری تھا۔

"اب بھلا یہ کیا بات کہ گندم کٹائی ہونے والی ہے یا کپاس کی چنائی تو ہونے دو' باپ کے پاس تمہیں دینے کے لیے کیا چار چھ سو روپے بھی نہیں' ہم کیا کمی ہے بھلا' ضروری ہے کہ تم بھی عام مزدور کی طرح حصہ لو اور مزدوری وصول کرو' اتنی رقم کیا میں نہیں دے سکتی تمہیں۔"

"دادی! وہ کوئی مجبور تو نہیں کرتے۔" حلیمہ لجاجت سے بولی۔ "میں اپنی مرضی سے کرتی ہوں۔ ابا کے ساتھ رہنے کا بہانہ اور گھر سے باہر وقت گزارنے کے لیے بھی یہ اچھا بہانہ ہے اور اپنی کمائی کا تو فخر بھی ہوتا ہے۔ وہ بھی کسی غیر سے نہیں اپنے باپ سے ہی لیتی ہوں۔ آپ فکر نہ کیا کریں۔ میں وہاں بہت خوش رہتی ہوں۔"

صارم' دادی پوتی کو شکوہ جواب شکوہ کرتے چھوڑ کر آ گئے' مبہم سی مسکراہٹ لیے۔

ارشد منزل کے وسیع لان میں ہمیشہ کی طرح روشنیوں کا سیلاب سا آیا ہوا تھا۔ ارشد چچی اور زوبی نے ان کا پُرتپاک استقبال کیا۔ صارم انہیں سلام کر کے لان کی طرف چل پڑے۔ تب ہی انہوں نے چچی کی آواز سنی۔ "کیا حلیمہ نہیں آئی؟"

"نہیں... دادی کی تنہائی کی وجہ سے۔" روبی انہیں دبی زبان سے جواب دے رہی تھی۔

"تو خالہ جان کو بھی لے آتیں' میں نے تو کہا تھا وہ اندر میرے کمرے میں آرام کر لیتیں' خاص طور پر حلیمہ کا کہہ کر آئی تھی میں۔ حلیمہ اس وقت نہانے گئی ہوئی تھی۔ خالہ جان سو رہی تھیں۔ اس لیے بطور خاص مزنہ سے کہا تھا کہ حلیمہ کو ضرور لائیں۔ وہ ہمارے ہاں آتی ہی نہیں ہے' کیا سوچے گی کہ..."

صارم نے سنا۔ اماں کہہ رہی تھیں۔ "ارے نہیں' کیا سوچے گی بھلا' بس وہ تو..." وہ ارشد چچا کے قریب چلے گئے۔ ان کے بیٹوں سے ہائے' ہیلو کر کے ارشد چچا کے پاس ہی بیٹھ گئے۔ دونوں لڑکے محفل موسیقی کے انتظام میں مصروف تھے۔

اس وقت عرشیہ خالہ بھی آ گئیں۔ ان کے ساتھ چند نئے چہرے بھی تھے۔

"اچھا تو پھر کوئی نیا شکار ہاتھ لگا ہے۔"

اماں' روبی' مزنہ باجی بھی آ گئیں۔ زوبی اور روشی

بھی آکر سب سے ملنے لگیں۔ زوبی نے تیز رنگ کی جھلملاتی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ روشی بھی نئے ہیئر اسٹائل کے ساتھ' شوخ میک اپ میں تھی۔

(دونوں بہنیں خاصی حسین ہیں' پتا نہیں نمائشی میک اپ کیوں ضروری سمجھتی ہیں۔)

صارم کو کوفت ہوتی تھی نقلی چہرے' مصنوعی اخلاق' بے ضرورت قہقہے..... وہ چچا کے پاس بیٹھے رہے' گوکہ زوبی دوبار ان کے پاس آکر انہیں اپنی دوستوں سے ملوانے پہ اصرار کرتی رہی مگر وہ ارشد چچا سے ضروری باتوں میں منہمک رہے۔ انہیں بطور خاص خواتین کی محفل سے گھبراہٹ ہوتی تھی۔ مرد لوگ کاروبار' نفع نقصان کے بارے میں ہی گفتگو کررہے تھے جو بہرحال خواتین کی فیشن اور مارکیٹوں کے بارے میں معلومات پر مبنی باتوں سے بہتر ہی تھی۔ کچھ لوگ سیاست پر تبصرے کررہے تھے۔

صارم سب کو بغور سنتے رہے' کافی فاصلہ ہونے کے باوجود زوبی اور روشی کے بلند کھنکتے قہقہے سماعت پر گراں گزر رہے تھے۔ غنیمت ہے کہ آج لوگ زیادہ نہ تھے ـــــ مہمانوں کی اکثریت رشتے داروں یا ارشد چچا ان کے بیٹوں کے احباب پر مشتمل تھی۔ کھانے کے بعد محفل موسیقی کا انعقاد ہوا۔ فرشی نشست پر گلوکار مع سازندوں اور دوستوں کے ہمراہ بیٹھ کر سُر ملانے لگے۔ سب ادھر متوجہ تھے۔ صارم اٹھ کر باہر آگئے۔ گیٹ پر چوکیدار اور ایک دو ملازم موجود تھے۔ ان کو اپنی روانگی کے بارے میں بتاکر اور تاکید کرکے کہ ان کا انتظار نہ کیا جائے' اور زوبی یا مزنہ باجی ڈرائیو کرکے گھر چلی جائیں۔

وہ سڑک پر نکل آئے۔ سنسان سڑک' اندر کے شور شرابے کے بعد باہر کا سناٹا سماعت کو سکون دے رہا تھا۔ ایک فرلانگ کے بعد وہ اس گلی میں آگئے' جہاں ایک دوست رہتا تھا۔ شاید جاگ رہا ہو یا پھر وہاں سے پیدل گھر تک مارچ کرنا پڑے مگر..... نہ صرف وہاں سب جاگ رہے تھے' بلکہ لان میں ٹیبل ٹینس کا میچ ہورہا تھا۔ عامر کے کزن اور دو تین دوست جو کہ صارم کے بھی یونیورسٹی کے ساتھی تھے۔ صارم کی آمد پر خوب تالیاں بجیں۔ وہ بھی ان کے ساتھ کھیل میں شریک ہوگئے۔ کئی دوست شادی شدہ تھے۔ بیگمات کے ہمراہ آئے تھے۔ عامر کی بیوی نے صارم کو میچ کے اختتام پر کشمیری چائے دیتے ہوئے مشورہ دیا۔

"بھائی! اب آپ بھی شادی کرلیں۔ بہت اکیلے پھرلیے' دیکھیں یہ سارے لوگ جو اپنی بیگمات کے ہمراہ آئے ہیں' کیسی رونق لگی ہے۔"

"اوہو' میرے دوست کے آنے سے تمہاری رونق میں کوئی کمی تو نہیں آئی۔" عامر نے احتجاجاً" بیوی کو مصنوعی طور پر ڈانٹا۔ "تم صارم کی اماں جان ہو' جو شادی پر اکسارہی ہو' صارم سے پوچھو وہ کتنی پُرسکون زندگی گزار رہا ہے۔"

"آپ چپ رہیں' آپ بے سکون ہیں تو ہوا کریں' غیر شادی شدہ لڑکے زیادہ بے سکون ہوتے ہیں' کیوں صارم بھائی!" وہ صارم سے گواہی دلوارہی تھی۔

"تمہیں اتنی فکر ہے' تو کوئی اچھی سی لڑکی تلاش کرو' شادی ہم کروادیں گے۔" عامر نے پٹڑی بدلی۔

"تلاش یہ خود کرلیں' ہم تو سب رونق لگانے والوں میں سے ہیں' آخر صارم بھائی کی امی اور بہنیں اپنی مرضی کی اور پسند کی لڑکی کو بہو بنائیں گی یا صارم بھائی کی پسند کی۔"

"میرا خیال ہے اشتہار دیا جائے' ایک تازہ بہ تازہ لڑکی کی ضرورت ہے' مطلب' میری بیوی جیسی' پھیکی سیٹھی' باسی نہ ہو' تازہ گلاب جیسی۔"

عامر ہمیشہ اپنی سیدھی سادی بیوی کا مذاق اڑاتا تھا' جو نمائشی اشیا' فضول میک اپ سے اجتناب برتتی تھی' جو اس کی ساس کو بہت پسند تھی۔ پسند تو عامر کو بھی تھی' مگر مذاق اڑانے کا اس کا طریقہ تھا۔

"صارم! یار تم بھی بولو' کوئی خاص پسند ہے تو..... بغیر بتائے تو مقصد حاصل نہیں ہوتا۔" دوست اکثر انہیں اکسایا کرتے۔ وہ ٹال جاتے' کیا بتاتے۔

ماں بہنیں ان کی پسند سے واقف ہونے کے باوجود' ان سے اتفاق نہ کرتی تھیں۔ اب بھی چپ رہے۔

رات گئے طاہر نے انہیں گھر پر چھوڑا۔ ان کا خیال تھا' سب سو چکے ہوں گے مگر اماں لاؤنج میں موجود تھیں۔
"کہاں گئے تھے؟" سخت لہجہ۔
"دوست کی طرف چلا گیا تھا۔"
"مجھے بتائے بغیر' میری پریشانی کا سوچے بغیر' کتنی شرمندگی اٹھانا پڑی تھی۔ سب مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے' جیسے میں مجرم ہوں۔"
"آپ جانتی ہیں مجھے گانے بجانے سے دلچسپی نہیں ہے' نہ ہی ایسی دعوتیں پسند ہیں۔"
"عامر کے گھر دوست جمع تھے۔ ٹیبل ٹینس ہو رہی تھی' میں بھی شریک ہو گیا۔ وقت کا اندازہ ہی نہیں ہوا' آپ کب آئیں؟"
"بس' ابھی' زوبی اتنی کھسیانی ہو رہی تھی' تم نے اسے آئس کریم کھلانے کی دعوت دی اور غائب ہو گئے۔" اماں کا غصہ کم نہیں ہو رہا تھا۔
"لاحول ولا' میں کوئی بچہ ہوں' یا وہ ننھی بے بی ہے' جسے میں آئس کریم کھلاتا۔"
"ویسے امی! آپ زوبی' روشی کے جھوٹ کے پلندوں سے واقف تو ہیں۔ اسی فضول عادت سے ایک کا نکاح ختم ہوا' دوسری کی دو منگنیاں ٹوٹیں' مگر باز نہیں آتیں' وہ جب چاہیں جو چاہیں کسی پر الزام رکھ دیتی ہیں اور صارم کب آئس کریم کی دعوت دیتے' مستقل ارشد چچا کے پاس ہی بیٹھے رہے۔ کھانا بھی ان ہی کے ساتھ کھایا۔"
صارم نے شکر گزار نظروں سے مزنہ باجی کو دیکھا۔
"اور زوبی کی ان ہی حرکتوں سے خاندان میں کوئی بھی اسے قبول نہیں کرتا۔"
"اماں... اب آپ بھی جا کر آرام کریں' میں بھی سونے جا رہا ہوں۔" وہ کہہ کر زینے کی طرف بڑھ گئے۔ اوپر جاتے جاتے انہوں نے سنا' مزنہ باجی کہہ رہی تھیں۔
"امی! آپ خوامخواہ مشکوک رہتی ہیں۔ آپ سمجھ رہی تھیں صارم' حلیمہ سے ملنے آ گئے۔ بھلا صارم کو دن میں اتنے مواقع ملتے ہیں تو وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے تو اور نہ ہی حلیمہ اتنی..." وہ ہونٹ چباتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئے۔ اب نیند تو غارت ہو گئی تھی۔ کاش انہوں نے کچھ سنا نہ ہوتا' گو کہ ارشد منزل سے نکل کر وہ گھر آنا ہی چاہ رہے تھے' مگر پھر انہیں خیال آیا کہ اماں فوراً" رائے قائم کر لیں گی کہ میں حلیمہ کی وجہ سے گھر گیا ہوں۔
حلیمہ کی عزت اور حرمت پر حرف آئے۔ یہ کسی قیمت پر انہیں گوارا نہ تھا۔ ارشد چچی کا حلیمہ کے بارے میں سوال کرنا۔ گویا انہوں نے اسے بھی بلایا تھا مگر اماں نے انہیں... آخر اس غلط بیانی کی کیا ضرورت تھی اور حلیمہ کو لے جانے میں بھی کیا حرج تھا؟



پوری رات بے چینی میں گزری۔ فجر کی نماز پڑھ کر ذرا دیر کو سوئے اور اپنے وقت پر تیار ہو کر نیچے آ گئے۔ میز پر ناشتا موجود' گھر والے اپنے کمروں میں محوِ آرام۔ دادی اور حلیمہ ناشتا کر رہی تھیں۔ آفس جانے سے پہلے دادی کے پاس ضرور آتے تھے۔ سلام کر کے ان کی دعائیں لے کر جاتے تھے۔
"تم نے ناشتا کر لیا؟"
"جی دادی! رات ارشد چچی شکوہ کر رہی تھیں کہ آپ کیوں نہیں آئیں۔ حلیمہ کا بھی پوچھ رہی تھیں۔" رہا نہ گیا تو کہہ ہی دیا۔
"لو... راگ رنگ کی محفلوں میں میرا کیا کام اور مجھ سے کسی نے کہا بھی نہیں۔ اتنی رات تک بھلا میں وہاں کیا کرتی۔ یہ لوگ تو آ گئی تھیں' تم کہاں تھے؟"
"میں... عامر کے گھر چلا گیا تھا' آپ کو یاد ہے' ایک بار جب میرا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ عامر نے مجھے خون دیا تھا۔ آپ نے اسے میرا خون شریک بھائی کہا تھا۔"
"ہاں' ہاں' اچھا بچہ ہے' بیوی کو لے کر آیا تھا ایک بار' حلیمہ بھی ملی تھی اس کی بیوی سے' مسخری سی ہے' لاابالی' مگر سادہ ہے۔"
صارم کو ہنسی آ گئی۔ عامر کی بیوی مسخری' عامر سنے گا تو... مزید بیوی کا مضحکہ اڑائے گا' پھر نیند کی کمی'

الجھن' تھکن' آفس میں دل نہیں لگا۔ اماں کی حلیمہ سے پرخاش نئی چیز نہ تھی' حالانکہ جب حلیمہ کی والدہ کی وفات ہوئی تھی' دادی اسے اپنے ساتھ لے آئی تھیں۔ گھر میں سب کو اس سے ہمدردی تھی اور جب چچا جان نے دوستوں کی منتخب کردہ لڑکی سے شادی کر لی تو سب چچا جان سے ناراض اور حلیمہ سے سب نے بے حد محبت کا اظہار کیا تھا' بلکہ ابا جان نے اسے پڑھانے کا بہانہ کر کے اپنے ساتھ ہی رکھ لیا۔
روبی سے اس کی دوستی مزید پختہ ہو گئی۔ مگر نئی اماں کو حلیمہ کا سکھ پسند نہ آیا۔ وہ آئے دن شوہر کو مجبور کر کے اسے گاؤں بلا لیتیں۔ اور مجبوری یہ کہ نہ تو حلیمہ جانے سے انکار کرتی' نہ دادی اسے منع کرتیں۔ انہیں اپنے بیٹے کی حلیمہ سے محبت کا اندازہ تھا۔ کبھی خود دادی اس کو گاؤں لے جاتیں' پھر ساتھ ہی لے ہی آتیں۔
پھر... بی اے کے امتحان ختم ہونے کے بعد وہ گاؤں گئی تو اس کی زندگی ایسے المیے کا شکار ہو گئی' جس نے اسے خزاں رسیدہ پتے کی طرح بے سمت کر دیا۔
وہ حیرت' صدمے اور مایوسی کے بھنور سے نبرد آزما تھی۔ کچھ عرصہ تو وہ صدمے کے تحت سکتے کی کیفیت سے دوچار رہی۔ درخت تو خزاں کے بعد پھر سے ہرے بھرے ہو جاتے ہیں' مگر حلیمہ جس خزاں کا شکار ہوئی اس میں بہار آنے کے آثار نہیں تھے۔ خود گھر والے' رشتے دار ہی اس کے بہار آشنا ہونے میں مزاحم تھے۔ کوئی بھی اسے مایوسی اور غم سے نکالنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ وہ بے چارگی کی تصویر بن گئی۔
اس کا کوئی گھر ٹھکانہ نہ تھا۔ دادی ہی اس کے اعتماد کو بحال کیے ہوئے تھیں۔ یہاں بھی وہ سب کی خدمت پر کمربستہ تھی۔ ملازموں کے ساتھ مل کر کتنے ہی کام کر ڈالتی اور کسی کو اسے منع کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ شاید سب ہی اسے نظر انداز کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا تھے۔ اماں جو پہلے اس کا روبی کی طرح خیال رکھتی تھیں۔ اب انہیں صرف اس پر طنز کرنا یاد تھا۔ روبی کی دوستی بھی قصۂ پارینہ بن گئی تھی۔ ایک خالہ عرشیہ تھیں' جب آتیں حلیمہ کو پکارتیں' فرمائش کر کے اس سے نئی نئی چیزیں پکواتیں۔ مسلسل کچن میں مصروفیت' وہ بھی سب کی نظروں سے اوجھل رہنا پسند کرتی تھی۔ خالہ' حلیمہ کے لیے بھی رشتے لاتیں جو دادی کی نظر میں اوٹ پٹانگ ہوتے۔ پتا نہیں انہیں صارم کیوں نظر نہیں آتے۔ ہاں اماں اکثر کسی لڑکی کی تعریف کے ساتھ ان کی رائے طلب کرتیں' وہ جھنجھلا کر رہ جاتے۔
پھر وہ حلیمہ کے کسی رشتے کا ذکر کرتیں۔
"اچھا بھلا رشتہ ہے۔ مگر تمہاری دادی کو پسند نہیں آتا۔ انہیں تو عرش سے اترا ہوا کوئی شہزادہ ہی پسند آئے گا۔ بڑی کہیں کی شہزادی ہے وہ۔ بدنام ہو چکی ہے سارے جہان میں۔" وہ صارم کے بگڑے تیور دیکھ کر یقین دلاتیں۔ شادی کی رات سسرال سے بھاگی۔ کون جانے کس کے ساتھ۔" صارم کے دل پر گھونسا لگا۔
"اماں! آپ جانتی ہیں' وہ دادی کے پاس اپنے باپ کے گھر آئی تھی' اور دادی ہی اسے یہاں لائی تھیں۔ کیوں بھول جاتی ہیں آپ؟"
"کیا پتا کس کے ساتھ بھاگی' اور کس طرح دادی کو ملی۔ دادی تو پوتی کے ہر عیب چھپاتی ہیں' کون نہیں جانتا' ہمیشہ ہی وہ حلیمہ کے لیے..."
"اماں! اب آپ اس بات کو چھوڑیں' ابا جان بھی ہر حقیقت سے باخبر ہیں۔" وہ طیش میں اٹھ کر ان کے پاس سے کہیں چلے گئے۔ اماں' بیٹیوں کو سنا کر صارم کی عقل پر افسوس کرنے لگیں۔ "سچائی سننے کو تو کوئی تیار نہیں۔ دادی' نہ پوتا' لو بھلا کس کس کی زبان بند کریں گے۔"
صارم کو اپنے گھر والوں کی ذہنیت پر افسوس ہوتا۔ حقیقت معلوم ہونے کے بعد بھی کسی کو یقین ہی نہ آتا۔ صارم کے والد پولیس میں آئی جی کے عہدے سے سبکدوش ہوئے تھے۔ تمام عرصہ پولیس کے محکمے میں نیک نامی کے باعث پسندیدہ شخصیت مانے گئے۔ بے حد ذہین اور کارگزار ہستی کے طور پر بے حد عزت

کمائی اور انہوں نے ہی حلیمہ کو اپنے گھر میں لا کر رکھا۔ اس وقت جب سب حلیمہ کی طرف سے مشکوک تھے۔ لوگوں کے منہ میں زبان نہیں، شعلوں کی لپک تھی، جھلسانے کے لیے، راکھ بنانے کے لیے، جو کسی کو بھی خاکستر کر سکتے تھے۔

حلیمہ تو اپنوں کو ہی بھگت رہی تھی۔ دادی اور چچا نے اپنے حسن سلوک سے محبت سے اسے سہارا دیا تھا۔ ورنہ، شاید لوگوں کے رویے اور نفرت بھری نظروں کی مار، اسے مار ہی دیتی۔ ادھ موئی تو ہو ہی گئی تھی۔ یہ تب کی بات ہے جب وہ انجینئرنگ کے شاندار رزلٹ کی خبر لے کر دادی کے پاس آئے تھے اور اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ یہ خواہش وہ پہلے بھی کر چکے تھے اور ابا جان نے چچا کے سامنے سوال بھی کر دیا تھا۔

چچا بہت خوش ہوئے تھے۔ لیکن انہوں نے صارم اور حلیمہ کی تعلیم مکمل ہونے تک خاموش رہنے کی درخواست کی تھی اور اب حلیمہ بی اے کر کے گاؤں جا چکی تھی۔ گو کہ اس کی خواہش آگے پڑھنے کی تھی مگر اماں نے بھی کہا کہ شادی کے بعد وہ پڑھ سکتی ہے۔ لیکن چچا جان شادی کے لیے ابھی تیار نہ تھے۔ تعلیم ختم ہونے تک تیاری ہو جائے گی۔ کہہ کر انہوں نے یہ معاملہ التوا میں ڈال دیا اور اب.... وہ بھی فارغ تھے۔ تیاری بھی ہو چکی ہو گی۔ چچا جان کی خواہش کے مطابق وہ دادی کے پاس کامیابی کا مژدہ لے کر خوشی سے سرشار پہنچ گئے۔

"دادی! اب تو چچا جان کو بتا دیں۔ ابا جان گاؤں جانے کے لیے تیار ہیں اور آپ بھی ساتھ جائیں گی نا؟"

دادی کے کندھے پر سر رکھے نہ جانے وہ کس کس آرزو کی تکمیل چاہ رہے تھے۔ اپنے جوش مسرت میں دادی کی افسردگی محسوس ہی نہیں کی۔ جب دادی نے سرد آہ کے ساتھ ایک لفافہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے بے خیالی میں لفافہ پکڑ لیا۔ اندر سے جو کارڈ برآمد ہوا وہ شادی کارڈ تھا۔ ارمانوں کو جلا کر خاک کر دینے والا۔ صارم تو اسی وقت غم سے نڈھال ہو کر بستر پر لڑھک گئے۔ حیرت، انتہائی حیرت، بے یقینی اور مایوسی نے پورے وجود کو اپنے خوفناک پنجوں میں جکڑ لیا تھا۔ دادی خود حیرت اور تاسف سے نڈھال تھیں۔

گاؤں میں.... حلیمہ کی شادی طے ہو گئی تھی۔ قریبی ایک گاؤں سے بارات آنا تھی۔ دادی کا اداس چہرہ بجھی بجھی آنکھیں کسی بھی امید سے خالی تھیں۔

"یہ کیسے.... یہ کیا، دادی، آ.... آپ سے پوچھے بغیر؟"

دادی گم صم تھیں، کیا کہتیں، بڑا بیٹا جتنا فرماں بردار لائق اور محبت کرنے والا تھا۔ چھوٹا شاہ نواز ہمیشہ سے لاابالی، گاؤں کے ماحول سے متاثر، تعلیم ادھوری چھوڑ کر زمینوں کا ہو کر زمین دار ہی بن گیا۔ عجیب عجیب شوق اور بے تکی عادات اپنا لیں۔ دادی نے اپنی یتیم بھانجی سے شادی کرا دی۔ جو بے حد خوش اخلاق سلیقہ شعار اور خدمت گزار تھی۔ شاہ نواز نے بھی بیوی سے بہت محبت کی تھی۔ خود کو بدل ڈالا تھا۔ پھر حلیمہ نے آ کر ان کی زندگی میں خوشیاں بھر دیں۔ دادی ان ہی کے ساتھ رہنے لگی تھیں۔ لیکن خوشیوں کی یہ بہار بہت کم تھی۔

دس برس، صرف دس برس کی عمر میں حلیمہ ماں کی گود سے محروم ہو گئی اور گھر ویران، شاہ نواز نے چند ماہ سوگ میں گزارے، اور پرانے دوستوں کے مشورے سے ایک غریب گھر کی ان پڑھ لڑکی کو بیاہ لائے۔ ماں سے تو اس وقت بھی کوئی مشورہ نہیں کیا تھا۔ وہ ان دنوں بڑے بیٹے کے پاس آئی ہوئی تھیں۔ حلیمہ ان ہی کے ساتھ تھی۔ جب انہیں خبر ملی فوراً گاؤں گئیں۔

نئی بیگم نے پرانی بیگم کی تمام نشانیاں گھر سے غائب کر دی تھیں۔ کوئی چیز بھی پہلے والی موجود نہ تھی۔ شوہر کو بھی مٹھی میں لے لیا تھا۔ گھر کا وہ پرانا سلیقہ ناپید تھا۔

وہ بے زار ہو کر شہباز کے پاس آ گئیں حلیمہ کو لے کر، روبی کے ساتھ اسکول میں داخلہ ہو گیا، مگر شاہ نواز کو حلیمہ سے بہت محبت تھی۔ یہ ہی محبت حلیمہ کو گاؤں لے جاتی۔ نئی اماں کو تو حلیمہ کی ماں کی کوئی چیز

برداشت نہ تھی۔ حلیمہ تو جیتی جاگتی نشانی تھی۔ نہ اسے کہیں پھینک سکتی تھیں نہ اس کی باپ سے محبت ختم کر سکتی تھیں۔

سب سے طاقت ور دادی کا وجود تھا۔ جن کی پناہ میں حلیمہ تھی۔ جس سے ان کو شدید نفرت تھی۔ مگر تند و تیز نظروں کے تیروں سے اسے زخمی تو کر سکتی تھیں۔ زبان کی تلوار سے گھائل بھی کر دیتی تھیں، مگر اسے یا اس کی محبت کو شاہ نواز کے دل سے نہیں نکال سکتی تھیں۔ بس یہ ہی ان کی پسپائی انہیں کسی بڑے اقدام کے لیے مجبور کر رہی تھی اور پھر اس کا موقع مل ہی گیا۔

حلیمہ کی عمر کا زیادہ حصہ تو چچا ابا، چچی اماں کے ساتھ ہی گزرا تھا۔ وہ ان سب سے بہت مانوس تھی۔ زیادہ تر تو وہ دادی کے ہمراہ گاؤں جایا کرتی تھی، مگر دادی ہر بار تو وہاں نہیں جاتی تھیں۔ اس مرتبہ قسمت اسے وہاں لے گئی۔ چونکہ امتحان کے بعد فارغ تھی اور رزلٹ آنے تک اسے ابا کے پاس رہنا تھا اور ان ہی دنوں اس نے چند اجنبی خواتین کو دیکھا۔ اماں ان سے بہت گھل مل کر باتیں کرتیں۔

اسے علم ہی نہ ہوا کہ اماں کا داؤ کامیاب ہو گیا ہے۔ صارم کے رشتے پر ابا بہت خوش تھے۔ اماں نے ہی انہیں ورغلایا۔

"نہ جانے وہاں کیا ہوتا ہو گا۔ تب ہی تو بھتیجی کو بیاہنے پر مجبور ہو گئے۔ ورنہ اتنے بڑے محل جیسے گھر میں رہنے والے کو کیا اپنے جیسا رشتہ نہ ملتا۔"

وہ حلیمہ سے بھی اس قسم کی تفتیش کیا کرتی تھیں۔ جس سے انہیں کوئی ایسا اشارہ مل جائے جسے بنیاد بنا کر باپ کو بیٹی کے خلاف ورغلائیں اور پھر.... چند میل آگے ایک گاؤں میں کچھ لوگ زمین کا سودا کرنے آئے۔ کئی ماہ کرائے کے گھر میں رہے۔ ظاہر تو یہ ہی کیا کہ جلد ہی وہ اپنا گھر شروع کرانے والے ہیں۔ یہیں زمین لے کر کھیتی باڑی کریں گے۔ رشتہ کرانے والی نے اماں کے حسب منشا ان کے بیٹے کے لیے حلیمہ کو دکھایا۔ ان کی آمد و رفت شروع ہوئی۔

اور پھر.... ایک دن وہ آ کر اسے انگوٹھی پہنا گئیں۔ چونکہ ان لوگوں کو شادی کی جلدی تھی۔ کاروبار تو ڈیرہ غازی خان میں تھا۔ لیکن شادی کے لیے انہیں پنجاب کے اعلا خاندان کی تلاش تھی۔ لڑکی گاؤں کی ہو، یہ بھی شرط تھی۔

انہوں نے جہیز لینے سے بھی انکار کر دیا۔ جب تک اپنا گھر نہ ہو، ساز و سامان کی ضرورت نہیں۔ پھر یہاں گھر بننے تک ڈیرہ غازی خان میں ہی رہنا ہو گا کہ وہاں اپنا گھر بھی ہے۔ شادی کے اگلے دن ڈیرہ غازی خان روانگی تھی۔ اور تیسرے دن ولیمہ۔ سارا پروگرام طے تھا۔

حلیمہ دنگ رہ گئی، یہ کیا ہوا، کیسے سب کچھ آناً "فاناً" طے ہو گیا۔ چچا ابا اور دادی کی مرضی لیے بغیر مگر وہ ابا سے کچھ کہہ نہ سکی۔ اماں کی نگرانی شدید تھی کہ وہ باپ سے مل نہ سکے۔ ابا کے استفسار پر انہیں بہلا دیا۔

"لڑکیاں شادی کے موقع پر باپ بھائی سے شرماتی ہیں۔"

"ابا تو ان کے تابع دار تھے۔ چاہتے تو اپنی محبت کام میں لا کر بیٹی سے مل لیتے" وہ ہمت کر لیتی، کم از کم اتنا تو کہتی کہ دادی سے تو اجازت لے لیں۔ پھر دادی اور چچا ابا کی فیملی آ گئی۔

چچا ابا کی ابا سے خاصی تلخ کلامی ہو گئی۔ دادی نے بھی گھر کا رنگ ڈھنگ دیکھا اور بیٹے سے باز پرس نہ کی۔ اماں اور ان کا کنبہ گھر کے ہر معاملے میں دخیل تھا۔ چچا ابا نے جلد بازی کے فیصلے اور انجان لوگوں پر بھروسا کرنے کے نقصان پر خاصی حجت کی، لیکن ابا نے کہہ دیا۔

"ڈیرہ غازی خان میں ان کا جنرل اسٹور ہے، میں نے معلوم کرایا ہے۔"

شادی کی جلدی کا جواز لڑکے والوں کے پاس تھا۔ شادی کر کے ڈیرے چلے جائیں گے۔ یہاں گھر بنتا رہے گا۔ پھر زمین کا قبضہ لے کر آ جائیں گے۔

حلیمہ سیدھی سادی، نیک خو لڑکی تھی۔ مگر.... کوئی انجانی حس اسے بے چین کیے ہوئی تھی۔ صرف لڑکے والوں کے یقین دلانے پر ابا نے بھروسا کر لیا۔ خود

جاکر دیکھنے کے بجائے کسی واقف کار کے ذریعے معلوم کرایا۔ جس نام کا اسٹور لڑکے کے باپ نے بتایا تھا۔ وہ ڈیرہ غازی خان میں موجود ہے۔ چلتا ہوا کاروبار ہے اور بس ''خاندان' عزیز' رشتے دار' کسی کا نہیں معلوم کرایا۔

گاؤں میں بھی کسی زمین کے سلسلے میں بات چیت چل تو رہی ہے 'فیصلہ نہیں ہوا' شادی کے بعد آکر طے کرلیں گے۔ صارم' دادی کے مجبور کرنے پر آگئے تھے' مگر ان کے دل کی جو کیفیت تھی' کسی کو بتا نہیں سکے۔ دیکھ رہے تھے کہ ابا جان بھی بے دلی سے سہی مجبور ہو کر آئے ہیں۔

بے ماں کی بچی' اکلوتی بھتیجی' پھر بارات آئی' نکاح ہو گیا' اور رخصتی بھی۔ صارم چھت پر کھڑے ہو کر انتہائی دل برداشتہ کیفیت میں رخصتی کا دل دوز منظر دیکھ رہے تھے۔

بارات دوپہر کو آئی تھی۔ رخصتی مغرب کے وقت عمل میں آئی' لمحوں بعد گیٹ خالی تھا۔ سب لوگ جا چکے تھے۔ ہر سمت سناٹا و ویرانی چھا گئی۔ غم ناک شام کے سرمئی اندھیرے ہر سمت ڈیرے ڈال چکے تھے اور اب نہ جانے کتنی شامیں' کتنی راتیں انہیں جدائی کے غم کے ساتھ گزارنی تھیں۔ جدائی..... جس کی انہیں توقع نہ تھی۔ امید نہ تھی' یقین ہی نہ تھا' اب آنکھوں سے اسے غیر کا ہوتا دیکھ رہے تھے' بے بسی کے عالم میں۔

حلیمہ کی کیفیت کچھ جدا تھی۔ اس کا دل خوف سے بند ہونے کو تھا۔ پیروں میں تھرتھراہٹ تھی' ہاتھوں میں رعشہ۔

دادی کی پرانی ملازمہ اس کے ساتھ سسرال آئی تھی۔ جلو نے ہی اسے سنبھالا ہوا تھا۔ سسرال کے گھر میں وہ ہی لوگ تھے' جو بارات میں آئے تھے۔ روکھا پھیکا استقبال ہوا' کیونکہ باراتی ہی مختصر تھے۔ تین خواتین' چار مرد اور باقی گاؤں کے لوگ تھے۔ ان میں سے بھی مرد لوگ راستے سے ہی اپنے گھر کو سدھارے۔

خواتین کچھ تو شوق میں اور گھر دور ہونے کے سبب یا پھر حلیمہ کے ابا کے گھر سے جو کھانے کی دیگیں آئی تھیں اور انہیں کھا کر جانے کی دعوت دی جاچکی تھی' اس لیے دلہن کے ساتھ ہی آگئیں۔

چند گاؤں والے آکر مردانے کے صحن میں بیٹھ گئے۔ گھر خاصا فراخ تھا۔ مردانے کا دروازہ الگ' زنانہ راستہ الگ تھا۔ خواتین حلیمہ کو لے کر اندر آئیں اور ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ چند گاؤں والیاں اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ گھر والیاں سب چلی گئیں۔ کھانے کا انتظام' دیگیں' برتن' اسی قسم کی گفتگو کرتی ہوئی باہر گئیں۔ گاؤں والیاں جلو سے سوالات کرنے لگیں۔ دولہا اندر آیا نہ ہی کوئی رسم وغیرہ ہوئی۔ حلیمہ کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ لگتا تھا سینے سے باہر آجائے گا۔ انجان لوگ' غیر خاندان' ڈیرہ غازی خان کے لوگوں کے طور طریقے سے ناواقف' نہ جانے کیسا ماحول اور کیسی عادات سے سابقہ ہوگا' کہیں یہ لوگ بھی عورت کو پیر کی جوتی سمجھ کر ظلم و زیادتی کو اپنا حق نہ سمجھتے ہوں۔

ابا نے بتایا تھا' یہ لوگ بہت غیرت مند ہوتے ہیں اور ان کے ہاں ہر فیصلے کا حق مرد کو ہوتا ہے اور عورتیں گھر بار دیکھتی ہیں۔ گویا عورت کی اہمیت صفر' حیثیت زیرو۔

''کیا میں ایک کنیز یا باندی کی صورت میں زندگی گزاروں گی؟ یہ لوگ مجھے دادی اور چچا ابا سے ملنے بھی دیں گے؟ ابا کے گھر آنے پر پابندی تو نہیں لگا دیں گے؟

پریشان کن خیالات نے دماغ میں اودھم مچا رکھا تھا۔ اعصاب پر مایوسی کا غلبہ تھا۔ کتنا وقت گزر گیا' جلو اس کے لیے کھانا لے آئی' جو یوں ہی پڑا تھا۔ گھر والیوں نے تو پھر اس کی خبر لی ہی نہیں۔ باہر کھانے کا انتظام تھا۔ عورتوں' بچوں کی آوازیں' برتنوں کی کھنکھناہٹ' ہنسی کی جھنکاریں۔

پھر... اسے احساس ہوا کہ شور میں خاصی کمی ہو گئی ہے۔ رات خاصی ہو چکی تھی اور نئی دلہن کے وجود

سے گھر والے بے فکر' پھر جلو آگئی' اس کی عجب حالت تھی' چہرہ فق' ہوائیاں اڑ رہی تھیں' سخت پریشان اور خوف زدہ' حلیمہ چوکنا ہو گئی۔ اسے یوں بھی عجب بے چینی تھی' کوئی انہونا احساس' جیسے کچھ ہونے والا ہو' کوئی سانحہ' حادثہ' چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھتی جلو اس کے پاس آکر سرگوشی کرنے لگی۔ اس کے ہاتھ میں سفید چادر تھی۔

''جلدی نکلو' یہ ٹھیک لوگ نہیں ہیں۔''

اس نے بتایا' وہ رفع حاجت کے لیے کسی مناسب جگہ کی تلاش میں گھر کے پچھواڑے چلی گئی۔ اسے علم نہ تھا کہ یہ جگہ مردانہ بیٹھک کے عقب میں ہے۔ گھر کی خواتین کمرے میں جاکر سو چکی تھیں۔ چند گاؤں کی عورتیں کھانا کھا کر اور اپنے گھر کے لوگوں کے لیے کھانے کی پوٹلیاں باندھ رہی تھیں۔ وہ مردوں کی آواز سن کر کھلی کھڑکی سے جھانکنے لگی۔ وہ خود اندھیرے میں تھی۔ اسے دیکھے جانے کا احتمال نہ تھا۔ اس نے اندر باراتی اور دولہا کے علاوہ دو' تین مرد بھی دیکھے۔ وہ کسی سودے کی بات کر رہے تھے۔ پہلے تو وہ سمجھ نہ سکی' پھر اس کی سماعت سے ''نئی نکور' کنواری لڑکی' دلہن' راستوں سے ناواقف'' وغیرہ الفاظ ٹکرائے۔

اس نے اب بغور سنا۔ یہ سودا حلیمہ کا ہو رہا تھا' صبح فجر کی نماز کے لیے گاؤں والے جب مسجد اور کسان لوگ کھیتوں کی طرف روانہ ہو جائیں۔ تب موقع ہوگا' گاڑی گیٹ پر رہے گی' یہ لوگ شادی کے بہانے لڑکیاں لاکر فروخت کرتے ہیں۔

جلو نے اس کا سارا زیور نہایت پھرتی سے اتارا' پوٹلی باندھ کر اس کی کمر سے باندھی۔ سفید چادریں جو باہر دسترخوان کی اٹھا لائی تھی' دونوں دیہاتی عورتوں کی طرح ڈھاٹا باندھ کر کمرے سے نکلیں' صحن خالی تھا۔

چند عورتیں گیٹ کی طرف جارہی تھیں۔ حلیمہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ مگر جلو اسے پکڑ کر سنبھالتی عورتوں کے پیچھے ہی گیٹ سے باہر نکلی تھی۔ حلیمہ کے اوسان خطا تھے۔ وہ انتہائی خوف زدہ تھی۔ دل میں آیت الکرسی پڑھ رہی تھی۔ عورتوں کے پیچھے پیچھے وہ عام دیہاتی عورتوں کی طرح گلی میں آگئیں۔ گیٹ سے باہر آکر جلو کی ہمت بڑھ گئی۔ گاؤں کی عورتیں سیدھی چلتی جارہی تھیں۔

جلو نے دوسری سمت کا راستہ پکڑا۔ وہ آتے وقت راستہ دیکھ ہی چکی تھی۔ انہیں پکی سڑک پر ایک ست سا تانگہ نظر آیا۔ جلو نے حلیمہ کو دھکیلا اور خود بھی تانگے میں چڑھ گئی۔ تانگے والا بھی خدا کی طرف سے مددگار کے طور پر آیا تھا۔

جلو نے اس سے شادی میں دیر ہونے' سواری نہ ملنے کا' کھانا دیر سے لگنے کا شکوہ کرتے ہوئے' زمین دار شاہ نواز کے گاؤں جلد ہی پہنچانے پر منہ مانگا کرایہ دینے کے وعدے کے ساتھ گھوڑے کو بھی جیسے بجلی لگ گئی۔ تانگے والا بھی جوش میں آگیا اور پکی سڑک پر ہوا سے باتیں کرتے تانگے کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چند منٹ پہلے ہی گھوڑا شاید نیند میں چل رہا تھا۔

جلو اب بھی سڑک پر دیکھ رہی تھی کہ..... کوئی پیچھا تو نہیں کر رہا۔ ان لوگوں کو اگر خبر ہو گئی۔ گاڑی اسی سڑک پر..... مگر حلیمہ کا دل اب مضبوط ہو گیا تھا۔ جو طاقت اسے' اس اجنبی مکان سے بحفاظت نکال کر لائی تھی۔ وہ ہی اس کی عزت و حرمت کی بھی نگہبان ہوگی۔ اسے اللہ کی طرف سے مدد ملی تھی اور اللہ کی رحمت و مہربانی پر دل سجدہ ریز تھا۔

گاؤں کا جانا پہچانا راستہ..... رات کا پُرفسوں ماحول' کھیتوں میں ہوا کی سرسراہٹ' اف اپنے گاؤں کی حد شروع ہوتے ہی دل اندر سے سمٹ کر پھیل گیا۔ جلو نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔ چاند کب کا غروب ہو گیا تھا۔ مگر..... گاؤں کی اندھیری رات میں بھی ایک حسین دل کش روشنی تھی۔ ستاروں کی ٹمٹماہٹ' ورنہ گلیاں تو تاریک تھیں۔ وہ لوگ..... یقین نہیں کر سکے ہوں گے کہ نئی دلہن' دیہات کی پروردہ کہیں جا بھی سکتی ہے۔

ابا کے گھر کی دیواریں سامنے تھیں' مگر یہ دیواریں بھی اس کی حفاظت نہیں کر سکیں۔ گیٹ پر مولا داد

حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ تانگے سے اترتی جلو اور سفید پوش کو دیکھ کر حقہ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اتنا تو جانتا تھا کہ جلو حلیمہ کے ساتھ گئی ہے۔ جلو تانگے سے اترنے سے پہلے کرایہ مع انعام دے کر تانگے والے کو خوش کر چکی تھی۔ حلیمہ کا ہاتھ پکڑے اتر کر گیٹ کی طرف بڑھی، مولا داد گیٹ کھول چکا تھا۔

"بیٹی کو لے کر آئی ہوں، اس کا وہاں دل ہی نہیں لگا۔"

جلو مولا داد کو مطمئن کرنے کے لیے سمجھا رہی تھی اور حلیمہ کو اندر دھکیل کر خود دو، ایک باتیں مولا داد سے کر کے تیزی سے اندر گھسی۔ حلیمہ کا دل پھر سے کپکپانے لگا۔ باپ کی ڈیوڑھی چھوڑ کر سسرال سدھارنے والی، پھر سے وہیں آگئی، کیا کہے گی؟ سب پوچھیں گے۔

سرخ عروسی جوڑے میں ملبوس، ایک سفید موٹی چادر سے جسم ڈھانپے چوروں کی طرح دبے پاؤں اندر آرہی تھی۔ کیوں؟ وہ اپنے بارے میں کچھ نہ جاننے کے تاثر سے خوف زدہ برآمدے میں داخل ہوئی۔ جلو آگے بڑھ کر دادی کے کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔

حلیمہ کو آتے دیکھ کر دادی بستر سے اٹھ گئیں۔ نماز اور وظیفے سے فارغ ہو کر لیٹی تھیں۔ گھر والے اور شادی کے مہمان سونے کے لیے کمروں میں جا چکے تھے۔ جلو، دادی کو اپنے تجربے مشاہدے اور اندیشوں کو یقین سے بیان کر رہی تھی۔ دادی کی سماعت جلو کی طرف نظریں حلیمہ کی جانب تھیں۔ جو پلنگ پر یوں گری تھی جیسے پیدل بھاگتی آئی ہو۔ جلو کے بیان کے بعد دادی پلنگ سے اتر کر کھڑی ہو گئیں۔

"چلو۔" انہوں نے حلیمہ کو مخاطب کیا۔ "چادر اوڑھ لو۔"

ان کی آواز جذبات کی شدت سے کپکپا رہی تھی مگر لہجہ ہموار تھا۔

جلو بھی ان کے پیچھے حلیمہ کے ساتھ کمرے سے نکلی۔ دادی نے جلو کے ایک ایک لفظ پر یقین کر لیا۔ وہ بہت پرانی خدمت گار تھی۔ آزمائی ہوئی تھی۔

دادی اس کی فہم و فراست کی معترف تھیں۔ وفادار، سمجھ دار، اور بے غرض، دادی نے شور کرنے یا کسی کو جگانے کی کوشش نہیں کی۔ خاموشی سے باہر آئیں۔ سرونٹ کوارٹر کی طرف گئیں۔ ان کا ڈرائیور چائے کا دھتی، کوئلوں پر چائے بنا کر پی رہا تھا۔ انہوں نے گاڑی لانے کا حکم دیا اور خود حلیمہ کا ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ کوئی سوال نہ جواب، نہ سرزنش، بے آواز گاڑی تینوں خواتین کو لے کر گیٹ کی جانب بڑھی۔

مولا داد نے دوسری بار حیرانی کا اظہار کیا، مگر دادی کو دیکھ کر گیٹ کھول دیا۔ لمحوں میں گاڑی اس کی نظروں سے دور جا چکی تھی۔ حلیمہ نیم بے ہوشی کے عالم میں دادی کے کندھے سے سر ٹکائے بے سدھ بیٹھی تھی۔ ایک گھنٹے میں وہ شہر اپنے گھر پہنچ گئیں۔ دادی خاموش اور پُرسکون تھیں، صرف حلیمہ بے چین تھی۔

چچا ابا کی کوٹھی، کتنی اجنبی لگ رہی تھی۔ سفر کا وقت اس پر قیامت کی طرح گزرا تھا۔ "اب کیا ہو گا؟" اب اس کے سامنے خوف کا جنگل تھا اور وہ..... جنگلی خونخوار جانوروں کے نرغے میں۔ وہ کمرے میں جا کر مردے کی طرح پڑ گئی۔

دادی مگر چاق چوبند تھیں۔ انہوں نے حلیمہ کو لباس تبدیل کر کے آرام کرنے کا کہہ کر خود ٹیلی فون سنبھال لیا۔ وہ بڑے بیٹے شہباز کو فون کر رہی تھیں، جو حلیمہ کی شادی کے سلسلے میں گاؤں میں موجود تھے۔ لگتا تھا کہ وہاں بھی جاگ ہو چکی تھی۔ کافی آوازیں..... اور شور، دولہا والے حلیمہ کے بھاگ جانے کی خبر لے کر آئے تھے اور..... وہاں دادی کی گمشدگی معما تھی۔

"تم ان بردہ فروشوں کو پولیس کے حوالے کرو..... کسی کو چھوڑنا نہیں۔"

وقت کا تقاضا..... عزت کا معاملہ، حالات کی نزاکت، مگر وہ بھی پرانے پولیس آفیسر تھے۔ فوراً" معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے۔ ابھی دولہا والے واویلا کر کے شاہ نواز پر دباؤ ڈال رہے تھے۔ اپنے نقصان، اپنی بے عزتی اور ذلت کے تماشے پر ہنگامہ کر رہے تھے کہ..... پولیس نے ان کو گھیر لیا۔

یہ ایک ریٹائرڈ آئی جی کے حکم پر آئے تھے۔ دولہا والے نہیں جانتے تھے کہ زمیندار شاہ نواز کے بڑے بھائی مشہور پولیس افسر ہیں۔ آناً" فاناً" سین بدل گیا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر بیگم شاہ نواز کا شور تھا۔ جو حلیمہ کو موردِ الزام ٹھہرا کر اسے کوس رہی تھیں۔

صبح سب گھر واپس آگئے، مگر حلیمہ..... مردے کی طرح بے حس پڑی رہی۔ کئی دن کمرے سے باہر نکلی، نہ کسی سے بات کی، وہ بالکل گونگی ہو گئی تھی۔ ابھی تک ذہن کام کرنے سے قاصر تھا۔ یہ اس کے ساتھ ہوا کیا؟ وہ جلو کے کہنے پر فوراً" چل پڑی..... کون سا احساس اسے خبر دے رہا تھا کہ کہیں کچھ غلط ہوا ہے اور اب دادی کی پناہ، چچا ابا کی شفقت، روبی کی دلداری۔

روبی ہی اسے زبردستی کچھ کھلا پلا دیتی، ورنہ وہ گھنٹوں ایک جگہ بیٹھی رہتی۔ اسے تو لگتا تھا کہ کسی اور ہی دنیا میں ہے، خاموشی، سناٹا۔



پھر ایک دن چچا ابا اس کے پاس آئے۔ بہت پیار کیا۔ سر پر ہاتھ رکھ کر اسے سمجھاتے رہے۔ پھر انہوں نے دادی کو بتایا۔

"وہ بولا گینگ گرفتار ہو گیا ہے۔ یہ ہی کاروبار تھا ان کا، کسی بھی نئی جگہ دور دراز کے علاقے میں جا کر شادی کا ڈھونگ رچا کر لڑکی کو فروخت کرتے تھے۔ یہ تو اللہ کا کرم تھا کہ اس نے جلو کو اپنے کانوں سے پروگرام سنوا دیا۔ وہ سب اعتراف جرم کر چکے اور جیل میں ہیں۔ ہم نے طلاق لے لی ہے۔ اب ہم پر کوئی بوجھ نہیں۔ شکر ہے اللہ کا اس نے بڑی مدد کی۔"

پھر وہ اس سے مخاطب ہوئے۔

"وہ تمہارا اباپ بہت شرمندہ ہے۔ بیٹھا ہوا ہے، اس کی ہمت نہیں کہ تم سے بات کرے۔ آؤ تم خود اس سے مل لو، ورنہ یوں ہی روتا رہے گا، پچھتا رہا ہے، بس بیٹا! قسمت میں ایسا ہی لکھا تھا، کیا کریں۔"

چچا ابا اسے پکڑ کر کمرے سے باہر لائے۔ باہر کی روشن دنیا نے اس کا استقبال کیا۔ اسے لگا کہ وہ صدیوں کے بعد کسی تاریک غار سے باہر آئی ہے۔

ابا نے والہانہ انداز میں اسے لپٹا لیا، اس کا بوجھ خود بخود ہلکا ہو گیا۔ ابا بہت روئے، وہ بھی..... گو کہ ابا اسے ساتھ لے جانا چاہتے تھے، مگر..... گاؤں جانے کی اس کی ہمت نہ تھی۔ سب کو منہ دکھانا، اماں کی باتیں سننا۔

ابھی وہ اس قابل نہ ہوئی تھی، پھر آخر رفتہ رفتہ سنبھل گئی، اور دادی خود اسے لے کر گاؤں گئیں۔ اماں کی تحقیر بھری نظریں، طنزیہ جملے۔

دادی نے شاہ نواز کو پکارا۔

"شاہ نواز تمہاری بیوی کو حلیمہ کا وجود گوارا نہیں۔ اسے سمجھا دو کہ اس گھر اور زمین جائیداد کی مالک حلیمہ ہے۔ اسے حلیمہ بری لگتی ہے تو کوئی بات نہیں، اسے وہیں چھوڑ آؤ، جس گھر سے وہ یہاں آئی تھی۔"

ابا نے بھی سخت لہجے میں بیوی کو ڈانٹا، اور انہیں لگا کہ وہ اکیلی رہ گئی ہیں، اپنے میکے کا وہ چھوٹا سا گھر، کچی دیواریں اور غربت و افلاس..... اب گوارا نہ تھا۔ بہتر یہ ہی تھا کہ خاموشی سے اپنی راجدھانی میں عیش کریں۔ انہوں نے ساس سے معافی مانگ لی۔ شوہر کو خوش کرنے کے جتن کیے۔ دراصل ان کی خوشی تو حلیمہ کو خوش رکھنے کی تھی۔ بے چارے ابا پر حلیمہ کو ترس بھی آتا تھا۔ دونوں طرف سے جملوں کی زد میں تھے۔ حلیمہ کی شادی، بغیر معلومات کے محض بیگم کی عقل و دانش پر بھروسا کر کے..... انجان لوگوں میں کر کے ماں اور بھائی کے مجرم تو بن گئے تھے۔

حلیمہ سے بھی شرمندہ تھے۔ بھلا صارم کو نظر انداز کرنا..... اتنا معمولی جرم تو نہ تھا۔ وہ سب سے شرمندہ تھے۔ اور..... منتظر کہ کب بھائی ایک بار پھر ان سے حلیمہ کا ہاتھ مانگیں۔

اور وہ..... مگر اب ان کی غلطی کا ازالہ ہونے کا فی الحال امکان نہ تھا۔ بھائی بالکل خاموش، بھابھی انجان بنی ہوئی، گویا ان کو معافی ملنے میں دیر لگے گی۔

وہ کسی لمبے انتظار کے لیے تیار ہو گئے۔ حلیمہ، دادی کے ساتھ واپس آگئی۔ بغیر دادی کے اب اس کا دل گھر میں لگتا بھی نہ تھا۔ اماں نے چولا بدلا ضرور تھا۔

وہ خود نہیں بدلی تھیں۔

مگر..... یہاں بھی اس کے لیے ماحول سازگار نہ تھا۔ چچی امی مخاطب نہ ہوتیں۔ روبی بھی الگ تھلگ رہنے لگی۔ جیسے دنیا ہی بدل گئی تھی۔ باوجود چچا ابا کے یقین دلانے کے کہ وہ بردہ فروشوں کا گروہ تھا جو اعتراف جرم کے بعد جیل میں ہے۔ مگر..... چچی امی کا خیال تھا کہ.....

"پولیس والوں کا کیا اعتبار وہ ہر اعتراف کرا سکتے ہیں۔ اور پھر شہباز بھی بھتیجی کے اقدام کو صحیح ثابت کرنے کے لیے انہیں جیل کی ہوا کھلوا سکتے ہیں" اور شاہ نواز کی بیوی نے انہیں فون پر یقین دلایا تھا کہ حلیمہ کا کسی سے چکر تھا۔ اسی لیے وہ سسرال سے بھاگی۔ اب یا تو وہ کسی وجہ سے پہنچا نہیں' یا دھوکے باز ہی تھا اور حلیمہ..... کو دادی کے سوا انہیں پناہ نظر نہ آئی۔ اسی لیے وہ بغیر کسی کو بتائے اسے لے کر چلی گئیں۔

ظاہر ہے اب سسرال میں تو اس کا داخلہ ہو نہیں سکتا تھا۔ چچی امی کو بھی حلیمہ میں کئی تبدیلیاں نظر آنے لگیں۔ اس کا مہینوں سب سے منہ چھپا کر کمرے میں قید رہنا' وہ بے قصور تھی تو سب کا سامنا کر کے بتا سکتی تھی۔ ایک ملازمہ کے کہنے سے' اتنا بڑا اقدام' سمجھ میں آنے والی بات نہیں' زندگی بھی کیا رنگ بدلتی ہے۔

حلیمہ حیران تھی' زندگی اس کے لیے بوجھ بن گئی تھی۔ وہ پچھتانا چاہتی تو نہیں تھی۔ مگر..... وہ پوری عمر گزار لیتی' کبھی شکوہ نہ کرتی کسی سے' مگر..... وہ تو بات ہی کچھ اور تھی۔

جلو..... ایک تجربہ کار' سمجھ دار' زمانہ ساز عورت تھی۔ اس پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ بھلا اس کا فائدہ ہی کیا تھا۔ اگر وہ غلط بیانی کرتی' مگر وہ کسی کو بھی اپنی صفائی نہ دے سکی۔ کسی نے پوچھا ہی نہیں۔ سب یک دم انجان ہو گئے۔

☼ ☼ ☼

پھر منزہ باجی سسرال سے میکے آگئیں۔ ان کے شوہر امریکہ چلے گئے تھے۔ انہیں پہلے بھی سب سے ملنے ملانے کا بہت شوق تھا۔ اب تو آزادی مل گئی تھی۔ پھر عرشیہ خالہ کے چکر لگنے لگے۔ کبھی صارم کے لیے لڑکیوں کی تصویریں' کبھی حلیمہ کے لیے رشتے۔ ارشد منزل والوں سے خالہ کا بہت میل جول تھا۔ منزہ باجی اور روبی کے بھی ارشد منزل والوں سے اچھے تعلقات تھے۔ جب خالہ کئی بار صارم کے لیے رشتے لے کر آئیں تو صارم زچ ہو کر دل کی بات کہنے پر مجبور ہو گئے۔ باپ تو ہم نوا تھے مگر اماں..... شدت سے مخالف۔ انہیں حلیمہ' بطور بہو گوارا نہ تھی' کسی قیمت پر نہیں۔

"جو کارنامہ وہ انجام دے چکی ہے۔ اس کے بعد مجھ سے یہ توقع نہ رکھو کہ میں اسے بیاہ کر لاؤں گی' نہ میرا دل اتنا بڑا نہیں ہے۔ آنکھوں دیکھی مکھی نگلنا....."

"وہ کارنامہ..... درست تھا' اپنی عزت بچانے کی انتہائی کوشش..... کیا آپ اس وقت خوش ہوتیں' جب..... اس کے فروخت ہونے کی خبر آتی' بربادی کی۔"

"بھئی۔ ہمیں کیا پتا' کون سچ کہہ رہا ہے' کون جھوٹا ہے' اور پولیس کے ہتھے چڑھنے کے بعد' کب رہائی ملتی ہے کسی کو۔"

"اف....." صارم کا دل چاہا سر پیٹ لیں۔ "آپ کیوں زبردستی الزام لگا کر اسے مجرم بنانا چاہتی ہیں۔"

"میں کیوں مجرم بناتی' ساری دنیا کہہ رہی ہے' وہ تمہاری چچی ببانگ دہل اعلان کر رہی ہیں کہ حلیمہ کا کسی سے چکر تھا۔ باپ کی زبردستی سے چپ رہی ورنہ شادی کے دن کیسی مردنی چھائی ہوئی تھی اس پر' جوں ہی موقع ملا فائدہ اٹھا لیا۔"

صارم مشتعل ہو کر کھڑے ہو گئے۔ "وہ سوتیلی ماں..... انہیں حلیمہ کی مردنی نظر آگئی۔ آپ کو جو میری سگی ماں ہیں' میں کبھی نظر نہیں آتا' نہ مرا دل' نہ چہرہ۔"

"اوفوہ..... دنیا کی زبان کون روک سکتا ہے۔ سننے کی کوشش تو کرو' لوگ کیا کہتے ہیں۔ لو جی! ایک معمولی ملازمہ کی آڑ لے کر' پوتی نے دادی کو بھی ڈرامے میں

شامل کر لیا۔ اور دادی صاحبہ پوتی کو بغل میں لے کر چل پڑیں۔"

صارم ماں کی زبان ہی نہیں پکڑ سکے تو دنیا کا مقابلہ کیسے کر سکتے تھے۔ ان کے پاس ایک ہی حل تھا۔ کسی بھی لڑکی سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ۔

☼ ☼ ☼

اب تو تین سال گزر گئے تھے۔

حلیمہ نے یونیورسٹی میں داخلہ لے کر تعلیم مکمل کرنے کی ٹھانی۔ ایک سال پہلے ہی ضائع ہو چکا تھا۔ اب اسے صبر آگیا تھا۔ اس نے لوگوں کی پروا کرنی چھوڑ دی اور دنیا کے معاملات میں حصہ لینا شروع کر دیا۔

اب بھی وہ گاؤں جانے کے لیے صارم کی اجازت ضرور لیتی تھی۔ انہیں ہی تو اعتراض ہوتا تھا۔ دادی اب سفر کرنے میں بہت تھک جاتی تھیں' سو بہت ہی کم جاتی تھیں۔

ارشد منزل والوں کے ہاں سے بلاوا آیا تھا۔ زوبی کی شادی کی تاریخ طے ہونے جا رہی تھی' دادی کو بحیثیت بزرگ خصوصی طور پر بلایا تھا۔ حلیمہ کو بھی وہ خود کہنے آئی تھیں' گو کہ یہ اتنی اہم تقریب تو نہ تھی مگر..... ارشد چچی کو ہر موقع پر ہجوم اکٹھا کرنے میں لطف آتا تھا۔ دادی کی بہت آؤ بھگت ہوئی۔ حلیمہ کو خصوصی طور پر ارشد چچی نے پیار بھرے شکوے سے شرمندہ کر دیا۔

"بہت اچھا لگ رہا ہے کہ تم بھی ہمارے گھر آئیں۔ مجھے تو لگتا تھا تم نے ہم لوگوں سے پردہ کر لیا ہے۔ بیٹا! سب سے ملنا چاہیے' ہم غیر نہیں ہیں' اپنا خاندان ہی ہیں۔ تمہارے لیے تو خاص طور پر ہمارے دل میں جگہ ہے کہ تم شاہ نواز بھائی اور فرخندہ آپا کی اکلوتی بیٹی ہو۔"

زوبی اسے اپنے کمرے میں لے گئی اور سسرال والوں کے بارے میں بتانے لگی۔ گھر میں خاصی چہل پہل تھی۔ سسرال والے آ گئے تو لاؤنج میں سجی لمبی سی کھانے پینے کے لوازمات رکھے جانے لگے۔ حلیمہ بھی روبی' زوبی کے ساتھ مصروف ہو گئی۔ بزرگ لوگ اندر شادی کی تاریخ طے کر رہے تھے۔ لڑکیاں گانے گا رہی تھیں۔ حلیمہ' زوبی کے پاس بیٹھی رہی' پھر کئی لڑکیاں زوبی کو مبارک باد دینے آگئیں۔ ایک خاتون حلیمہ سے متعارف ہونا چاہ رہی تھیں۔ انہیں یہ سادہ اور معصوم صورت لڑکی بہت پسند آئی۔ زوبی نے کچھ سوچ کر کہا۔

"ارے یہ صارم بھائی کی کزن ہیں۔" وہ صاحبہ چونک گئیں۔

"اچھا....." بہت پُرجوش انداز میں حلیمہ سے ہاتھ ملا کر بتایا۔

"میں فائزہ ہوں' صارم میرے کلاس فیلو رہے ہیں۔ ہماری بہت اچھی دوستی تھی۔ صارم بے حد شریف اور لائق اسٹوڈنٹ تھے۔ وہ آج آئے نہیں۔ ورنہ ہم پرانی یادیں تازہ کرتے اور ہاں زوبی کی میرے خالہ زاد بھائی سے شادی ہو رہی ہے۔ ملاقات رہے گی ان شاء اللہ۔"

وہ صارم کی باتیں کرتی رہیں' پھر حلیمہ کمرے سے باہر جا رہی تھی' تو اس نے سنا' فائزہ زوبی سے سرگوشی میں پوچھ رہی تھیں۔

"کتنی پیاری لڑکی ہے' صارم سے کیوں شادی نہیں ہوئی؟ یا..... پھر....."

زوبی نے کیا کہا' حلیمہ کچھ سننے سے پہلے باہر آگئی۔ وہ جانتی تھی زوبی نے انہیں بتا دیا ہو گا اور گل پھندنے لگا کر بتایا ہو گا۔ اس کا دل یکدم ہی بے زار ہو گیا' مگر وہ ابھی گھر نہیں جا سکتی تھی۔ پھر مہمانوں کے جانے کے بعد گھر میں رہ جانے والی رشتے دار خواتین ایک جگہ جمع ہو کر باتیں کرنے لگیں۔ دادی کے آس پاس سب بیٹھی تھیں' تب ہی ارشد چچی نے پوچھ لیا۔

"خالہ جان! حلیمہ کے بارے میں آپ نے کیا سوچا؟" سوال تو دادی سے کیا تھا۔ جواب ان کی بہو کی طرف سے آیا۔

"ہم کیا سوچیں۔ اس کے باپ زندہ ہیں۔ یہ ان کا کام ہے۔" چچی امی تلخی سے بولی تھیں۔

"میرا مطلب ہے کوئی رشتہ وغیرہ۔ بچی پر خوامخواہ داغ لگ گیا۔ ورنہ ہے تو آخر کنواری' پھر اتنی معصوم' خوب صورت۔"

"ہاں... مگر... داغ دار چیز کون پسند کرتا ہے۔ سب کو شفاف' بے داغ بہو کی تلاش ہوتی ہے۔" چچی امی دراصل اپنی خواہش بیان کر رہی تھیں۔

"خیر بھابھی! غیروں کی تو اور بات ہے۔" ارشد چچی ہمت ہارنے والی کب تھیں۔ "اپنوں کو تو سارے واقعے کا علم ہی ہے۔ غلطی بھی اپنی تھی۔ غیروں میں اپنے جگر کا ٹکڑا دیتے ہوئے بہت چھان پھٹک کرنی پڑتی ہے۔ مگر شاہ نواز بھائی کی سادگی' خیر سب اچھا ہو گیا' اب دیکھیں' صارم کے ساتھ جوڑ بھی ہے' رشتہ بھی قریبی۔"

چچی امی بلبلا گئیں۔ "لو' جب پہلے رشتہ دیا تھا تب تو وہاں سے ٹکا سا جواب ملا' جب نہیں تو اب کیسے ہو سکتا ہے' میرا بھی اکلوتا بیٹا ہے' بہت دیکھ بھال کر چھان پھٹک کر کروں گی' کسی اونچے خاندان کی بے داغ لڑکی۔"

"غیروں سے اپنے پھر بھی اچھے ہوتے ہیں بھابھی!" ارشد چچی اپنی ضد پر اڑی رہیں۔

"ایک بار اور سوچ لیں' بیٹیاں اپنے گھر چلی جائیں گی' غیر لڑکی آکر پتا نہیں کیا سلوک کرے گی آپ سے' بڑھاپا آرہا ہے' بہو سے ہی واسطہ پڑے گا۔"

چچی امی اٹھیں۔ "دیکھوں' یہ ڈرائیور کھانے سے فارغ ہوا کہ نہیں۔"

کہتی ہوئی باہر چلی گئیں۔ حلیمہ کا جی چاہا کاش اس کے پاس سلیمانی ٹوپی ہوتی' جسے پہن کر سب کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی یا سماعت ہی مفلوج ہوتی کہ کچھ سن نہ سکتی۔ اتنی ذلت... راستہ اس قدر طویل ہو گیا کہ جیسے ختم ہی نہ ہو گا' گھر پہنچتے ہی... وہ دادی کے کمرے میں جا گھسی' مگر لاؤنج میں بیٹھے صارم اور چچا ابا کی شامت آگئی۔

"سنیے' اب اگر کسی نے مجھے مشورے دیے صارم کے سلسلے میں تو میں چپ نہیں رہوں گی' بھئی آپ کو بہت پسند ہے حلیمہ' تو اپنے بیٹے سے کیوں نہ کر دی شادی' اب بھتیجے' بھانجے بھی ہیں خیر سے' کر لیں ان سے' اب میں کسی کے منہ سے حلیمہ کا نام نہ سنوں' بتا دیا ہے میں نے۔"

"کیوں بھئی' اس نام میں کیا خرابی ہے؟" چچا ابا بے حد حیران ہوئے۔ "اتنا پیارا نام ہے' میں نے ہی رکھا تھا۔ اگر آپ کو پسند نہیں تو اپنی مرضی کا کوئی نام پکار لیا کریں۔"

"معصوم نہ بنیں' صاف بات ہے میں صارم کے نام کے ساتھ اس کا نام لینا پسند نہیں کروں گی' سن لو صارم... میں ہرگز تمہاری شادی حلیمہ سے نہیں کروں گی۔ یہ میں طے کر چکی ہوں' بس... اب اپنی مرضی سے کسی بھی لڑکی سے کروں گی۔ ایسی لڑکی جو میرے معیار پر پوری اترے' میرے گھر میں رہنے کے لائق ہو۔"

"بیگم! توبہ کرو' اللہ کو برا لگ سکتا ہے' اتنا غرور نہیں کرنا چاہیے۔" چچا ابا نے سمجھایا' چچا ابا کو خود حلیمہ پسند تھی۔ مگر چچی امی کی اپنی ساس سے بھی جھڑپ ہو گئی۔

صارم کے سلسلے میں انہوں نے صاف کہہ دیا۔ وہ صارم کی قسمت خود بنائیں گی' بہت اعلا خاندان کی بہت نفیس لڑکی سے بیاہ کر کے۔

"چاہے وہ صارم کو پسند نہ ہو؟" دادی نے پوچھ لیا۔

"ہاں... چاہے اسے اچھا لگے یا نہ لگے' میں اسے عروج پر پہنچانا چاہتی ہوں۔ اس کی تباہی نہیں دیکھ سکتی۔ آپ کی تو وہ بھانجی کی بیٹی ہے' آپ کو تو پسند ہو گی ہی۔ اگر وہ میری بھانجی ہوتی' تب بھی میں اس کے مشکوک کردار کی وجہ سے یہ پسند نہ کرتی۔"

پھر چچی امی نے لڑکیوں کی تصویریں دیکھنی شروع کر دیں' صارم کا انکار بڑھتا گیا۔ حلیمہ کو اپنی زندگی دوبھر لگنے لگی۔ مگر دادی نے اسے سنبھال لیا تھا۔ گاؤں میں اماں نے اب کم آمدنی' مہنگائی' گزارا مشکل ہے' ہونے کا واویلا شروع کر دیا تھا۔

مجبوراً" حلیمہ ابا کے کھیتوں میں کام کرنے لگی۔

گندم کٹائی' کپاس چنائی کے وقت وہ وہیں ہوتی' ابا خود نگرانی کرتے تھے۔ حساب سے اسے بھی اجرت مل جایا کرتی۔ ابا کے لیے یہ کم تکلیف دہ عمل نہ تھا' مگر حلیمہ کے زور دینے پر' انہیں بھی گھر کے سکون کی خاطر' اس تجویز میں کوئی خرابی نظر نہ آئی۔

"گاؤں جا کر کھیتوں میں مزدوری کرنے سے یہ بہتر نہیں کہ شہر میں کوئی جاب کر لو۔ جاہل تو نہیں ہو تم۔" صارم نے چڑ کر مشورہ دیا' مگر وہ جانتی تھی۔

جاب کرنے کا مطلب ہے دنیا کی زبانیں' پھر سے اس کے کردار کے پرخچے اڑائیں۔ جب چچی امی اس کے کردار سے مطمئن نہ تھیں تو غیروں کا تو کہنا ہی کیا تھا۔ ان کے اعتراضات پر وہ اب زیادہ وقت کمرے میں گزار دیتی' گھر کے کام بہت کم کر دیے۔ بلکہ عرشیہ خالہ کے آنے پر ان کی فرمائش پر ہی کچن کا رخ کرتی ورنہ دادی کے پاس بیٹھی رہتی۔ گھر میں بھی آخر کب تک خالی بیٹھی رہتی۔ ابا کا فون آیا تو اس نے ان سے جاب کرنے کی اجازت مانگی' وہ بھی راضی نہ تھے۔

"دیکھو بیٹا! تم وہاں گھر میں ہو' اماں اور بھائی جان کی پناہ میں' مجھے بھی بے فکری رہتی ہے۔ گھر سے باہر نکلنے والی لڑکیوں کو سو طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مجھے پریشانی رہے گی کہ تم کسی بڑی الجھن میں گرفتار نہ ہو جاؤ' پیسوں کا کیا ہے' تم میری ذمے داری ہو' جتنے چاہو میں دوں گا' مگر تم خود ہی یہاں آکر کھیتوں میں کام کرتی ہو' مجھے بھی اطمینان رہتا ہے کہ میری نظروں کے سامنے ہو' اس بہانے میں تم سے مل لیتا ہوں' تم بھی گھر کی چپقلش سے دور ہوتی ہو' مگر جاب کر کے تم وہیں رہو گی' گاؤں نہیں آسکو گی' روز چھٹیاں تو نہیں ملیں گی۔" چلو بات ہی ختم۔

ارشد چچی' دادی کو حلیمہ کے لیے نت نئے رشتے بتایا کرتیں۔

"دیکھو بی بی! حلیمہ مجھ پر بوجھ نہیں ہے' نہ اتنی دوبھر کہ کسی دوہاجو کو پسند کر لوں' کوشش تو میری یہی ہے کہ اب بہتر سے بہتر رشتہ تلاش کروں' باقی اس کی قسمت۔"

دادی اسی قسم کا جواب دیتیں' چچی امی کو سخت ناگوار ہوتا۔

"ہاں بھئی' اس شہزادی کے لیے کوئی شہزادہ ہی آئے گا۔" وہ چڑ جاتیں۔

آخر ایک دن بول پڑیں۔ "اماں جان! آپ صارم کا انتظار تو کریں نہیں' وہ میرا بیٹا ہے' میرا بھی اس پر حق ہے' میں جہاں چاہوں گی اس کی شادی وہیں ہو گی' اور اگر آپ کو حلیمہ کے لیے صارم کا ہی رشتہ چاہیے تو پھر میری موت کا انتظار کریں' کیونکہ میری زندگی میں تو ایسا ہو نہیں سکتا۔"

دادی ہکا بکا ہو گئیں اور حلیمہ شرم سے پانی پانی' انہوں نے اسی پر بس نہیں کیا' حلیمہ سے بھی کہا۔

"بس بی بی! بہت ہو چکا اپنی دادی سے کہو' جیسا رشتہ آئے تمہیں رخصت کر دیں' میں زیادہ دن تمہیں اپنے گھر برداشت نہیں کروں گی' میرا بیٹا بے چین رہتا ہے اور گھر میں چپقلش رہتی ہے' مجھے بھی سکون چاہیے۔"

☼ ☼ ☼

حلیمہ اسی دن گاؤں چلی گئی۔ صارم آئے تو خبر ملی' انہوں نے اماں سے کچھ کہا' نہ بہنوں سے ہی کچھ پوچھا۔ دادی سے بات ہوئی' وہ بھی کیا بتاتیں۔ سرد آہ بھر کر رہ گئیں۔ صارم سمجھ گئے' کوئی بات اتنی ہی بری لگی ہو گی کہ صارم سے کچھ کہے بغیر وہ چلی گئی۔

اب صارم کمرے کے مکین رہ گئے' خاموشی ان کی ذات کا جزو بن گئی' کمرا بند کیے لیٹے رہتے۔ اماں کے سوالات' بہنوں کے بہلاوے' سب خاموشی اور اداسی کی نذر ہو گئے۔ پھر آفس کے کام سے دبئی چلے گئے۔ لمبے عرصے کے لیے۔ گھر میں اداسی اور سناٹا ہو گیا۔ دبئی سے انہیں آسٹریلیا جانا پڑا۔ وہاں نئے آفس کی تیاری ہو رہی تھی۔

حلیمہ کو بھی علم ہو گیا۔ وہ جانتی تھی چچی امی اسے ہی صارم کے جانے کا سبب سمجھ رہی ہوں گی' وہ خود ہر معاملے سے الگ تھلگ رہتی تھی' سب کی خدمت

کرتی۔ ہر کام میں حصہ لیتی کہ گھر میں رہ کر مہمان بنے رہنا اسے پسند نہ تھا' پھر بھی اور جب سب کچھ چھوڑ کر الگ ہو گئی پھر بھی اُسے گھر کی بے سکونی کا سبب سمجھا گیا۔ کیوں سب اچانک اس سے متنفر ہو گئے؟ اس نے خود تو کوئی غلطی نہیں کی تھی۔

حلیمہ جانتی نہ تھی۔ دنیا تاریک پہلو پر ایمان رکھتی ہے' برائی قبول کرنے میں ایک منٹ نہیں لگتا۔ روشن پہلو دیکھنے میں سب بے انتہا بخیل ہوتے ہیں۔ کسی نے اسے شاباشی نہیں دی' کوئی اس کے بربادی سے بچنے کے اقدام کو سراہ نہ سکا' ہاں تجسس اور شکوک کا اظہار..... یہ نام نہاد شادی اس کے لیے سزا بن گئی۔ وہ گاؤں جا کر بھی مطمئن نہ تھی۔ وہاں اماں اس کو کچوکے لگاتیں۔



اور پھر وہ ہو گیا' جس کی کسی کو امید نہ تھی۔

ارشد منزل والوں کی طرف سے آیا ہوا ایک رشتہ دادی کو پسند آگیا۔ لڑکا امریکہ میں رہائش پذیر تھا۔ چھوٹی بہن کی شادی میں شرکت کے لیے آیا تھا' زوبی کی کوشش' چچی امی کا اصرار کہ صارم کے آنے سے پہلے یہ کام ہو جائے۔ دادی نے بھی بہتر سمجھا' وہ مزید کوئی الجھن مول لینا نہیں چاہتی تھیں۔ دادی کی بیماری کا سن کر حلیمہ اَبا کے ساتھ آگئی۔ فوری طور پر نکاح کی تجویز اس لیے بھی تھی کہ لڑکا واپس جا کر ویزا کی کوشش کرلے گا۔

نکاح کے ساتھ رخصتی بھی ہو گئی۔ بہن کی شادی کے سلسلے میں رفیق (دولہا) کو ابھی یہاں رکنا تھا' موقع غنیمت تھا' بہن کی شادی کے دن بھائی کا ولیمہ بھی ہو گیا۔ حلیمہ پھر اجنبی لوگوں میں آگئی تھی' مگر یہاں فائزہ اور زوبی مل گئیں۔ فائزہ' صارم کی کلاس فیلو' ان صاحبہ کو حلیمہ بہت پسند آئی تھی۔ رفیق ان کا بھی رشتے دار تھا' نند کی شادی تو ہو گئی' مگر بعد کے معاملات حلیمہ نے سنبھالے' چوتھی کی رسم' پھر دعوت' زوبی اور فائزہ مددگار تھیں' چونکہ رفیق کی بڑی بہن آسٹریلیا میں تھیں۔ وہ شادی میں نہیں آسکیں۔

ساری ذمے داری فائزہ نے اٹھائی' حلیمہ کو دیکھ کر کوئی یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ یہ نئی دلہن ہے۔ لگتا تھا وہ برسوں سے ان لوگوں کے ساتھ رہتی آئی ہے۔ حلیمہ کی ساس اس سے بہت خوش تھیں' اس کا کریڈٹ فائزہ کو ملا۔ حلیمہ' فائزہ کی دریافت تھی۔ رفیق کو اس سے بہتر بیوی مل نہیں سکتی تھی۔ اس کی سسرال والوں کا خیال تھا۔

صارم آسٹریلیا سے دبئی اور وہاں بھی برانچ کے کاموں سے نمٹ کر واپس آگئے۔ حلیمہ کی شادی کی خبر..... کسی بم کی طرح ان کے اعصاب کے پرخچے اڑا چکی تھی۔ انہوں نے کسی سے کچھ نہیں پوچھا دادی سے بھی اس سلسلے میں بات نہ کی۔

ایک دن جب وہ دولہا کے ساتھ آئی ہوئی تھی' دادی نے صارم کو رفیق سے ملوایا۔ چند منٹ کی ملاقات اور بس' انہوں نے حلیمہ کو نظر بھر کر دیکھا بھی نہیں' وہ چلی گئی' دادی نے انہیں گم صم دیکھ کر کہا۔

"بس بیٹا! جو بہتر لگا میں نے وہ ہی کیا' خود کو اور حلیمہ کو الزام سے بچانے کے لیے' حلیمہ کو اس جرم سے بری کرنے کے لیے' جو اس نے نہیں کیا' تمہاری ماں نے مرنے کی دھمکی دی تھی' کیسے انتظار کرتی تمہارا۔"

"دادی! میں نے آپ سے کہا تھا میری زندگی حلیمہ کے بغیر ناممکن ہے اور آپ نے مکمل کرنا ہی نہیں چاہا۔" صارم ضبط کی آخری حد پر تھے۔

"میں نے جو چاہا تھا وہ نہ کر سکی' گھر والوں کو حلیمہ میں عیب ہی عیب نظر آرہے تھے۔" دادی بھی بے بسی کے عالم میں پوری بات بتا نہ سکیں کہ تمہاری ماں کا اصرار تھا صارم کی غیر موجودگی میں حلیمہ رخصت ہو جائے۔ ورنہ اتنی جلدی بھی نہ تھی۔ لڑکے کو ابھی یہیں رکنا تھا' ایک ہفتہ بعد بھی نکاح ہو سکتا تھا۔ صارم کے آنے کے بعد اب کیا ہو سکتا ہے' صارم مٹھیاں بھینچے ہوئے کمرے میں ٹہلنے لگے۔

"بیٹا! میں نے حلیمہ سے پوچھ لیا تھا کہ وہ چاہے تو تمہارا انتظار کرے' اس نے بھی یہ ہی چاہا کہ کسی بڑی الجھن سے بچنے کے لیے' جو کام بعد میں ہونا ہے وہ تمہارے آنے سے پہلے ہو جائے' بس بیٹا! یہ ہی اس کی قسمت ہے' صبر کے سوا اب....."

صارم نے بندھی مٹھی ماتھے پر ماری' دانت کچکچا کر بولے۔ "قسمت..... ہر بات قسمت کے سپرد' ہر کام قسمت پر..... قسمت کو کیوں مورد الزام ٹھہراتی ہیں آپ لوگ' خود اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق عمل کر کے کہتے ہیں یہ قسمت میں تھا' پہلے بھی اس کی قسمت پر تھوپ دیا۔"

شدید غصہ تھا' دادی رونے لگیں' وہ بھی ان کے کندھے پر سر رکھ کر روئے' پھر خود کو سنبھال کر بولے۔

"آج میں ہار گیا' میں جو سمجھتا تھا ایک وقت آئے گا کہ..... مگر میں اب ہار چکا ہوں' مجھے اللہ سے امید ہے وہ مجھے قسمت پر حاوی ہونے کا راستہ دکھائے گا' میں نے اللہ سے ہی حلیمہ کو مانگا تھا' آپ نے تو کبھی امید دلائی ہی نہیں۔"

وہ فوراً" کمرے سے باہر نکل گئے۔ دادی آنسو پونچھتی رہیں' اِس وقت وہ غصے میں تھے' ناکامی' مایوسی کا غلبہ تھا۔ دوسرے دن دادی نے ساتھ بٹھا کر سمجھایا۔

"وہ اپنی نحوست کو تمہارے گھر سے دور کرنا چاہتی تھی' یہ رشتہ نہ ہوتا تو دوسرا بھی تھا۔ وہاں گاؤں میں ماں نے زندگی اجیرن کر دی' یہاں تمہاری ماں اسے تمہارے راستے کا پتھر سمجھ رہی تھیں۔ اس نے بھی خود کو پتھر سمجھ لیا تھا' جو تمہاری منزل کے راستے میں رکاوٹ تھا۔ اس نے تمہارا راستہ صاف کر دیا' سب اس کے فیصلے پر خوش ہیں۔"

صارم کا جی چاہا اپنے بال نوچ لیں۔

لیکن اب بے بسی اور کچھ نہ کر سکنے کے احساس کے علاوہ کچھ نہ بچا تھا۔



رفیق جا چکا تھا اور سب کاغذات مکمل ہو گئے۔ ویزا بھی آگیا۔ حلیمہ ملنے آئی تو دیر تک دادی کی آغوش میں چھپی روتی رہی۔ آنسو آبشار بن گئے۔ دادی بھی پریشان ہو گئیں' بمشکل اسے بہلا کر چپ کرایا۔

"بیٹا' میری جان! اللہ نے چاہا تو پھر ملیں گے' تم آؤ گی اور میں تمہارا انتظار کروں گی' خوشی خوشی جاؤ۔"

"دادی! امریکہ بہت دور ہے۔" اسے سب سے دوری رلا رہی تھی۔

"ہاں تو لوگ وہاں سے آتے ہی ہیں' میں رفیق میاں سے کہوں گی وہ تمہیں ضرور ایک سال کے بعد بھیج دیں گے۔" دادی تسلی دیتی رہیں۔

چچی امی سے اس نے بہت لجاجت سے معافی مانگی۔ انہوں نے کھلے دل سے معاف کر دیا۔ (کانٹا جو نکل گیا تھا) آنسوؤں سے چہرہ دھو کر وہ گھر کے باہر آئی' لان تک پہنچی تھی کہ صارم آفس سے آتے ہوئے ملے۔ دونوں اپنی جگہ ٹھٹھک گئے' پھر وہ ان کے پہلو سے نکلنے کے لیے ایک طرف ہو گئی۔ صارم نے بغور دیکھا۔

"بہت جلدی میں ہو؟" پوچھنے پر مجبور ہو گئے۔

"جی..... صبح چار بجے کی فلائٹ ہے میری' رات کو ارشد منزل میں دعوت بھی ہے۔"

"کچھ دیر رکو گی نہیں؟"

"نہیں' دیر سے آئی ہوئی تھی' وقت کم ہے میرے پاس' آپ نے آفس سے آنے میں دیر کر دی۔"

"ہاں' میں ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں اور تمہارے پاس میرے لیے وقت کم پڑ جاتا ہے۔"

وہ چونک گئی' ان کا لہجہ زخمی تھا۔ "آپ کو مجھ سے کوئی کام تھا؟"

"کام..... صرف کام؟ تم نے بہت کام کیے' سب کو آرام بھی پہنچایا' لیکن میں کیوں نہ سمجھ پایا کہ تم کو اتنی جلدی ہو گی' تم میرا انتظار بھی نہیں کر سکیں' کچھ کہہ کر وقت کو آگے بڑھا سکتی تھیں۔"

انہیں اندازہ ہوا حلیمہ کے چہرے پر سرخی ہے' شاید اسے یہ مشورہ پسند نہ آیا تھا۔

"کیسا انتظار؟ کیا آپ نے کہا تھا کہ میں آپ کا انتظار کروں؟"

"میں ملک سے باہر تھا' یہ موقع مناسب سمجھا شادی کے لیے' کیا مجھے شکوے کا حق نہیں؟"

"حق؟ پہلے کون سے حق ادا کیے آپ نے؟ جواب شکوے کا حق بھی چاہتے ہیں اور جہاں تک شادی کا تعلق ہے' موت کی طرح شادی کا بھی وقت مقرر ہے اور میں اتنی بااختیار کبھی نہ تھی کہ وقت بڑھانے کی کوشش کرتی اور کس لیے؟"

"میرے لیے۔" ان کے لہجے میں عجب سا اضطراب تھا' بے قراری' "کیا تمہیں میرا انتظار واجب نہ تھا۔ میں اتنی بھی اہمیت نہیں رکھتا تمہاری زندگی میں؟"

حلیمہ کے چہرے پر سرخی بڑھ گئی۔ ہونٹ کپکپائے' کچھ کہنے کی کوشش کی' پھر شاید ضبط سے کام لے کر عام سے لہجے میں پوچھنے پر مجبور ہو گئی۔

"کس قسم کی اہمیت چاہتے ہیں آپ؟ میں سمجھی نہیں۔" کوشش کے باوجود وہ آواز کی لرزش پر قابو نہ پاسکی۔

"ہاں.... یہ غلطی تو مجھ سے ضرور ہوئی' اپنے جذبات کو زبان نہ دے سکا' مگر کیا میرے جذبوں میں اتنا اثر نہ تھا کہ تم خود سمجھ سکتیں' میں کیا چاہتا ہوں؟ تم اتنی ناسمجھ تو نہیں ہو۔"

"میں اب بھی نہیں سمجھی۔"

"اچھا.... تو سنو' تمہاری زندگی میں اپنی اہمیت' بطور شریک حیات۔"

حلیمہ ہکابکا ہو گئی' اتنا سیدھا صاف جواب' اب وہ نہ سمجھنے کا بہانہ کیسے کرے۔

"یہ.... میرے سمجھنے کی بات ہے' نہ آپ کے سمجھانے کی' لیکن شاید آپ ابھی تک مجھے نہیں سمجھ سکے۔ میں حلیمہ اپنی خودداری' انا اور وقار کو سب سے زیادہ اہمیت دیتی ہوں۔ معاف کیجیے صارم بھائی! آپ کی زندگی میں میری کچھ اہمیت ہو بھی تو آپ کے گھر میں' نہ میری اہمیت ہے' نہ گنجائش۔ آپ کچھ بھی کرلیں' مجھے وہ عزت نہیں دے سکتے' جس کی میری زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت ہے۔"

لہجے میں شعلوں کی لپک تھی' تو الفاظ دھواں دے رہے تھے۔

"میں اتنی بھی کم حیثیت اور ادنیٰ ہستی نہیں کہ سب کی حقارت اور بے عزتی برداشت کرتی رہتی' کاش مجھ سے کچھ کہنے سے پہلے آپ اپنی اماں اور بہنوں کو اپنی زندگی میں میری اہمیت کا احساس دلانے میں کامیاب ہو جاتے۔ سوری' یوں بھی وقت گزر چکا' لکیر پیٹنے سے حاصل کیا؟ اب اس اظہار کی ضرورت تو نہیں تھی۔ میں حلیمہ شاہ نواز نہیں' حلیمہ رفیق ہوں' اور مطمئن ہوں اپنی حیثیت سے۔"

وہ ان کے پہلو سے سمٹ کر نکلی اور گیٹ کے باہر چلی گئی۔ جہاں اس کی سسرال سے گاڑی آگئی تھی۔

صارم بے بسی سے اسے باہر جاتا دیکھ رہے تھے۔ الفاظ سے بھی زیادہ تلخ وہ مسکراہٹ تھی' جو حلیمہ کے چہرے پر کبھی دیکھی نہیں تھی۔ طنزیہ مسکراہٹ' جو چلتے چلتے انہیں ناکامی کا احساس دلا گئی۔ صارم کو اپنا وجود پتھر کی طرح لگا۔ آئینہ دکھا کر انہیں شرمندہ کر کے وہ جا چکی تھی۔ کاش! وہ آج بھی کچھ نہ کہتے۔ خود اس پر آشکار نہ ہوتے۔ اپنا بھرم خود ہی کھو دیا۔ اس نے اپنی عزت کا بھرم رکھنے کے لیے ان کی غیر موجودگی میں ان کے راستے سے ہٹ جانے کو کس لیے ترجیح دی' وہ جان چکے تھے۔ ہاں اب وہ ان کی نہیں بن سکتی۔

وہ حلیمہ رفیق بن چکی تھی۔ ان پر گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔ اتنی آسانی سے وہ ان کی محبت کی تحقیر کر کے چلی گئی۔ انہیں اپنی مضبوط اور پاکیزہ محبت پر کتنا یقین تھا۔ اپنے جذبوں کی شدت سے وہ ہی واقف تھے۔ شاید کسی کو بھی احساس نہ ہوا یا وہ کسی پر ظاہر نہ کر سکے' دادی کے سوا۔

صارم کی زندگی میں نہ کوئی خوشی رہی' نہ ولولہ' نہ کوئی امید' وہ گھر والوں سے بھی بے نیاز ہو گئے۔ اپنا آفس' اپنا بیڈ روم.... باغیچے میں شام کی چائے پینا تو اب قصۂ پارینہ تھا۔ سب کے ساتھ ناشتا' کھانا' گزرے دنوں کی عیاشی کے سوا اور کیا تھا۔ بات چیت' کسی کا حال پوچھنا' بہنیں گھیر گھار کر لاتیں' قصہ سنانا

چاہتیں' کوئی لطیفہ بیان کرتیں۔ خود ہی ہنستی رہتیں وہ تو بے زاری کے عالم میں کھڑکی کے باہر پودوں پر پھدکتی چڑیاں دیکھتے رہتے۔

خالہ کے پاس لڑکیوں کی نئی فہرست تھی۔ تصویریں انہیں دکھائی جاتیں۔ وہ اٹھ کر کمرے میں چلے جاتے۔ دادی کے پاس بھی جا کر خاموش رہتے' وہ تاسف سے کہتیں۔

"کیا ہو گیا ہے میرے بچے کو' ہنسنا بولنا بھول گیا ہے' بیٹا کچھ کہو' دل میں رکھنے سے گھٹن بڑھتی ہے' دل کو کھلا رکھو' ورنہ بیمار ہو جاؤ گے۔"

"کچھ نہیں ہوتا دادی! جیسا ہے ویسا ہی رہے تو بہتر ہے' میں کس کے لیے دل کو کھولوں' دل تو بند ہونے کے لیے ہوتا ہے۔" صارم کے لہجے کا درد دادی سے برداشت نہ ہوتا تھا۔ وہ سب سمجھتی تھیں۔ صارم کو کون سا دکھ اندر اندر گھن کی طرح کھا رہا ہے۔ آخر کھل کر بات کرنی پڑی۔ حلیمہ کی مجبوری۔ ان کی اماں کے مرنے کی دھمکی۔ حلیمہ سے خود صاف بات کر کے اسے گھر سے جانے پر مجبور کرنا اور ارشد منزل والوں سے حلیمہ کی شادی کے لیے رشتہ تلاش کرنے کا تقاضا۔

"اس طرح میں بھی مجبور ہو گئی' یہ رشتہ بھی زوبی کی سسرال سے آیا۔ تمہاری ماں کی ضد تھی کہ فوراً شادی ہو۔"

صارم کو شک تھا کہ اس فوری شادی میں گھر والوں کا ہاتھ ہے۔ یہ علم نہ تھا کہ خود حلیمہ سے ہی کہہ دیا گیا.... اب اماں نے بیٹے کی خوشامد شروع کر دی۔ وہ بے زار ہو گئے۔ اماں سے تو کچھ کہتے نہ تھے۔ دادی سے ہی کچھ بات کر لیتے۔ اماں کو یہ بھی ناگوار تھا' مگر بیٹا چپ کا روزہ رکھے' دادی کے کمرے میں ہی افطار کرتا۔

"آپ نے کچھ بتایا نہیں کہ اماں' حلیمہ سے اس درجے بے زار تھیں۔"

"کئی دفعہ بتانے کی کوشش تو کی تھی' کیا تم نے خود محسوس نہیں کیا اور حلیمہ خود بھی اپنے وقار کی خاطر' راضی ہو گئی تھی اور بیٹا تم بھی کیا کر لیتے۔"

"مجھے علم ہوتا تو کم از کم اس شادی کو روک لیتا' مگر سب نے خفیہ طور پر خاص طور پر میری غیر موجودگی میں یہ ڈرامہ رچایا۔ ابا جان بھی کچھ نہ بولے۔"

"جو ہونا تھا وہ ہو گیا' اب تم اس بات کو بھول جاؤ' کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کرو' گھر بساؤ' سب خوش ہوں گے' تم بھی نئی زندگی میں رچ بس کر سب بھلا دو گے۔"

"بھلانا ہی تو نہیں چاہتا۔" وہ اٹل لہجے میں کہہ کر وہاں سے آگئے۔ دادی پھر نصیحتیں شروع کر دیتیں۔

اچانک صارم کے لیے ایک اور صدمہ۔

ابا جان ہارٹ اٹیک کے نتیجے میں ختم ہو گئے۔ صارم پر ذمہ داریوں کا بوجھ بڑھ گیا۔ ماں کی دلداری' دادی کو سنبھالنا' جوان کے بڑھاپے میں سب سے بڑا صدمہ تھا۔ وہ بے حد کمزور ہو گئیں' مگر اللہ کی رضا کے آگے انسان بے بس ہوتا ہے۔ سب نے جلد ہی اس غم کو برداشت کر کے دنیا کے معاملات میں حصہ لینا شروع کر دیا۔

اماں اب صارم سے کچھ کہنا چاہتیں' کوئی خواہش یا فرمائش تو اس کے لیے ساس سے رجوع کرتیں' جو پہلے کبھی نہیں کیا تھا وہ کرنا پڑا۔ شوہر کے بعد وہ بھی خود کو کمزور محسوس کرنے لگیں۔ بیٹے کو قابو کر سکیں' نہ بیٹیوں کو سمجھا سکیں۔

مزنہ کی آج کل شوہر سے چپقلش چل رہی تھی۔ وہ مستقل میکے میں مقیم تھیں۔ دونوں بیٹے باپ کے پاس تھے۔ مذاکرات ہو رہے تھے۔ خود مزنہ کی سیر تفریح مٹر گشت جوں کی توں تھی۔

روبی کا رشتہ آیا ہوا تھا۔ وہ کسی طور راضی نہ ہو رہی تھی کہ لڑکا پنڈی کا رہائشی ہے' میکے سے دوری گوارا نہ تھی۔ ادھر اماں کی خواہش کہ صارم خود بھی شادی کے لیے تیار ہو جائے تو دونوں بہن بھائی کے فرائض ادا ہوں۔ انہوں نے ساس سے رجوع کیا۔

"اماں جان! آپ صارم کو سمجھائیں' کیا بڑھاپے میں گھر بسائے گا' بچے دیکھ لوں' گھر میں رونق ہو۔"

اماں جان پوتے تک ان کا پیغام پہنچانے کی پابند

تھیں مگر صارم کے چہرے پر غصے کا کھنچاؤ۔ طنزیہ مسکراہٹ، کس طرح بیان کرتیں۔ خاموشی اور صارم کی گھر سے بے زاری سے تنگ آکر ایک دن ان کا گریبان تھام کر چلا اٹھیں۔

"چاہتے کیا ہو تم، مجھے ابھی سے مردہ سمجھ لیا ہے؟ بات کرتے ہو نہ بات کا جواب دیتے ہو، اور کتنی اذیت پہنچاؤ گے، ماں ہوں دشمن نہیں، آج بتا دو کیا چاہتے ہو؟"

"آپ میرا جواب جانتی تو ہیں، پھر یہ کیسا سوال ہے، جیسا آپ چاہتی تھیں، ویسا ہی ہو رہا ہے، اب کیا پریشانی ہے؟" ادھر سے روکھا پھیکا جواب آیا۔

"پریشانی کہ اذیت؟ ماں ہوں تمہاری، کچھ خیال کرو۔"

"کاش اماں! آپ نے میری ماں بن کر میرے بارے میں کچھ سوچا ہوتا۔ آپ نے تو اپنے عمل سے ثابت کیا ہے کہ آپ باجی اور روبی کی ماں ہیں۔ میرا آپ سے تعلق کتنا ہے؟ میں آپ کا گھر چلا رہا ہوں، آپ عوض میں مجھے دو وقت روٹی دیتی ہیں، بس۔"

انتہائی اشتعال کی کیفیت میں اٹھ کر باہر چل دیے۔ یہ دیکھے بغیر کہ ماں کس درجے ششدر رہ گئی ہیں یہ بات سن کر، کئی دن اماں کے کانوں میں ان کے الفاظ گونجتے رہے، اتنی سچائی کی بیٹے سے توقع نہ تھی۔ اپنا محاسبہ کیا تو احساس ہوا۔

ہمیشہ انہوں نے بیٹیوں کو اہمیت دی۔ صارم سے ان کا تعلق غیر جذباتی سا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ صارم دادی اور اپنے والد سے قریب تھے۔ دادی نے شروع سے ان پر خاصی توجہ دی تھی، جو اماں کو زیادہ پسند نہ تھی۔

ان کا جھکاؤ دادی کی طرف دیکھ کر اماں تلملا جاتی تھیں۔ بہرحال، پیار سے روبی کو سمجھا بجھا کر شادی کے لیے تیار کیا گیا۔ وہ رخصت ہو کر پنڈی چلی گئی۔ مزنہ کے شوہر سے مذاکرات کامیاب ہو گئے تو وہ بھی چلی گئیں۔



صارم کے وہ ہی لیل و نہار تھے۔ اماں تنہائی اور خاموشی سے گھبرا کر ساس کے پاس جا بیٹھتیں، وہاں کم از کم صارم کی آواز تو سنائی دیتی تھی۔ ایک دن تو بہت عاجزی سے انہوں نے ساس سے کہا۔

"اماں! آپ صارم کو راضی کریں، جس لڑکی کی طرف انگلی اٹھائے گا میں اسے بیاہ لاؤں گی، اب دیر نہ ہو تو اچھا ہے۔"

"یہ بات تم نے کچھ دن پہلے کی ہوتی تو میں کچھ کرتی، تم نے تو ضد باندھ لی کہ حلیمہ اس گھر میں بہو بن کر نہیں آئے گی۔"

"اب میں سناٹے سے تنگ آگئی ہوں۔ اور اب حلیمہ ہے بھی نہیں۔ اللہ کی مرضی کے بغیر تو کچھ ہوتا نہیں، جہاں نصیب تھے، وہ وہاں چلی گئی۔"

"بے شک، اللہ کی مرضی کے آگے بھلا ہماری کیا مجال، مگر انسان کوشش تو کرے، تم نے مگر میری سنی نہ صارم کی مانی، میں نے تم سے کہا بھی تھا زرینہ تمہارا بیٹا ضد کا بہت پکا ہے۔ ارادوں کا پختہ، تم ہار جاؤ گی، مگر اس وقت تم نے میری اور شہباز کی کوئی بھی بات نہ ماننے کا عزم کر رکھا تھا۔ اس وقت مان لی ہوتی تو آج سناٹے نہ ہوتے۔ صارم کی زندگی میں خزاں نہ ہوتی۔"

"چھوڑیں اماں جان! چار سال ہونے کو ہیں، اس کو گئے ہوئے۔ اب کیا انتظار ہے کہ بیوہ ہو کر یا طلاق لے کر آئے گی، تب گھر بسائیں گے اور آ بھی گئی تب بھی آج بھی مجھے انکار ہے۔ میں کیا تھوک کر چاٹوں گی نہیں، میری بھی انا ہے چار سال میں اس کے ہاں چڑیا کا بچہ تک نہیں ہوا تو ہمیں کیا دے گی، سناٹے؟"

"تمہارا دماغ ابھی درست نہیں ہوا، کیسی ماں ہو تم، تم ابھی تک اس سے نفرت کرتی ہو، زرینہ! خدا سے ڈرو، اللہ نے تکبر کرنے والوں کے انجام سے ڈرایا ہے، توبہ کرو، توبہ۔" انہوں نے خوب خبر لی، وہ ڈر گئیں۔

"دراصل اماں جان! مجھے اندازہ ہی نہ ہوا کہ اس کی محبت اتنی شدید ہے، میں نے سوچا، قریب رہنے سے انسیت ہو جاتی ہے، بھول جائے گا۔"

"افسوس تو یہ ہی ہے کہ تم اپنے بیٹے کے جذبات

سے ناواقف ہی رہیں، کبھی اسے جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اب جو اس کی زندگی میں روکھا پن اور ویرانی ہے کوئی امنگ ہے، نہ ولولہ، کیا وہ تمہیں خوشی دیتا ہے؟ نہیں ناں؟ اگر تم نے اس کی خوشی پوری کر دی ہوتی تو آج تم بھی مطمئن ہوتیں، بیٹے کی خوشی اس کی زندگی کتنی پُر بہار ہوتی، گھر میں بچے ہوتے، تمہیں سناٹوں کی شکایت نہ ہوتی۔"

زرینہ بیگم چپ ہو گئیں، غور کیا تو اماں جان کی شکایت بھی بے جا نہ تھی۔ انہیں اپنی کوتاہی کا احساس ہوا بھی۔ مگر ایک ضد تھی جو اپنی ناپسندیدگی کو وجہ بنا کر خود کو درست قرار دے رہی تھی۔ "کیا دنیا میں لڑکیوں کا قحط پڑ گیا؟ چلو میں نے غلطی کی، مگر اب تو کچھ ہو نہیں سکتا تو صارم کیا ہم لوگوں کی خوشی کے لیے، اپنی زندگی کے لیے، اس گھر کی بہار کے لیے، ذرا سی قربانی نہیں دے سکتا؟" مگر کسی سے کہہ نہ سکیں۔ چند دن بعد پھر سوچ کر صارم سے اپنی محبت، ممتا کا واسطہ دے کر شادی کی درخواست کی۔ ادھر وہ ہی جواب۔

"میں ضرورت محسوس نہیں کرتا، جب ایسا وقت آئے گا، بتا دوں گا۔"

"بھئی مان گئے، کیسی پکی محبت ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔" بھنا کر بولیں۔

"ختم ہونے والی چیز محبت نہیں ہوتی۔ نفرت ختم ہو سکتی ہے، محبت نہیں۔ وہ بھی آپ نے ختم نہیں کی، آج تک زندہ رکھے ہوئے ہیں۔"

کچھ دیر بعد انہیں جتا کر چل دیے، وہ اب واقعی عاجز آگئی تھیں۔ غصہ کرتیں، جھلاتیں، مگر پچھتانے کی عادت نہ تھی۔



پھر صارم کے آسٹریلیا جانے کے آرڈر آگئے۔ سڈنی برانچ میں اسٹاف کی ضرورت تھی، انہیں جانا پڑا، دادی کی ضعیفی کی وجہ سے فکر مند تھے۔ مزنہ کو خیر خبر رکھنے کی تاکید کر کے چلے گئے۔

سڈنی میں توقع سے زیادہ رہنا پڑا۔ ایک بار آکر چند دن سب کے ساتھ رہ کر پھر چلے گئے۔ روبی کا خیال تھا کہ شاید بھائی آسٹریلیا میں رہائش کا سوچ رہے ہیں۔ اب اماں نے انہیں مجبور کرنا شروع کر دیا۔ فون پر رو کر کہتیں۔

"ارے کسی بھی لڑکی سے شادی کرلو، وہیں کرلو، بے شک کوئی انگریز ہو، مجھے وہ بھی منظور ہے، کوئی نیگرو ہو، کہیں کی ہو، بس مجھے تمہاری دلہن دیکھنے کی تمنا ہے۔"

صارم کو ہنسی آجاتی، اماں نے پٹڑی بدل لی تھی۔ انہوں نے صارم کے دوستوں سے ربط ضبط بڑھا لیا، سب سے درخواست کی تھی، کسی طرح صارم کو شادی کے لیے تیار کریں۔

پھر کسی دوست کی معرفت یہ اطلاع ملی کہ صارم کسی کالی لڑکی کے ساتھ دیکھے جا رہے ہیں۔ اماں حیران ہو گئیں۔ اتنے بدذوق صارم کبھی نہیں تھے، مگر پھر انہیں احساس ہوا شاید وہ صارم کو پسند آ ہی گئی ہو۔ باہر کے ملکوں میں اتنی رنگینی ہے، لڑکے لڑکیاں بے محابا ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ شاید وہاں کے ماحول نے بدل دیا ہو۔ وہ وہاں کے رنگ میں رنگ گئے تو کیا تعجب! چلو ٹھیک ہے، کالی ہے تو کالی سہی، گھر تو بسے، بچوں سے گھر بھرے، شور شرابا، لڑائی جھگڑا ہو۔

وہ بہو سے زیادہ بچوں کی طلب گار تھیں۔ انہوں نے ارشد چچی کے سامنے دل کھول کر رکھ دیا۔

"یاد ہے بھابھی! میرے گھر کی رونقیں، میاں کے دوست، ان کی فیملیز، روبی، مزنہ کی سہیلیاں، روزانہ گھر میں کوئی نہ کوئی مہمان ..... اور اب کیا ہے، گھر ویران، نہ ہنسی مذاق، نہ قہقہے، ہائے! میرے میاں کیا گئے، ساری رونق ہی لے گئے۔ بچی کھچی جو ذرا سی بہار تھی، وہ روبی لے گئی۔"

"رونق تو بھابھی! حلیمہ کے دم سے تھی۔" ارشد چچی نے دل جلایا۔ "جب سے وہ گئی ہے، سونا پن ہو گیا۔ ہر طرف چلتی پھرتی نظر آتی تھی۔ خاطر مدارات کرتی، اصرار کر کے کھلاتی، ہنستی، مسکراتی، خوشی کا احساس دلاتی، شاید آپ نے کبھی محسوس نہیں

کیا۔ اس کے وجود سے گھر کیسا جگمگاتا تھا۔ تازگی تھی گھر میں‘ اس کا دل کس قدر وسیع تھا سب کے لیے‘ کسی کو جوس دے رہی ہے‘ کسی کو شربت‘ کسی کے لیے چائے اور لوازمات الگ‘ بے ضرر‘ تیز دست‘ ارے وہ تو جن تھی جن ‘پل بھر میں ہر چیز حاضر۔“

بوجھل دل سے زرینہ نے کہا۔ ”ارے اب اس کا کیا ذکر‘ مجھے نوکرانی تو نہیں چاہیے۔“

”نوکرانی؟“ ارشد چچی حیرت سے چلائیں۔

”نوکرانی اتنی ماہر اور مستعد کب ہوتی ہے بھابھی! وہ دل والی تھی‘ رونق تو اسی کے دم سے تھی اور روبی تو اپنے کمرے سے نکلتی ہی نہیں تھی۔ حلیمہ ہی ہر طرف نظر آتی۔“

جن کا خطاب اسے عرشیہ خالہ نے دیا تھا۔ زرینہ بیگم کو علم ہی نہ ہوتا۔ کب حلیمہ نے کیک بیک کرلیا۔ کب دہی بڑے اور سموسے یا رول بنا کر رکھ لیے کہ کوئی مہمان آئے اور تازہ تازہ گرم سموسے یا رول کھلائے جائیں۔ بے آواز بنا شور شرابے کے کیا کچھ تیار ہو جاتا۔ کبھی روبی کو کوئی نئی ڈش بنانے کا شوق ہوتا‘ نہ صرف کچن میں افراتفری پھیل جاتی‘ بلکہ نوکروں کو ڈانٹ الگ اور کبھی تو اماں کو بھی اس کی مدد کے لیے آنا پڑتا۔ اب سوچا تو خیال آیا‘ واقعی وہ دل سے کام کرتی تھی‘ دکھاوے کے لیے نہیں۔

ارشد چچی کے یاد دلانے پر غور کیا۔ واقعی روبی کی تو مصروفیات اس کے کمرے تک تھیں۔ ٹی وی‘ کمپیوٹر اور کبھی کوئی سہیلی آجاتی‘ وہ بھی کمرے میں غڑاپ‘ خاطر مدارات کے لیے حلیمہ ہی تھی۔ واقعی رونق تو حلیمہ سے تھی۔ انہوں نے صارم کا فون آنے پر بڑے شوق سے کہا۔

”سنا ہے تم کسی کالی لڑکی میں دلچسپی لے رہے ہو‘ کون ہے‘ کہاں کی ہے؟“

”اچھا... تو علم ہو گیا آپ کو۔“ وہ عجب طرح ہنسے۔

”آپ کے جاسوسوں نے خبر دے دی۔“

”میرے کون سے جاسوس ہیں بھلا‘ کسی نے وہاں تمہیں دیکھا اس کے ساتھ‘ یہاں بھی خبر پہنچ گئی‘ تم نے تو اس کی ضرورت بھی نہیں سمجھی۔“

”چلیے کسی طرح سہی‘ خبر مل گئی آپ کو‘ کوئی حکم؟“

”حکم؟“ ان کے دل پر گھونسا لگا تھا۔ ”میں حکم نہیں‘ التجا کرتی ہوں۔“

”کہ میں اسے چھوڑ دوں یہ ہی کہنا چاہتی ہیں؟“

”میں ایسا کیوں کہوں گی صارم!“ ماں کا دل تھا‘ تڑپ گیا‘ روکھا لہجہ تھا بیٹے کا۔

”آپ چاہتی ہیں نا کہ میں واپس آکر آپ کی خواہش پوری کردوں‘ جو میری خواہش نہیں ہے‘ کیونکہ آپ کو میری کوئی خوشی برداشت نہیں ہوتی۔“ فون بند۔

وہ رو پڑیں‘ ساس سے کہا۔ ”بیٹے کو ماں پر بھروسا نہیں رہا‘ اماں جان کیسی آزمائش ہے یہ۔“

”تو تم نے کبھی اس کی خواہش پوری کی ہوتی‘ اس کی خوشی کا خیال کیا ہوتا‘ تم اپنی خوشی کو اہمیت دیتی رہیں‘ کبھی ماں بن کر اس کا مان رکھ لیا ہوتا‘ تمہاری طرف سے تلخ تجربے کا یہی نتیجہ ہونا چاہیے تھا۔“

”اس نے میری بات سننے کی کوشش ہی نہیں کی‘ لگتا ہے اسے میری آواز سننا گوارا ہی نہیں۔“

”وہ اتنا سنگدل نہیں‘ تم اس سے ڈکٹیٹر بن کر بات کرتی ہو‘ اب ماں بن کر نرم لہجے میں یقین دلا دو‘ تم دیکھنا کیسا فرماں بردار ثابت ہوگا۔“

وہ کس طرح یقین دلاتیں‘ اب انہیں اس سے فرق نہیں پڑتا کہ صارم گوری سے بیاہ کرے یا کالی سے‘ انہیں بیٹے کا گھر بسا دیکھنا ہی ہے‘ خواہ وہ کسی بھنگی سے ہی کرلیں شادی۔ انہیں اپنا طنطنہ یاد آیا۔ صارم کو ہر خوشی سے محروم رکھا‘ حلیمہ کے سلسلے میں تعصب سے کام لیا۔ کیا تھا اگر وہ حلیمہ کو بہو بنا لیتیں۔ ہاں اگر وہ شاہ نواز کی بیٹی نہ ہوتی۔ گاؤں والی نہ ہوتی‘ تو... پھر انہیں انکار نہ ہوتا‘ گو کہ وہ یہیں پلی بڑھی‘ ان ہی کے گھر میں رہی۔ بے ماں کی ہونے کی وجہ سے اسے ہمدردی تو ملی‘ محبت نہیں۔

اگر صارم کی ثابت قدمی کا اندازہ ہو جاتا تو حلیمہ کم از کم اس نیگرو لڑکی سے تو بہتر ہوتی۔ نہ جانے کتنی کالی

ہوگی‘ موٹے ہونٹوں اور ابلے ڈیلوں والی ”اف صارم نے مجھ سے انتقام تو نہیں لیا؟“ انہیں پہلے بھی حلیمہ کو پسند کرنے پر صارم کی گھٹیا پسند پر غصہ آتا تھا۔ اب تو یہ نیگرو... خدایا۔ برداشت کی بھی حد ہے۔

☼ ☼ ☼

نہ جانے کس طرح‘ مگر دل کڑا کر کے صارم سے کہہ ہی دیا۔

”صارم بیٹا! اب تم مجھے خوش خبری سنا دو۔“ کتنا عاجزانہ انداز تھا۔ وہ خود ہی اپنے بدلے ہوئے لہجے پر شرمسار ہو گئیں۔ کہاں گئی ان کی وہ تحکمانہ آواز‘ صارم اپنے پچھلے فون پر کی گئی تلخ کلامی پر شرمندہ تھا‘ معافی مانگنے لگا۔

”ہاں‘ ہاں‘ میں نے معاف کیا‘ بس اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا‘ میں بہو کے استقبال اور اس کے لیے لباس وغیرہ کی تیاری کرلوں؟“

”بہو کے استقبال کی تیاری؟ کیا کہہ رہی ہیں اماں!“

”بس جس لڑکی کے ساتھ گھوم رہے ہو‘ اسے پسند کرتے ہو‘ اس سے شادی کرلو۔“

”اماں سچ؟ آپ اجازت دے رہی ہیں؟“ خوشی سے معمور کھنکتی آواز۔

”ہاں... ہاں اجازت ہے چاہے وہ کوئی ہو‘ کیسی ہو بس تمہاری پسند ہو۔“

”اچھا... سچ کہہ رہی ہیں نا آپ... تو پھر اپنی ہونے والی بہو کو بھی خوش خبری سنا دیں۔ وہ کہتی ہے‘ جب تک تمہاری ماں خود اپنی زبان سے اجازت نہ دے دیں‘ وہ شادی نہیں کرے گی‘ فون اسے دے رہا ہوں‘ آپ خود بات کرلیں۔“

صارم کی خوشی آواز سے ظاہر تھی۔ برسوں بعد‘ انہیں اس آواز میں اپنے پرانے صارم کا وجود کھنکتا ملا تھا۔

”ارے... پتا نہیں وہ میری زبان سمجھے کہ نہ سمجھے‘ تم ہی کہہ دو۔“

”آپ اپنی زبان میں ہی بات کریں‘ ورنہ اسے یقین نہیں آئے گا‘ وہ سمجھ جائے گی‘ نہ بھی سمجھی تو میں سمجھا دوں گا‘ آپ کی آواز تو سن لے گی‘ بس کافی ہے۔“

انہوں نے ایک دھیمی نرم آواز سنی۔

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام‘ بس بیٹا! مجھے یہ ہی کہنا ہے کہ میں چاہتی ہوں تم میرے بیٹے کا نصیب بن کر چمکو‘ سدا اسے خوشیاں دو‘ خوش رہو۔“ آواز بھرا گئی۔

ہاں یہ کسی لڑکی کی آواز تھی‘ جوان کے بیٹے کے قریب ہی تھی‘ انہیں خوشی سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

”اماں! اس نے آپ کی آواز سن لی ہے‘ بات بھی سمجھ لی‘ مبارک ہو‘ اس کالی نے بھی رشتہ منظور کرلیا۔ اب دادی سے میری بات کرائیں۔“

کس قدر خوش تھے صارم‘ آواز میں کھنک‘ لہجے میں ولولہ۔ وہ ریسیور اماں جان کو دے کر باہر آگئیں۔

روبی کی نند اور دیور کی شادی تھی۔ دادی تو سفر کرنے کے لیے تیار نہ ہوئیں‘ بہو سے کہا۔

”تم چلی جاؤ‘ سمدھیانے کا فنکشن ہے۔“

وہ چلی گئیں‘ اتفاق سے روبی کے بیٹے کی طبیعت خراب ہو گئی۔ روبی خود بھی شادیوں کی مصروفیت میں بہت تھک گئی تھی۔ ماں کو روک لیا‘ غرض ایک ماہ بعد وہ آئیں تو روبی کو ساتھ لائیں۔ گھر میں بچے کے رونے اور قلقاریوں نے رونق کردی‘ سب بہت خوش تھے۔ مزنہ بھی آجاتی‘ عرشیہ خالہ کو گھسیٹ لاتی مگر عرشیہ خالہ کو اب لطف نہ آتا۔

”بھئی... حلیمہ کے بغیر گھر بے لذت لگتا ہے۔ روبی بچے میں مگن‘ تم کو کچن سے الرجی‘ آپا اب کام کرنے کے قابل نہیں‘ ہائے حلیمہ نے خوب مزے کروائے‘ کاش آپا آپ نے حلیمہ کو بہو بنایا ہوتا۔“

روبی کے بچے کو دادی کے کمرے سے بہت دلچسپی تھی۔ وہاں اس کے لیے بہت سی چیزیں تھیں۔ دادی کا پاندان‘ ان کی عینک اور چھڑی‘ پھر دواؤں کی شیشیاں‘ دادی اس کے منہ میں سونف کے دو دانے رکھ دیتیں۔

وہ گردن ہلا کر آنکھیں مٹکا کر ذائقے کا لطف لیتا۔ پھر روبی چلی گئی۔ اور بچے کے ساتھ شور شرابا بھی گیا۔

پورا مہینہ ہو گیا تھا' بلکہ صارم سے بات کیے تو دو ماہ گزر گئے تھے۔ ایک ماہ پنڈی کا قیام' پھر روبی بھی ایک ماہ رہ کر گئی۔ اب وہ صارم سے بات کرنے کے لیے بے تاب تھیں۔ پھر صارم کے دوست نے خبر دی۔ وہاں آسٹریلیا میں صارم کی شادی ہو گئی۔

سڈنی میں صارم کے ایک رشتے دار بھی مل گئے۔ انہوں نے لڑکا لڑکی دونوں کے بزرگ کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کیا۔ کمپیوٹر پر تصویریں آگئیں' مگر دلہن ایک چادر میں چھپی ہوئی تھی' شکل نظر نہ آئی' مزنہ اور روبی نے بہت واویلا کیا کہ دلہن کا منہ کیوں نہ دکھایا۔

"امی آپ بھی بس.... کہتیں تو سہی کہ دلہن کی تصویر بھیجو۔"

"امی نے سوچا' ابھی سے نیگرو کو دیکھ کر کیا دل خراب کریں۔"

روبی نے مزنہ سے پتے کی بات کی' صارم دلہن کو لے کر امریکہ گئے ہوئے تھے۔

پھر ایک دن اطلاع ملی' وہ آنے والے ہیں' روبی "فورا" آگئی۔ مزنہ روز آجاتی۔ دلہن کے زیور لباس وغیرہ کی تیاری کے لیے بازار کے چکر لگنے لگے۔ زرینہ بیگم کو تھکن کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ کمزور ہو گئی تھیں۔ انہیں طاقت ور سہارے کی ضرورت تھی اور لائق فائق بیٹے سے بڑھ کر کس کا سہارا ہوتا۔ صارم کی آمد کی خبر سے جوش و خروش بڑھ گیا تھا' مگر کالی' موٹے ہونٹوں والی نیگرو بہو' جوش پر ٹھنڈا پانی پڑجاتا۔

حلیمہ کیا بری تھی۔ اور بھی اچھی بھلی خوش شکل' کتنی لڑکیاں دیکھیں' مگر قسمت کہاں جا کر ٹکرائی۔

روبی نے باغیچے میں نئے پودے لگوائے۔

صارم کو لان میں شام کی چائے پینا اچھا لگتا تھا۔ سردی ہو یا گرمی' سبز گھاس کا غالیچہ' کیاریوں میں لگے پودوں کے رنگ برنگ کے پھول' اب عرصے سے یہ عادت بھی چھوٹ گئی تھی' مگر من پسند دلہن کے ساتھ تو یقینا" وہ پھر سے یہیں چائے کا لطف لیں گے۔

مزنہ اور روبی اب تواتر کے ساتھ حلیمہ کو یاد کرتیں۔

بے چاری پر خواہ مخواہ ہی شک کیا۔

زرینہ بیگم نے بھی ساس سے معذرت کی' جو حلیمہ کے سلسلے میں انہیں بھی ملوث کرنے کی مرتکب ہوئیں۔ دادی نے شکر ادا کیا۔ سالوں بعد ان پر سے الزام کا دھبہ مٹ گیا۔ وہ ناکردہ جرم سے بری ہو گئیں۔

☼ ☼ ☼

پھر ایک دن ساس' بہو برآمدے میں بیٹھی بادام پستے چھیل کر کاٹ رہی تھیں۔ گیلری کے دروازے پر آہٹ ہوئی تھی' کوئی مہمان؟

ہائے کہیں ارشد بھابھی نہ ہوں۔ ان کی آمدورفت آج کل خوب بڑھ گئی تھی' سارے چھلے ہوئے پستے پھنکا لگا کر کھا جائیں گی۔ انہوں نے پستے کا پیالہ کرسی کے نیچے سرکا دیا۔

مڑ کر دیکھا' آنکھ کی ٹھنڈک' دل کا قرار' کھلی آنکھوں کو جھٹلانا ممکن نہ رہا۔ اٹھیں اور دوڑ کر بیٹے سے لپٹ گئیں۔ نہ جانے کیا ہوا' دل سے دھواں سا اٹھا' اور آنسو بن کر چہرہ کو بھگونے لگا۔

صارم آگئے تھے' انہوں نے صارم سے الگ ہو کر چہرہ خشک کیا اور کالی بھتنی کا نظارہ کرنے کے لیے دل مضبوط کیا' مگر صارم کے پیچھے جگہ خالی تھی اور اب جو دیکھا تو صارم کے ساتھ.... لڑکی' دادی سے یوں چمٹی ہوئی تھی جیسے برسوں بعد کسی بہت قریبی عزیز سے ملاقات کر رہی ہو۔

پھر لڑکی دادی سے علیحدہ ہوئی' کڑاک' ان پر بجلی گری' یک لخت انہیں شدید کمزوری محسوس ہوئی۔ نیگرو لڑکی کے بجائے وہاں حلیمہ کھڑی تھی۔ یہ آنکھوں کا دھوکا تو نہ تھا۔ وہ حیرت کی شدت سے بے ہوش نہیں ہو گئیں' یہ تعجب تھا' پھر وہ خود ان سے لپٹ گئی۔ انہوں نے مردہ دلی سے اس کے سر پر ہاتھ

پھیرا۔ صارم' دادی سے الگ ہو کر حلیمہ کے پہلو میں کھڑے ہو گئے۔

"دیکھا اماں! میں نے آپ کو حیران کر دیا' اچانک پہنچ کر' کیوں دادی؟ راز فاش تو نہیں کر دیا تھا اماں پر' مگر اماں کی حیرانی نے بتا دیا کہ آپ نے میرے راز کو دل میں ہی چھپا لیا تھا' اوہ تھینک یو دادی!" ان کا خوشی سے چمکتا چہرہ' دمکتا وجود' بہکتا ہوا لہجہ اور کھنکتی آواز' وہ ایسا ہی چاہتی تھیں۔ اتنا ہی خوش و خرم' شاداں و فرحاں' پھر اب کیا ہوا' جذبوں پر برف کیوں آگری؟ حلیمہ' بیوہ' مطلقہ یا.... کہاں ملی' کیسے ہاتھ لگی' وہ دھم سے کرسی پر گریں' حلیمہ نے صارم کو متوجہ کیا۔

"چچی امی کو دیکھیں' وہ ٹھیک نہیں لگ رہیں۔"

صارم ہنسے۔ "اچانک ملنے والی خوشی' اتنی ہی بے پایاں ہوتی ہے۔" لاپروائی سے کہہ کر وہ دادی سے راز و نیاز میں مصروف ہو گئے۔ اف ایسی شکست' اتنی پسپائی' وہ بیٹے کی خوشی کے لیے کالی بھتنی کو برداشت کرنے کے لیے تیار تھیں اور رازدار دادی.... نہیں۔ ان کے سر میں دھماکے ہونے لگے۔ پھر صارم' دادی سے الگ ہو کر ماں کی طرف آئے۔ ان کے کندھے پر سر رکھ کر بڑے نرم لہجے میں پیار سے کہا۔

"اماں! جو کچھ میں نے کیا آپ کی اجازت کے بعد' میں شرمندہ نہیں ہوں' ہاں آپ کو اس ساری واردات سے بے خبر رکھا تھا۔ اپنی خوشی کے آگے مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ آپ کو شاک لگے گا' چلیے سب بتاتا ہوں' میں بھی بہت حیران ہوا تھا' بلکہ مجھے تو غصہ بھی تھا' صدمہ بھی۔"

ان کا ماں کے ساتھ التفات' نرمی سے مسکراتے ہوئے ان کو تسلی دینا' کتنا اچھا لگ رہا تھا زرینہ بیگم کو اور پھر وہ اس داستان پر سے پردہ اٹھانے لگے' جس کے حیران کن انکشاف نے ان کو بھی ہفتوں مضطرب رکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ سڈنی آفس کے کام سے گئے تھے۔ وہاں انہیں نیٹ پر ایک دوست کی طرف سے پیغام ملا۔

بار بار ایک دوست' نامعلوم دوست صارم سے ملنا چاہتا تھا۔ کچھ عرصہ تو وہ اپنی مصروفیت کے باعث توجہ نہ دے سکے۔ پھر انہیں اس اجنبی دوست سے ملنے ملبورن جانا پڑا۔ تجسس اور شوق کسی اجنبی دوست سے ملنے کا' نیٹ پر جو پتا تھا اس پر پہنچے' ایک نہایت معقول صورت شائستہ خاتون نے دروازہ کھولا۔

صارم کے تعارف کرانے پر وہ انہیں ایک کمرے میں لے گئیں۔

ایک سادہ سا کمرا' سنگل بیڈ پر ایک بیمار منحنی اجنبی صورت شخص' میز پر دواؤں کی شیشیوں کے انبار' کمرے میں دواؤں کی مخصوص بو' خاتون کے توجہ دلانے پر بیمار نے انہیں دیکھا' اپنا کمزور ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا۔ صارم نے اس کا ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں تھام لیا۔ انجان دوست' نام نامعلوم' صورت ناآشنا' وہ بغور اس بیمار میں کسی شباہت کو تلاش کرتے رہے۔

"میں رفیق ہوں۔" بیمار کے منہ سے تعارفی الفاظ ادا ہوئے' صارم کو یاد نہ آیا۔

"میں.... آپ کی کزن حلیمہ کا شوہر ہوں۔"

دھماکا سا ہوا۔ صارم لڑکھڑا گئے تھے۔ انہیں اپنا جسم سُن ہوتا ہوا لگا۔

"جی ہاں' میں وہ بدنصیب شخص ہوں' جو خود بھی صحت حاصل کر سکا' نہ حلیمہ کو کوئی لمحہ بھر کی خوشی یا سکون ہی دے سکا' بہت شرمندہ ہوں میں' مجرم ہوں' حلیمہ کے ارمانوں کا' آپ لوگوں کی توقعات پر پورا نہ اترنے کا۔"

رفیق کی آواز بہت کمزور تھی۔ صارم کو یاد آیا۔ ایک بار وہ رفیق سے ملے تو تھے۔ تب بھی انہیں لگا تھا کہ وہ صحت مند نہیں ہے۔ چہرے پر زردی تھی۔ انہیں اس نے بالکل متاثر نہیں کیا۔ اس لیے وہ حلیمہ سے حالِ دل کہنے پر مجبور ہو گئے اور آج رفیق کمزور و ناتواں' شدید بیمار۔ خاتون نے آگے آکر رفیق کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر شاید دلاسا دیا۔

"تم آرام کرو۔" انہوں نے بڑے مشفقانہ لہجے میں کہا۔ میں انہیں خود سب کچھ بتا دیتی ہوں۔ وہ اشارے سے صارم کو دوسرے کمرے میں لائیں۔ انہیں صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"میں رفیق کی بڑی بہن ہوں۔" انہوں نے افسردہ لہجے میں وہ بتانا شروع کیا' شاید اب تک کوئی بھی اس کہانی سے واقف نہ تھا۔ وہ کہانی جو حلیمہ سے متعلق تھی۔ حلیمہ کی سرگزشت' صارم کسی بچے کی طرح اشتیاق اور حیرانی سے ان خاتون کو دیکھ رہے تھے۔

حلیمہ ایک شہزادی تھی اور ایک دیو کی قید میں تھی۔ دیو جو کسی بیماری میں مبتلا تھا' اسے ایک خدمت گزار کی ضرورت تھی۔ جو اس کی دیکھ بھال کر سکے اور وہ اپنا فرض ادا کرتی رہی' مگر دیو کی بیماری لاعلاج تھی اور وہ اب مایوس ہو کر اس روایتی شہزادے کے انتظار میں تھا' جو اسے آزاد کرا کے لے جائے۔

"جب رفیق پاکستان گیا' چھوٹی بہن کی شادی کے سلسلے میں۔" خاتون دھیمے لہجے میں بتا رہی تھیں۔ غالباً" ان کی کوشش تھی کہ رفیق تک ان کی آواز نہ پہنچے۔ "اور میں نے سنا کہ وہاں اس کی شادی کی کوشش ہو رہی ہے' میں پاکستان نہیں جا سکی تھی۔ میں جانتی تھی' رفیق بیمار ہے۔ وہ برسوں سے اس بیماری کے عذاب سے نبرد آزما ہے۔ دراصل پہلے وہ نفسیاتی مریض تھا۔ اس کا علاج نہ ہو سکا' بلکہ اس پر تابڑ توڑ حملے ایسے ہوئے کہ وہ مایوسی کا شکار ہو گیا۔ ہماری ماں کے مرنے کے بعد ابا نے دوسری شادی کر لی تھی۔ انہوں نے رفیق کو بری طرح تنگ کیا۔

جب تک میں وہاں رہی' اس کو سوتیلی ماں کے ظلم و ستم سے بچاتی رہی' پھر میری شادی ہو گئی اور رفیق وہاں ماں کی نفرت سہنے کے لیے اکیلا رہ گیا۔ پھر ابا بھی اس سے چڑنے لگے' اور وہ بھی ماں کے ساتھ اس پر تشدد کرنے لگے۔ اسکول سے اٹھا لیا' دن رات مار پھٹکار نے اسے جنونی بنا دیا۔ پھر ابا بھی ختم ہو گئے اور گھر میں رفیق' ماں کے ساتھ رہنے پر مجبور۔ چھوٹی بہن جو دوسری ماں کی بیٹی تھی' کچھ ہمدردی کر لیتی' میں نے رفیق کو اپنے پاس بلانا چاہا' مگر وہ کسی کے ساتھ امریکہ جا پہنچا۔

امریکہ میں وہ بالکل ہی مریض بن گیا۔ اسے عورتوں سے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ طرح طرح سے خود کو اذیت پہنچانے لگا۔ امریکہ کا کھلا ڈلا ماحول اس کے لیے آزمائش بن گیا تھا۔ میں نے اسے اپنے پاس بلانا چاہا۔ وہ نہیں آیا' وہ رشتے داروں سے ڈرنے لگا تھا۔ پھر سنا کہ اس کی شادی طے ہو گئی ہے' میں نے فائزہ کو فون کر کے اسے رفیق کی بیماری کا بتایا' کیونکہ اس نے ہی یہ شادی کروائی تھی' اس نے کہا' رفیق کو تنہائی سے نجات دینے اور ایک ہمدرد' خدمت گزار اور شریف لڑکی کی ضرورت ہے' وہ اپنے مرض سے نجات حاصل کر لے گا۔ اس کی محرومیوں کا ازالہ اسی طرح ہو گا' اس کی نفسیاتی گرہیں کھل جائیں گی' میرے کلاس فیلو صارم شہباز کی کزن ہے' ایک طلاق ہو چکی ہے' معصوم اور خاموش سی ہے بے ماں کی ہے۔ گھر والوں کو انکار نہیں ہے' ان کی اپنی مجبوری ہے۔

غرضیکہ میرے منع کرنے کے باوجود' شادی ہوئی' نہ جانے رفیق کو فائزہ نے کس طرح منایا۔ وہ امریکہ آیا تو میں نے اسے فون کیا' اسے ڈانٹا' اس نے کہا وہ لڑکی ایک نرس کی طرح اس کی خدمت کرے گی۔ وہ لڑکی کو شادی کے پہلے دن سب کچھ بتا چکا ہے۔ پھر حلیمہ آئی تو میں اس سے جا کر ملی۔ افسوس' میں اس بچی کی کسی طرح مدد نہ کر سکی۔ وہ ایک ذہین' صابر اور مضبوط ارادوں کی شریف مگر مجبور لڑکی تھی۔ وہ اپنے گھر والوں کو کچھ بتا نہیں سکی اور نرس کی طرح زندگی گزارتی رہی۔

میں تو ڈرتی رہی کہ کہیں رفیق' حلیمہ کو بھی اپنی نفرت اور انتقام کا نشانہ نہ بنا دے' مگر شکر ہے رفیق ضرورت مند تھا۔ اسے حلیمہ کی ضرورت تھی۔ اس نے امریکہ میں دن رات محنت کر کے بہت کمایا تھا' مگر بیماری سے مجبور ہو گیا۔ دن بدن بیماری اور کمزوری بڑھتی گئی' مایوسی' دنیا سے بے زاری اس پر حاوی ہوتی گئی۔

چار سال حلیمہ نے نرس بن کر رفیق کی خدمت

کی۔ چار صبر آزما سال' پھر میں انہیں یہاں لے آئی۔ میرے میاں ڈاکٹر ہیں' ہم نے بہت کوشش کی' علاج بھی کروایا۔ مگر رفیق کو اب حلیمہ سے شادی بھی اپنا جرم لگنے لگی تھی۔ پھر میرے سمجھانے پر' حلیمہ کی خشک بے رنگ زندگی کے واسطے دینے پر.... رفیق نے حلیمہ کو طلاق دے دی۔"

صارم کے اعصاب پر پہاڑ آ گرے' سناٹے اور صدموں کا کوہ گراں' وہ ساکت بیٹھے رہے' اتنا کچھ ہو گیا' حلیمہ نے کسی کو خبر نہ ہونے دی۔

"اب مسئلہ یہ ہے کہ.... حلیمہ کہاں جائے' وہ پاکستان والوں کو بتانے سے گریزاں ہے' پھر میں نے فائزہ کو سارا مسئلہ بتا دیا۔ وہ بھی شرمندگی میں وہاں کسی کو نہ بتا سکی' پھر اس نے آپ کا ای میل ایڈریس دیا۔ میں بار بار ٹرائی کرتی رہی۔ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ آپ آسٹریلیا میں ہیں' مجھے قوی امید تھی' آپ ضرور آئیں گے' اب حلیمہ رفیق کے لیے نامحرم ہے' لیکن وہ اب کہاں جائے' رفیق کی زندگی تو اب چند روزہ ہے' طلاق کے بعد وہ محض ایک تنخواہ دار نرس کی طرح رفیق کا کام کرتی ہے۔ وہ یہاں رہ کر نرسنگ کا پیشہ اختیار کرنا چاہتی ہے' مگر مجھے اس پر بہت ترس آتا ہے۔ اسے بھی زندگی میں گھر بسانے' خوشیاں حاصل کرنے کا حق ہے' اسے آخر کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے' آپ کو اسی لیے بلایا ہے' آپ اس کی کہیں بھی شادی کرا دیں۔ وہ آپ کی رشتے دار ہے' پاکستان بھی لے جا سکتے ہیں۔"

خاتون بات ختم کر چکی تھیں اور خاموش تھیں۔ صارم کٹھ پتلی کی مانند گم صم اور ساکت' ان کے سامنے رکھی کافی برف بن چکی تھی۔ ان میں تو جنبش کی بھی ہمت نہ تھی۔ یہ حلیمہ کی زندگی کی کہانی تھی۔ اس کی خشک بنجر زندگی کا ذمہ دار کون تھا؟ وہ خود' ان ہی کے تغافل اور بے نیازی کے سبب ہی وہ ایسی لاحاصل زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئی۔

پھر.... صارم کے سامنے وہ آئی' اس کا حلیہ کسی معمولی خدمت گار جیسا ہی تھا۔ بے رنگ و روپ' سادگی' محرومی' افسردگی کی چھاپ کے سوا کوئی رنگ یا جذبہ اس کے چہرے پر نہ تھا۔ صارم کو دیکھ کر ایک جھجک کے ساتھ رکی' حیرانی کا تاثر آنکھوں میں نمایاں ہوا' پھر وہ رفیق کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ مارکیٹ سے کچھ دوائیں لے کر آئی تھی' پھر صارم کی موجودگی میں اس نے رفیق کو پرہیزی کھانا کھلایا۔ دوا دی۔ منہ دھلایا' وہ کسی ماہر نرس کی طرح اپنا کام کر رہی تھی۔

"حلیمہ! چلو میں تمہیں لینے آیا ہوں' میرے ساتھ چلو۔" بالآخر وہ بولے تھے۔

حلیمہ ایک لمحہ کو ساکت ہوئی' پھر اس نے مڑ کر رفیق کو دیکھا۔ شاید اجازت طلب کر رہی تھی۔

صارم نے اپنا جملہ دہرایا۔ حلیمہ نے مضبوط لہجے میں پوچھا۔ "کس حیثیت میں۔"

"یہاں کس حیثیت میں رہ رہی ہو؟"

"ایک تنخواہ دار ملازمہ اور یہ نوکری تو میں چار سال سے کر رہی ہوں' اب میرے مالک مجھے نوکری سے الگ کریں گے' تب ہی کہیں جاؤں گی۔"

"وہ تمہیں اپنی زندگی سے الگ کر چکے ہیں۔" صارم نے سنجیدگی سے سمجھایا تھا۔ "یہاں اب تمہارا کچھ نہیں ہے اور میں تمہیں تمہارے وارث ہونے کے دعوے پر لے جاؤں گا۔"

"معاف کیجیے گا۔ میرا آپ کا یہ پرانا تعلق ہے' پہلے کبھی آپ نے یہ حق کیوں استعمال نہیں کیا؟"

"اس لیے کہ وہاں پاکستان میں تمہارے والد' میرے والد اور ہماری دادی تمہاری وارث تھیں' میں نہیں۔"

"لیکن میں آپ کے حکم کی پابند نہیں۔" اف! حلیمہ اتنی سرد مہر کبھی نہ تھی۔

"میں تم سے کہہ رہا ہوں۔" صارم نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "یہاں اب تمہارا کوئی رشتہ' تعلق نہیں' وہ شرعی تعلق مسٹر رفیق کسی بوجھ کی طرح اتار چکے ہیں' یہاں رہنا غیر شرعی ہے' یہ اب غیر ہیں۔"

"یہ.... میری زندگی میں کبھی تھے ہی نہیں۔" حلیمہ

کی آواز بوجھل تھی۔

"میں اول دن سے ہی ان کی خدمت پر مامور تھی اور اب تو باقاعدہ تنخواہ دار نرس کے طور پر کام کر رہی ہوں۔"

صارم پیشانی مسلنے لگے۔ بے چارگی سے آخری بار سمجھانا چاہا۔

"تم ابھی سمجھ نہیں رہی ہو حلیمہ! آسٹریلیا میں تمہارا قیام غیر قانونی ہے۔ تم یہاں غیر محفوظ ہو۔ گھر والوں کو بھی تمہاری فکر ہے۔ یہ غیر ملک ہے۔"

"آپ جانتے تو ہیں' میں اپنے ملک میں بھی بلکہ اپنے گھر میں بھی غیر محفوظ تھی۔ ملازمت تو مجھے امریکہ میں مل ہی جائے گی' وہاں کی شہریت ہے میرے پاس۔"

صارم نے خاتون خانہ سے کہا۔ "آپ سمجھائیں' میں آپ کے بلانے پر آیا تھا۔ حلیمہ کی زندگی کے اس موڑ سے ناواقف' آپ انہیں... خیر چلتا ہوں۔"

انہوں نے رفیق کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے اپنا کمزور ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔

"صارم صاحب! میں حلیمہ کو طلاق دے چکا ہوں' آج میں ملازمت سے بھی برخاست کرتا ہوں' چونکہ طلاق کو چھ ماہ گزر گئے ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں آپ انہیں لے جائیں' واقعی اب کوئی شرعی جواز یہاں رہنے کا نہیں رہا۔"

عجب ڈرامائی ماحول ہو گیا' حلیمہ کچھ پریشان' خاتون مطمئن' رفیق مزید کمزور۔

"چلو... اب تو ملازمت بھی نہیں رہی۔ میرے ساتھ چلنے کے علاوہ اب کوئی راستہ نہیں۔"

صارم' حلیمہ کو دیکھ رہے تھے۔ وہ گھبرا گئی۔ پھر ہمت کر کے بولی۔ "آپ کے ساتھ جانے میں بھی شرعی جواز ہونا چاہیے۔"

"تو پھر... میں آج ہی نکاح کر سکتا ہوں۔" فوری فیصلہ' حلیمہ کے چہرے پر کچھ حیا' کچھ اشتعال کی سرخی چمکی' تیز لہجے میں بولی۔

"اچھا... تو یہ کام آپ نے چھ سال پہلے ہی کیوں نہیں کیا... یا میری زندگی آپ کی نظر میں محض ایک مذاق تھی' آج بھی اسی مذاق کا حصہ بنانا چاہتے ہیں آپ؟" صارم وہاں سے چل پڑے' کوئی جواب ان کے پاس نہ تھا۔ "کل آؤں گا۔" کہا اور بس' خاتون خانہ دروازے تک ساتھ آئیں۔

"آپ فکر نہ کریں' کل ہم اسے تیار کر لیں گے' بلکہ نکاح بھی کل ہو جائے تو اچھا ہے' یہ بہت بہتر فیصلہ ہے۔"

وہ ہوٹل آکر سوچنے لگے۔ حلیمہ کی زندگی میں اتنے پیچ و خم' اس قدر طوفان کیوں ہیں؟ ہر سمت آندھیاں اور بے سکونی اور وہ تنہا ہر طوفان سے مقابلہ کر رہی ہے۔ انہیں بہت جلد خیال آیا کہ وہ خود ہی اس کے ذمے دار ہیں۔ اگر ذرا ہمت' بہادری سے کام لے کر اسے اپنی زندگی میں شامل کر لیتے تو اس کو تابڑ توڑ مصیبتوں اور صعوبتوں سے گزرنا نہ پڑتا۔ رات میں جاگتے ہوئے انہوں نے دل کو بہت مضبوط محسوس کیا۔ اب اور دیر نہیں کی جا سکتی' فیصلہ کر کے سو گئے۔

٭ ٭ ٭

اگلے دن تیار ہو کر وہ پھر اسی گھر کے دروازے پر کھڑے تھے' مگر آج وہ وہاں تنہا نہ تھے۔ کافی لوگ جمع تھے' نہ جانے یہ کون ہیں اور کیوں جمع ہیں' کیا نکاح کے مہمان؟ مگر نہیں بہت جلد انہیں حقیقت کا علم ہو گیا۔ رات کے پچھلے پہر رفیق وفات پا گیا تھا۔ زندگی اور بیماری کے بوجھ سے آزاد' سمجھ میں نہیں آیا۔ افسوس کریں یا... مگر اس کی بہن سے مل کر بہرحال انسانیت کے ناتے ہمدردی کا اظہار کیا۔

خاتون نے بتایا' رفیق کے جسد خاکی کو امریکہ لے جایا جا رہا ہے۔ جہاں اس کا گھر ہے۔ پاکستان میں اب کوئی رہا نہیں' امریکہ میں کچھ عزیز ہیں' حلیمہ کے جانے کا جواز نہ تھا۔

اگلی شام صارم کا نکاح حلیمہ سے ہو گیا' لیکن حلیمہ نے یہ رضامندی صرف شرعی نقطہ نظر سے دی تھی' اس کی ضد تھی کہ وہ چچی امی کی اجازت کے بغیر ان کی

بہو نہیں بنے گی اور اگر چچی امی اب بھی نہ مانیں تو وہ چپ چاپ اپنے گاؤں والے گھر چلی جائے گی۔

صارم نے یہ شرط مان لی تھی' مگر اسے آسٹریلیا کی سیر کرانا' اس کے ساتھ گھومنا پھرنا' آزادی کے ساتھ کسی کے اعتراض کے بغیر' زندگی کے بہترین روز و شب تھے۔ آخر چچی امی کی اجازت مل گئی۔ اور وہ اسے لے کر سونٹزرلینڈ چلے گئے اور انہوں نے اپنی اس خوشی میں رازدارانہ طور پر دادی کو شامل کر لیا تھا۔ کبھی وہ اس سے معافی مانگتے' اپنی کمزوری اور بزدلی پر' جس کی وجہ سے حلیمہ کو اس قدر تکلیف پہنچی۔ وہ سادگی سے کہتی۔

"میری قسمت میں یہ ہی تھا۔" یہاں بھی قسمت... وہ جھلا جاتے۔ انسان اپنی غلطی اور کوتاہی کو قسمت کا نام کیوں دیتا ہے۔

"قسمت اسے کہتے ہیں حلیمہ بیگم! جو آج میں فتح یاب اور سرخرو ہو گیا' اپنے جذبۂ صادق کی بدولت۔" وہ اسے سمجھاتے۔

"وہ بھی قسمت میں تھا اور آپ بھی قسمت سے ملے ہیں' ہم تقدیر کے غلام ہیں۔" وہ انہیں سمجھاتی' پھر پاکستان میں مزنہ باجی اور روبی نے بہت پرتپاک خیر مقدم کیا۔ انہیں بے حد خوشی تھی۔ شکر ادا کر رہی تھیں۔

"اف توبہ' میں تو نیگرو لڑکی کا تصور کر کے پریشان ہو رہی تھی کہ بے چاری کو کیسے برداشت کریں گے۔"

یہ صارم کی بھی فتح تھی' حلیمہ کی بھی' خوشی' اطمینان' سکون۔

چچی امی بھی دو پوتے گود میں لے کر مسرور و شادمان' لان میں شام کی چائے کا رواج پھر تازہ ہوا۔

عرشیہ خالہ کی حلیمہ سے فرمائشیں۔ حلیمہ کی کچن میں مصروفیت' اسے تو بھول گیا کہ وہ کبھی یہاں سے کہیں گئی تھی۔ اس کی زندگی کے پانچ سال کہاں گم ہو گئے تھے' سوچنے پر بھی یاد نہ آتا۔ دراصل اسے سوچنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ صارم کی محبت' بچوں کی دیکھ بھال' دادی کی خدمت' چچی امی کی فرماں برداری میں ہی وقت گزرتا جا رہا تھا۔

سب خوش تھے' روبی کی دوستی پھر سے استوار ہو گئی۔ مزنہ باجی اس کے مشورے سے کپڑے سلواتیں۔ عرشیہ خالہ کو بھی کسی کا رشتہ کرانے کے لیے اس کا مشورہ درکار ہوتا۔ یہ سب وہ ہی لوگ تھے جو اس سے بے زار تھے۔ اس کے وجود سے نالاں' مگر اب جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ وہ اس فیملی میں ایسے فٹ تھی جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔

"قسمت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اللہ پر بھروسا اور یقین ہونا چاہیے' جو صارم نے کیا' جو چاہا' پا لیا۔"

یہ دادی کے الفاظ تھے۔ جن کو اس نے گرہ میں باندھ لیا تھا۔

٭



راشدہ رفعت

آج پھر صبح سے ہی گھر میں ایمر جنسی نافذ تھی۔ نزہت آپی کو دیکھنے کچھ لوگ آرہے تھے۔ سارہ نے صفائی ستھرائی کر کے گھر کا کونا کونا چمکا دیا تھا۔ نزہت آپی کچن میں مصروف تھیں' اگرچہ مہمان کھانے پر مدعو نہیں تھے۔ لیکن چائے کے ساتھ پیش کیے جانے والے لوازمات اتنے تھے کہ کھانے کی کسر پوری ہوجاتی۔ چیزیں تو بازار سے بھی منگوائی جاسکتی تھیں' لیکن ایک تو اس سے گھر کے بجٹ پر کاری ضرب لگتی' پھر مہمانوں کو نزہت آپی کا سلیقہ دکھانا بھی تو مقصود تھا۔ بلاشبہ ان کے ہاتھ میں اتنا ذائقہ تھا کہ جو کھاتا انگلیاں چاٹتا رہ جاتا' حالانکہ سارہ کا ذاتی خیال یہ تھا کہ اب وہ زمانے گزر گئے جب لڑکے والوں پر لڑکی کے سلیقے کا رعب ڈالا جاتا تھا' لیکن ان کی بھولی ماں شاید ابھی تک اپنے زمانے میں جی رہی تھیں' جب لڑکی کی شکل و صورت سے زیادہ اس کے کاڑھے گئے تکیے اور کشن زیادہ غور سے ملاحظہ کیے جاتے تھے۔

خیر میمونہ بیگم کا بھی کیا قصو تھا' ان کے پاس جو اوصاف تھے وہ ہی اولاد میں منتقل کر سکتی تھیں نا۔

اس نیک نام اور وضع دار سفید پوش گھرانے کے حالات ہمیشہ سے آج جیسے نہیں تھے۔ جب ابصار صاحب زندہ تھے تو اس گھرانے کی گزر بسر بہت خوش اسلوبی سے ہوتی تھی۔ دو بیٹیاں اور ایک چھوٹا بیٹا' ایک خوش باش اور مکمل خاندان' ایک حادثے کے نتیجے میں ابصار صاحب زندگی کی بازی ہار گئے تو پورے خاندان پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ سب سے بڑی نزہت نویں جماعت کی طالبہ تھی اور چھوٹے نعمان نے تو ابھی ڈیڑھ دو برس پہلے ہی اسکول جانا شروع کیا تھا۔

میمونہ بیگم کو اللہ نے بھائی کی نعمت سے محروم رکھا تھا۔ ماں' باپ راہی عدم سدھار گئے تھے۔ سسرال بھی لمبا چوڑا نہ تھا۔ دو جیٹھ' دونوں ہی عیال دار تھے۔ بمشکل اپنی زندگی کی گاڑی ــــ کھینچ تان کر گھسیٹ رہے تھے۔ انہیں چاہنے کے باجود سہارا نہ دے پائے' اکلوتی نند شادی شدہ اور صاحب حیثیت تھی۔ مگر بھرے پرُے سسرال میں رہتے ہوئے وہ بیوہ بھاوج کی مالی مدد کرنے سے قاصر تھی۔ ہاں ان کے شانے پر دھرا ایک بوجھ ضرور کم کر دیا۔ اپنے بڑے بیٹے کے لیے ان کی سارہ کا ہاتھ مانگ لیا۔ بے شک دونوں ابھی بچے تھے۔ لیکن بڑوں میں بات طے ہو گئی تھی۔

میمونہ بیگم کے لیے ایسے کڑے وقت میں یہ جذباتی سہارا ہی بہت تھا کہ خاندان والے کسی نہ کسی طرح ان کے ساتھ ہیں۔ دو دکانوں کے کرائے' سلائی مشین کے ساتھ اور اللہ کے بھروسے پر انہوں نے نئی زندگی کا آغاز کیا۔

گھر کے حالات دیکھتے ہوئے نزہت ایف اے کے بعد گھر بیٹھ گئی' البتہ پرائیویٹ بی اے کر کے تعلیم کا سلسلہ مکمل کر لیا تھا۔ سارہ نے البتہ اپنی ذہانت کے بل بوتے پر وظائف بھی حاصل کیے اور ٹیوشن پڑھا کر تعلیمی مدارج کامیابی سے طے کرتے ہوئے یونیورسٹی

جا پہنچی تھی۔ اب تو اس کا ٹیوشن سینٹر ٹھیک ٹھاک چل نکلا تھا۔ شام کے وقت آس پاس کے گھروں سے ڈھیروں بچے اس کے پاس پڑھنے آتے تھے۔ اس کی اپنی پڑھائی کے علاوہ گھر کے کئی خرچے ٹیوشن کی آمدنی سے پورے ہوتے تھے۔ کسی حد تک مالی آسودگی تو حاصل ہوگئی تھی، لیکن میمونہ بیگم کی پریشانی کی اصل وجہ نزہت کی بڑھتی عمر تھی۔

نزہت بتیس برس کی ہو چکی تھی، لیکن اب تک کوئی مناسب رشتہ نہ مل پایا تھا۔ اس کا ذرا سا چھوٹا قد رشتے کے لیے آنے والوں کو بہت بڑا عیب لگتا، اکثر و بیشتر اسی بنا پر وہ رد کر دی جاتی۔ لیکن ہر بار جب بھی رشتے کروانے والی بوا کوئی نیا رشتہ لے کر آتیں تو میمونہ بیگم پچھلے تجربے کو بھلا کر نئی آس میں مبتلا ہو جاتیں۔ نزہت خود بھی ماں کی پریشانی سمجھتی تھی، سو اس رشتہ پریڈ سے حد درجہ بے زار ہونے کے باوجود اپنی بے زاری گھر والوں پر ظاہر نہ کرتی اور چپ چاپ ماں کی ہدایات بجا لاتی۔ اس وقت بھی وہ کچن میں چنا چاٹ اور دہی بڑے بنانے میں مصروف تھی، جب سارہ نے اندر جھانکا۔

"بس آپی! اب آپ ریسٹ کریں، بلکہ ایک اچھی اور بھرپور نیند لے لیں، تاکہ شام کو مہمانوں کے سامنے بالکل فریش دکھائی دیں۔ باقی سارا کام میں سمیٹ لوں گی۔" سارہ نے کچن میں آکر بہن کو مخاطب کیا۔

"ابھی ذرا دیر میں تمہارے ٹیوشن والے بچے آنے شروع ہو جائیں گے، پھر ان کے ساتھ دماغ کھپانا پڑے گا۔ تم بھی تو صبح سے صفائی میں لگی ہوئی ہو، جاؤ تم ذرا دیر کو کمر سیدھی کر لو۔" نزہت نے نرمی سے جواب دیا۔ شام کو مہمانوں کی آمد کی وجہ سے سارہ نے ٹیوشن کے بچوں کو وقت سے ذرا پہلے بلایا تھا۔

"آج میں نے سب بچوں کو ٹیسٹ دیا ہوا ہے، بیٹھ کر کرتے رہیں گے۔ امی کو نگرانی پر بٹھا دوں گی اور چھوٹے بچوں کو بھی آج امی اور نومی سنبھال لیں گے، بس آپ نکلیں کچن سے، سارا وقت کچن میں چولہے کے سامنے کھڑی رہتی ہیں، اپنی اسکن کا خیال رکھا کریں۔"

سارہ نے اسے کچن سے بھیج کر ہی دم لیا۔

☼ ☼ ☼

شام کو جب مہمان آئے تو ہر کام بخیر و خوبی نبٹ چکا تھا۔ نزہت بھی نہا دھو کر ہلکے آسمانی رنگ کے کاٹن کے سوٹ میں کافی اچھی لگ رہی تھی۔

"اللہ کرے اس بار تو بات بن ہی جائے۔"

جب وہ ٹرالی گھسیٹ کر کمرے میں لائی تو میمونہ بیگم نے دل سے دعا کی تھی۔ سارہ بھی بہن کے ساتھ مہمانوں کو چیزیں پیش کرنے لگی۔

لڑکے کی والدہ اپنی دو شادی شدہ اور ایک غیر شادی شدہ بیٹی کے ساتھ لڑکی دیکھنے آئی تھیں۔ جس وقت وہ لوگ نزہت کی بنائی ہوئی چیزوں سے بھرپور انصاف کرتے ہوئے اس کا انٹرویو کرنے میں مصروف تھیں، اسی وقت ڈرائنگ روم میں سمیعہ کی آمد ہوئی۔ وہ پڑوس میں ہی رہتی تھیں، ان کے دو نٹ کھٹ جڑواں بیٹے سارہ کے پاس ٹیوشن پڑھتے تھے، اب بھی وہ ان کا ہاتھ تھامے ٹیوشن کے لیے ہی چھوڑنے آئی تھیں۔

"سمیعہ باجی! بچے تو سب پڑھ کر چلے گئے۔ آج پہلے بلایا تھا میں نے، ان کی نوٹ بک پر لکھ کر بھی دیا تھا۔" سارہ نے انہیں یاد دلایا۔

"سوری بھئی ان لوگوں نے مجھے کاپی نہیں دکھائی، میں شاید غلط وقت پر آگئی ہوں۔ آپ لوگوں کے گیسٹ آئے ہوئے ہیں۔" سمیعہ نے شرمندہ ہوتے واپس پلٹنا چاہا۔

"کوئی بات نہیں بیٹی، آجاؤ، چائے پی کر چلی جانا۔" شفیق سی میمونہ بیگم نے انہیں شرمندگی کے اثر سے باہر نکالا اور سدا کی بے تکلف سمیعہ نے فوراً اس آفر کو قبول کر لیا۔ حالانکہ سارہ ذرا سی جز بز بھی ہوئی، پھر بھی ماں کے اشارے پر انہیں پلیٹ میں دہی بڑے ڈال کر دیے۔ ان کے بیٹوں کے ہاتھ میں ایک ایک

بسکٹ تھمایا۔ ابھی ایک، دو ماہ پہلے ہی آذر اور شاہ ذر اسکول میں داخل ہوئے تھے۔ دونوں بہت پیارے، بلا کے ذہین، مگر شرارتی تھے۔ آج جانے کیسے شرافت سے سر جھکائے بیٹھے بسکٹ کھانے میں مصروف تھے۔ سارہ نے انہیں پیار سے دیکھا تھا۔

"اچھا تو تم بھی ٹیوشن وغیرہ پڑھاتی ہو؟" لڑکے کی ماں نے نزہت آپی کے انٹرویو کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔

سارہ نے بچوں پر سے نظریں ہٹا کر انہیں دیکھا۔ کیسا پُرغرور انداز تھا ان کا، سارہ کو سخت برا لگا۔ نزہت آپی بھی ان لوگوں کے پے در پے سوالوں سے نروس سی لگ رہی تھیں، تب ہی سمیعہ بول پڑیں۔

"دہی بڑے بہت ٹیسٹی ہیں نزہت! سچ میں نے تمہارے ہاتھ کے بنے دہی بڑوں سے ٹیسٹی دہی بڑے آج تک نہیں کھائے۔" انہوں نے کھلے دل سے تعریف کی تھی۔

"آج کل گھر میں یہ چیزیں بنانے کا تردد کون کرتا ہے بھئی! نہ کسی کے پاس اتنا فارغ وقت ہوتا ہے اور پھر جب چار پیسے خرچ کر کے ہر چیز بازار سے مل جاتی ہے تو گھر پر یہ چیزیں بنانے کی دردسری کون مول لے۔"

لڑکے کی بڑی بہن نے نخوت سے کہا، سب کے سب ایک لمحے کو چپ رہ گئے۔

"یہ تو صحیح کہہ رہی ہیں باجی آپ۔" سمیعہ نے فوراً ان کی بات سے اتفاق کیا تھا۔ باجی کہنے پر لڑکے کی بہن واضح طور پر تلملائی تھیں، مگر کچھ بولیں نہیں۔

"اچھا سارہ! میں چلتی ہوں، کل تو ٹائم پر ہی آئیں نا یہ لوگ؟" سمیعہ نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

سارہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ سمیعہ اپنے دونوں بچوں کو لے کر چلی گئیں۔ مہمان بھی ذرا دیر بیٹھنے کے بعد چلے گئے تھے۔

عجیب نک چڑھی سی فیملی تھی۔ حالانکہ لڑکے کی چھوٹی بہن تو سارہ کی ہم عمر ہی تھی، اس نے کتنی بار اس سے گفتگو کا سلسلہ جوڑنے کی کوشش کی تھی۔ مگر ہوں ہاں سے زیادہ جواب نہ ملا تو وہ بھی مایوس ہو کر خاموش ہو گئی تھی۔ لڑکے والوں کے انداز و اطوار سے سارہ نے یہ ہی اندازہ لگایا کہ بات بنے گی نہیں اور ہوا بھی یہ ہی، تین دن بعد رشتہ کروانے والی بوا ان کا جواب لے کر آگئی تھیں۔

سارہ صحن میں بچوں کو پڑھا رہی تھی۔ اتفاقاً آج بھی سمیعہ اپنے بیٹوں کے پیچھے ان کی کاپیاں وغیرہ دینے آئی تھی اور برآمدے میں امی کے پاس بیٹھی بوا کی پاٹ دار آواز سارہ کے ساتھ سمیعہ کے کانوں تک بھی بآسانی پہنچ رہی تھی۔

"سچی بات ہے کہ اپنی نزہت ان لوگوں کو جچی نہیں، لڑکے کی ماں، بہنیں کہہ رہی تھیں کہ لڑکی کا قد بھی چھوٹا ہے اور رنگ بھی دبتا ہوا ہے، حالانکہ میں نے تو سمجھانے کی کوشش کی، رنگت کوئی دبتی ہوئی نہیں، ایسی کھلتی ہوئی گندمی رنگت ہے اور قد چھوٹا ہے تو کیا ہوا تمہارا بیٹا بھی کوئی عالم چنا تو نہیں۔ ہیل والے سینڈل پہن کر ایسی اچھی لگے گی تمہارے بیٹے کے ساتھ، مگر نہ جی، ان کے تو نخرے ہی آسمانوں کو چھو رہے ہیں، میں نے بھی کہا، دفع دور، نہیں کرنا رشتہ تو نہ سہی، ہماری نزہت کو کوئی رشتوں کی کمی تھوڑی ہے۔" بوا جی نے چائے میں بسکٹ ڈبوتے ہوئے بنا

کسی لاگ لپٹ کے ساری صورت حال بتادی اور پھر اطمینان سے چائے، بسکٹ سے انصاف کرنے لگیں۔ میمونہ بیگم جیپ کی چپ رہ گئی تھیں۔

سارہ بظاہر ایک بچی کو سوال سمجھانے میں مصروف تھی۔ مگر کاپی پر دھرے اس کے ہاتھ کی لرزش اور چہرے کی تمتماہٹ اس کے اندرونی غصے کا پتا دے رہی تھی۔

"اچھا پھر میں چلوں، آج یہ دونوں پھر شرارت کریں تو دو لگانا انہیں۔" سمیعہ نے بھی جانا ہی مناسب سمجھا تھا۔ سارہ محض سرہلا کر رہ گئی۔



تین، چار دن بعد کی بات تھی، جب بوا جی کی دوبارہ آمد ہوئی، اس بار وہ کوئی رشتہ لے کر نہیں آئی تھیں، بلکہ اپنی کند ذہن پوتی کو سارہ کے پاس ٹیوشن پڑھوانے لائی تھیں۔ امی نے آج بھی انہیں چائے پیے بغیر نہ جانے دیا۔ حالانکہ سارہ کا دل چاہ رہا تھا کہ ان کی چائے میں چینی کے بجائے نمک ڈال دے۔ آج تک وہ جو بھی رشتے لے کر آئی تھیں، وہ محض دل دکھانے اور عزت نفس مجروح کرنے کا باعث بنے تھے۔ اس نے ان کے سامنے رکھی تپائی پر ٹرے تقریباً" پٹخی تھی۔ امی نے بد تہذیبی کے اس مظاہرے پر اسے گھورا مگر بوا جی کا اس جانب قطعاً" دھیان نہ تھا۔ وہ تو کوئی اور ہی قصہ چھیڑے بیٹھی تھیں۔

"بس بھئی یہ تو قسمتوں کے کھیل ہیں۔ ہمارا کام تو لوگوں کو ایک دوسرے سے ملوانا ہے۔ آگے کی چھان پھٹک کرنا لوگوں کی اپنی ذمہ داری، اب کل سمیعہ اور اس کی بہن کو عرفان کے گھر لے کر جا رہی ہوں۔" بوا جی نے میمونہ بیگم کو مخاطب کرتے بتایا تو سارہ ایک دم چونکی۔ عرفان تو شاید اسی بندے کا نام تھا جس کے گھر والے کچھ دن پہلے نزہت کو دیکھ کر انکار کر گئے۔

"بس سارے قسمت کے چکر ہیں۔ رشتہ دیکھنے آئے تھے تمہارے گھر، اور اتفاق سے سمیعہ آگئی۔ وہ بھی اپنے بھائی کے لیے لڑکی تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ عرفان کی چھوٹی بہن اسے بہت پسند آئی، کل سمیعہ اور اس کی بہن کو لے کر ان لوگوں کی طرف جا رہی ہوں، آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔ لڑکا ماشاءاللہ بہت اچھا ہے۔ خوب پڑھا لکھا، سمیعہ بتا رہی تھی انجینئر ہے۔ لاہور میں نوکری ہے، رہائش بھی وہیں کی ہے۔ سمیعہ کو تو لڑکی پسند ہے، اس کی بہن کو بھی پسند آگئی تو بات آگے چلے گی۔" بوا جی چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے تفصیل بتانے لگیں۔

"واقعی بوا جی! قسمتوں کے کھیل ہیں۔" میمونہ دھیمے لہجے میں بس یہ ہی کہہ پائی تھیں۔

"ویسے خدا لگتی کہوں تو لڑکی سمیعہ کے بھائی کے پاسنگ بھی نہیں ہے۔ جانے سمیعہ کو کیا بات پسند آئی اس میں۔ اس کا بھائی تو کیا گبھرو جوان ہے۔ تصویر دکھائی تھی اس نے مجھے۔ میں نے کہا لڑکی والوں کو بھی دکھا دیتی ہوں تو فٹ سے پھر اپنے پرس میں رکھ لی کہ ابھی نہیں، بات آگے بڑھی تو اپنے بھائی کو ہی بلوا لوں گی۔ تصویر سے کہیں زیادہ خوب صورت ہے میرا بھائی۔ میں نے کہا، چلو بھئی جیسے تمہاری مرضی، خیر! لڑکی والوں کے سامنے نقشہ تو کھینچ دیا میں نے اس کے بھائی کا۔ خوب ہی دلچسپی لے رہے تھے۔ مجھے پانچ سو کا نوٹ بھی پکڑا دیا۔ خیر سے رشتہ طے ہو گیا تو سمجھو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ آج کل تو جانے کیسا زمانہ آگیا رشتے کی کوئی بیل منڈھے نہیں چڑھتی پہلے تو لوگوں کو رشتہ دکھانے کی دیر ہوتی تھی، فوراً" ہی شگن کا روپیہ لڑکی کی ہتھیلی پر رکھ دیتے تھے۔ میری بہشتی ساس تو اتنی اعتبار والی وچولن سمجھی جاتی تھی کہ بڑے بڑے گھرانے صرف اس۔۔۔۔"

بوا جی ماضی کی راکھ کریدنے لگی تھیں۔ سارہ مرے مرے قدم اٹھاتی واپس پلٹ گئی۔ اس کی طبیعت میں حسد کا مادہ رتی برابر بھی نہ تھا، پھر بھی دل میں عجیب سے افسوس نے گھر کرلیا۔ شاید پیسے کو پیسہ کھینچتا ہے۔ سمیعہ کا تعلق بھی خاصے کھاتے پیتے گھرانے سے تھا اور عرفان کی والدہ اور بہنوں کی کلائیوں میں پھنسی سونے کی چوڑیاں ان کی حیثیت کا پتا دے رہی تھیں۔

ورنہ عرفان کی بہن میں کوئی ایسی خاص بات تو نہ تھی کہ سمیعہ کو اپنے خوبرو بھائی کے لیے پسند آگئی۔

"خیر! مجھے کیا، نصیب اپنا اپنا۔" اس نے منفی سوچوں کو ذہن سے جھٹکا تھا اور پھر بہت دل سے اپنی نزہت آپی کے نصیب جلد کھلنے کی دعا کی تھی۔



بوا جی آج پھر اپنی روتی بسورتی پوتی کو ٹیوشن کے لیے چھوڑنے آئی تھیں۔

"دیکھ یہ دونوں تجھ سے کتنے چھوٹے ہیں، پر آرام سے بیٹھ کر پڑھ رہے ہیں۔" انہوں نے اپنی پوتی کی توجہ سمیعہ کے دونوں بچوں کی جانب دلوائی۔ جو واقعی سر جھکائے ڈرائنگ بک میں رنگ بھرنے میں مصروف تھے۔

"آئیں بوا جی، بیٹھیں۔" آج میمونہ گھر پر نہ تھیں، سو سارہ کو آداب میزبانی نبھانا پڑے۔

"بیٹھتی ہوں بیٹا! ایک تو اس گرمی نے عاجز کر رکھا ہے، اوپر سے اس لڑکی نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ چھٹے سال میں لگ گئی پر پڑھنے لکھنے کا نام نہیں لیتی۔ بچوں کی طرح حلق پھاڑ کر روتی ہے۔ اتنی مشکل سے گھسیٹ کر لائی ہوں اسے۔ حالانکہ آج ایک جگہ لازمی پہنچنا تھا۔ دیر کروادی اس نگوڑماری نے۔" بوا جی واقعی ہانپ رہی تھیں۔ سارہ نے انہیں بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کی۔

"آپ روز ہی کسی مشن پر نکلی ہوتی ہیں اور بات کہیں بھی نہیں بنتی۔" سارہ آج طنز کیے بغیر نہ رہ پائی، لیکن بوا جی نے قطعاً" برا نہ مانا تھا۔

"سولہ آنے صحیح بات کی ہے بیٹا! روز بوڑھی ہڈیاں اس آس پر گھسیٹتی ہوں کہ کوئی رشتہ طے ہو تو معقول رقم ہاتھ میں آئے۔ صرف رشتہ دکھانے پر تو سو پچاس روپے ملتے ہیں۔ فائدہ تو ہمیں تب ہی ہوتا ہے، جب بات پکی ہو۔ دونوں طرف سے منہ مانگے پیسے تو ملتے ہی ہیں، ایک جوڑا الگ سے اور مٹھائی کا ڈبا بھی ضرور لیتی ہوں، مگر بات بنے تب نا، اللہ جانے کیوں اب تو لڑکے والوں کے مزاج ہی نہیں ملتے، پتا نہیں کیسی لڑکیاں چاہیے ہوتی ہیں انہیں۔ میں تو کہتی ہوں کہ آرڈر پر بنوا لو تب ہی تمہاری ڈیمانڈ پوری ہو سکتی ہے، ورنہ تو ہرگز نہیں۔" بوا جی حد سے زیادہ جلی بھنی بیٹھی تھیں۔

"کیوں اب کیا ہوا بوا جی؟" سارہ نے پھیکے سے انداز میں ہنستے ہوئے دریافت کیا۔

"ہونا کیا تھا بٹی! سمیعہ اور اس کی بہن کو لے کر گئی تھی، ایک رشتہ دکھانے۔ ارے وہ ہی لوگ جو تمہاری طرف بھی آئے تھے اپنی نزہت کے لیے۔ عرفان کی چھوٹی بہن شمائلہ۔" بوا جی نے اسے لاعلم جان کر وضاحت کی۔

"معلوم ہے مجھے، پھر کیا ہوا؟" سارہ نے فطری تجسس سے مجبور ہو کر پوچھا۔

"ہونا کیا تھا، سمیعہ کو تو لڑکی اچھی لگی تھی، جب ہی اپنی بہن کے ساتھ رشتہ لے کر پہنچ گئی وہاں۔ پھر میں نے عرفان کے گھر والوں سے لڑکے کی خوب ہی تعریفیں کر ڈالیں۔ ایسا بچھ بچھ گئے وہ لوگ سمیعہ اور اس کی بہن کے آگے۔ چائے کے ساتھ بیسیوں طرح کے لوازمات سجا دیے میز پر۔ خوب ہی آگے پیچھے پھرے اور اگلے دن سے ہی میرے سر ہو گئے کہ سمیعہ کے پاس جا کر جواب لے کر آؤں۔ چار چکر کٹوائے اس سمیعہ کی بچی نے مجھے، پھر کہہ دیا میری بہن کو لڑکی پسند نہیں آئی، کہتی ہیں، اس کی ناک پھینی ہے اور آنکھیں چھوٹی، اب بھلا بتاؤ اس سب میں میرا قصور کہاں سے نکلتا ہے، میں نے جب لڑکی والوں کو یہ جواب پہنچایا تو ناراض ہو کر مجھے ہی دس باتیں سنا ڈالیں۔ تم خود بتاؤ بٹی! یہ کہاں کا انصاف ہے کہ لڑکی میں عیب نکالیں لڑکے والے اور بری بنوں میں۔ میرا کام تو پل کا سا ہے، ادھر کی رائے ادھر بتانا پڑتی ہے اور ادھر کا جواب ادھر، لیکن سارا ملبہ بے چاری بوا جی پر ہی گرتا ہے۔" آج بوا جی حد سے زیادہ دکھی ہو رہی تھیں۔

سارہ کو ان پر ترس بھی آیا اور ہنسی بھی۔ جب نزہت

آپی کے لیے وہاں سے انکار ہوا تھا تو بے شک زبان سے نہ سہی پر دل میں ایک خاموش خیال ضرور پیدا ہوا تھا کہ کاش جس طرح ان لوگوں نے ہمارا دل دکھایا ہے، ان کے ساتھ بھی کبھی ایسا ہی معاملہ درپیش ہو۔ اسے ہرگز اندازہ نہ تھا کہ یہ خاموش دعا اتنی جلدی قبولیت کا درجہ پا جائے گی۔ لیکن سمیعہ وغیرہ کی طرف سے جس پست ذہنیت کا مظاہرہ ہوا تھا سارہ کو اس پر بھی افسوس ہوا تھا۔ بظاہر روشن خیال نظر آنے والی فیملی سے اس بات کی توقع نہ تھی۔

سمیعہ کی بہن کو ایک، دو بار اس نے سمیعہ کے گھر میں دیکھا تھا۔ دیکھنے میں تو وہ بھی سمیعہ کی طرح بہت پر خلوص، ملنسار اور خوش اخلاق لگی تھی۔ اسے کسی لڑکی میں یوں عیب نکال کر ٹھکرانا نہیں چاہیے تھا۔ اسے بیک وقت عرفان کے گھر والوں کو ملنے والے جواب پر خوشی بھی ہو رہی تھی اور سمیعہ وغیرہ کے طرز عمل پر افسوس بھی۔ ان ہی متضاد کیفیات میں گھری وہ بوا جی کی بات سننے گئی۔ دو گھڑی بیٹھ کر بوا جی چلی گئیں تو وہ بھی ساری سوچیں ذہن سے جھٹک کر پھر سے بچوں کو پڑھانے لگی۔



بالآخر ان سب کی دعائیں رنگ لے آئیں۔ اس بار بوا جی جو رشتہ لے کر ہی آئیں وہ بہت مہذب اور معقول لوگ تھے۔ ان ہی کی طرح سفید پوش گھرانے سے تعلق تھا۔ دولت کے بجائے شرافت اور نجابت کو ترجیح دینے والے انہیں اپنے جیسے اقدار پسند لوگوں کی تلاش تھی۔ نزہت کے ہاتھ پر شگن کا روپیہ رکھ کر انہوں نے اپنی طرف سے بات پکی کر دی۔ میمونہ بیگم بھی اپنی نند اور بڑے جیٹھ کے ساتھ جا کر لڑکے کو دیکھنے کے بعد سند قبولیت بخش آئیں۔ وہ اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھیں۔ جس نے ان کی دعاؤں کو قبولیت کا درجہ دیا۔ ہر آنے جانے والا بھی انہیں مبارک باد دے رہا تھا۔

اس روز سمیعہ آئیں تو اس نے بھی انہیں بہت گرمجوشی سے مبارک باد دی۔

"بس بیٹی اللہ نے مجھ گناہ گار پر کرم کر دیا، ورنہ میں تو بھانت بھانت کے لوگوں کو دیکھ کر مایوس ہو چکی تھی۔ خاندان برادری میں نزہت کے جوڑ کا کوئی تھا نہیں اور باہر سے جو بھی رشتہ آیا دل دکھانے کا سبب ہی بنا، لیکن اللہ نے خاص کرم کیا۔ عبدالمبین اور اس کا گھرانہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا میں نے اپنی بچی کے لیے دعاؤں میں مانگا تھا۔" میمونہ بیگم کی آنکھیں تشکر کے احساس سے بھیگ گئی تھیں۔

"اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں آنٹی! پھر پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، اگر ظاہر کو ترجیح دینے والے لوگ اس دنیا میں پائے جاتے ہیں تو باطن کی خوبصورتی ڈھونڈنے والے بھی کم نہیں۔"

"کم از کم آپ تو ایسی بات نہ کہیں سمیعہ باجی!" سارہ بے اختیار انہیں ٹوک بیٹھی تھی۔

"کیوں بھئی، میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے کیا؟" وہ حیران ہوئیں۔

"نہیں، نہیں بات تو آپ کی بالکل درست ہے۔" سارہ نے ماں کے سامنے بحث سے گریز کیا۔ مگر ذرا دیر بعد جب میمونہ بیگم کسی کام سے اٹھ گئیں تو سمیعہ مسکراتے ہوئے اس کے پاس آ بیٹھیں۔

"ہاں تو جناب! اب اپنی بات کی وضاحت فرمائیں۔"

"چھوڑیں سمیعہ باجی! ویسے ہی میرے منہ سے بات نکل گئی۔" اس نے انہیں ٹالنا چاہا۔

"نہیں یہ بات ایسے ہی تو نہیں کہی تم نے۔" انہوں نے نفی میں گردن ہلائی۔

"بات صرف اتنی سی ہے کہ بوا جی نے بتایا تھا کہ آپ لوگ اپنے بھائی کے لیے لڑکی دیکھنے گئے تھے اور اس کی شکل و صورت میں خامی نکال کر انکار کہلوا دیا۔ مجھے آپ سے اس بات کی توقع نہیں تھی باجی!" اس بار اس نے صاف گوئی سے کہہ دیا۔

"تمہیں پتا ہے میں اپنے بھائی کے لیے کون سی لڑکی دیکھنے گئی تھی؟" سمیعہ نے پوچھا۔

"جی، پتا ہے۔" اس نے رسانیت سے جواب دیا۔

"اور پھر بھی تمہیں ہمارا انکار برا لگا؟" سمیعہ کو اچنبھا ہوا۔

"انکار نہیں، انکار کا طریقہ۔" سارہ ہولے سے بولی تھی۔

"وہ لوگ بھی تو اسی طریقے سے انکار کر گئے تھے۔" سمیعہ نے اسے یاد دلایا۔

"چلیں مان لیا کہ ان لوگوں کے ساتھ جو ہوا صحیح ہوا، لیکن ان لوگوں کو ایک طرف رکھ کر دیکھیں تو آپ لوگوں کی بات تو غلط تھی نا؟"

"تو ڈیئر سارہ! ان لوگوں کو ایک طرف کریں ہی کیوں؟ وہ لوگ یہ ڈیزرو کرتے تھے اسی لیے ان کے ساتھ ایسا ہوا۔" سمیعہ معنی خیز انداز میں مسکرائی تھی۔

"یعنی؟" سارہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں، سمیعہ بس مسکراتی رہیں۔

"یعنی آپ لوگوں کا وہاں رشتہ لے جانے کا مقصد یہ ہی تھا کہ انہیں انکار کہلوایا جائے؟" سارہ اب بھی بے یقین تھی۔

"تم شاید ایسے میری بات درست طور پر نہ سمجھ پاؤ، اس کے لیے تمہیں میرے ساتھ میرے ماضی میں جھانکنا پڑے گا۔" اس بار سمیعہ گہری سانس کھینچتے ہوئے سنجیدہ ہوئی تھیں، پھر انہوں نے دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا۔ سارہ ہمہ تن گوش تھی۔

"تمہاری اور ہماری فیملی میں حیران کن حد تک مماثلت ہے سارہ! جتنی عمر میں تمہیں یتیمی کا داغ سہنا پڑا کم و بیش میری بھی اتنی ہی عمر تھی جب میرے والد کا انتقال ہوا۔ مجھ سے بڑی دو بہنیں اور تھیں، ابا جی کیا مرے ہمارے سر سے جیسے کسی نے سائبان چھین لیا ہو، مجھے اعتراف ہے کہ تم لوگوں کی نسبت ہماری زندگی ذرا سہل طریقے سے گزری کہ مالی مشکلات نہ تھیں۔ ابا جی کے محکمے سے ملنے والا فنڈ، زرعی زمینوں کی آمدنی سب کچھ گزارے کے لیے بہت تھا، پھر ہمیں ننھیال والوں کی بھی مکمل سپورٹ حاصل رہی، لیکن دوسرے مسائل بہت گمبھیر تھے۔

شاہینہ آپی کی عمر نکلتی جا رہی تھی، لیکن کوئی مناسب رشتہ مل کر نہ دے رہا تھا۔ خاندان میں کوئی ان کی عمر کا نہ تھا اور خاندان سے باہر کا جو بھی رشتہ آتا، وہ شاہینہ آپی کے بجائے نوشین آپی کے لیے دست سوال دراز کر دیتا، حالانکہ شاہینہ آپی کم صورت نہ تھیں۔ ہاں، نوشین آپی بلا کی حسین تھیں۔ امی نے اس صورت حال سے تنگ آ کر نوشین آپی کے لیے آیا ایک رشتہ قبول کر لیا اور انہیں رخصت کر دیا۔

میری بات میرے ہوش سنبھالنے سے بھی پہلے دانیال سے طے ہو گئی تھی۔ تم تو جانتی ہو کہ دانیال میرے ماموں زاد ہیں۔ امی میری طرف سے تو بے فکر تھیں، بالکل ایسے جیسے آنٹی تمہاری طرف سے بے فکر ہیں، لیکن مسئلہ شاہینہ باجی کی بڑھتی عمر کا تھا۔ بہت کڑا وقت تھا وہ ہمارے لیے۔ ہر دس، پندرہ دن کے وقفے سے ہمارے گھر میں بھی ویسی ہی رشتہ پریڈ ہوتی جیسی میں ایک عرصے سے تم لوگوں کے ہاں دیکھتی آ رہی ہوں، مجھے تسلیم ہے کہ شادی زندگی بھر کا بندھن ہے، محض کسی پر ترس کھا کر یا ہمدردی میں رشتے نہیں جوڑے جاتے۔ ہر کسی کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی پسند کے مطابق رشتہ ڈھونڈے، جس پر من راضی ہو اسی کو قبولیت بخشے، لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ جو لڑکی آپ کے معیار پر پوری نہ اترے تو جواب دیتے وقت ایسے جواز تراشے جائیں کہ لڑکی کی انا، شخصی وقار، بھرم سب ریزہ ریزہ ہو جائے۔ "ہمیں آپ کی بیٹی پسند نہیں آئی، اس کا رنگ دبتا ہوا ہے، ہمارے بھائی کے ساتھ جچے گی نہیں یا بھئی لڑکی کا ماتھا تو بہت چوڑا ہے، قد چھوٹا ہے، ناک پھینی ہے۔"

استغفار، ایسے بے ہودہ اعتراضات؟ انکار کرنے کا کوئی شائستہ طریقہ بھی ہوتا ہے اور پھر حد یہ کہ جو لوگ خود لڑکی دیکھنے آئے ہیں ان کے اپنے پہلو میں کوئی نہ کوئی ایسی صورت ضرور موجود ہوتی ہے جو خود بھی ایسے ہی کسی اعتراض کا با آسانی نشانہ بن سکتی ہے۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی سارہ! کہ جب بھی کوئی شاہینہ

آپی کی شکل و صورت میں خامی نکال کر انکار کرتا تو میرا غصے کے مارے کتنا برا حال ہو جاتا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ میری پیاری آپی کا خود پر سے اعتماد ختم ہوتا جا رہا تھا۔ وہ حد درجہ ڈپریسڈ رہنے لگی تھیں اور میرا جی چاہتا کہ جو لوگ اس بھونڈے طریقے سے انکار کہلواتے ہیں میں بھی ایسے لوگوں کے ہاں کوئی رشتہ لے کر جاؤں اور بالکل اسی طرح انکار کر کے انہیں ان کے رویّے کی بدصورتی کا احساس دلاؤں، لیکن جب بھی میں اپنے گھر والوں کے سامنے اپنے ایسے کسی ارادے کا اظہار کرتی تو اس بے وقوفانہ بات پر ڈانٹ ہی سننے کو ملتی، ظاہر ہے یہ ناقابل عمل بات تھی اور پھر میں گھر کی سب سے چھوٹی بے وقوف بچی تھی، میری بات کو کون سنجیدگی سے لیتا، لیکن پھر اللہ نے کرم کیا۔ شاہینہ آپی کی شادی ہو گئی، میری امی بہ طریق احسن اس فرض سے سبکدوش ہوئیں انعام بھائی سعودیہ میں ملازمت کرتے تھے۔ بہنوں کو بیاہتے بیاہتے ذرا سی عمر زیادہ ہو گئی تھی، لیکن وہ میری شاہینہ آپی کے لیے واقعی اللہ کا انعام ثابت ہوئے۔ شاہینہ آپی ان کے سنگ بھرپور اور خوش گوار زندگی بسر کر رہی ہیں۔ چار بچے ہیں ان کے وہیں سعودیہ میں ہی ہوتی ہیں۔

میں نے گریجویشن کر لیا تو امی نے مجھے بھی ٹھکانے لگا دیا، حالانکہ میں نے بہت شور مچایا کہ کم از کم ماسٹرز تو کر لینے دیں، لیکن یہ جو تمہارے پڑوس میں دانیال صاحب رہتے ہیں نا انہوں نے آنکھیں دکھائیں کہ خبردار، شادی لیٹ کرنے کا نام نہ لینا۔ بیس سال منگنی کا عرصہ کم نہیں ہوتا۔ تم شرافت سے رخصتی پر راضی ہو جاؤ۔ شادی کے بعد میں تمہیں ڈبل ایم اے کروا دوں گا، مگر کہاں کا ڈبل ایم اے جی.... شادی کے ایک برس بعد ہی ڈبل بچے گود میں آ گئے۔" سمیعہ کا اشارہ اپنے جڑواں بچوں کی جانب تھا۔ سارہ کو ان کے انداز پر ہنسی آ گئی۔

"ویسے سچ کہوں تو آج کل تم لوگوں کی وجہ سے مجھے کچھ سکون کا سانس نصیب ہوتا ہے۔ وہ دو، تین گھنٹے جو بچے تمہارے پاس گزارتے ہیں پورے دن میں میرے لیے سب سے سکون کا وقت وہی ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ جڑواں بچے پیدائش کے فوراً" بعد سنبھالنا مشکل ہوتے ہیں۔ انسان عادی نہیں ہوتا نا، لیکن میرے لیے ان کی شیر خوارگی کا زمانہ بہت آسان تھا۔ کم از کم آج کل کی نسبت تو بہت آسان تھا، یہ تو جیسے جیسے بڑے ہو رہے ہیں اتنے شرارتی ہو گئے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ مجھے تو لگتا تھا کہ ان کی شرارتوں سے تنگ آ کر تم ان کی چھٹی نہ کر دو، لیکن تم نے میرے بچوں کو بہت اچھے طریقے سے ہینڈل کیا اور شاید ان کو یہاں ٹیوشن لگوانے کے بعد میرا یہاں آنا جانا بڑھا، ورنہ پہلے تو رسمی آشنائی تھی، لیکن چند مہینوں میں ہی نہ صرف میرے بچے تم لوگوں کے بہت قریب آ گئے بلکہ خود میرا تم لوگوں سے عجیب سا دلی تعلق بن گیا اور جب نزہت کے لیے میں آنٹی کو پریشان دیکھتی تو سچ مانو میں دل سے نزہت کے لیے دعا کرتی تھی اور اس دن میں اچانک آ نکلی جب نزہت کو دیکھنے وہ چند تنک چڑھی خواتین آئی ہوئی تھیں، اور پھر دو، چار دن بعد اتفاق سے بوا جی کا جواب بھی میں نے سن لیا۔

بس برسوں پرانی ___ خواہش بے دار ہو گئی، ایسے لوگوں کو سبق سکھانے اور مزا چکھانے کی، تم تو جانتی ہو کہ میری نوشین آپی کا سسرال بھی اسی شہر میں ہے، دو دن بعد نوشین آپی مجھ سے ملنے آئیں تو میں نے انہیں بہت جتن کر کے منایا کہ وہ میرے ساتھ وہاں رشتہ دیکھنے چلیں۔ بوا جی سے میں پہلے ہی بات کر چکی تھی۔ رشتہ دیکھنا تو ایک بہانہ تھا۔ اصل میں تو انہیں آئینہ دِکھانا مقصود تھا سو انہیں دکھا دیا۔" سمیعہ تفصیل بتا کر ہو گئیں۔

"یعنی وہ سب ڈرامہ تھا؟" حیرت کی زیادتی سے سارہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"آف کورس ڈرامہ یار!" وہ مسکرائیں۔

"حد ہے سمیعہ باجی! حرکت تو غلط ہی تھی آپ کی، ایک لڑکی کے جذبات کو ٹھیس پہنچی۔ جانے اس نے آپ کے بھائی کے حوالے سے کیا کچھ خواب نہ دیکھ لیے ہوں گے۔ جب بوا جی نے ہم لوگوں کے

سامنے آپ کے بھائی کی شان میں اتنے قلابے ملا ڈالے تو وہاں تو جانے کتنی تعریفیں کی ہوں گی۔" سارہ نے انہیں احساس دلانا چاہا۔

"کسی حد تک تم صحیح کہہ رہی ہو، لیکن پہلی بات اگر وہ لڑکی اس روز ساتھ نہ آتی تو شاید میں یہ قدم نہ اٹھاتی، لیکن تم نے اس کے انداز ملاحظہ نہیں کیے تھے، کیسے اکڑ کر تیوریاں چڑھائے بیٹھی تھی، جیسے لڑکی دیکھنے نہ آئے ہوں، لڑکی خریدنے آئے ہوں اور دوسری بات میں ایک گھنٹے سے تمہارے ساتھ فارسی بول رہی ہوں کیا؟ فقط ہم تین بہنوں کا ذکر کیا ہے نا تم سے، بھائی کا نام تک لیا؟ چھ سال ہو گئے ہیں تمہارے پڑوس میں آ کر آباد ہوئے، کبھی میرے سسرال میں میرے کسی بھائی کو آتے دیکھا تم نے؟" سمیعہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"یعنی آپ کا کوئی بھائی سرے سے ہے ہی نہیں؟" سارہ کو حیرت کا دوسرا جھٹکا لگا۔ سمیعہ نے ہنستے ہوئے نفی میں گردن ہلا دی۔

"بھائی کی خواہش مجھے ہمیشہ سے ہی بہت رہی، لیکن اللہ نے اس نعمت سے محروم رکھا، دانیال کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس محرومی کا ازالہ یوں کیا کہ تمہیں اکٹھے دو بیٹے دے دیے۔"

"اگر آپ کا کوئی بھائی ہی نہیں تو آپ نے بوا جی کو کس کی تصویر دکھائی تھی۔" سارہ کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"وہ تصویر؟" سمیعہ پھر ہنسی۔

"اپنے اعصام الحق کی تھی، بلکہ اعصام الحق کی تصویر والا پوسٹ کارڈ تھا۔ تمہیں بتایا نا میں نے کہ میری بات تو تقریباً" بچپن سے ہی دانیال سے طے تھی، سو لڑکیوں کو جو آئیڈیل بنانے والا مرض لاحق ہوتا ہے، اللہ کا شکر ہے کہ میری اس سے جان چھوٹی رہی، میرے دانیال ہی میرے آئیڈیل رہے، لیکن جب بھی کوئی اچھا لگا تو دل میں یہ ہی خواہش پیدا ہوئی کہ کاش یہ میرا بھائی ہوتا۔ کبھی کسی کرکٹر کو دیکھ کر یہ خیال آتا، کبھی کسی ٹیلی ویژن اسٹار کو دیکھ کر، آج کل اعصام الحق کو بھائی بنانے کو دل کرتا ہے، کتنا اچھا لگتا ہے نا کیوٹ سا۔" سمیعہ مزے سے بول رہی تھیں۔

"حد کرتی ہیں سمیعہ باجی آپ، اگر بوا جی وہ تصویر لڑکی والوں کو دکھا دیتیں تو کیا بنتا آپ کا؟ بھلے سے بوا جی کو اعصام الحق کا نہ پتا ہو، باقی تو پوری دنیا جانتی ہے نا۔" سارہ نے ان کی توجہ ایک اہم نکتے کی طرف دلائی۔

"تو بوا جی کو تصویر دی کس نے تھی؟ بس ایک جھلک دکھا کر واپس اپنے پاس رکھ لی۔ اتنی احمق تو میں بھی نہیں تھی کہ اعصام الحق کی تصویر لڑکی والوں کا دکھا کر اس کا رشتہ مانگنے چل پڑتی، پھر تو میرا حشر نشر ہی ہونا تھا۔"

"آپ کو تو جرأت کے اس مظاہرے پر ستارہ جرأت ملنا چاہیے۔ ویسے آپ کو پتا ہے آپ کے بھائی صاحب کی واقعی منگنی ہو گئی ہے۔ ہر چینل اور ہر اخبار میں اس انگیجمنٹ کی کوریج ہوئی ہے، اگر بوا جی کی نگاہ کسی اخباری تراشے پر پڑ گئی تو آپ سے پوچھیں گی نہیں کہ بیٹی! بھائی کی منگنی میں تم نظر کیوں نہیں آ رہیں؟" سارہ نے انہیں ڈرایا۔

"پوچھیں گی تو کہہ دیں گے کہ بھائی نے ہماری مرضی کے خلاف منگنی کی ہے۔ بس اسی لیے ہم نے تقریب کا بائیکاٹ کر دیا۔" سمیعہ نے شاہانہ پن سے جواب دیا۔ اس بار سارہ اپنی زوروں کی ہنسی نہ روک پائی تھی۔

سمیعہ باجی کے طرز عمل سے سو فیصد اتفاق نہ سہی، پر جینے کا یہ انداز اسے پسند آیا تھا۔



دوسری قسط ۲

فرحت اشتیاق

جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو

H شہریار خان ایک نہایت معزز اور اعلا خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ذہانت میں بھی بے مثال اور نہایت سحر انگیز شخصیت کے مالک ہیں۔ اسی وجہ سے وہ خاصے مغرور ہو گئے ہیں۔ ورلڈ بینک میں ایک اعلا عہدے پر فائز ہونے کی وجہ سے شہریار خان اپنے بیوی بچوں کے ساتھ واشنگٹن (امریکا) میں مقیم ہیں۔ ان کی بیوی بھی نہایت خوب صورت اور اعلا تعلیم یافتہ ہیں۔ گھر اور بچوں کی نگہداشت کی خاطر ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہونے کے باوجود وہ ایک گھریلو خاتون ہیں۔ ان کے دو بیٹے ہیں۔ بڑا بیٹا سکندر اپنے باپ کا عکس ہے۔ گو چھوٹا بیٹا زین بھی ذہین اور خوب صورت ہے مگر سکندر، باپ کا عکس ہونے کی وجہ سے شہریار خان کی تمام تر توجہ اور امیدوں کا مرکز ہے۔ باپ کے اس امتیازی سلوک کی وجہ سے زین بچپن سے ہی بے حد حساس اور کم گو ہو گیا ہے۔ وہ اپنے بھائی سے نفرت کرنے لگا ہے۔

لیزا، لندن میں رہتی ہے، مگر اس کا وطن روم ہے۔ اسے اپنے وطن سے بے حد محبت اور انسیت ہے، چنانچہ وہ ہر سال اپنی چھٹیاں روم میں گزارتی ہے۔ روم میں اس کی ملاقات ایک لڑکے سے ہوتی ہے جو اپنا تعارف "سکندر" کے نام سے کرواتا ہے۔ وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں روم آیا ہوا ہے۔ مغرور اور ہینڈسم سا سکندر، لیزا کو بے حد اچھا لگا۔ وہ اس سے دوستی کی خواہاں ہے۔

مکمل ناول



سکندر کو اس کے ہوٹل چھوڑنے کے بعد وہ سیدھی گھر آگئی تھی۔

Fermi Eur پر اس کا اپنا خوب صورت اپارٹمنٹ تھا۔ خوب صورت رہائشی عمارتوں کے بیچ کشادہ سڑک پر یہ ایک چار منزلہ عمارت تھی جس کی تیسری منزل پر اس کا اپارٹمنٹ تھا۔ بیسمنٹ میں مکینوں کے لیے پارکنگ ایریا تھا جبکہ گراؤنڈ فلور سے لے کر چوتھی منزل تک ہر فلور پر بس ایک ایک اپارٹمنٹ تھا۔ تمام اپارٹمنٹس کشادہ اور خوب صورت تھے۔

5 سال قبل اس کے پاپا نے اپنی کچھ پراپرٹی ان دونوں بہنوں میں برابر برابر تقسیم کی تھی تب اپنے حصے کا کچھ پیسہ بینک میں رکھ چھوڑنے کے بعد بقایا رقم سے اس نے یہ اپارٹمنٹ خرید لیا تھا۔ اس سے قبل ہر سال وہ چھٹیوں میں روم آتی تو ہوٹل میں ٹھہرتی تھی۔ اپنا یہ اپارٹمنٹ یہاں خرید کر اسے بڑا سکون ہوا تھا۔ اب اپنے روما سے اس کا رشتہ بہت مضبوط ہو گیا تھا۔ کہ اب یہاں اس کا اپنا گھر تھا۔ وہ سال کے دو ماہ یہاں گزارتی تھی باقی وقت اس کے اپارٹمنٹ کی دیکھ بھال نینی کیا کرتی تھیں۔

کچن سے کام کیے جانے کی آوازیں آرہی تھیں گویا نینی رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھیں۔

"ہائے نینی!" اس نے کچن کے دروازے سے اندر جھانکا۔ رات بھر کے جاگنے اور دوسرے شہر تک جانے آنے کی تھکن اس کے چہرے سے عیاں تھی مگر مسکراہٹ بدستور اس کے لبوں پر موجود تھی۔

"آ گئیں؟ یہ اچانک صبح سویرے تمہیں Naples جانے کی کیا سوجھی؟ صبح ہڑبونگ مچاتی اتنی جلدی میں گئیں، مجھے پوچھنے تک کا موقع نہیں دیا کہ اتنی افراتفری میں جا کس کام سے رہی ہو۔"

نینی نے گردن گھما کر قدرے فکرمندی سے اسے دیکھا۔

ساٹھ سال کی عمر میں وہ اب بھی چاق و چوبند تھیں اور لیزا کو وہ اسی طرح عزیز تھیں جیسے ایک بچے کو اپنی ماں۔ وہ بچپن میں اس کی اور سیم کی آیا تھیں مگر اس نے انہیں کبھی اپنی ملازمہ نہیں سمجھا تھا۔

"لمبی کہانی ہے نینی! ذرا فریش ہو آؤں پھر سناتی ہوں۔" وہ مسکرا کر بولی اور چھپاک سے کچن سے باہر نکل گئی۔

اس کے اپارٹمنٹ میں 2 بیڈ رومز، کچن، ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم کے علاوہ اوپر کی منزل پر واقع ایک کمرہ جسے اس نے اپنا اسٹوڈیو بنا رکھا تھا موجود تھے۔ ایک کمرہ اس کا تھا، ایک نینی کا۔

ڈرائنگ روم زیادہ تر لیونگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ تب ہی اس نے ٹی وی بھی وہیں رکھا ہوا تھا۔

ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم کے بیچ میں کوئی دیوار نہ تھی۔ یہیں سے لکڑی کی گول چکردار سیڑھی اوپر کمرے میں جاتی تھی۔ جہاں آخری اسٹیپ چڑھا اور اوپر کمرے میں موجود۔ وہ کمرہ اندر داخل ہوتے ہی بتا دیا کرتا تھا کہ وہ کسی آرٹسٹ کا اسٹوڈیو ہے۔ وہاں جا بجا اس کی مکمل اور نامکمل پینٹنگز اور پینٹنگز بنانے سے متعلقہ سامان بکھری حالت میں پڑا نظر آتا تھا۔ اسٹوڈیو کا باہر کی طرف کھلنے والا شیشے کا دروازہ چھوٹی سی بالکونی میں کھلتا تھا۔ وہاں اس نے کچھ گملے اور ایک آرام دہ کرسی رکھی ہوئی تھی۔ جب کبھی کام کرتے کرتے تھکاوٹ کا احساس ہوتا یا کئی گھنٹے اسٹوڈیو میں گزارنے پر گھٹن محسوس ہونے لگتی تب وہ بالکونی میں آکر بیٹھ جایا کرتی تھی۔

اپنے اس اپارٹمنٹ کو اس نے اپنی سہولت کے مطابق سیٹ کر رکھا تھا۔ اس کے لندن کے اپارٹمنٹ سے جہاں وہ سال کے 10 ماہ گزارا کرتی تھی، یہ اپارٹمنٹ کہیں زیادہ پیارا تھا جس میں وہ سال کے صرف دو ماہ گزارتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اب پوچھیں آپ کیا پوچھ رہی تھیں؟"

کچن میں موجود 4 کرسیوں والی چھوٹی میز پر وہ اور نینی ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ کبھی اس نے اپنے دوستوں وغیرہ کو کھانے پر بلا رکھا ہوتا تب ڈائننگ روم میں بیٹھ کر کھانا کھایا جاتا تھا ورنہ صرف وہ اور نینی ہوتے تو کچن ہی میں میز پر کھانا، ناشتہ سب ہو جایا کرتا۔

"اتنی افراتفری میں منہ اندھیرے Naples جانے کی وجہ پوچھ رہی تھی۔" نینی نے نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"روبرٹو کا ایک کولیگ ہے، سکندر نام ہے اس کا، روما میں روبرٹو ہی کی کمپنی میں لیگل ایڈوائزر ہے، میں اس سے کئی بار مل چکی ہوں۔ اسے ایک میٹنگ کے لیے نیپلز جانا تھا اس کی ٹرین مس ہو گئی تو بس پھر میں اسے وہاں لے گئی۔ میں نے سوچا اس بہانے Naples بھی دیکھ لوں گی۔ کتنے سال ہو گئے تھے مجھے وہاں گئے۔"

اس نے اپنی پلیٹ میں پاستا ڈالتے ہوئے نینی کو جواب دیا۔

"روبرٹو کے کسی کولیگ کے لیے خود کو اتنا خوار کرنے کی کوئی ضرورت تو نہیں تھی۔" نینی نے تھوڑا برا سا منہ بنایا۔

"وہ اب صرف روبرٹو کا کولیگ نہیں ہے، میری بھی اس سے دوستی ہو گئی ہے۔"

"تمہاری دوستیوں میں نیا کیا ہے۔ کس سے نہیں ہو جاتی تمہاری دوستی؟"

"میری اچھی عادت کا ذکر تو اچھے انداز میں کریں نینی۔" اس نے جیسے برا مان کر صدائے احتجاج بلند کی۔

نینی اس کے انداز پر مسکرائی تھیں۔ انہوں نے اس کی پلیٹ میں چکن کا ایک پیس رکھا۔

"ٹھیک سے کھاؤ۔" وہ ان کے محبت بھرے انداز پر مسکرائی تھی۔ اسی وقت فون کی بیل بجی۔

"میں دیکھتی ہوں۔" وہ تیزی سے اٹھی تھی۔ کچن کے سامنے والا کمرہ اس کا تھا درمیان میں خوب صورت اٹالین ٹائلز سے مزین کوریڈور تھا۔

وہ تیز رفتاری سے اپنے کمرے میں آگئی تھی اور اسکرین پر چمکتا نمبر دیکھ کر ہی اسے پتا چل گیا تھا کہ یہ کال کس کی ہے۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ یک دم ہی سنجیدگی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ یہ محمود خالد اس کے پاپا کی کال تھی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔

"السلام علیکم پاپا!" سپاٹ انداز میں اس نے انہیں سلام کیا۔ ایسے جیسے کسی جان پہچان کے خود سے عمر میں بڑے شخص کو ادب اور احترام سے سلام کیا جاتا ہے۔

"وعلیکم السلام بیٹا! کیسی ہو؟" محمود خالد نے محبت بھرے لہجے میں اس سے پوچھا۔

اس کے چہرے پر ایک تلخ سا تاثر آگیا۔ اسے اپنے پاس پاکستان بلانے کے لیے، سیم کی طرح اس کی بھی اٹھا کر کسی پاکستانی سے زبردستی شادی کروانے کے لیے یہ محبت بھرا لہجہ اور فکر ظاہر کرتا انداز بنایا جاتا تھا ورنہ ساری زندگی اپنی دونوں بیٹیوں کو نظرانداز کرنے اور انہیں تکلیف پہنچانے کے سوا انہوں نے کیا ہی کیا تھا؟

"میں ٹھیک ہوں پاپا! آپ کیسے ہیں؟"

اس نے ان سے کبھی بدتمیزی نہیں کی تھی، کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی مگر جس روز سے ان کی وجہ سے اس سے اس کا ملک، اس کا گھر اور اس کی بہن چھن گئی تھی وہ ان سے پھر کبھی ویسی محبت نہ کر پائی تھی جیسی زندگی کے 13 سالوں تک کرتی رہی تھی۔ اس کے اندر وہ 13 سال کی بچی آج بھی اپنے باپ سے اپنا گھر چھن جانے اور اپنی بہن سے بچھڑ جانے پر خفا تھی۔

"میں ٹھیک ہوں بیٹا! بس آج تمہاری یاد آرہی تھی۔ میں نے سوچا تمہیں فون کروں۔ میرا اندازہ یہی تھا کہ آج کل تم روم آئی ہوئی ہو گی۔"

"ہاں میں اپنے روما آئی ہوئی ہوں جسے آپ نے مجھ سے چھین لیا تھا۔"

وہ یہ بول نہیں پائی تھی ہاں سوچا ضرور تھا۔ بولی تو صرف اتنا تھی۔ "جی۔"

وہ ذہنی اور جذباتی طور پر خود کو ان سے اتنی دور لے جا چکی تھی کہ ان سے بات کرتے ہوئے اسے گفتگو کا موضوع یا جملے یوں سوچنے پڑتے گویا کسی اجنبی سے

بات کر رہی ہو۔

"آج کل کیا ہو رہا ہے بیٹا؟ ریسٹ کر رہی ہو یا کسی ایگزیبیشن کی تیاری ہے؟"

"ایگزیبیشن کی تیاری کر رہی ہوں۔ اگلے مہینے فلورنس میں میرا سولو شو ہے۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"پھر تو خوب مصروف ہو گی تم؟"

وہ اس کے آرٹسٹ بننے کے مخالف رہے تھے۔ ہر وہ چیز جس سے اسے خوشی ملتی تھی' وہ اس کے مخالف رہے تھے' پھر پتا نہیں اب وہ کیسے اس کی پینٹنگز اور ایگزیبیشنز کے متعلق اتنے خوشگوار انداز میں بات کر لیا کرتے تھے۔

"آنٹی کیسی ہیں؟"

اس نے مروتاً" اپنی سوتیلی ماں کی خیریت پوچھی۔ یہ نہیں تھا کہ اس کے اور اس کی سوتیلی ماں کے بیچ کوئی روایتی قسم کے تعلقات تھے' بس ایک غیریت اور اجنبیت تھی وہ کئی سال لندن میں محمود خالد اور ان کی بیوی کے ساتھ رہی تھی مگر یوں جیسے کسی دور کے واقف یا ملنے جلنے والے کے ساتھ رہ لیا جائے۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ مجھ سے کہتی رہتی ہے کہ میں تمہیں تمہاری چھٹیوں میں پاکستان بلواؤں۔"

ان کے دل کی بات زبان پر آگئی تھی۔ ایک تلخ سا تاثر اس کے چہرے پر ابھرا تھا۔

دو منٹ کی فون کال جس میں رسمی باتوں کے سوا اس نے کوئی بات نہیں کی تھی' ختم کر کے وہ بجھے بجھے سے انداز میں بیڈ پر لیٹ گئی تھی۔

وہ ہر وقت ہنستی مسکراتی رہتی تھی' زندگی سے خوش رہتی تھی مگر جس وقت بھی اس کی اپنے ماں یا باپ سے بات ہوتی اس کے لبوں کی ہنسی اور چہرے کی خوشی درد اور غم میں بدل جاتی ' پھر آنسوؤں سے اس کی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔ بچپن کی ہر محرومی ہر دکھ یاد آجایا کرتا۔ اپنا وہ گھر یاد آجایا کرتا جہاں اس کا اور سیم کا بچپن گزرا تھا۔

اس کی جاب لندن میں تھی۔ اگر جاب کا مسئلہ نہ ہوتا تو وہ کب کا دوبارہ روم ہی میں سیٹل ہو چکی ہوتی۔ اپنی اتنی اچھی جاب کو چھوڑ دینا اسے حماقت لگا تھا۔ اب وہ 13 سال کی لیزا محمود نہیں تھی جس کے بارے میں اس کے ممی' پاپا فیصلہ کریں گے کہ اس نے کہاں رہنا ہے اور کس کے ساتھ رہنا ہے۔ اپنی عمر کے 18 ویں سال سے اپنے فیصلے اس نے خود کرنے شروع کر دیے تھے۔

محمود خالد کو اس کے کسی ایک نہیں' بے شمار فیصلوں سے اختلاف تھا' مگر اسے ان کے اختلاف کی کبھی فکر نہ رہی تھی۔ وہ دنیا میں اگر کسی کی مانتی تھی تو وہ سیم تھی۔ اس کی بہن' اس کی دوست' اس کی ماں' اس کا باپ۔ کبھی وہ دونوں بہنیں ایک ہی گھر میں ساتھ رہا کرتی تھیں۔ کتنا پیار تھا ان دونوں بہنوں میں سیم اس کا کس طرح خیال رکھا کرتی تھی۔ اسکول کے اندر' اسکول سے باہر وہ ہر جگہ لیزا کا سایہ بنی رہتی۔ وہ دونوں ایک کمرے میں ساتھ سوتی تھیں۔ رات دیر تک جاگ کر باتیں کیا کرتیں۔ نینی ان کے کمرے میں انہیں دیکھنے آتیں تو وہ دونوں سوتی بن جایا کرتیں۔ ان کے والدین کی آپس میں بالکل نہیں بنتی تھی۔ یہ شادی ہی غلط ہوئی تھی۔ محمود خالد مغرب کی ایک عورت کو بیوی بنا لینے کے بعد اس سے مشرقیت کی توقع رکھتے تھے۔ اگر ایک اعلا تعلیم یافتہ' خوب صورت اور دولت مند پاکستانی مسلمان مرد سے شادی کرنے کے لیے وکٹوریا جیووانی نے اسلام قبول کیا تھا' اپنا نام تبدیل کر لیا تھا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ یہ تبدیلی دائمی تھی۔ جس خطے سے ان کا تعلق تھا اس تعلق کی نسبت سے انہیں جیسا ہونا چاہیے تھا' وہ ویسی ہی تھیں۔ محمود خالد وکٹوریا کو خدیجہ بنانے کی لاکھ کوششیں کر لیتے' انہیں کامیابی نہیں ملنا تھی۔ وہ مغرب کی ایک عورت کو مشرقی انداز کی بیوی اور ماں کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے مگر ایسا کیونکر ہو سکتا تھا؟ وکٹوریا نے اسے اور سیم کو صرف پیدا کیا تھا۔ اس کے علاوہ بحیثیت ایک ماں کے ان کا ان دونوں سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔

اوپر تلے کی چھوٹی چھوٹی بچیاں گھر پر آیا کے رحم و کرم پر ہوتیں اور ان کی اٹالین ماں رات گئے پارٹیز اٹینڈ کر کے گھر واپس آیا کرتی تھیں۔ لیزا ماں اور باپ دونوں کی جانب سے نظر انداز کی گئی تھی جبکہ سیم اس معاملے میں اس کے مقابلے میں نسبتا" یوں خوش قسمت رہی تھی کہ بچپن میں محمود خالد' سیم سے بہت پیار کرتے تھے۔ سیم شکل و صورت اور ذہانت میں بالکل محمود خالد جیسی تھی جبکہ لیزا دکھتی بھی وکٹوریا کی طرح تھی اور ذہنی صلاحیتیں اور قابلیت بھی اس میں اپنے باپ جیسی نہ تھیں۔ وہ نہ کبھی ماں کی توجہ پا سکی نہ باپ کی۔ اسے توجہ' پیار اور محبت اگر کہیں سے ملی تو سیم کے پاس سے۔ سیم بے تحاشا خوب صورت تھی' بے پناہ ذہین' پُراعتماد اور غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل تھی' جبکہ وہ سیم کے مقابلے میں ہر چیز میں اوسط درجے کی رہی تھی۔ پڑھائی میں بری نہیں تھی' اچھی تھی پر سیم کی طرح پوزیشن ہولڈر اور گولڈ میڈلسٹ کبھی نہیں رہی تھی۔ اسکول میں سب اسے سیم کی وجہ سے پہچانا کرتے تھے۔ وہ سیم پر فخر کیا کرتی تھی۔ اپنی اس بے تحاشا حسین اور ذہین بہن پر اسے ناز ہوتا تھا۔

دوسری جانب سیم اسے اس کے آرٹ کے حوالے سے سراہتی رہتی تھی کہ اس میں پینٹنگ کی خداداد صلاحیت ہے اور وہ بڑی ہو کر ایک کامیاب آرٹسٹ بن سکتی ہے۔ اسے بچپن ہی میں یہ اعتماد سیم نے دیا تھا۔ جو ذمہ داریاں ماں باپ کی ہوتی ہیں اس کے لیے تو وہ ذمہ داریاں بھی سیم ہی نے نبھائی تھیں۔ اس کی ہمت بڑھانا' اس کی پروا کرنا' ہر مشکل میں اس کے ساتھ کھڑے ہونا اور اس سے بے حد' بے حساب پیار کرنا۔

اسے آج بھی وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب وکٹوریا اور محمود خالد باضابطہ طور پر علیحدہ ہو گئے تھے۔ محمود خالد نے اپنی پوسٹنگ لندن کروالی تھی۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے کر لندن جا رہے تھے جبکہ وکٹوریا اور محمود کے مابین طے شدہ معاہدے کے تحت سیم کو وکٹوریا کے ساتھ رہنا تھا۔ وہ اور سیم ایک دوسرے سے لپٹ کر بہت روئی تھیں۔ آخری رات جو انہوں نے اپنے گھر میں ساتھ گزاری' وہ دونوں بہنیں اس ساری رات روتی رہی تھیں۔ سیم روتی بھی رہی اور اسے پیار کر کر کے یہ سمجھاتی بھی رہی تھی کہ ان دونوں بہنوں کو کوئی بھی کبھی جدا نہیں کر سکتا۔

"الگ ممی' پاپا ہو رہے ہیں لز! ہم دونوں نہیں' ہمیں کوئی بھی الگ نہیں کر سکتا۔ میں ابھی 14 سال کی ہوں ناں' صرف 4 سال رک جاؤ۔ ذرا میں 18 سال کی ہو جاؤں' پھر دیکھنا تم سے ملنے میں جب دل چاہے گا آیا کروں گی۔ پھر نہ ممی مجھے تم سے ملنے' تمہارے پاس آنے سے روک سکیں گی نہ پاپا۔"

پھر وہ محمود خالد کے ساتھ لندن آگئی تھی اور سیم

......

وہ وکٹوریا کے ساتھ اٹلی ہی میں رہی تھی۔ محمود خالد سے شادی کے لیے جو ان کی ماں نے ظاہری طور پر اپنا مذہب تبدیل کیا تھا' اسے ترک کر کے وہ واپس اپنے اصل مذہب پر چلی گئی تھیں۔ وہ خدیجہ سے پھر وکٹوریا ہو گئی تھیں۔ طلاق کے فورا" بعد ہی انہوں نے اس فرنچ فیشن ڈیزائنر سے شادی کر لی تھی جو ان کی اور محمود خالد کی طلاق کی وجہ بنا تھا۔ وہ ایک مشہور فیشن ڈیزائنر اور ارب پتی تھا۔ گویا محمود خالد سے طلاق لے کر وکٹوریا نے کوئی گھاٹے کا سودا نہیں کیا تھا۔ ان کا فیشن ڈیزائنر شوہر دنیا بھر کے فیشن اور ڈیزائن کے دارالحکومت سمجھے جانے والے شہر Milan میں رہتا تھا سو شادی کر کے وہ اس کے ساتھ Milan چلی گئی تھیں۔ سیم بھی ان کے ساتھ چلی گئی تھی۔ سیم روم میں تھی تو اس کا اپنے روما سے ایک رابطہ تو تھا وہ Milan چلی گئی تو روما سے جیسے ناتا ٹوٹتا محسوس ہوا۔

محمود خالد کی ملازمت شاندار تھی سو لندن میں بھی ان کے گھر میں وہی ٹھاٹ باٹ اور عیش و آرام تھے جو روم میں تھے مگر وہ وہاں کبھی ایک پل بھی دل سے خوش نہ رہ سکی تھی۔ وہ نہ اس گھر کو اپنا سمجھتی تھی نہ اس اسکول کو' نہ لندن کی سڑکیں اور گلیاں کبھی اسے اپنا بنا

سکیں۔ اس کا دل تو وہیں اس کے روما میں سیم کے اور اس کے مشترکہ کمرے ہی میں رہ گیا تھا۔

سیم Milan میں پڑھ رہی تھی اور وہ لندن میں۔ سیم کے تعلیمی اخراجات و دیگر اخراجات کے لیے محمود خالد اسے باقاعدگی سے رقم بھجواتے تھے سو سیم کی تعلیم پہلے ہی کی طرح بہت اچھی ہو رہی تھی' وہ اسی طرح کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ رہی تھی ورنہ شاید وٹوریا کا فرنچ شوہر نکولس سوتیلی بیٹی کی شاندار تعلیم کے راستے میں رکاوٹ ڈالتا۔ وہ سوتیلی بیٹی پر اپنا کوئی پیسہ خرچ کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ اس کا رویہ سیم کے ساتھ کوئی بہت دوستانہ نہ تھا۔ سیم فون پر بات ہونے پر اسے بتایا کرتی تھی کہ نکولس بیوی کے ساتھ جہیز کے طور پر ملی اس بیٹی کو صرف اور صرف ایک بوجھ سمجھتا تھا۔ لیزا' سیم کے لیے کڑھا کرتی کہ وہ خود باپ کے ساتھ لندن میں عالیشان زندگی گزار رہی ہے اور سیم ماں کی شفقت و محبت سے محروم سوتیلے باپ کی تلخ نگاہوں اور کڑوی باتوں کے بیچ انتہائی مشکل زندگی گزار رہی تھی۔ وہ تو سیم تھی جو بہت بہادر اور پُر اعتماد تھی تب ہی ان تمام حالات سے سمجھوتا کر گئی اگر سیم کی جگہ وہ خود ہوتی تو کبھی ان کٹھن حالات کا سامنا نہ کر پاتی۔

وہ 16 سال کی تھی اور سیم 17 کی جب ایک رات نشے کی حالت میں نکولس سیم کے کمرے میں آدھمکا تھا' مگر اس کے شور مچا دینے پر وہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

اسے جب یہ بات پتا چلی' وہ بلک بلک کر رو پڑی تھی۔ اس کی نازوں پلی' بہن کس آزمائش میں گھر گئی تھی۔ اسے اس روز اپنے ماں اور باپ دونوں سے شدید ترین نفرت محسوس ہوئی تھی۔ وہ ان دونوں کو زندگی بھر معاف نہیں کرے گی۔ ان دونوں بہنوں کا کیا قصور تھا جو انہیں ایک دوسرے سے جدا کیا گیا؟ اس کے باپ نے ایک بیٹی کو گھر کا عیش و آرام اور تحفظ دے دیا اور دوسری کو سوتیلے باپ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا؟

وہ اس واقعہ کے بعد محمود خالد سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور ہو گئی تھی۔ سیم اس واقعہ کے بعد ہوسٹل شفٹ ہو گئی تھی۔ وٹوریا بجائے اپنے بدکردار شوہر کو برا سمجھنے کے سیم کے خلاف ہو گئی تھیں۔ اور باپ نے اس واقعہ کے بعد ایسی کوئی عملی کوشش نہ کی تھی کہ سیم کو اپنے پاس بلوا لیتے۔ وہ milan میں ہوسٹل میں رہ کر اپنے تعلیمی مدارج طے کر رہی تھی اور پہلے ہی کی طرح اب بھی سال میں ایک مرتبہ چھٹیوں میں محمود خالد اسے اپنے پاس لندن بلوایا کرتے تھے۔ سال بھر میں وہ واحد موقع ہوتا تھا جب وہ دونوں بہنیں ایک دوسرے سے مل پاتی تھیں ورنہ تو وہ صرف فون پر ہی ایک دوسرے کی آواز سن پاتی تھیں۔

وہ 17 سال کی تھی جب محمود خالد نے ایک پاکستانی خاتون سے جنہیں اس کی دادی نے ان کے لیے منتخب کیا تھا' شادی کر لی۔ ان کی ماں سے محمود خالد کی شادی کو اس کی دادی بیٹے کا جوانی کے جنون میں کیا گیا ایک غلط فیصلہ قرار دیتی تھیں۔

عائشہ ایک پڑھی لکھی' اچھے خاندان کی' میچیور اور مذہبی رجحان رکھنے والی خاتون تھیں۔ انہوں نے لیزا کے ساتھ نہ کوئی بیر باندھا نہ اسے اپنا دشمن سمجھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے فاصلہ رکھتی تھیں' وہ انہیں آنٹی کہتی تھی۔

گزرتے وقت کے ساتھ وہ باپ سے مزید دور ہوتی چلی گئی تھی۔ وہ باپ کے گھر میں باپ اور ان کی بیوی کے ساتھ یوں رہتی تھی جیسے کوئی مہمان ہو۔ جیسے وہ اس کا گھر نہ ہو۔ اس کا دل باپ کی طرف سے کبھی صاف نہ ہو سکا تھا۔ وہ ان سے کبھی لڑی نہ تھی' کبھی کوئی گستاخی نہ کی تھی مگر اس نے زندگی کے کسی بھی چھوٹے بڑے فیصلے میں کبھی ان کی رائے اور ان کا مشورہ نہ مانا تھا۔

وہ چاہتے تھے وہ بزنس ایڈمنسٹریشن پڑھے' اس نے فائن آرٹس پڑھا۔ وہ جاب سے ریٹائرمنٹ کے بعد پاکستان واپس جا رہے تھے' وہ چاہتے تھے وہ بھی ان کے ساتھ پاکستان چلے' اس نے صاف منع کر دیا۔ تب وہ اپنی

تعلیم مکمل کر کے لندن ہی میں جاب تلاش کر رہی تھی۔ پھر اسے جلد ہی ملازمت بھی مل گئی تھی۔

محمود خالد اسے ساتھ لے جانے کی کوشش میں ناکام ہو جانے کے بعد اپنی بیوی عائشہ کے ساتھ پاکستان چلے گئے۔ اس اکیلی کے لیے وہ گھر بہت بڑا تھا سو اس نے اپنے لیے ایک چھوٹا اور اپنی مرضی کے مطابق اپارٹمنٹ لے لیا تھا۔ وہ اپنے فیصلے پر پوری طرح مطمئن تھی۔ وہ کیوں وہ کام کرے جو محمود خالد اس سے کہہ رہے ہیں۔ اس کے اور سیم کے بچپن میں انہوں نے اور وِکٹوریا نے ان دونوں بہنوں کی پروا کی تھی جو آج وہ ان کی پروا کرے؟ وہ پچھلے 5 سالوں سے لندن میں تنہا رہ رہی تھی۔ محمود خالد کی آج بھی یہی خواہش تھی کہ وہ ان کے پاس کراچی آجائے۔ وہ اس کی شادی کسی پاکستانی لڑکے سے کرانا چاہتے تھے۔ وہ 27 سال کی ہو گئی تھی اس کی شادی اب ہو جانی چاہیے تھی مگر وہ شادی اپنی مرضی سے کرنا چاہتی تھی اور کم از کم کسی پاکستانی سے ہر گز نہیں۔ کم از کم یہ اطمینان اور خوشی وہ اپنے سنگدل باپ کو ہر گز نہ دینا چاہتی تھی کہ انہوں نے اپنی دونوں بیٹیوں کی شادیاں اپنے ملک کے مردوں سے کروائی ہیں۔ ساری زندگی پاکستان سے باہر گزار کر بھی وہ زندگی بھر اندر سے پاکستانی ہی رہے تھے، تب ہی ریٹائرمنٹ کے بعد وہیں لوٹے تھے۔ وہیں اپنا بزنس شروع کیا تھا اور سیم جسے 14 سال کی عمر میں وِکٹوریا اور سوتیلے باپ کے حوالے کر کے اس کی ذمہ داریوں سے بری الذمہ ہو گئے تھے اس پر پھر اپنا حق جتانے کھڑے ہو گئے تھے۔

اپنے نئے شروع کیے بزنس میں مزید فائدوں کے لیے انہوں نے سیم کی شادی اپنے ایک کاروباری واقف کے ساتھ کروادی تھی۔ سیم کا شوہر ہاشم اسد اس سے عمر میں پورے 15 سال بڑا تھا۔ اسے اپنے باپ کی موقع پرستی پر شدید غصہ آیا تھا۔ کیا کوئی باپ ایسا ہو سکتا ہے؟

سیم کے ساتھ دست درازی کی کوشش والے واقعہ کے فوراً" بعد ہی وِکٹوریا کی نکولس سے علیحدگی ہو گئی تھی۔ انہوں نے ایک سال بعد پھر ایک اٹالین آدمی سے شادی کرلی تھی۔ سیم پھر کبھی ماں کے پاس نہ رہی تھی۔ اس کی باقی تمام تعلیم ہوسٹلز وغیرہ میں ہوئی تھی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسے روم میں بڑی اچھی جاب مل گئی تھی، وہ وہاں رہ رہی تھی۔

وہ چھٹیوں میں چند ہفتوں کے لیے محمود خالد کے پاس پاکستان گئی تھی۔ وہیں محمود خالد کے کاروباری دوست ہاشم اسد کی نگاہ انتخاب سیم پر آکر ٹھہری تھی۔ وہ اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے چکا تھا۔ روپیہ پیسہ بے شک اس کے پاس بہت تھا، دولت کی ریل پیل تھی، personality (شخصیت) بھی اچھی تھی، مگر اس کی شہزادی جیسی بہن کی شادی ایک شادی شدہ مرد سے، جو اس سے عمر میں 15 سال بڑا تھا اور جس سے وہ بالکل بھی محبت نہ کرتی تھی، کس طرح کروائی جا سکتی تھی؟

لیزا نے سیم کو بہت سمجھایا تھا کہ وہ یہ شادی نہ کرے۔ وہ پاپا کو چھوڑ کر واپس اٹلی چلی جائے، مگر سیم نے روتے ہوئے اسے یہ سمجھایا تھا کہ اس کے لیے یہ شادی کرنا بہت ضروری ہے۔ اگر اس نے شادی سے انکار کیا تو پاپا کو بزنس میں بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔ جو نیا project وہ شروع کرنے جا رہے تھے، اس کے لیے انہوں نے ہاشم سے قرض لے رکھا تھا اور وہ قرض معمولی نہیں، ایک بہت بڑی رقم تھی۔

"ہونے دو پاپا کو Loss، ختم ہو جانے دو ان کا بزنس، وہ زندگی بھر تمہاری خوشیوں اور سکون کا گلا گھونٹتے آئے ہیں، میں اس بار انہیں تمہاری زندگی تباہ نہیں کرنے دوں گی۔"

وہ روتے ہوئے چلائی تھی، مگر اپنے چیخ و پکار کے باوجود بھی سیم کو بچا نہیں پائی تھی۔ سیم کی شادی ہاشم اسد کے ساتھ ہو گئی تھی۔

سیم کی شادی والے دن وہ لندن میں اپنے اپارٹمنٹ میں خود کو بند کر کے سارا دن روتی رہی تھی۔

وہاں اس کے پاپا کے ملک میں ان ہی کا ایک ہم وطن اس کی بہن کی خوشیوں کو اجاڑنے جا رہا تھا۔

دلہن بنی سیم نے اسے کراچی سے نکاح سے کچھ دیر قبل فون کیا تھا۔ وہ بڑی بہادر لڑکی تھی۔ وہ الٹا اسے حوصلہ دے رہی تھی۔

"لز! میں خوش رہوں گی، ہاشم اچھے آدمی ہیں۔ تم میری فکر کیوں کرتی ہو سوئیٹ ہارٹ؟"

"اپنے سے 15 سال بڑے، شادی شدہ اور طلاق یافتہ جس شخص کے ساتھ تمہیں زبردستی باندھا جا رہا ہے، تم اس کے ساتھ خوش رہو گی سیم؟" وہ جواباً" پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بولی تھی۔

"میں پاپا کو اس ظلم کے لیے کبھی معاف نہیں کروں گی سیم! میں تمہاری زندگی کی خوشیاں چھیننے پر انہیں کبھی بھی معاف نہیں کروں گی۔" وہ زار و قطار روتے ہوئے بولی تھی۔

اور پھر وہ واقعی محمود خالد کو کبھی معاف نہیں کر سکی تھی۔ باپ سے بات کر کے جیسے سب کچھ پھر سے یاد آ گیا تھا۔ وہ سیم کو یاد کرتے ہوئے اس کے ساتھ ہوئے ظلم و زیادتی کو سوچ کر آزردہ ہوتے ہوئے، بھیگی پلکوں کے ساتھ سو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اور یہ خوب کمال بات تھی کہ صبح سویرے اس کی آنکھ کھلی ہی سیم کے فون سے تھی۔

ہمیشہ کی طرح پھر یہی ہوا تھا کہ ادھر اس نے دل سے سیم کو یاد کیا ادھر سیم موجود ہوئی، یا فون پر یا پھر روبرو۔ سیم کی آواز سنتے ہی رات کی ساری اداسی اور دکھ پل بھر میں رخصت ہو گیا تھا۔

"سیم! آئی لو یو۔" اس نے بے اختیار اس کی آواز سنتے ہی کہا تھا۔

"ہائیں! خیریت تو ہے Sis؟ میرے ہیلو کا جواب اس قدر رومانٹک؟" سیم حسب عادت خوشگوار موڈ میں تھی۔

"پتا ہے میں رات تمہیں سوچتے ہوئے سوئی تھی اور ابھی میری آنکھ تمہارے فون سے کھلی ہے۔" وہ بیڈ پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں بولی۔

سیم سے بات کر لینے کے بعد اب اس کا بگڑا موڈ ٹھیک ہو ہی جانا تھا۔

سیم اس سے بات کرتے ہوئے کبھی اپنی شادی شدہ زندگی کے دکھڑے نہیں سناتی تھی۔ وہ اس طرح ظاہر کرتی تھی گویا اپنی شادی سے خوش ہو، مگر وہ صرف بہنیں نہ تھیں، سہیلیاں بھی تھیں، اور وہ جانتی تھی سیم نے زندگی کے ساتھ سمجھوتا کر لیا تھا، اس رشتے کو بہت اچھی طرح نبھا بھی رہی تھی مگر وہ دل سے خوش نہیں تھی۔ کبھی باتوں باتوں میں غیر اختیاری طور پر سیم کے منہ سے کچھ ایسا نکل جاتا جو اسے یاد دلا دیتا تھا کہ سیم نے اپنی خوشیوں اور خواہشات کا گلا گھونٹ کر، سمجھوتے کی زندگی کو اپنا لیا ہے، صرف اور صرف باپ کی خوشی کی خاطر۔

سیم اس سے بات کرتے ہوئے نہ خود کوئی اداسی ظاہر کرتی تھی، نہ اسے اداس رہنے دیتی تھی۔ وہ ان دنوں دفتری کام سے ترکی آئی ہوئی تھی اور اس کے پاس اسے سنانے کے لیے وہاں کے بہت سے دلچسپ قصے تھے۔ شادی کے بعد سیم نے ہاشم کی خواہش پر اس کی کمپنی کو جوائن کر لیا تھا۔ شکر تھا کہ سیم جیسی غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل لڑکی کو ہاشم نے گھر پر بٹھانے کی جاہلانہ کوشش نہیں کی تھی۔

سیم سے بات کر لینے کے بعد وہ خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے آفس میں بیٹھا لیپ ٹاپ پر کچھ کام کر رہا تھا تب ہی اس کے موبائل پر کال آئی۔ کال کرنے والی شخصیت کے نام کو قدرے تعجب سے دیکھتے ہوئے اس نے کال ریسیو کی۔

"ہیلو!" اس کے ہیلو میں ہلکی سی اجنبیت موجود تھی۔

"Ciao سکندر۔" لیزا خوشگوار موڈ میں بولی۔ جواباً" وہ خاموش رہا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ لیزا نے اسے کیوں فون کیا تھا۔

"کہاں گم ہو گئے؟ کیا یادداشت کھو گئی؟ میں لیزا ہوں۔" وہ اس کی خاموشی پر جیسے حیران ہو کر بولی تھی۔

"میں تمہیں پہچان گیا ہوں لیزا! میرے پاس تمہارا نمبر Save (محفوظ) ہے۔" وہ قدرے سنجیدگی سے بولا۔

"نمبر تو محفوظ ہے' پہچان بھی گئے ہو۔ مگر لگتا ہے یہ بھول گئے ہو کہ کل ہماری آخری بات یہ ہوئی تھی کہ ہم دونوں دوست بن گئے تھے۔" وہ اپنے اسی خوشگوار دوستانہ انداز میں بول رہی تھی۔

"مجھے یہ بات بھی یاد ہے۔" اس بار وہ ہلکا سا مسکرایا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی تھی۔

"شکر' صد شکر تمہیں میں بھی یاد ہوں' میری دوستی بھی یاد ہے' ورنہ تمہارے اجنبی سے "ہیلو" سے تو میں ڈر ہی گئی تھی۔ خیر اس بات کو چھوڑو' یہ بتاؤ تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟"

"میں ٹھیک ہوں۔" اس نے قدرے حیرانی سے اپنی خیریت بتائی۔ کیا اس نے یہ پوچھنے کے لیے فون کیا تھا؟

کل آمنہ سے بات کرنے کے بعد وہ بہت دکھی ہو گیا تھا۔ دس سے پندرہ منٹ کی گفتگو کے بعد وہ پھر سے جیسے دکھ کے سمندر میں اتر گیا تھا۔ ایسا بہت کچھ یاد آگیا تھا جس نے اس کی طبیعت کو پھر سے بوجھل کر دیا۔

"آواز سے تو بہت ٹھیک ابھی بھی نہیں لگ رہے۔" وہ دوستانہ سی فکر مندی کے ساتھ بولی۔ "میں نے ایک پروگرام بنایا ہے۔ اس سے تمہارا موڈ اور تمہاری طبیعت دونوں اچھے ہو جائیں گے۔ تم آج شام بزی تو نہیں ہو ناں!"

لیزا کے سوال کے جواب میں وہ فوراً" بولا۔ "میں بزی تو نہیں ہوں مگر مجھے......"

"بزی نہیں ہو نا بس پھر done ہو گیا۔ میں تمہارے آفس آف ہونے کے ٹائم' پر تمہیں لینے آؤں گی۔ شام کے وقت روما میں سیاحوں کے لیے جو خاص اور پُرکشش مقامات ہیں وہ تو تمہیں دیکھنے میں اتنا مزا نہیں آئے گا۔ ان کے لیے ہم کسی دن صبح سے نکلیں گے۔ آج میں تمہیں steps Spannish لے کر چلوں گی۔ شام کے وقت وہ جگہ تمہیں اچھی لگے گی۔"

اسے اس کی گائیڈ کس نے بنایا تھا' کم از کم اس نے تو ایسی کوئی خواہش ظاہر نہیں کی تھی کہ وہ روم گھومنا چاہتا ہے۔

"تمہارا شکریہ لیزا! مگر میرا کہیں بھی گھومنے پھرنے کا......" وہ شائستگی کے ساتھ اسے منع کرنا چاہ رہا تھا۔

"تمہارا موڈ نہیں ہے' مگر میرا موڈ ہے تمہیں اپنا روما دکھانے کا۔ میں تو کل تم سے یہ سن کر حیران رہ گئی کہ تم نے اتنے دنوں میں ابھی تک روما کی کوئی خاص جگہ نہیں دیکھی۔ میں جانتی ہوں یہ تمہاری رومن ہالی ڈیز نہیں ہیں' تم یہاں آفس کے کام سے آئے ہو مگر آفس سے بچ جانے والے فارغ ٹائم میں تم یہاں ان دنوں کو چھٹیوں کی طرح انجوائے کر سکتے ہو۔ میں تمہاری دوست بن گئی ہوں ناں' بس میری بات مانو۔ آج روما کو ایک رومن لڑکی کے ساتھ اس کی نظر سے دیکھو۔" اسے مزید کچھ بھی کہنے کا موقع دیے بغیر لیزا نے فون بند کر دیا تھا۔

وہ اس لڑکی پر حیران تھا۔ آخر اسے اس میں اس درجہ دلچسپی کس وجہ سے تھی؟ اس نے سوچ لیا تھا وہ آج آفس ٹائم ختم ہونے سے پہلے ہی آفس سے اٹھ جائے گا۔ اس کا لیزا کے ساتھ کہیں بھی گھومنے پھرنے کا قطعاً" کوئی موڈ نہ تھا۔ کل اس سے اتنی مدد لے چکنے کے بعد آج وہ اسے بدتمیزی اور بے مروتی سے منع نہیں کر سکتا تھا اس لیے بہتر یہی تھا کہ پہلے ہی اپنے ہوٹل روانہ ہو جائے' مگر لیزا کو جیسے اس کے اس ارادے کی بھنک پہلے ہی پڑ گئی تھی وہ آفس ٹائم ختم ہونے سے پہلے اس کے آفس میں موجود تھی۔

اسے یہاں دفتری کاموں میں معاونت کے لیے جو سیکریٹری فراہم کی گئی تھی' وہ اسے ایک معاہدہ ٹائپ کرنے کے لیے دے رہا تھا' جب ریسپشنسٹ نے انٹرکام پر اس کے لیے کسی لیزا محمود کے آنے کی اطلاع دی۔

اس کے ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔

"انہیں اندر بھیج دیجیے۔" دفتر میں وہ اس کے علاوہ اور کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

سیکریٹری اس کے آفس سے نکل رہی تھی جب وہ ہنستی مسکراتی اندر داخل ہوئی۔

اس نے میرون کلر جارجٹ کے پرنٹڈ ڈھیلے سے بلاؤز کے ساتھ آف وائٹ ٹراؤزر پہن رکھا تھا' پیروں میں اونچی ایڑی والے آف وائٹ سینڈلز' بال کھلے ہوئے تھے۔ جس طرح تمام اٹالین عورتیں اور لڑکیاں ہر وقت موقع اور موسم کے لحاظ سے میک اپ کیے رکھتی تھیں' اسی طرح اس نے بھی شام کے وقت کے لحاظ سے لائٹ سا میک اپ کر رکھا تھا۔ ناخنوں پر نیل پالش بھی بجی تھی' اس کے ڈیزائنر گلاسز ہمیشہ کی طرح اس کی شخصیت کے وقار کو بڑھا رہے تھے۔

اس نے ایک نظر میں سر سے پاؤں تک اس لڑکی کو بغور دیکھا۔ اس میں ایسی کوئی کمی نہ تھی کہ اسے لوگوں کے پیچھے بھاگنا پڑتا۔ ایک سے بڑھ کر ایک مرد اس کی رفاقت کی تمنا کر سکتا تھا' پھر اس لڑکی کے ساتھ مسئلہ کیا تھا؟

"چاؤ سینور سکندر!" وہ اس کی میز کے سامنے آتے ہوئے بولی۔

"چاؤ لیزا!" وہ اخلاقاً" مسکرایا تھا۔ "بیٹھو۔"

"میں جلدی آگئی۔ بس کاموں سے فارغ ہو گئی تھی' میں نے سوچا تمہارے آفس چلتی ہوں۔ اگر ابھی تم بزی ہوئے تو میں تمہارا انتظار کر لوں گی۔ ویسے تم بزی لگ تو نہیں رہے۔" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

اب وہ کیا بتاتا کہ اس سے بچنے کے لیے وہ آفس سے اٹھنے کو پر تول ہی رہا تھا۔ لیزا کی نگاہیں اس کی میز پر تھیں جس پر سردست اس کے سامنے نہ کوئی فائل تھی نہ کاغذات اور نہ ہی اس کا لیپ ٹاپ کھلا ہوا تھا۔

"ہاں بس کام ختم ہی ہو گیا تھا۔" وہ قدرے سنجیدگی سے بولا۔

"چلیں پھر؟" لیزا نے فوراً" اس سے پوچھا۔

اسے لوگوں کے احسان لینے کی عادت نہ تھی اور اسے یہ بھی ہرگز نہیں پتا تھا کہ اگر آپ کسی سے احسان لے چکے ہوں تو پھر اس سے پیچھا کس طرح چھڑاتے ہیں۔ وہ کرسی پر سے اٹھ گیا تھا۔

"چلو!" وہ اس کے دفتر اسے لینے آچکی تھی۔ اس کے اسے Naples لے کر جانے اور واپس لانے کے احسان کے بدلے اسے اور کیا کیا کچھ اپنی مرضی کے خلاف برداشت کرنا تھا وہ فی الحال سمجھنے سے قاصر تھا۔

وہ لیزا کے ساتھ دفتر سے نکل آیا اور اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وہ بغیر اپنی مرضی اور خواہش کے اس کے ساتھ Piazza di spagna جا رہا تھا۔

انہیں Barberini سے Spagna پہنچنے میں بہت زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

قدیم آرکیٹیکچر والی بلڈنگز کے درمیان گھرے Spannish Steps کے سامنے وہ دونوں کھڑے تھے۔ شام کا وقت ہونے کے سبب وہاں سیاحوں کا رش تھا۔ تاریخی اہمیت کی حامل ہسٹری میں شغف رکھنے والوں کے لیے جادوئی سا تاثر رکھتی یہ چوڑی اور کشادہ سیڑھیاں' بہت دور سے کھڑے ہو کر دیکھنے پر بھی نظر آتی تھیں۔ خوب صورت انداز کی کشادہ سیڑھیوں کی تین منزلیں چڑھنے کے بعد اوپر خوب صورت آرکیٹکچر کا حامل دو ٹاورز والا چرچ تھا جو فرانسیسی حکومت نے اٹلی میں 18 ویں صدی میں بنوایا تھا۔ Steps کے بالکل سامنے سڑک پر Bernini کا بنایا مشہور Barcaccia فاؤنٹین (فوارہ) تھا' جو دیکھنے میں ایک کشتی جیسا نظر آتا تھا۔ گویا سیڑھیاں چڑھنے سے پہلے بالکل سامنے کشتی سے مشابہت رکھتا خوب صورت اور تاریخی فوارہ تھا اور ڈھیر سارے steps چڑھ کر بالکل اوپر پہنچ جائیں تو دو خوب صورت میناروں والا چرچ دیکھنے والے کو اپنے آرکیٹکچر سے مبہوت کر دیا کرتا تھا۔ موسم بہار سے لے کر گرمیوں کے موسم تک یہ جگہ سیاحوں کے ساتھ ساتھ روم کے مقامی لوگوں کی بھی آماجگاہ بن جایا کرتی تھی۔ ان

مہینوں کے دوران ان سیڑھیوں کو خوب صورت پھولوں سے سجا بھی دیا جاتا تھا۔

اس وقت بھی اسے سیڑھیوں کے دائیں جانب پہلے زینے سے لے کر اوپر تک جاتے ڈھیر سارے خوش رنگ و خوب صورت پھول سجے نظر آرہے تھے۔ بہت سے لوگ ان سیڑھیوں پر بیٹھے تھے۔ بہت سے سیاح فاؤنٹین کے اردگرد کھڑے تصویریں کھنچوا رہے تھے، کچھ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چرچ تک پہنچ جانا چاہتے تھے۔ اسے وہاں کچھ مقامی آرٹسٹ بھی کام کرتے نظر آرہے تھے جو وہاں تفریح کے لیے آئے لوگوں کو ان کے پورٹریٹس بنا کر اسی وقت بیچ بھی رہے تھے۔

"تمہیں پتا ہے Piazza di spagna صدیوں سے شاعروں، ادیبوں، مصوروں، موسیقاروں اور آرکیٹیکٹس کی پسندیدہ جگہ رہی ہے۔ بائرن، شیلے، آسکر وائلڈ، جارج ایلیٹ، ہنری جیمز، میری شیلے، پرسی، کیٹس کس کس کے نام یاد آجاتے ہیں اس جگہ کے ساتھ۔ شام ہوگئی وزٹنگ آورز ختم ہوگئے ہیں ورنہ میں تمہیں وہ گھر بھی ضرور دکھاتی جہاں کیٹس نے اپنی زندگی کے آخری دن گزارے تھے۔ اب اسے ایک میوزیم بنا دیا گیا ہے۔"

اس نے اپنا کوٹ لیزا کی گاڑی میں چھوڑ دیا تھا، ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر رکھی تھی۔ وہ لیزا کی بات سن رہا تھا۔ مگر اس کی نگاہیں بے شمار سیڑھیوں اور اوپر دور سے نظر آتے چرچ پر تھیں۔

وہ دونوں سیڑھیوں کے پاس پہنچے۔ وہاں پہلے steps پر بیٹھی ایک لڑکی ایک اٹالین آرٹسٹ سے اپنا پورٹریٹ بنوا رہی تھی۔ وہاں چند اور آرٹسٹس بھی اسی طرح سیاحوں کے پورٹریٹس بناتے نظر آرہے تھے۔ لیزا نے بھی اس کے ساتھ اس آرٹسٹ اور اس لڑکی کو دیکھا تھا۔

"مصوروں کا یہاں کھڑے ہو کر لوگوں کو ان کے پورٹریٹس بنا کر دینا اس جگہ کی تاریخ کا حصہ ہے۔ پتا ہے سکندر! اٹھارویں صدی میں خوب صورت اٹالین مرد اور عورتیں یہاں پر اس امید پر جمع ہوا کرتے تھے کہ شاید وہ کسی مشہور مصور کے ماڈل کے طور پر منتخب کرلیے جائیں۔"

لیزا مسکرا کر اسے اس جگہ کے متعلق تمام معلومات اس طرح فراہم کر رہی تھی جیسے کوئی گائیڈ کسی سیاح کو، وہ جواباً" چپ رہا تھا۔

"اب تمہارا کیا موڈ ہے، تم نے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانا ہے یا یہیں بیٹھنا ہے؟"

سیڑھیوں کے پاس آکر رکتے ہوئے لیزا نے اس سے پوچھا۔ اس کا موڈ تو سرے سے یہاں آنے ہی کا نہیں تھا مگر اس کے کوئی جواب دینے سے قبل لیزا مزید بولی۔

"ویسے اگر اتنی ساری سیڑھیاں چڑھنے کا تمہارا موڈ نہیں ہے مگر تم چرچ دیکھنا چاہتے ہو تو اوپر جانے کے لیے لفٹ بھی ہے۔"

"یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔" گھومنے پھرنے تاریخی جگہیں دیکھنے میں اسے قطعاً" دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کوئی اور دنیا تھی، کوئی اور زندگی تھی جس میں تاریخ سکندر شہریار کو مسحور کیا کرتی تھی۔

وہ یونیورسٹی سے اپنے دوستوں کے ساتھ مصر گھومنے گیا تھا۔ وہ کہتا تھا اس نے قلوپطرہ کا مصر دیکھ لیا، اب اسے جولیس سیزر کا اٹلی بھی دیکھنا ہے، پھر کبھی فرصت میں وہ ان دونوں ملکوں کے اوپر ایک کتاب لکھے گا۔

وہ دونوں چند سیڑھیاں چڑھ کر قدرے اونچائی پر آکر ایک سیڑھی پر بیٹھ گئے۔

"آج میں نے تمہیں اسپینش اسٹیپس دکھا دیے، کل سیٹرڈے ہے، تمہاری چھٹی ہوگی ناں؟ روبرٹو کی تو ہوتی ہے۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ مسکراتے ہوئے مزید بولی۔ "کل صبح میں تمہیں تمہارے ہوٹل سے پک کرلوں گی۔ پھر ہم کولوزیم فورم اور پینتھن دیکھیں گے۔ پھر ویٹی کن سٹی میں تمہیں کسی اور دن لے کر چلوں گی۔"

اس نے از خود ہی یہ کس طرح فرض کرلیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ روم گھومنا پھرنا چاہتا ہے۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان..... یکدم اس پر چڑچڑے پن اور غصے کا حملہ ہوا۔

اس نے بے حد سنجیدہ نگاہوں سے لیزا کو دیکھا۔ اسے ایک دم ہی یہ بہتر لگا کہ وہ اس سے براہ راست خود میں اس غیر معمولی دلچسپی کی وجہ پوچھ لے چاہے اسے برا ہی کیوں نہ لگ جائے۔ لیزا اس کی طرف بغور دیکھ رہی تھی۔

"لیزا! میں تم سے ایک بات پوچھوں؟"

"نہیں، مجھے تم سے محبت نہیں ہوئی ہے۔" وہ جو سوال پوچھنے کے لیے اس کی طرف بغور دیکھ رہا تھا لیزا کے اس بے ساختہ جملے پر ہکا بکا رہ گیا۔ وہ مسکراتی ہوئی شرارتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم یہی پوچھنا چاہتے تھے نا؟" وہ ہنس کر بولی۔ وہ حیرت کے جھٹکے سے باہر نکلا تو بے اختیار اس کے لبوں سے ایک قہقہہ نکلا۔ وہ لیزا کے اتنے اچانک اور اس قدر صاف گو جملے پر اپنا بے ساختہ قہقہہ روک ہی نہیں پایا تھا۔

اتنے Blunt انداز میں بدتمیزی کے ساتھ تو نہیں مگر پوچھنا تو وہ واقعی اس سے یہی چاہتا تھا۔

"نہیں۔" وہ ہنسی روکتے ہوئے بولا۔

"جھوٹ، تمہارے چہرے پر صاف صاف لکھا ہے کہ تم مجھ سے مشکوک ہو رہے ہو اور تمہارے جیسے ہینڈسم بندے کے پیچھے کوئی لڑکی آئے تو تمہیں یہ سوچنا ہی چاہیے کہ وہ تم پر فدا ہو گئی ہے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ کوئی بھی لڑکی منٹوں میں تم پر عاشق ہو سکتی ہے۔"

وہ اب مسکراتے ہوئے دلچسپی سے اس کی بات سن رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے کا خراب موڈ اور بیزاری جیسے یک دم ہی کہیں غائب ہو چکی تھی۔

"دیکھو اس میں ذرا سا بھی شک نہیں کہ تم مجھے بھی بہت اچھے، بہت ہینڈسم لگتے ہو، اوپر سے تمہارا یہ غرور اور خود پسندی بھی تم پر بہت سجتی ہے مگر میرے بارے میں تم بے فکر رہو۔ مجھے تم میں اس طرح کی دلچسپی نہیں ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے مگر پُرزور انداز میں کہہ رہی تھی۔

وہ پھر ہنس پڑا تھا۔

"اصل میں سکندر! میرا ابھی زندگی میں بہت دور دور تک محبت اور شادی کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ میں شادی اس سے کروں گی جس سے مجھے محبت ہوگی اور جس سے مجھے محبت ہوگی وہ جب میری زندگی میں آئے گا تو مجھے پتا چل جائے گا میرے دل میں اسے دیکھتے ہی گھنٹیاں بجنے لگیں گی۔"

"اور مجھے دیکھ کر چونکہ تمہارے دل میں کوئی گھنٹیاں نہیں بجیں اس لیے مجھے یہ اطمینان رکھنا چاہیے کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہوئی ہے۔" وہ اس کی باتوں کو انجوائے کرتا ہنس کر بولا تھا۔ وہ واقعی ٹھیک ٹھاک قسم کی آؤٹ اسپوکن لڑکی تھی۔

"جس دن تم مجھے پہلی بار Pizzeria میں ملے تھے مجھے بہت ہینڈسم لگے تھے۔ نہیں، نہیں، گھنٹی کوئی نہیں بجی تھی۔" سنجیدگی سے بولتے بولتے اس نے لفظ ہینڈسم بولنے کے ساتھ ہی فوراً" حلفیہ انداز میں اسے یقین دلایا تھا۔

وہ پھر ہنس پڑا تھا۔ ہوا سے اڑتے اپنے بالوں کو ہاتھوں سے پیچھے کرتی وہ خود بھی مسکرا رہی تھی۔

"اب میری بات کا کوئی اور مطلب مت نکالنا۔ مجھے تمہارا چہرہ خاص طور پر تمہاری آنکھیں بہت پُرکشش لگتی ہیں۔ تم سے پہلی بار مل کر ہی میرا دل چاہا تھا کہ تمہارا چہرہ پینٹ کروں۔ میں تمہارا چہرہ پینٹ کرنا چاہتی ہوں سکندر! تمہاری اجازت سے۔" اس بار وہ قدرے سنجیدگی سے بولی۔

وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کوئی اگر مجھے اچھا لگے اور میں اسے پینٹ کرنا چاہوں تو سیدھا سیدھا اس شخص سے جا کر پوچھ لیتی ہوں اور ابھی تک ہر کسی نے بے تحاشا خوش ہوتے ہوئے مجھے خود کو پینٹ کرنے کی اجازت دی ہے۔ مگر تم جیسے مغرور و بے نیاز بندے کے بارے میں مجھے یقین

تھا کہ تم نے خوش تو کیا ہونا ہے' الٹا مجھے صاف صاف انکار کر دینا ہے۔"

"تو اس لیے مجھ سے دوستی کی جا رہی تھی۔ میں بلاوجہ یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید تمہارے دل میں کوئی گھنٹی و نٹی بج رہی ہے۔" وہ اپنی عادت اور مزاج کے برخلاف اس کے ساتھ اس قدر باتیں کس طرح کر رہا ہے وہ خود حیران تھا۔ اب اسے لیزا کی کمپنی بری نہیں لگ رہی تھی۔

ان کے پاس سے سیاحوں کا ایک گروپ سیڑھیاں چڑھتا اوپر چرچ کی جانب جا رہا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے لیزا کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ اتنا خوش کس بات پر ہے؟ آخر وہ ہنس کس بات پر رہا ہے؟ کیا سکندر شہریار کو خوش ہونے اور ہنسنے کا کوئی اختیار حاصل ہے؟ اس کے اندر خود سے شدید ترین نفرت میں مبتلا شخص نے یکدم ہی سوال کیا۔

لمحے بھر میں اس کے لبوں سے مسکراہٹ رخصت ہو گئی تھی۔ چہرے پر نرمی اور دوستانہ تاثر کی جگہ سختی اور سنجیدگی آ گئی۔ اس نے لیزا سے نظریں ہٹا کر سامنے Fountain کی طرف نگاہ کی۔ وہ یہاں سے فوراً واپس چلے جانا چاہتا تھا۔ لیزا اس کے اندر کی شکست و ریخت سے انجان تھی۔ وہ اسی دوستانہ انداز میں اس سے کہہ رہی تھی۔

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ چلو چل کر کچھ کھاتے ہیں۔ یہاں سیڑھیوں پر بیٹھ کر کھانے پینے کی بالکل اجازت نہیں ہے ورنہ یہاں بیٹھ کر کھانے میں اور مزا آتا۔"

"میں واپس جانا چاہتا ہوں لیزا؟" وہ یک دم ہی سیڑھی پر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"کیوں بھئی اتنی جلدی کیوں؟ ابھی تو میں تمہیں ......" لیزا اسے حیرت سے دیکھتی کچھ کہنے لگی تھی مگر وہ سنجیدگی سے اس کی بات کاٹ کر فوراً بولا۔

"مجھے آفس کا کچھ ضروری کام ہے۔ میں اپنے ہوٹل جانا چاہتا ہوں۔"

وہ اب کہیں کچھ لمحے پہلے کا وہ ہنستا مسکراتا، قہقہے لگاتا شخص نہیں لگ رہا تھا۔ اس کا قطعیت بھرا انداز دیکھ کر لیزا اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے پر حیرت تھی۔ وہ جیسے سکندر کے موڈ کی یوں اچانک تبدیلی کو سمجھ نہیں پائی تھی۔

☼ ☼ ☼

لیزا اسے ہوٹل چھوڑنے آئی تھی۔ ہوٹل تک آنے کا راستہ اس نے خاموشی سے گزارا تھا۔ اس نے اپنے چہرے کو اتنا سنجیدہ اور سخت بنا رکھا تھا کہ لیزا جیسی باتونی لڑکی بھی اس سے پھر کوئی بات کرنے کی ہمت نہیں کر پائی تھی۔

ہوٹل آنے پر گاڑی سے اترتے ہوئے اس نے پُرتکلف انداز میں بغیر مسکرائے اس کا شکریہ ادا کیا۔

"تھینکس لیزا! تم مجھے Spannish Steps دکھانے لے کر گئیں۔" وہ حسب عادت جواباً مسکرائی۔

"اور کل صبح میں تمہیں Forum اور Pantheon دکھانے لے کر چلوں گی۔"

"میں شاید نہ جا سکوں۔ مجھے آفس کا کچھ کام ہے۔"

"آفس کا کام آفس میں کیا کرو ناں۔ روم میں چھٹی کا دن تو Vacanze Romane کی طرح گزارو۔ کل پھر تم مجھے یہ بھی بتانا کہ تم مجھے اپنا پورٹریٹ بنانے کی اجازت دے رہے ہو یا نہیں۔" وہ اس کے انکار کے جواب میں مسکرا کر بولی تھی۔

اس نے Roman Holiday کے الفاظ اٹالین میں ادا کیے تھے۔ وہ مزید بحث یا انکار کیے بغیر سر ہلاتا اسے خدا حافظ کہہ کر اندر آ گیا۔

اس کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں تھا کل لیزا کے ساتھ کہیں پر بھی جانے کا اور یہ انکار اسے کس طرح کرنا تھا' وہ سوچ چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

رات وہ اپنے اسٹوڈیو میں تھی۔ وہ اپنی ایک نامکمل پینٹنگ مکمل کرنے میں مصروف تھی۔ اس نے ڈھیلی ڈھالی سی ٹی شرٹ ٹراؤزر کے ساتھ پہن رکھی تھی۔ بالوں کو کیچو میں لپیٹا ہوا تھا۔

کینوس پر رنگ بکھیرتے اسے یک دم ہی سکندر کا خیال آیا۔ وہ آج شام سے مسلسل اسی کو سوچ رہی تھی۔ وہ ایسا کیوں تھا؟ وہ دوسرے لوگوں سے اتنا مختلف کیوں تھا؟ جیسے اندر ہی اندر کوئی غم اسے ختم کر رہا تھا' جیسے وہ خود سے ہی ناراض تھا۔

آج شام وہ اس کے ساتھ کتنے خوشگوار انداز میں باتیں کر رہا تھا، قہقہے لگا کر رہا تھا پھر ہنستے ہنستے یک دم اسے کیا ہو گیا تھا؟ وہ جانتی تھی اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جو اسے ناگوار گزری ہو۔ وہ سکندر کے پل پل بدلتے موڈ کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

وہ اس بہت مختلف سے شخص کے چہرے کو واقعی پینٹ کرنا چاہتی تھی۔ سکندر کی آنکھوں کی مقناطیسیت' ان کی گہرائی' ان کی اداسی' ان کا حزن اور ان کا اسرار اسے کینوس پر اتارنا تھا۔

☼ ☼ ☼

جب رات وہ سویا ہی نہیں تھا تو صبح جاگنے کا کیا سوال۔ وہ بیڈ پر لیٹا تھا اور اس نے ناشتہ کمرے ہی میں منگوا کر کر لیا تھا۔ اس وقت وہ غیر دلچسپی سے اٹالین میں نیوز کا کوئی چینل دیکھ رہا تھا۔ جب اس کے موبائل پر لیزا کی کال آنے لگی۔ بجائے اس کال کو اگنور کرنے کے اس نے اسے ریسیو کر لیا۔

"ہیلو!"

"چاؤ سینور سکندر!" اس کے لہجے میں شرارتی سی کھنک تھی۔

"آجاؤ نیچے میں تمہارے ہوٹل کے باہر تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔"

"کیوں؟" اس نے قصداً حیرانی سے پوچھا جیسے اسے کل کی بات یاد ہی نہ ہو۔

"کیا مطلب؟ تم بھول گئے کیا؟ کل یہی تو طے ہوا تھا کہ آج صبح ہم کولوزیم چلیں گے۔ اگر تیار نہیں ہوئے ہو تو جلدی سے تیار ہو کر نیچے آجاؤ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔" وہ اس کی حیرت پر حیران ہو کر بولی تھی۔

"آئم سوری لیزا! مجھے یہ بات بالکل بھی یاد نہیں رہی تھی۔ میں آفس کے ایک کولیگ کے ساتھ Pompeii گھومنے نکل چکا ہوں۔ ان فیکٹ اس وقت ہم دونوں ٹرین میں ہیں۔ میں آج رات یا پھر کل صبح واپس آؤں گا۔"

اس کی نظریں ٹی وی اسکرین پر تھیں' وہ ٹرینز ہی کو دیکھ رہا تھا۔

کل لیزا کے ساتھ جو چند منٹوں کے لیے وہ خوش ہوا تھا' مسکرایا تھا' اس نے قہقہے لگائے تھے' اس پر وہ رات بھر خود سے لڑا تھا۔ اسے خوش ہونے اور قہقہے لگا کر ہنسنے کا حق کس نے دیا۔ وہ اس لڑکی سے اب نہیں ملنا چاہتا تھا، کیونکہ وہ اسے خوش ہونے اور ہنسنے پر مجبور کر دیتی تھی اور وہ چند منٹوں کے لیے تو کیا چند سیکنڈز کے لیے بھی خوش رہنا نہیں چاہتا تھا۔

"اچھا۔" اس نے لیزا کے لہجے میں بڑی واضح مایوسی محسوس کی۔ "تم نے مجھے بتایا نہیں' کب بنا تمہارا جانے کا پروگرام؟"

"کل رات' مجھے تمہارے ساتھ کولوزیم جانے کا پروگرام یاد نہیں رہا تھا ورنہ میں تمہیں فون کر کے بتا دیتا۔ آئم سوری۔" اس نے لہجے میں مصنوعی سا تاسف شامل کرتے ہوئے کہا۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ تم انجوائے کرو Pompii بھی ہسٹری میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اچھی جگہ ہے۔ میں گھر جا کر اپنی کچھ ادھوری پینٹنگز پوری کر لیتی ہوں۔ کولوزیم کا پروگرام پھر کسی دن رکھ لیں گے۔" اس بار وہ خوش دلی سے بولی تھی۔

سکندر نے سکون کا سانس لیا۔ اور بیڈ سے اٹھ کر باتھ روم کا رخ کیا۔ مسلسل جاگ جاگ کر اس کی آنکھوں میں جلن ہونے لگتی اور سر بھاری بھاری رہتا تھا۔ نہانے کے بعد وقتی طور پر اس کی طبیعت فریش ہو گئی تھی۔

ابھی وہ بالوں میں برش کر ہی رہا تھا کہ اس کے پاس

ہوٹل کے ریسیپشن سے کال آئی کہ اس سے ملنے کوئی صاحب ہوٹل کی لابی میں آئے بیٹھے ہیں۔

اس نے نام پوچھا تو جواب میں ایک اٹالین نام اسے بتایا گیا۔ وہ اس نام کے کسی بھی شخص سے واقف نہیں تھا، مگر وہ ابھی دفتر میں سب لوگوں سے کہاں واقف تھا۔ وہ صرف یہاں متعلقہ ڈپارٹمنٹ سے منسلک لوگوں سے ہی واقف تھا۔ یقیناً" یہ آفس ہی سے کوئی شخص تھا اور یقیناً" آفس ہی کے حوالے سے کوئی ضروری کام تھا۔

وہ فوراً" ہی بذریعہ لفٹ نیچے آگیا۔ خوب صورت انٹیریر والی اس لابی میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر نرم و گداز صوفے اور میزیں موجود تھیں۔ چکنے، خوب صورت ٹائلز، قیمتی فانوس اور دیواروں پر بنے حسین نقش و نگار اس جگہ کو بہت آرٹسٹک لک دے رہے تھے۔

وہ وہاں کسی اٹالین مرد سے ملنے آیا تھا مگر وہاں آتے ہی سامنے ہی ایک صوفے پر لیزا بیٹھی نظر آگئی۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے نہ دیکھنے کا تاثر دے ہی نہیں سکتا تھا۔

اپنے جھوٹ پر شرمندگی اور کھسیاہٹ محسوس کرتے ہوئے وہ اس کے پاس آگیا۔ لیزا اسے گھور رہی تھی۔

"تو سینور سکندر اس وقت Pompii جا رہے ہیں اور ٹرین میں ہیں۔"

"آئم سوری لیزا! میں نے تم سے جھوٹ بولا۔" بات کھل چکی تھی تو اب مزید جھوٹ نہیں بولا جا سکتا تھا۔ وہ اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

"تمہاری بات سننے کے بعد میں یہاں سے جانے ہی لگی تھی کہ اچانک مجھے یاد آگیا کہ آج تو روم سے باہر اٹلی کے دیگر تمام شہروں میں جانے والی نارمل ٹرینز کی ہڑتال ہے۔"

لیزا اسے گھورتے ہوئے طنزیہ انداز میں بولی۔

اس نے بے ساختہ اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ زبان نہ آنے کا نقصان۔ حالانکہ وہ صبح سے جاگا ایک نیوز چینل ہی دیکھ رہا تھا اور اس پر اس نے ٹرینز اور روم کے ریلوے اسٹیشنز کی فوٹیجز دیکھی تھیں۔ اگر زبان آتی ہوتی تو کم از کم وہ ٹرین کا لفظ تو ہرگز نہ بولتا۔

"سمجھ تو مجھے آگیا تھا کہ تم میرے ساتھ کولوزیم نہیں جانا چاہتے اس لیے جھوٹ بول رہے ہو، مگر میرا دل چاہا کہ میں جھوٹے کو اس کے جھوٹ کے کھل جانے کا تو بتا کر جاؤں۔"

وہ حقیقتاً" بہت شرمندہ ہوا تھا۔ اس سے تو کہیں بہتر ہوتا وہ اس کو صاف لفظوں میں جانے سے منع کر دیتا۔ "تمہارے ساتھ جانے سے نہیں، بس میرا کہیں پر بھی جانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔" وہ شرمندگی سے ہلکا سا مسکرا کر قدرے معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

"تو تم مجھے سچ بھی بتا سکتے تھے۔ بہرحال مجھے سمجھ میں آگیا ہے کہ تم میرے ساتھ کہیں پر بھی جانے آنے میں بلکہ شاید میرے ساتھ دوستی کرنے میں بھی دلچسپی نہیں رکھتے ہو تو اب میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کروں گی۔" وہ یکدم ہی سنجیدگی سے بولتی ہوئی صوفے پر سے اٹھی۔

"میں چلتی ہوں۔ بائے۔" وہ سنجیدہ انداز میں اسے خدا حافظ کہہ کر وہاں سے جانے لگی۔

"لیزا! میں تمہارے ساتھ کولوزیم جانا چاہتا ہوں۔" وہ بے اختیار صوفے سے اٹھا تھا۔

لیزا نے مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ ہنوز خاموش تھی۔

"میں آج روم کو ایک رومن لڑکی کے ساتھ اس کی نظر سے دیکھنا چاہتا ہوں۔" وہ مسکرا کر لیزا ہی کا جملہ دہرا رہا تھا۔

"جب تم کہیں پر بھی جانا نہیں چاہتے تو اپنے جھوٹ پر شرمندگی محسوس کرتے ہوئے زبردستی تمہیں کہیں جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وہ اب بھی سنجیدہ تھی۔

"پلیز لیزا! میں تمہارے ساتھ کولوزیم جانا چاہتا ہوں۔ رومنز کتنے ظالم اور سفاک لوگ تھے، میں وہاں کا وزٹ کر کے اس کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔"

معذرت خواہانہ انداز میں بھی وہ جان بوجھ کر اسے چڑانا نہیں بھولا تھا۔ وہ جس طرح اپنے ملک کی ہر چیز کے قصیدے پڑھتی تھی، جس طرح اپنے ملک کی ہر چیز پر باقاعدہ فخر کرتی تھی، وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اپنی سفاک تاریخ کا وہ کس طرح دفاع کرے گی۔

"تھوڑے، بہت نہیں، تم خاصے ٹھیک ٹھاک قسم کے بدتمیز آدمی ہو سکندر شہریار! اگر مجھے تمہارا پورٹریٹ بنانے کا لالچ نہ ہوتا تو اب میں تمہارے ساتھ کبھی بھی کہیں نہیں جاتی۔" وہ اسے گھورتے ہوئے بولی تھی۔

وہ مبہم سا مسکرایا۔ "چلیں؟"

"چلو۔" لیزا جواباً" اسی خفگی بھرے انداز میں بولی۔

وہ دونوں گاڑی میں بیٹھے تھے۔ لیزا کو شاید زیادہ دیر ناراض رہنا یا غصہ کرنا آتا ہی نہیں تھا تب ہی اب وہ اس کے ساتھ نارمل انداز میں باتیں کر رہی تھی۔

گاڑی اب ایک اونچائی کی طرف جاتی سڑک پر چل رہی تھی۔

بہت دور سے ہی اس سڑک پر کولوزیم نظر آنا شروع ہو گیا تھا۔ رومیوں کے جاہ و جلال اور ان کی بربریت کی کئی ہزار سال پرانی داستانیں اپنے اندر سمیٹے ہوئے۔ دنیا کے 7 عجائبات میں سے ایک عجوبہ اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ رومیوں کی انجینیئرنگ اور آرکیٹیکچر میں مہارت کا جیتا جاگتا ثبوت۔ صدیوں سے شان و شوکت سے اپنی جگہ ایستادہ۔ اس کی بیرونی دیوار کا ایک حصہ اسے ٹوٹا ہوا نظر آ رہا تھا جس طرح اس نے بے شمار تصاویر، موویز اور ڈوکومنٹریز میں دیکھ رکھا تھا۔

"اٹلی آنے والوں کے لیے کولوزیم دیکھنا تو لازمی ہے۔ میں حیران ہوں تم ابھی تک یہاں کیوں نہیں آئے تھے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ یہ وہ جگہ ہے جسے دیکھے بغیر روم آنے والا کوئی شخص یہاں سے واپس نہیں جاتا۔ یہاں کوئی نان اٹالین مووی ایسی نہیں ہو سکتی جس میں کولوزیم کو نہ دکھایا گیا ہو۔"

"تب تو تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں تمہیں یہاں لے آئی ورنہ تم سے تو کچھ بعید نہ تھا کولوزیم دیکھے بغیر ہی یہاں سے واپس چلے جاتے۔"

"میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں لیزا محمود!" وہ اسی جیسی ٹون میں بولا۔

"تمہاری شکر گزاری کا اندازہ تو مجھے تمہارے آج صبح کے جھوٹ سے ہی ہو گیا تھا۔ تمہیں قائل کرنا چاہتی ہوں تاکہ مجھ سے اپنا پورٹریٹ بنوا لو، ورنہ تمہاری اس بدتمیزی پر مجھے بہت غصہ ہے۔ پتا ہے کل تمہیں ڈراپ کرنے کے بعد میں نے اپنے سب کام چھوڑ کر سب سے پہلے ہمارے آج کلوزیم وزٹ کرنے کے لیے آن لائن ٹکٹس خریدے تھے۔ ایسے یہاں آجائیں تو معلوم ہے ٹکٹ خریدنے کے لیے کتنی لمبی لائن میں لگنا پڑتا ہے۔ اب ہم لائن میں لگنے کی زحمت سے بچ جائیں گے۔"

لیزا نے اس کی صبح کی حرکت اسے دوبارہ جتائی تھی۔

وہ اب گاڑی پارک کر رہی تھی۔ سکندر ارد گرد دیکھ رہا تھا۔ کلوزیم کے اندر داخل ہوتے اور اس کے بیرونی حصے کے اطراف گھاس پر کھڑے ـــــ ہو کر تصویریں کھنچواتے سیاح وہاں بے شمار تھے۔ جو لوگ گھاس پر کھڑے ہو کر تصاویر بنوا رہے تھے، وہ تصویر میں اپنے عقب میں کلوزیم کو لانا چاہتے تھے۔

وہ اور لیزا گھاس کے اوپر چلتے کلوزیم کے سامنے آ گئے تھے۔ وہ اس لڑکی کے ساتھ یہاں نہیں آنا چاہتا تھا۔ اسے نہ اس لڑکی میں کوئی دلچسپی تھی نہ روم کی تاریخ میں، مگر پھر بھی وہ اس وقت یہاں آ کر خود کو خوش محسوس کر رہا تھا۔ اسے اس لڑکی کے ساتھ یہاں آنا اچھا لگ رہا تھا۔

"اندر چلیں؟" اس نے لیزا کی طرف دیکھ کر خود اندر جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

"چلو۔" وہ جواباً" مسکرا کر بولی تھی۔

وہ دونوں کلوزیم کے اندر آ گئے تھے۔ سیاحوں کے ساتھ رش کا حصہ بنے وہ بھی 72 اے ڈی میں بنے اس Amphitheatre کا نظارہ کر رہے تھے۔

درمیان میں بہت بڑا کشادہ صحن نما حصہ اور اس کے اطراف سیڑھیوں کی طرح اونچی ہوتی پتھروں سے بنی نشستوں کی قطاریں جیسے کہ موجودہ دور کے فٹ بال اسٹیڈیمز نے اپنی تعمیر کا بنیادی نقشہ Colosseum ہی سے چرایا تھا' ایسا لگتا تھا۔ یہاں اس کھلے میدان میں انسانوں کا خونخوار درندوں کے ساتھ مقابلہ کروایا جاتا تھا اور یہ غیر انسانی اور بربریت لیا عمل Romans کے لیے ایک کھیل' ایک تفریح تھا۔ پچاس ہزار افراد پتھر کی سیڑھیوں پر بیٹھے تالیاں بجا بجا کر اس غیر انسانی عمل کو دیکھا کرتے تھے۔ وہ دونوں ایک بہت بڑے سے پتھر کے سامنے کھڑے ہو کر نیچے میدان کو دیکھ رہے تھے۔

"Kill the loser who ever he may be"۔

بے ساختہ colosseum میں ان گلیڈی ایٹر لڑائیوں کے متعلق پڑھا گیا جملہ اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ اگر خونخوار درندے کو جان سے مار دیا تو غلام اور مجرم آزاد نہیں تو درندے کے ہاتھوں اس کی موت جو ہارے گا وہ مرے گا۔

"تم لوگوں کی تاریخ ظلم اور سفاکی سے بھری ہوئی ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو' رومن بادشاہ اپنے وقت کے ظالم ترین لوگ تھے۔" وہ اس بار بغیر برا مانے بولی تھی۔ "پر رومن اتنے برے بھی نہیں ہوتے۔ میں ایک رومن لڑکی کو جانتا ہوں اور وہ کافی اچھی ہے۔"

اپنی شخصیت اور اپنے مزاج سے بہت مختلف جملہ بالکل بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ لیزا اس تعریفی جملے پر خوش ہو کر مسکرائی تھی۔

"تو تم اس اچھی رومن لڑکی کو یہ اجازت دے رہے ہو کہ وہ تمہارے چہرے کے تمام نقوش' خاص طور پر تمہاری آنکھیں ان کے تمام تر تاثر کے ساتھ کینوس پر اتار سکے؟"

"میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا۔" وہ جواباً" مسکرایا۔

"اوہ... میں خوش ہو گئی تھی۔ لیکن خیر! ابھی تو تمہارا یہاں کافی دنوں کا قیام باقی ہے' دیکھ لینا میں تمہیں راضی کرنے میں کامیاب ہو ہی جاؤں گی۔"

وہ دونوں اب وہاں اس قدیم آرکیٹکچر کے بیچ آہستہ آہستہ چلتے اور گردو پیش کو دیکھتے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

وہ لیزا کے پر یقین سے انداز پر مبہم سا مسکرایا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا ایسا کبھی بھی ہونے والا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ کہیں چلے جانا' گھومنے پھرنے پر راضی ہو جانا الگ بات تھی' مگر اس سے ہٹ کر وہ کسی کی بات کے لیے کبھی بھی راضی نہیں ہو سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم نے دنیا میں ابھی تک Cheese (پنیر) کھائی ہی نہیں ہے' اگر تم نے اٹالین چیز نہیں کھائی ہے اور تم نے دنیا میں ابھی تک کافی نہیں پی ہے' اگر تم نے اٹالین کافی نہیں پی ہے۔"

وہ دونوں کلوزیم سے نزدیک ایک ریسٹورنٹ میں لنچ کر رہے تھے' تب لیزا اس سے بولی تھی۔ ریسٹورنٹ کے باہر شیڈ میں لگی میزوں میں سے ایک پر وہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔

اٹالین پنیر اور زیتون کے مزے دار ذائقے والا ہاتھ سے تیار کیا پاستا کھاتے ہوئے وہ لیزا کی بات دلچسپی سے سن رہا تھا۔ وہ اپنی اس ٹون کو برقرار رکھتے ہوئے ایک پل کا ڈرامائی وقفہ دینے کے بعد مزید بولی۔

"اور تم ابھی تک دنیا میں کسی سچے آرٹسٹ سے نہیں ملے ہو' اگر تم لیزا محمود سے نہیں ملے ہو۔"

وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"تم خود اپنی کتنی تعریفیں کرتی ہو۔"

"ہاں تو ہوں نا میں تعریف کے قابل۔" وہ ہنس کر بولی۔

"لیزا! تم مسلمان ہو؟ میرا مطلب ہے تمہارے والد مسلمان اور والدہ کرسچن ہیں۔"

کچھ دیر کے بعد کھانا کھاتے کھاتے اس نے پوچھا۔ مگر سوال منہ سے نکلتے کے ساتھ ہی اسے اس کے نامناسب ہونے کا احساس ہوا۔

"سوری یہ سوال کچھ پرسنل ہو گیا۔" اس نے فوراً" ہی معذرت کی۔

"نہیں' یہ سوال مجھے تو پرسنل نہیں لگا۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"میں مسلمان ہوں سکندر! اس لیے نہیں کہ میرے پاپا مسلمان ہیں' بلکہ اس لیے کہ میں نے خود اپنے لیے اس مذہب کو چنا ہے۔ جب ماں اور باپ الگ الگ مذاہب سے ہوں تو بچے خود اپنے لیے کسی ایک مذہب کو چن نہیں پاتے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی تھا۔ میرے لیے نہ اسلام کی کچھ خاص اہمیت تھی' نہ عیسائیت کی۔ یوں سمجھ لو' میں بس نام کی مسلمان تھی۔ مگر 9/11 نے دنیا میں جہاں بہت کچھ تبدیل کر دیا' وہاں میرے جیسے نوجوان نسل کے لڑکے اور لڑکیوں کو جن کے لیے ان کا اسلامی تشخص کچھ خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا' بہت کچھ سمجھا گیا۔

جب 9/11 کا واقعہ رونما ہوا میں 18 سال کی تھی۔ ایک کنفیوزڈ سی نوعمر لڑکی جس کے لیے اپنی ماں یا باپ میں سے کسی ایک مذہب کو چننا دشوار کام تھا' جس کے لیے مذہب ایک ثانوی چیز تھی۔ مگر پھر جب میں نے اسے اپنے ساتھ' اپنے جیسے بہت سے نام کے مسلمانوں کے ساتھ ان کے محض اسلامی نام یا اسلام سے سرسری سے تعلق کی وجہ سے امتیازی سلوک ہوتا دیکھا' تب جیسے میں چونک سی گئی تھی۔ لندن میں میری بہت سی دوستوں اور ملنے والوں نے صرف میرے پاپا کے مسلمان ہونے کی وجہ سے جب چھوڑ دیا یا مجھ سے کھنچے کھنچے رہنے لگے' تب پہلی بار میرے دل میں خواہش جاگی کہ جس مذہب کے خلاف دنیا بھر میں اس قدر نفرت پھیلائی جا رہی ہے جسے ختم کرنے کو سارا مغرب درپے ہے' وہ درحقیقت ہے کیسا؟ پھر میں نے اسلام کو سمجھنے اور جاننے کی کوشش کی اور میں نے اسے بہت روشن خیال اور فطرت سے قریب پایا۔

میں نے اسلام کو جاننے اور سمجھنے کے بعد اپنی مسلم شناخت برقرار رکھی ہوئی ہے سکندر!"

اسے لیزا کے مسلمان ہونے کا سن کر خوشی ہوئی تھی۔ اسے اب یہ بھی سمجھ میں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ پیزا یا پاستا کچھ بھی کھاتے ہوئے لیزا گوشت کی جگہ سبزیوں یا مچھلی سے بنی ڈش کا انتخاب کیوں کرتی ہے اور اس کا لباس چاہے جتنا بھی مغربی وضع کا ہو' مگر جسم کو مکمل طور پر ڈھانپے ہوئے کیوں ہوتا ہے۔

"تم پاکستان سے ہو نا سکندر؟" کھانا کھا لینے کے بعد وہ دونوں وہیں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ ڈارک اسٹرونگ کافی بغیر کریم یا دودھ کے' خالصتا" اٹالینز کی طرح۔ کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے لیزا نے اچانک اس سے پوچھا۔

"نیشنلٹی کا پوچھ رہی ہو تو وہ امریکن ہے۔ ہاں تعلق کی بات کرتی ہو تو وہ میرا پاکستان ہی سے ہے۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دے تو دیا۔ مگر وہ کچھ بے چین سا ہوا تھا۔

وہ لیزا کے مزید اپنی ذات سے متعلق کسی سوال سے کترا رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ سخت رویہ نہیں رکھنا چاہتا تھا' مگر وہ اپنے بارے میں کچھ بتانا — بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"تمہارے پاپا بھی تو پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں' مگر تمہیں اردو نہیں آتی۔"

اس نے جلدی سے گفتگو کا رخ لیزا کی طرف موڑ دیا۔ اسے اندازہ تھا۔ وہ باتونی لڑکی اب اس موضوع پر اور پھر اس موضوع سے کچھ اور بات نکال کر کہیں سے کہیں پہنچ جائے گی۔

"کس نے کہا مجھے اردو نہیں آتی؟ مجھے اردو آتی ہے۔ میں اردو کے بہت سارے لفظ بول سکتی ہوں۔ خبیث' ذلیل' کمینہ' الو کا پٹھا۔ مجھے سارے لفظ آتے ہیں۔"

وہ اس کے اردو ذخیرہ' الفاظ پر ہونق بنا اسے منہ کھولے دیکھ رہا تھا۔ وہ یہ جملہ اردو میں بولی تھی۔ اس کی اردو کھڑی کھڑی' اطالوی لہجے والی اردو تھی۔

"تمہیں یہ اردو آتی ہے؟ گالیاں؟ پتا ہے' جو لفظ تم نے بولے ہیں۔ یہ سب کے سب گالیاں ہیں۔ بہت

خراب گالیاں۔"

وہ اسے لاعلم سمجھ کر سنجیدگی سے انگریزی ہی میں سمجھانے لگا۔ مگر اسے حیرت کا شدید ترین جھٹکا لیزا کو سرا اثبات میں ہلاتا دیکھ کر لگا۔

"ہاں مجھے پتا ہے۔ پاپا نے تو ہمیں کبھی اردو نہیں سکھائی۔ مگر ہماری نینی بچپن میں مجھ سے اور میری بہن سے چونکہ اردو میں بات کرتی تھیں تو ہم دونوں ہی نے اردو سیکھ لی تھی۔ میرا تلفظ اور لفظوں کی ادائیگی صاف نہیں ہے، مگر اردو مجھے پوری آتی ہے۔"

"تمہاری نینی تم لوگوں کو گالیاں سکھاتی تھیں؟"

"نہیں... یہ گالیاں تو میں نے اور سیم نے خود سے فرمائش کرکے سیکھی تھیں۔ اسکول میں ہمیں کسی پر غصہ آتا یا لڑائی ہو جاتی تو ہم اسے یہ لفظ بول دیا کرتے تھے۔ ایک بار میرے ایک کلاس فیلو سے میری اور سیم کی لڑائی ہو گئی تو اس سے بدلہ لینے کے لیے کچھ دنوں بعد ہم نے اسے جا کر بتایا کہ تم الو کے پٹھے ہو، اس کا مطلب ہماری زبان میں یہ ہے کہ تم بہت جینئس اور اسمارٹ ہو۔ پتا ہے پھر ساری کلاس کے سامنے اپنی قابلیت جھاڑنے کے لیے، یہ بتانے کے لیے کہ اسے بہت ساری زبانیں آتی ہیں اس نے خود اپنے منہ سے پوری کلاس کے سامنے "میں الو کا پٹھا ہوں۔" کہا تھا۔ تب مجھے اور سیم کو بہت مزا آیا تھا۔ بعد میں ہم دونوں خوب ہنسے تھے۔"

وہ فخریہ انداز میں بتا رہی تھی۔

"مگر مجھے تو کوئی خوشی نہیں ہو رہی کہ جو لڑکی تازہ تازہ میری دوست بنی ہے۔ وہ ٹرک ڈرائیوروں والی اردو Vocabulary (ذخیرہ لفظ) رکھتی ہے۔"

اس نے سے اسے دیکھا۔

وہ لاپروائی سے شانے اچکا کر ہنسی۔

"اگر تم سیکھنا چاہو تو میں تمہیں اٹالین میں کچھ گالیاں سکھا سکتی ہوں۔ بوقت ضرورت تمہارے کام آئیں گی۔" اس نے اپنی خدمات اسے پیش کیں۔ وہ دونوں اب میز سے اٹھ رہے تھے۔ آج اس نے لیزا کو بل پے نہیں کرنے دیا تھا۔

"شکریہ، بہت شکریہ... میں خاصا مہذب آدمی ہوں۔"

"دیکھو آنے والے وقت کا کچھ پتا نہیں ہے، میری مانو چند ایک اٹالین گالیاں سیکھ لو۔ بوقت ضرورت تمہارے کام آئیں گی۔"

وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ نہ بولنے سے تھکتی تھی نہ ہنسنے سے۔

"تم اتنا کیسے بول لیتی ہو؟ میں پوری زندگی اتنا زیادہ نہیں بولا ہوں گا، جتنا تمہارے ساتھ ان تین دنوں میں... بولا ہوں۔"

"میں زیادہ تو نہیں بولتی، لگتا ہے تم نے کبھی کوئی باتونی لڑکی دیکھی نہیں ہے۔"

وہ اب اس کے ساتھ مسلسل اردو ہی میں بات کر رہی تھی۔ وہ ہنس پڑا۔

چہل قدمی کرتے ہوئے اسے ایک ریسٹورنٹ کے پاس سے گزرتے اس کے شیشے کے دروازے میں اپنا عکس نظر آیا۔ اپنے چہرے پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں خوشی نظر آئی۔ اپنے چہرے کی اس مسکراہٹ کو دیکھتے ہی اس کی مسکراہٹ فوراً" رخصت ہو گئی۔

سکندر شہریار کو یہ حق کس نے دیا تھا کہ وہ زندگی کے ایک بھی لمحے کو انجوائے کرے، مسکرائے، ہنسے، خوش ہو؟ اسے زندگی کو زندہ لوگوں کی طرح گزارنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

"اب ہم Forum اور پھر Hill Palatine چلتے ہیں۔ شام تک گھومنے کے لیے ہمارے پاس کافی ٹائم ہے۔"

لیزا اس کی سوچوں اور موڈ کی تبدیلی سے انجان مسکرا کر بولی۔

"میرا کہیں اور جانے کا موڈ نہیں ہے۔ میں واپس جانا چاہتا ہوں۔"

اچانک وہ خشک لہجے میں سنجیدہ چہرے کے ساتھ بولا۔ لیزا اس کے موڈ کی تبدیلی کو محسوس کر گئی تھی۔

"تمہیں اچانک کیا ہو جاتا ہے سکندر! کل بھی تم نے اس طرح کیا۔ تمہیں میری کوئی بات بری لگی ہے؟"

"کوئی بات نہیں ہوئی ہے۔ بس میں تھک گیا ہوں۔ آرام کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

لیزا چپ ہو گئی۔ وہ دونوں گاڑی میں آکر بیٹھ گئے۔

"آئم سوری لیزا! اگر میری وجہ سے تمہارا دن خراب ہوا ہے تو... تم اپنے بہت سے کام چھوڑ کر مجھے روم کے تاریخی مقامات دکھانے آئی تھیں۔ بس مجھے زیادہ بولنا، باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا۔ میں تھکن اور کوفت محسوس کرنے لگتا ہوں۔"

لیزا نے گاڑی اسٹارٹ کی، تب وہ اس سے سنجیدگی سے بولا تھا۔

"مجھے اندازہ ہے سکندر! اور تم فکر مت کرو، میرا دن ہرگز خراب نہیں ہوا۔ میرا مقصد تو سینیور سکندر پر اپنا اچھا تاثر قائم کرنا، دوستی کرنا ہے تاکہ اس دوستی کے لحاظ میں وہ مجھے اپنی پینٹنگ بنانے کی اجازت دے دے۔"

وہ سنجیدگی سے بولی، مگر وہ کوشش کے باوجود بھی اپنی مسکراہٹ روک نہیں پایا۔ اسے مسکراتا دیکھ کر لیزا بھی مسکرائی تھی۔ وہ اسے اچھے انداز میں رخصت کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے ایک رسمی مسکراہٹ چہرے پر لیے اسے خدا حافظ کہہ کر اندر آگیا تھا۔ اندر آتے ہی اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ اپنے کمرے میں آگیا۔ اندر آتے ہی اس نے نیند کے لیے ڈاکٹر کی تجویز کردہ ٹیبلیٹ لی اور اپنا موبائل فون آف کر دیا۔ وہ بستر پر لیٹ گیا وہ خود کو سزا دینا چاہتا تھا۔ وہ ارادتا" اپنے ان ڈراؤنے خوابوں کو دیکھنے کے لیے سو جانا چاہتا تھا جو اس کی طبیعت کو کئی دنوں تک نڈھال رکھا کرتے۔

تین دن سے خوش ہونے اور قہقہے لگا کر ہنسنے کی کم سے کم سزا بھی یہ خواب ہی ہو سکتے تھے۔ یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ سوئے اور اسے وہ ڈراؤنے خواب نظر نہ آئیں، پھر وہ سو کر اٹھے تو اسے اعصابی درد نہ ہو رہا ہو؟

سکندر شہریار کو سزا ملنی چاہیے، اسے کوئی سخت سے سخت سزا ملنی چاہیے۔

ہنسی اور سکندر شہریار کے لبوں پر؟

خوشی اور سکندر شہریار کی آنکھوں میں؟

وہ خاموش لیٹا چھت پر لٹکتے فانوس کو دیکھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کہاں رہیں سارا دن؟" نینی رات کے لیے کھانا پکا رہی تھیں اور وہ میز پر چڑھ کر بیٹھی ناشپاتی کھا رہی تھی۔ اسے پھلوں میں ناشپاتی بہت پسند تھی۔

"ساڑھے تین بجے تک تو گائیڈ بنی ہوئی تھی، اس کے بعد سینڈرا سے ملنے چلی گئی تھی۔ جب سے روم آئی ہوں اس سے مل ہی نہیں سکی تھی۔"

"گائیڈ؟" نینی کو اس کے لاابالی پن سے بولے جملے میں زیادہ قابل توجہ گائیڈ والی بات لگی تھی۔

"جی گائیڈ... وہ بے چارہ یہاں ٹورسٹ نہیں ہے، آفس کے کام سے آیا ہوا ہے، مگر میں زبردستی اسے ٹورسٹ بنانے پر تلی ہوئی ہوں۔" وہ ہنس کر بولی۔

نینی نے اسے بغور دیکھا تھا۔ "وہ کون؟ وہ روبرٹو کا کولیگ کیا نام بتایا تھا تم نے اس کا؟"

"سکندر۔" اس نے جھٹ انہیں نام بتایا۔

"کیسا ہے وہ؟" نینی نے اسے مسکرا کر دیکھتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا۔

"پرسنالٹی پوچھ رہی ہیں یا مزاج؟" اس نے ناشپاتی کی قاش منہ میں ڈالتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

"ظاہری شخصیت کی بات کریں تو وہ بہت ہینڈسم ہے۔ اپالو کا خیال آتا ہے اسے دیکھ کر۔ اور نیچر کی بات کریں تو دوسرے لوگوں سے بہت مختلف سا ہے وہ... کھویا کھویا، اداس سا، خود سے خفا خفا سا۔ کبھی زندہ دلی سے ہنستا ہے، کبھی بالکل سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ بات کرتے کرتے اچانک ہی رک جاتا ہے، ہنستے ہنستے ایک دم ہی چپ ہو جاتا ہے۔"

وہ کچھ کھوئے کھوئے سے انداز میں جیسے تصور میں سکندر کو دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

"شادی شدہ ہے کہ کنوارا؟" نینی نے یک دم ہی

بے حد دلچسپی ظاہر کی۔ وہ سبزیاں کاٹتی رک کر بغور اسے دیکھنے لگی تھیں۔

"نینی!" اس نے بے حد ناراضی سے انہیں دیکھا۔ "تم اس کی اس قدر تعریف کر رہی ہو تا تو مجھے لگا کہ شاید..."

"آپ کو بالکل غلط لگا نینی۔" وہ نینی کا وضاحتی جملہ کاٹتے ہوئے قدرے خفگی سے بولی۔

"وہ مجھے بس ایک دوست کی حیثیت میں اچھا لگا ہے۔ میں اسے پینٹ کرنا چاہتی ہوں اس لیے اچھا لگا ہے۔"

"لیکن کسی اور طرح بھی تو وہ اچھا لگ سکتا ہے۔ جب وہ اتنا اچھا ہے تو پھر..."

"ناممکن... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس کی سب سے بڑی خامی اس کا پاکستان سے تعلق رکھنا ہے۔ ناممکن ہے کہ میں دوستی سے بڑھ کر اس کے لیے کچھ اور سوچوں۔"

نینی کو اس کی بات بری لگی تھی۔ وہ پاکستان کی برائی سن کر ہمیشہ اسی طرح رد عمل ظاہر کیا کرتی تھیں۔

"پاکستانی ہونا کیا اتنا برا ہے لیزا؟"

"ہاں میرے لیے برا ہے میں کسی مسلمان آدمی سے شادی کروں گی مگر وہ مسلمان آدمی پاکستان سے ہرگز تعلق نہیں رکھتا ہوگا اور آپ مجھے اس طرح ناراضی سے مت گھوریں۔ آپ خود کون سا اب پاکستانی ہیں۔ گزشتہ چوبیس سالوں سے آپ اٹالین ہیں۔"

ایسا پہلی بار نہ ہوا تھا۔ وہ برملا پاکستانی مردوں کو برا کہا کرتی تھی اور نینی اس کے برا کہنے پر ہر بار یوں ہی بدمزہ ہوا کرتی تھیں۔

"پاکستان کے خلاف یہ ساری نفرت سیم نے تمہارے اندر ڈال دی ہے لیزا۔" انہوں نے خفگی سے کہہ کر دوبارہ سبزیاں کاٹنا شروع کر دی تھیں۔

"پاکستان کے خلاف یہ ساری نفرت پاپا نے میرے اندر ڈالی ہے نینی! انہوں نے اپنے عمل سے ثابت کر کے بتایا ہے کہ پاکستانی مرد کتنے برے ہوتے ہیں۔ وہ پاپا ہوں یا ہاشم اسد۔ سارے پاکستانی مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ منافق دوغلے اور سنگ دل۔"

وہ بے تلخی سے فوراً" ہی میز سے نیچے اتری اور کچن سے باہر چلی گئی۔

نینی کے چہرے پر بھی کچھ برہمی تھی۔ انہوں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ اوپر اپنے اسٹوڈیو میں آ کر خود کو پینٹنگ میں مصروف کر چکی تھی۔ جب اسے سیڑھیوں سے کسی کے اوپر چڑھنے کی آوازیں سنائی دیں۔

نینی اوپر اس کے پاس آئی تھیں۔ ان کے چہرے پر اب اس کے لیے خفگی نہیں بلکہ ممتا اور محبت تھی۔ وہ ان کے پیار کے اظہار پر اب مزید اپنا موڈ خراب رکھ نہیں سکتی تھی۔

"آپ چلیں میں آ رہی ہوں۔" وہ مسکرا کر بولی۔ وہ گردن ہلاتی واپس نیچے جا رہی تھیں۔ لیزا کام روک کر انہیں جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ ماں کی اصل گود اور اصل پیار تو اس نے پایا نہیں تھا ہاں ماں کے جیسے پیار کی جھلک اس نے نینی کے پیار میں دیکھی تھی۔

وہ جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ اولاد تھی نہیں۔ وہ اور ان کا خاندان اس کے دادا کے خاندان کے جدی پشتی ملازم تھے۔ اس کی دادی کو بیٹے کی اٹالین عورت سے شادی کے سبب اپنی پوتیوں کی تربیت اور پرورش سے متعلق تفکرات لاحق تھیں۔ پوتیوں کی اسلامی خطوط پر تربیت کے لیے انہوں نے اپنی قابل بھروسا ملازمہ مہر النساء کو اٹلی بیٹے کے پاس بھیج دیا تھا۔ تب نینی چھتیس، سینتیس سال کی تھیں۔ پھر جب ان بہنوں کا گھر ٹوٹا ان کا ساتھ چھوٹا تب ان بہنوں کی زندگیوں میں نینی کی ضرورت بھی ختم ہو گئی تھی۔ جب گھر ہی نہ رہا تھا تو کسی آیا یا ملازمہ کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی تھی۔ مگر پیچھے پاکستان میں بھی نینی کا کون تھا وہاں جا کر بھی انہیں اس کی دادی کے گھر رہنا یا پھر کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی کے گھر پر آیا ہی بننا تھا تو پھر یہ ملک کیا

تھا۔

وہاں روم میں پاکستانی ایمبیسڈر کو اپنے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے پاکستانی آیا کی ضرورت تھی۔ وہ اچھے حسب نسب والی ملازمہ تھیں، محمود خالد کے گھر ان کی بچیوں کی آیا رہ چکی تھیں اس حوالے کی بنیاد پر انہیں روم میں دوسری ملازمت فوراً" ہی مل گئی تھی۔ پھر آنے والے برسوں میں وہ کسی نہ کسی پاکستانی سفارت کار یا بزنس مین کے گھر پر ان کے بچوں کی آیا کے طور پر یا ان کے بچوں کو قرآن پاک پڑھانے کا کام کرتی رہی تھیں۔ ان تمام برسوں میں لیزا کا ان سے برابر رابطہ رہا تھا۔

پانچ سال قبل جب اس نے روم میں اپنا فلیٹ خریدنے کا سوچا تب اس کے ذہن میں فوراً" ہی یہ خیال آیا تھا کہ وہ اپنے فلیٹ کی دیکھ بھال کے فرائض نینی کے سپرد کر دے گی۔ اس نے اب نینی کو کہیں پر بھی ملازمت کرنے سے منع کر دیا تھا۔ وہ خود تو یہاں صرف دو ماہ گزارا کرتی لیکن باقی سارا سال اس کے فلیٹ کا خیال نینی رکھتی تھیں۔ وہ انہیں ان کے اخراجات کے لیے پابندی سے ہر ماہ لندن سے پیسے بھیجا کرتی تھی۔ اس کی پرورش اور تربیت میں ان کا بہت ہاتھ تھا۔ وہ ماں نہیں تھیں، پر ماں جیسی تو تھیں۔ ان کا حق تھا اور اس کا فرض کہ اب جب وہ بوڑھی ہو چکی ہیں وہ ان کا خیال رکھے۔

وہ کھانا کھانے کے لیے نیچے آ گئی تھی۔ کھانے اور کافی کے بعد آج اس کا رات بھر کام کرنے کا موڈ تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ بہت اندھیری بڑی ہیبت ناک جگہ تھی۔ جیسے کوئی غار کوئی سرنگ وہاں روشنی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اسے وہاں بہت ڈر لگ رہا تھا۔ اسے اس اندھیرے سے وحشت اور تنگ جگہ پر گھٹن ہو رہی تھی۔ وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ وہ مدد کے لیے چلا رہا تھا وہ چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ کوئی تھا جو اس اندھیرے میں چلتا اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ اسے تمسخرانہ نظروں سے دیکھتے اس کی بے بسی پر قہقہے لگا رہا تھا۔ وہ خود کو بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ مگر نہ وہ وہاں سے بھاگ پا رہا تھا نہ ہی اس شخص سے خود کو دور کر پا رہا تھا۔ زور زور سے چلاتے یک دم ہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

چند سیکنڈ زوہ بالکل کسی مردے کی طرح ساکت بیڈ پر پڑا رہا۔ اس کے جسم میں کوئی جنبش نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد جب وہ اپنے ہاتھ پاؤں ہلانے کے قابل ہوا تب اس کا ہاتھ بے ساختہ اپنے چہرے پر گیا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ اسے پسینہ آنے لگا۔ اس کے جسم پر کپکپاہٹ طاری ہو گئی تھی۔

اسے اپنے کمرے کے گھپ اندھیرے میں شدید ترین گھٹن ہونے لگی۔ وہ اپنی ساری ہمت جمع کر کے بستر سے اٹھا تھا۔ وہ کمرے کی تمام کھڑکیاں کھولنا چاہتا تھا وہ کمرے کی تمام بتیاں روشن کرنا چاہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ لاس اینجلس میں رہ رہا تھا اور کیلی فورنیا یونیورسٹی میں اپنی انڈر گریجویٹ اسٹڈیز میں مصروف تھا۔ اسے گھر کی یاد بالکل نہیں آتی تھی۔ اسے اگر کوئی یاد آتا تھا تو وہ اس کی امو جان تھیں۔ باقی اسے اپنے گھر کے نہ کسی فرد کی یاد آتی تھی نہ کسی اور چیز کی۔

امو جان سے اس کی فون پر خوب لمبی گفتگو ہوتی تھی۔ جبکہ شہریار خان اس سے فون پر انتہائی مختصر بات کیا کرتے تھے۔ سرسری انداز میں اس کی تعلیم اور کیمپس سے متعلق چند سوالات اور پھر مخصوص جملہ کہ اسے پیسوں یا کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ وہ اس کا رزلٹ کیسا دیکھنا چاہتے ہیں آگے اس کے مستقبل کے لیے کیا کچھ سوچتے ہیں کچھ بھی نہیں۔ یہ سب وہ یقیناً" سکندر سے کہتے ہوں گے۔

وہ اپنے گھر کے مقابلے میں خود کو لاس اینجلس میں زیادہ پُرسکون محسوس کرتا تھا۔ یہاں اسے ہر وقت کسی کے ساتھ اپنا موازنہ نہیں کرنا ہوتا تھا۔ وہ سکندر کو کبھی بھولے سے بھی فون نہیں کرتا تھا۔ سکندر خود ہی

ہر دس، پندرہ دن میں اسے فون کیا کرتا اور وہ جان چھڑانے والے انداز میں چند منٹ کی بات کرکے سکندر سے پیچھا چھڑا لیا کرتا۔

باپ کے رویے اور ایک بے مقصد سی مقابلہ بازی اور اس مقابلے بازی میں پے در پے شکست نے اسے خاصا تلخ اور سنجیدہ بنا دیا تھا۔ کیمپس میں اس کی بہت زیادہ دوستیاں نہیں تھیں۔ گنتی کے چند ایک ہی دوست تھے جن کے ساتھ وہ اکثر نظر آتا تھا۔

جس طرح شہریار خان نے سکندر کو بوسٹن میں رہائش کے لیے کرائے پر فلیٹ دلا رکھا تھا اسی طرح اسے بھی لاس اینجلس میں فلیٹ مہیا کیا گیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ سکندر کے لیے رہائش کا انتظام کرنے وہ بوسٹن خود گئے تھے، خود اس کی رہائش کے لیے جگہ منتخب کی تھی، گھر کا سامان ڈلوایا تھا، جبکہ اس کے لیے یہ سارا کام لاس اینجلس میں اپنے ایک واقف کے ذریعے کروا دیا تھا۔ پیسہ اس کے لیے بھی اتنا ہی خرچ کیا گیا تھا، مگر اس پر اپنا وقت اور اپنی توانائیاں برباد نہیں کی گئی تھیں۔

اس روز رات میں سکندر کا اس کے پاس فون آیا تھا۔ وہ خود کو ذہنی اور جذباتی طور پر سکندر سے بہت دور لے جا چکا تھا۔ وہ اسے سوچنا نہیں چاہتا تھا، اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سکندر کو سوچ کر، اس سے بات کرکے، اس سے مل کر سوائے اپنے ہارے ہوئے ہونے اور دوسری پوزیشن پر کھڑے ہونے کے اسے اور کوئی احساس نہیں ملا کرتا تھا۔

"کیسے ہو زین؟" اس کے خشک سے ہیلو کے جواب میں سکندر گرم جوشی سے بولا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔" اس نے جواباً اس کی خیریت معلوم کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

"اسپرنگ بریک (چھٹیوں) میں، میں گھر جا رہا ہوں! تم بھی آجاؤ، کتنے مہینے ہو گئے ہم دونوں ایک دوسرے سے ملے نہیں ہیں۔"

اس سے قبل وہ چھٹیوں میں جب گھر گیا تھا تب اس نے قصداً جانے میں دیر کر دی تھی کیونکہ اسے پتا تھا کہ سکندر چھٹیاں گزار کر واپس جا چکا ہو گا۔ سکندر اس کے آنے کا انتظار کرتے کرتے، اسے فون پر بلاتے بلاتے آخر کار مایوس ہو کر جس روز بوسٹن واپس لوٹا تھا وہ اس سے اگلے ہی دن واشنگٹن اپنے گھر پہنچ گیا تھا۔

"میرا موڈ نہیں ہے۔ میں چھٹیاں اپنے دوستوں کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔"

وہ خشک سے لہجے میں بولا تھا۔ اس کا لہجہ کسی بھی طرح کے جذبات سے عاری تھا۔ وہ اب بچہ نہیں تھا۔ بڑا ہو چکا تھا۔ اسے اب اپنے جذبات لوگوں سے چھپانا آگیا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ سکندر کے لیے جو کچھ بھی محسوس کرتا، اس کا لفظوں میں اظہار بھی کرے۔ اس کا سرد اور خشک رویہ سکندر کو زین کی زندگی میں اس کی جگہ بتانے کے لیے کافی تھا۔

"پھر بھی تم کوشش تو کرو زین! دوستوں کے ساتھ پھر چلے جانا۔ مجھے تم بہت یاد آرہے ہو۔"

سکندر کے لہجے کی محبت اسے بناوٹی محسوس ہوئی تھی۔ وہ خود کو بہت اچھا ثابت کرنے کے لیے پوز کیا کرتا تھا۔ اسے سکندر کی اس منافقت اور دوغلی شخصیت سے نفرت تھی۔

"میں نے تمہیں بتایا ہے نا میں نہیں آسکوں گا۔ پھر کسی اور چھٹیوں میں میرا آنے کا موڈ بنا تو تمہیں بتا دوں گا۔"

وہ اسی خشک سے لہجے میں بولا تھا۔

"اچھا... چلو جیسی تمہاری مرضی۔" سکندر کے لہجے میں مایوسی در آئی تھی۔

وہ سمجھتا تھا خود سے ہر چیز میں کمتر بھائی پر وہ ترس تو کھاتا ہے محبت ہرگز نہیں کرتا۔

اس نے سکندر کے لہجے کی مایوسی پر دھیان دیے بغیر فون بند کر دیا تھا۔



اس نے اپنے بنیادی مضمون کے طور پر اکنامکس کو منتخب کیا تھا۔ اپنی خواہش پر نہیں بلکہ اس لیے کہ اپنی انڈر گریجویٹ ڈگری کے لیے سکندر کا بھی بنیادی مضمون یہی تھا۔

اسے قانون پڑھنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر آگے اس نے بھی قانون پڑھنا تھا۔ پتا نہیں اس خود ساختہ مقابلے بازی سے وہ کبھی باہر نکل بھی سکے گا کہ نہیں یا ساری زندگی سکندر جیسا بننے کی خواہش میں گزر جائے گی۔ وہ خود کو اس جنون سے نکالنا چاہتا تھا، وہ اپنے راستے سکندر سے بالکل علیحدہ کر لینا چاہتا تھا لیکن اس کے اندر سکندر کو شکست دینے کی خواہش جیسے آج بھی کہیں چھپی بیٹھی تھی۔

اپنے میجر سبجیکٹ اکنامکس ہی کے لیے اسے اس سمسٹر میں Calculus کا اضافی کورس پڑھنا تھا۔ اور یہ کورس پڑھنے کے لیے اسے میتھس ڈپارٹمنٹ میں کلاسز اٹینڈ کرنا تھیں۔

اس روز وہ اس سبجیکٹ کی پہلی کلاس لینے Maths ڈپارٹمنٹ آیا تھا۔ اور وہاں اسے وہ ملی تھی.... امِ مریم۔

وہ اس دن کو ایک عام سا دن سمجھ کر کیمپس آیا تھا۔ جانتا ہی نہیں تھا کہ آج اسے وہ ملے گی جس سے مل کر اس کی زندگی سے تمام شکایتیں دور ہو جائیں گی۔ اس کے اندر سے تمام تلخیاں ختم ہو جائیں گی۔ وہ اپنے ڈپارٹمنٹ سے بھاگتا دوڑتا یہاں پہنچا تھا۔ امِ مریم کا میجر سبجیکٹ Maths تھا تو اس نے تو اس کلاس میں ہونا ہی تھا۔

وہ کلاس میں سنجیدگی اور خاموشی سے بیٹھا لیکچر سن رہا تھا۔ تب اس لڑکی نے پروفیسر کو مسلسل زچ کرتے اپنے سوالوں سے اسے چونکا دیا۔ وہ مختلف فارمولوں اور ٹرمز سے متعلق ایسے تکنیکی ــــ سوالات کر رہی تھی، جن میں سے بعض کے جوابات پروفیسر کو بھی معلوم نہیں تھے۔

شاید نہیں یقیناً وہ لڑکی بہت ذہین تھی۔ وہ maths خصوصاً Calculus میں بہت اچھی تھی، تب ہی انڈر گریجویٹ لیول پر اپنے پی ایچ ای کیے قابل پروفیسر کو ٹف ٹائم دے رہی تھی۔

یہ اس کا امِ مریم سے پہلا تعارف تھا۔ جس میں وہ اس کا نام نہیں جان سکا تھا۔ صرف اس کی قابلیت اور خود اعتمادی سے آگاہ ہوا تھا اور یہ اندازہ ہوا تھا کہ وہ شاید انڈیا یا پاکستان سے ہے۔

ہفتے میں تین، چار بار یہ کلاس لینے اسے یہاں آنا تھا۔

دوسری بار وہ وہاں کلاس اٹینڈ کرنے آیا تو اتفاقاً اسے امِ مریم کے برابر والی کرسی پر جگہ ملی۔ وہ خاموشی سے بیٹھا لیکچر سن رہا تھا۔

اس کے برابر بیٹھی وہ آج بھی اسی دن کی طرح مختلف سوالات پروفیسر سے کر رہی تھی۔ اور کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر استاد کو پریشان کرنے کے لیے اس طرح کے سوالات کر رہی ہے، بلکہ یوں لگتا تھا جیسے اس کے ذہن میں جو سوالات ابھر رہے تھے، وہ برملا پروفیسر سے ان کا ذکر کر رہی تھی۔

کلاس ختم ہونے پر ایک ایک کرکے تمام اسٹوڈنٹس کلاس سے جانے لگے، مگر وہ وہیں بیٹھی تھی۔ اسے Derivation میں ابھی بھی ایک الجھن تھی، جسے پروفیسر سمجھانے سے قاصر رہے تھے۔

وہ Maths میں شروع سے بہت اچھا تھا، اسے اس Derivation میں کہیں کوئی کنفیوژن نہیں تھی۔ اپنی عادت اور مزاج کے برخلاف وہ بے ساختہ اس سے کہہ بیٹھا۔

"اس Point پر آپ کنفیوز ہیں نا؟ لائیں میں سمجھاؤں۔" اس لڑکی نے چونک کر سر اٹھایا، اسے یوں دیکھنے لگی، ایسے جیسے ابھی تک وہ اس کی موجودگی ہی سے لاعلم تھی۔

"ہاں ایسی کون سی غیر معمولی بات تھی۔ زین شہریار میں کہ اس کی موجودگی یا غیر موجودگی کا نوٹس لیا جائے۔" سکندر سے حسد محسوس کرتے کرتے اب وہ اس حد تک تلخ سوچ کا حامل ہو گیا تھا کہ اپنے بارے میں بھی بہت کم ہی کچھ اچھا سوچ پاتا تھا۔

"آپ کو یہ Derivation سمجھ میں آگئی ہے؟" اس لڑکی نے کچھ حیرت، کچھ خوشی سے کہا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا اور پھر اسی

کی نوٹ بک پر اسے Derivation شروع سے آخر تک سمجھادی۔

کل دس منٹ لگے تھے اسے سمجھانے میں۔

"آپ کا بہت شکریہ۔" وہ مسکراتے ہوئے تشکر آمیز انداز میں بولی تھی۔

"یو آر ویلکم۔" وہ جوابا" مسکراتے ہوئے کرسی سے اٹھا تھا۔

"آپ نے اپنا نام نہیں بتایا؟" وہ بھی اس کے ساتھ ہی کرسی سے اٹھی تھی۔ اس وقت کلاس میں صرف وہ دونوں تھے۔

"زین شہریار۔"

"میں امّ مریم ہوں۔"

"تم سے مل کر خوشی ہوئی زین۔" اس کے تعارف کے جواب میں اس نے دوستانہ انداز میں اپنا تعارف کروایا تھا۔ اس کا بے تکلف انداز اسے اچھا لگا تھا۔

"تم پاکستان سے ہو زین؟" وہ دونوں ساتھ چلتے ہوئے کلاس سے نکل رہے تھے۔

اس نے مختصر لفظوں میں اسے اپنے بارے میں بتایا۔ ان دونوں بھائیوں کی پیدائش امریکہ میں ہوئی تھی۔ شہریار خان کی ملازمت کے سبب ان بھائیوں کی اب تک کی ساری زندگی پاکستان سے باہر گزری تھی۔ اب گزشتہ کئی سالوں سے تو وہ لوگ تھے ہی امریکہ میں۔ ہاں چھٹیوں میں ان کا ہر سال پاکستان اپنے دادا کے گھر جو اسے اپنا خاندانی اور آبائی گھر لگا کرتا تھا' جانا لازمی ہوا کرتا تھا۔ وہ امریکی شہری تھا' جبکہ امّ مریم امریکی نہیں تھی۔ وہ یہاں پڑھنے کے لیے آئی تھی۔ اس مختصر رسمی سے تعارف اور گفتگو کے بعد وہ دنوں ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے تھے۔

چند ہی دنوں کے اندر سے یہ بات پتا چل گئی کہ وہ لڑکی صرف کلاس روم کے اندر لیکچرز کے دوران ہی اپنی ذہانت ثابت نہیں کرتی بلکہ کلاس سے باہر اپنے پورے ڈپارٹمنٹ میں اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکی ہے۔

Maths ڈپارٹمنٹ کا جو سہ ماہی میگزین نکلا کرتا تھا وہ اس کے ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل تھی' ڈرامیٹک کلب کی وہ روح رواں تھی' اپنے ڈپارٹمنٹ کے علاوہ دیگر کئی سائنس ڈپارٹمنٹس کی مختلف آرگنائزیشن اور کلبز کی وہ سرگرم ممبر تھی۔

وہ نصابی اور غیر نصابی دونوں طرح کی سرگرمیوں میں شان دار کارکردگی اور ریکارڈ رکھنے والی لڑکی تھی۔ وہ امریکہ میں ایک امریکن یونیورسٹی میں امریکیوں پر سبقت حاصل کر رہی تھی اور یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا۔

پہلے دن کی تعارفی گفتگو کے بعد اس نے امّ مریم سے ازخود گفتگو کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ ہاں ہفتے میں تین بار جب وہ ——— کلاس اٹینڈ کرنے آتا تب امّ مریم کبھی اس کے پاس آکر اور کبھی دور ہی سے اس سے سلام دعا کر لیا کرتی تھی۔ وہ اپنے آپ میں گم رہنے والا سنجیدہ مزاج لڑکا تھا' ایسے میں امّ مریم یا کسی بھی اور لڑکی سے دوستی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

امّ مریم کا ڈرامیٹک کلب رومیو جولیٹ اسٹیج کر رہا تھا۔ آتے جاتے جتنی باتیں اس کے کانوں میں پڑی تھیں' اس سے اتنا تو اسے پتا چل ہی چکا تھا کہ اس ڈرامے کا اسکرپٹ امّ مریم نے لکھا تھا' ڈائریکشن بھی اسی کی تھی اور جولیٹ کا کردار بھی وہ ہی ادا کر رہی تھی۔

یہ ڈرامہ وہ لوگ کسی چیریٹی کے لیے کر رہے تھے۔

اس نے بھی خاموشی سے ٹکٹ خرید لیا تھا۔ وہ آڈیٹوریم میں پچھلی نشستوں میں سے ایک پر بیٹھا تھا۔

امّ مریم اسٹیج پر آئی تو واقعی چراغوں میں روشنی نہ رہی تھی۔ وہ بے تحاشا حسین لگ رہی تھی۔ وہ واقعی جولیٹ لگ رہی تھی۔ اس کے آجانے کے بعد اسٹیج پر پھر کسی اداکار کا رنگ جم نہیں پا رہا تھا۔ ڈرامہ دیکھنے والا ہر فرد جولیٹ کے سحر میں گرفتار ہو چکا تھا۔

وہ خوب صورت تھی' مگر خوب صورت تو بہت لڑکیاں ہوتی ہیں' اسے جو چیز دوسری لڑکیوں بلکہ باقی سب سے نمایاں کرتی تھی وہ اس کی آنکھوں سے چھلکتی ذہانت' اس کی چھا جانے والی شخصیت تھی۔

وہ مبہوت سا ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے جارہا تھا۔ ڈرامہ ختم ہونے پر وہ خاموشی سے آڈیٹوریم سے اٹھ آیا۔ دیگر لڑکے لڑکیوں کی طرح اس نے ام مریم سے ملنے کی کوئی کوشش نہ کی تھی۔

ام مریم کو تو یہ پتا بھی نہیں چلا ہوگا کہ وہاں وہ بھی آیا تھا' اتنی بہت سی تالیوں کے بیچ اس بے تحاشا حسین و ذہین لڑکی کو زین' شہریار کی تالیاں کہاں سنائی دی ہوں گی؟ وہ اپنے اندر ایک بے نام سی اداسی محسوس کررہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ام مریم اپنی کامیابی کی خوشی میں تمام کلاس فیلوز کو پارٹی دے رہی تھی۔

اسے سراہنے' اسے پسند کرنے والے بہت تھے۔ زین' شہریار تو کہیں پس منظر میں تھا۔ ہجوم کا حصہ بننے کے لیے وہ اس کے گھر پارٹی میں جاتا؟ ظاہر ہے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

وہ پارٹی میں نہیں گیا تھا۔ پارٹی سے اگلے روز اس کی کلاس بھی نہیں تھی تو وہ ڈپارٹمنٹ بھی نہیں گیا۔ وہ اپنے ہی ڈپارٹمنٹ میں تھا اور لائبریری کی طرف جارہا تھا۔ جب اسے سامنے سے ام مریم آتی نظر آئی۔

وہاں وہ جتنی مقبول تھی' جتنی اس کی دوستیاں تھیں یہاں بھی اس کے کچھ نہ کچھ دوست ضرور ہوں گے' جن سے وہ ملنے آئی تھی۔ وہ اسے دیکھ لینے کے باوجود نہ دیکھنے کا تاثر دے کر خاموشی سے گزر جانا چاہتا تھا۔ مگر یہ دیکھ کر اسے اپنی جگہ پر رک جانا پڑا کہ وہ اسی کی طرف آرہی تھی۔ وہ حیرت زدہ سا خاموش کھڑا اسے اپنی پاس آتے دیکھ رہا تھا۔

"کل کہاں تھے تم؟" وہ آتے ہی بغیر سلام دعا کے خفگی سے بولی۔

"کل؟"

"ہاں کل۔ اب یہ مت کہنا کہ تمہیں پتا نہیں ہے کل کیا تھا۔" وہ خفا خفا سی اسے دیکھ رہی تھی۔

"کل کیا تھا ام مریم؟" اپنے دل میں حیرت اور بے تحاشا خوشی محسوس کرتے اس نے بظاہر اسے چھیڑا تھا۔ کیا واقعی ام مریم نے کل اس کے نہ آنے کو محسوس کیا تھا۔

"کل پارٹی رکھی تھی نا میں نے اپنے گھر پر۔ سب آئے تھے' سوائے تمہارے۔" وہ ناراضی سے اسے گھور رہی تھی۔

"مگر تم نے مجھے بلایا کب تھا؟" وہ مسکرا رہا تھا۔

"میں نے ساری کلاس کو انوائٹ کیا تھا اور مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے کلاس میں پارٹی کا اعلان کیا تھا تم بھی کلاس میں موجود تھے۔"

"میں اجتماعی دعوت دیے جانے پر کہیں نہیں جاتا۔ مجھے مجمع کا حصہ بننے میں قطعا" کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" وہ اس بار قدرے سنجیدگی سے بولا تھا۔

"بڑے مغرور ہو تم زین شہریار! اگر مجھے پتا ہوتا تم اس قدر مغرور اور خود پسند ہو تو تمہیں علیحدہ سے پارٹی کی دعوت دیتی۔" اس نے جوابا" ام مریم پر یہ ثابت کرنے کی ہرگز کوشش نہیں کی تھی کہ وہ مغرور اور خود پسند نہیں ہے۔ وہ خاموش رہا تھا۔ وہ اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

" Play والے دن بھی آئے' مگر مجھ سے ملے نہیں۔ سب مجھ سے ملنے' مجھے مبارک باد دینے آئے' سوائے تمہارے۔ کل پارٹی پر میں نے تمہارا اس قدر انتظار کیا' مگر تم غائب۔ اس قدر مغرور بھی نہیں ہونا چاہیے انسان کو۔"

تو اس نے اسے Play والے دن دیکھا تھا؟ وہ ام مریم کی شخصیت کے سحر میں گرفتار بے شمار افراد میں سے ایک فرد نہیں تھا۔ وہ اس کے ہونے اور نہ ہونے کو محسوس کیا کرتی تھی۔

زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی ذات کے بارے میں اس نے اپنے اندر ایک سچی خوشی ابھرتی محسوس کی۔ اسے زندگی میں پہلی بار خود اپنے آپ پر پیار آیا' خود سے محبت کا احساس جاگا۔ وہ اتنا غیر اہم بھی نہیں' وہ اتنا عام سا بھی نہیں کہ یوں ہی نظر انداز کردیا جائے۔

"میں نے سوچا اتنے لوگ تمہیں مبارک باد دے رہے ہیں' سراہ رہے ہیں' ان سب کے بیچ میری مبارک باد کی شاید تمہیں ضرورت ہی نہ ہو۔"

"تم نے بالکل غلط سوچا تھا زین! میں نے تمہاری مبارک باد کا بہت انتظار کیا۔ میں نے کل پارٹی پر بھی تمہارا بہت انتظار کیا۔"

"چلو جو ہوگیا سو ہوگیا۔ آج تمہاری اس خوشی اور کامیابی کو سیلیبریٹ کرلیتے ہیں۔ کہیں ساتھ لنچ کرلیتے ہیں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

ام مریم کے چہرے پر پھیلنے والی خوشی بڑی بے ساختہ تھی۔ کیا وہ اس لیے خوش تھی کہ وہ اس کے ساتھ وقت گزارنے کی بات کررہا تھا؟ کیا وہ زین شہریار اس غیر معمولی لڑکی کے لیے کچھ غیر معمولی اہمیت اختیار کرگیا تھا؟ جو اسے نظر آرہا تھا' جو ام مریم کی نگاہیں اسے بتارہی تھیں اسے سمجھ لینے کے باوجود بھی وہ سمجھنے سے ہچکچا رہا تھا۔

بچپن سے خود کو نظر انداز ہوتے دیکھنے کا وہ احساس اس طرح اس کے اندر بیٹھ چکا تھا کہ اب یک دم ہی یہ مان لینا کہ وہ نظر انداز کی جانے والی شخصیت کا مالک نہیں ہے' مشکل ہورہا تھا۔ ام مریم نے بخوشی اس کی لنچ کی دعوت قبول کرلی تھی۔

وہ زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی کے ساتھ لنچ کرنے جارہا تھا۔ امریکہ جیسے ملک کا شہری ہوتے' وہیں پلتے بڑھتے 19 سال کی عمر تک پہنچ جانے کے باوجود اس کی ابھی تک کوئی گرل فرینڈ نہیں تھی۔

وہ صرف اسے لنچ ہی نہیں کروا رہا تھا بلکہ وہ اس کے لیے پھولوں کا ایک گلدستہ اور چاکلیٹس کا ایک باکس بھی ساتھ لے کر آیا تھا۔ اس کی کامیابی پر اسے مبارک باد دینے کے لیے بطور تحفہ۔

ام مریم اس لنچ کے لیے بطور خاص تیار ہوکر آئی تھی' اس نے بہت خوبصورت لباس پہن رکھا تھا۔ سلیقے سے کیے میک اپ اور شانے سے کچھ نیچے آتے سلکی بال جو صبح کیمپس میں بینڈ میں جکڑے ہوئے تھے اس وقت کھلے تھے۔ وہ اس کے لیے تیار ہوکر آئی تھی۔

اسے بے پناہ خوشی کا احساس ہورہا تھا اس کا دل چاہ رہا تھا وہ اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہے کہ یہ اہتمام اس پیاری لڑکی نے اسی کے لیے کیا تھا۔

"بہت اچھی لگ رہی ہو۔" وہ اس کے چہرے کو محبت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"شکریہ! میں نے سوچا تم خاص طور پر میرے اعزاز میں مجھے یہ لنچ دے رہے ہو تو مجھے بھی ذرا اچھی طرح تیار ہوکر آنا چاہیے۔" وہ جوابا" مسکرا کر بولی۔

ساتھ لنچ کرتے ہوئے وہ دونوں دنیا زمانے کے تمام موضوعات پر باتیں کررہے تھے۔ وہ لڑکی صرف حسن اور ذہانت میں ہی یکتا نہیں تھی وہ ہر چیز اور معاملے میں منفرد تھی۔

اس کا ذوق بہت ہی اعلا تھا۔ کھانے پینے سے لے کر لباس' دلچسپیوں' دوستوں اور زندگی گزارنے کے انداز تک میں۔

اس کی گفتگو کا انداز اتنا خوبصورت تھا کہ اس کا جی چاہتا وہ بولتی رہے اور وہ اسے سنتا رہے۔

اس روز لنچ کرکے وہ دونوں ریسٹورنٹ سے باہر نکلے تو ایک دوسرے کے بہت نزدیک آچکے تھے۔ وہ لڑکی اس کے لیے بے حد اہم ہوچکی تھی۔

اب وہ کلاس اٹینڈ کرنے آتا تو وہ دونوں کلاس میں ساتھ بیٹھتے۔ لائبریری میں ساتھ بیٹھ کر اپنے اسائنمنٹس بناتے' لائبریری' جم' کیفے ٹیریا' کیمپس کے آس پاس کی دیگر جگہیں' ایسی کوئی جگہ ہی نہیں تھی جہاں وہ ساتھ وقت نہیں گزارتے تھے۔

وہ کم گو تھا' اپنی ذات میں گم رہتا تھا۔ کچھ زیادہ سوشل بھی نہیں تھا مگر اب ام مریم کے ساتھ وہ بے تکان گھنٹوں باتیں کیا کرتا تھا۔ کیمپس میں جن کلبز کی سرگرمیوں میں وہ مصروف رہا کرتی تھی اسے بھی زبردستی ان میں شامل کرنے کی کوشش کرتی اور وہ صرف اور صرف اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی دھن میں ان سب میں شامل ہوتا جارہا تھا۔

وہ پاکستان سے آئی تھی۔ اور یہاں اپنے چچا کے

پاس رہ رہی تھی۔ وہ بہت اچھی فیملی کی لڑکی تھی۔ وہ جس وقت اس کے ساتھ ہوتی تب تو اس کے ساتھ ہوتی ہی تھی مگر جب ساتھ نہ ہوتی تب بھی ساتھ محسوس ہوا کرتی۔ وہ رات اسے سوچتا اس کی باتیں یاد کرکے مسکراتے ہوئے سوتا تھا۔ اب اسے گھر کی رتی برابر بھی یاد نہیں آتی تھی۔

شہریار خان اب بھی اس میں اور سکندر میں واضح فرق رکھتے مگر اسے اس سے بھی اب کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اب وہ سکندر کو سرے سے سوچا ہی نہیں کرتا تھا۔ اسے زندگی سے پیار ہو گیا تھا۔ اسے زندگی میں پہلی بار خود اپنے آپ سے پیار ہو گیا تھا۔ اس کا خوش رہنے کو دل چاہتا اور وہ بے پناہ خوش رہتا بھی تھا۔

اس کے دل نے اس سے کہا وہ ام مریم کا ساتھ کچھ گھنٹوں، کچھ مہینوں یا چند سالوں کے لیے نہیں بلکہ عمر بھر کے لیے چاہتا ہے۔ ہاں وہ ام مریم سے محبت کرنے لگا۔ وہ لڑکی اس کے لیے ناگزیر ہو چکی تھی۔ وہ اس کے ساتھ اپنی ساری زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے جو بھی جذبات رکھتے تھے مگر ابھی تک ایک دوسرے سے ان کا اظہار نہیں کیا تھا۔

یہ ایک ان کہی تھی جسے دونوں سمجھتے تھے پر محبت کا لفظ ابھی تک زبان سے ادا نہیں ہوا تھا۔ اس کے اندر ایک ڈر، ایک ہچکچاہٹ سی تھی اگرچہ جانتا تھا کہ وہ لڑکی اس سے والہانہ —— پیار کرتی ہے مگر کیا وہ اس سے شادی بھی کرنا چاہتی ہے؟

نجانے رد ہو جانے کا کیسا خوف تھا اس کے اندر جو وہ لاکھ کوشش کے باوجود اتنے مہینوں بعد بھی ام مریم سے اقرار محبت نہیں کر پایا تھا۔



کیلکولس کا پہلا کورس ختم کرکے وہ اگلے سمسٹر میں جا چکا تھا۔ مگر اب انہیں ملنے کے لیے اس کلاس کی ضرورت بھی کہاں تھی وہ دونوں ہمہ وقت ساتھ ہوتے تھے۔ ایشین اسٹوڈنٹس کی ایک تنظیم تھی جو وہاں زیر تعلیم ساؤتھ ایشین اسٹوڈنٹس کے لیے وقتاً فوقتاً مختلف پروگرامز کا اہتمام کرتی رہتی تھی تاکہ اس طرح ان ممالک کے طالب علموں کو ایک دوسرے کے قریب آنے اور ایک دوسرے کو جاننے کا موقع ملتا رہے۔ ام مریم اس کی ممبر تھی اور اس کی خواہش پر وہ بھی اس کا ممبر بن گیا۔

اس روز اس تنظیم کی جانب سے باربی کیو پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ پارٹیوں میں جانے کا شوقین نہ ہونے کے باوجود وہ ام مریم کے ساتھ بصد شوق تمام پارٹیز میں جاتا۔ وہ اس رات بھی اس کے ساتھ وہاں آیا تھا۔

ساؤتھ ایشین ممالک سے تعلق رکھتے بہت سے اساتذہ کو بھی آج اس پارٹی میں مدعو کیا گیا تھا۔

ان کے پروفیسرز اور لیکچررز چاہے جتنے بھی سخت مزاج ہوں مگر کلاس روم سے باہر خصوصاً اس طرح کی تقریبات میں وہ اپنے اسٹوڈنٹس کے ساتھ خوب گھل مل جاتے۔ آج کی اس پارٹی کے لیے ان کے ایک پروفیسر نے اپنے گھر کا بیک یارڈ ان لوگوں کو خود آفر کیا تھا۔

ان کا گھر خاصا بڑا تھا اور بیک یارڈ میں اتنی جگہ تھی کہ وہاں باربی کیو کیا جاسکے اور تمام افراد وہاں بیٹھ بھی سکیں۔ وہ maths ڈپارٹمنٹ کے پروفیسر تھے۔

اڑتیس سال کے بالکل ینگ ایسوسی ایٹ پروفیسر۔ غالباً والدہ امریکن تھیں اور والد انڈین۔ زین لڑکوں کے ایک گروپ کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا اور مریم اپنے پروفیسر اور چند دوسرے اسٹوڈنٹس کے ساتھ باربی کیو کی تیاریوں میں مصروف تھی۔

اسے پروفیسر کا اس سے اتنا گھلنا ملنا اور باتیں کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بلاوجہ ہر بات کے لیے اسی کو آواز دے رہے تھے۔ ام مریم سے قریب ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسے ان کی نگاہوں میں ام مریم کے لیے پسندیدگی محسوس ہوئی تھی۔

یک دم ہی اس کا موڈ آف ہو گیا۔ وہ فوراً ہی وہاں سے جانے کے لیے اٹھ گیا۔ اسے ام مریم پر شدید غصہ آرہا تھا۔ وہ اس سے کچھ بھی کہے سنے بغیر وہاں سے چلے جانا چاہتا تھا مگر ام مریم نے شاید اسے بیک یارڈ سے جاتے دیکھ لیا تھا وہ گیٹ سے باہر نکل رہا تھا۔ جب اس نے اپنے پیچھے ام مریم کی آواز سنی۔

"زین! کیا ہوا؟ کہاں جا رہے ہو؟" اس نے نظریں گھما کر اسے دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر غصہ اور ناراضی تھی۔

"میرے سر میں درد ہے۔ گھر جا رہا ہوں۔"

"مجھے بتائے بغیر؟ میں تمہیں اٹھ کر آتا نہ دیکھتی تو تم مجھے بتائے بغیر چلے جاتے۔ چاہے میں جتنا بھی پریشان ہوتی رہتی؟" اس کے لہجے میں واضح شکوہ تھا۔

"میں نے ضرورت محسوس نہیں کی تمہیں بتانے کی۔ تم ڈاکٹر خان کے ساتھ کافی مصروف تھیں۔"

اس کا لہجہ طنزیہ اور کچھ جتانے والا تھا۔ ام مریم اسے دکھ سے دیکھتی رہ گئی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے تم یونہی چلے جاتے اور مجھے کچھ فرق نہیں پڑتا؟"

"ہاں تمہیں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ تمہیں چاہنے اور سراہنے والے لوگ بے شمار ہیں۔ زین شہریار اتنے لوگوں کے درمیان نظر کہاں آئے گا۔"

وہ بہت بے مروتی سے بولا۔ اس کا لہجہ سخت تھا۔ اس نے ام مریم کی آنکھوں میں آنسو آتے دیکھے تھے۔

"ٹھیک کہا تم نے۔ زین شہریار مجھے کیسے نظر آسکتا ہے۔ اس کی میرے لیے اہمیت کیا ہو سکتی ہے سوائے اس کے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ سوائے اس کے کہ وہ میرے لیے ساری دنیا کے تمام لوگوں سے زیادہ اہم ہے۔ سوائے اس کے کہ جس وقت وہ میرے ساتھ ہوتا ہے میں خوش ہوتی ہوں۔ سوائے اس کے کہ جب وہ آس پاس نظر نہیں آتا میرا دل اداس رہتا ہے۔ سوائے اس کے کہ ساری دنیا میری تعریف کرے مگر زین شہریار مجھے غلط سمجھے تو اپنی ہر اچھائی ہر خوبی میرے لیے بے معنی ہو جاتی ہے۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔

اپنے رویے اور اپنے لفظوں کی سختی پر شرمندہ ہونا بھول گیا۔

وہ ام مریم کے آنسوؤں پر بھی دھیان نہیں دے پا رہا تھا۔ وہ اس کے لفظوں میں موجود محبت کی شدت پر ساکت کھڑا رہ گیا تھا۔

"مریم!" وہ بے اختیار اس کے پاس آیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ اس سے کیا کہے۔

"لوگ مجھے کتنا پسند کرتے ہیں یا نہیں کرتے مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا زین! مجھے فرق پڑتا ہے تو اس بات سے کہ جس سے میں محبت کرتی ہوں وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا یا شاید محبت تو کرتا ہے مگر اس کا اقرار نہیں کرنا چاہتا۔ شاید میں اس کے لیے اتنی اہم ہوں ہی نہیں کہ وہ میرے ساتھ اپنی ساری زندگی گزارنا چاہے۔"

ام مریم اس کا جواب سننے کے لیے وہاں رکی نہیں تھی۔ وہ روتی ہوئی واپس چلی گئی تھی۔ وہ اس کے پیچھے نہیں گیا تھا۔ چند منٹ وہاں کھڑے رہنے کے بعد وہ وہاں سے واپس آگیا۔ اسے ام مریم کے اظہار محبت نے خوشی دی تھی۔ اسے اس کے آنسوؤں سے تکلیف پہنچی تھی۔

اپنی خود ساختہ سوچوں اور احساس کمتری میں گھر کر وہ اس لڑکی کو گنوانے چلا تھا؟ وہ لڑکی ہونے کے ناتے اظہار محبت میں پہل اس کی جانب سے چاہتی تھی۔ اس کے لبوں سے کسی خوبصورت اقرار کو سننے کی منتظر رہی تھی اور وہ اسے یہ خوشی نہیں دے پایا تھا۔ اسے خود پر شدید غصہ آیا۔

وہ اپنی اس زیادتی اور اس غلطی کا ازالہ اب کسی بہت بہت خوبصورت اور منفرد انداز میں کرنا چاہتا تھا۔ اسے کیا کرنا تھا یہ وہ سوچ چکا تھا۔

آنے والے چند دن اس نے بالکل خاموشی سے گزارے۔ بظاہر ام مریم اس کے ساتھ پہلے والے انداز ہی میں مل رہی تھی۔ وہ دونوں کیمپس میں پہلے ہی کی طرح ساتھ ہوتے تھے مگر وہ جانتا تھا ام مریم اس سے سخت ناراض تھی۔ اتنی ناراض کہ اپنی ناراضی کا اظہار کرنا بھی اسے گوارا نہیں تھا۔

ویک اینڈ پر اس نے اسے اپنے ساتھ CRUISE

SHIP (جہاز) پر انوائٹ کیا تھا۔ اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس cruise پر صرف وہ دونوں ہی ہوں گے بلکہ یہ کہا تھا کہ وہ اپنے دوستوں کے گروپ کے ساتھ CRUISE SHIP پر دو دنوں کے لیے جا رہا ہے۔

اس cruise ship نے لاس اینجلس سے لے کر catalina آئی لینڈ تک جانا تھا۔ درمیان میں دو اور خوبصورت مقامات پر رکنا تھا۔ ابتدائی طور پر انکار کرنے کے بعد وہ اس کے اصرار پر مان گئی تھی۔ لاس اینجلس سے ان کی cruise ship نے روانگی کا آغاز کیا تب ام مریم اس سے تعجب سے پوچھنے لگی۔

"تمہارے دوست کہاں رہ گئے؟"

"میری دوست ام مریم میرے ساتھ ہے۔ مجھے اس کے علاوہ اور کسی کا ساتھ نہیں چاہیے۔" وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔ اس کے لفظوں میں گہرائی تھی۔ سچائی تھی۔ ام مریم خاموشی سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

وہاں پر انجوائے کرنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ میوزک، گیمز، بہترین کھانے اور بھی بہت کچھ۔ سارا دن وہ اس سب کو انجوائے کرتے رہے۔ رات میں وہ اسے اپنے ساتھ عرشے پر لے آیا تھا۔ وہ کھلے سمندر کے بیچوں بیچ خوبصورت جہاز کے deck پر خوبصورت سرخ گلابوں کے ساتھ اسے پروپوز کرنا چاہتا تھا۔

"میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں مریم! میں تمہارے ساتھ اپنی پوری عمر بتانا چاہتا ہوں۔ تمہیں میری محبت اور میرا ساتھ قبول ہے؟"

اس نے آہستگی سے بولتے ہوئے پھول اس کی طرف بڑھائے اور اپنا دوسرا ہاتھ بھی اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

"زین" وہ جیسے اس سے اس انداز سے اظہار محبت کی امید نہیں رکھتی تھی۔ وہ خوش بھی تھی اور وہ حیران بھی۔ ام مریم نے بے اختیار اس کے ہاتھ سے پھول لے لیے اور اپنا ہاتھ زین کے بڑھے ہاتھ میں دے دیا۔

"تم کبھی بھی اور کہیں بھی کہتے۔ مجھے اچھا لگتا مگر مجھے پرپوز کرنے کے لیے یہ خوبصورت جہاز اور یہ سمندر منتخب کر کے تم نے ان لمحوں کو میرے لیے بہت یادگار بنا دیا ہے زین!"

وہ خوشی سے سرشار لہجے میں بول رہی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے والہانہ نظروں سے اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جس سے وہ شدید محبت کرتا تھا۔

"بیٹا جی بیس سال کی عمر شادی کے لیے کچھ چھوٹی عمر نہیں ہے؟" اس کی امو جان چھیڑنے والے انداز میں اس سے فون پر کہہ رہی تھیں۔

جہاز سے واپس آ کر اس نے اس رات ہی اپنی امو جان کو فون کیا۔ وہ انہیں ام مریم کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔ اپنے گھر میں وہ صرف ماں ہی سے قریب تھا کہ باپ نے اسے کبھی در خور اعتنا سمجھا ہی نہ تھا۔

سو باپ سے وہ ام مریم کا کیا تذکرہ کرتا۔ رہ گیا سکندر تو اسے وہ اس قابل سمجھتا نہیں تھا کہ اپنی اتنی ذاتی بات اس سے شیئر کرے اس نے شہریار خان اور سکندر شہریار دونوں کے متعلق سوچنا اور کڑھنا ان دنوں بالکل چھوڑ دیا تھا۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ اسے سکندر کے ساتھ نہ کوئی مقابلہ کرنا ہے نہ موازنہ۔

"میں ابھی شادی کی بات نہیں کر رہا۔ ابھی تو ہم دونوں پڑھ رہے ہیں۔ وہ بڑی ambitious لڑکی ہے۔ اگلے چار پانچ سال تو ہم دونوں ہی کا شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ لیکن منگنی یا بات تو طے کی جا سکتی ہے اس دوران۔۔ پلیز امو جان!" آپ پاپا سے بات تو کریں۔"

زندگی بھر اس نے اپنی ہر بات باپ تک پہنچانے کے لیے امو جان ہی کا سہارا لیا تھا۔

"اچھا میں بات کرتی ہوں تمہارے پاپا سے۔" اس کے اصرار کے جواب میں امو جان نے محبت بھرے انداز میں اسے امید دلائی۔

"تھینک یو امو جان۔" وہ سرشار سا ہو گیا۔

"یہ بتاؤ وہ ہے کیسی؟" انہوں نے اشتیاق ظاہر کیا۔ اور وہ انہیں ام مریم کی خوبیوں سے آگاہ کرنے لگا۔

"ام مریم بہت خوبصورت ہے امو جان! وہ بہت ذہین ہے، وہ بہت اچھی فیملی سے تعلق رکھتی ہے۔ کوئی اگر ڈھونڈنے کی کوشش کرے تب بھی کوئی معمولی سی برائی بھی اس میں نہیں نکال سکتا۔"

"تب تو میں ام مریم سے جلد از جلد ملنا چاہوں گی زین۔" امو جان ہنس کر بولیں۔

ماں سے بات کر لینے کے بعد اس نے مطمئن ہو کر فون بند کر دیا تھا۔ ام مریم کو کون ناپسند کر سکتا تھا؟ اسے یقین تھا وہ اس کے پاپا کو ضرور پسند آئے گی۔ بلکہ وہ ان کے معیار سے بھی بہت بڑھ کر ثابت ہو گی۔ ایسی بیوی اس کے لیے نہیں انہوں نے شاید اپنے شہزادے سکندر شہریار کے لیے سوچ رکھی ہو گی۔ اور سکندر اس کا کیا رد عمل ہو گا جب وہ ام مریم سے ملے گا؟

اس نے کسی کو شکست دینے کے لیے ام مریم کو نہیں چُنا تھا مگر اس وقت امو جان سے بات کرنے کے بعد جب اس نے اپنے پاپا اور سکندر کو سوچنا شروع کیا تب بے اختیار یہ سوچ اس کے دل میں ابھری تھی کہ سکندر خود اپنے لیے یا اس کے پاپا چاہے جتنی بھی اچھی لڑکی سکندر کے لیے ڈھونڈ لائیں مگر وہ ام مریم جیسی ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔

ایک عجیب سی طمانیت ایک عجیب سا سکون وہ اپنے اندر اترتا محسوس کر رہا تھا۔

سکندر لیونگ روم میں آیا تو امو جان کو کسی گہری سوچ میں گم پایا۔ وہ زین سے فون پر بات کرنے کے بعد ریسیور واپس رکھتے ہوئے کسی گہری سوچ میں تھیں وہ زین کے مقابلے میں گھر جلدی جلدی آتا تھا۔ دو یا تین دن کی بھی چھٹی آتی تو وہ دوڑا دوڑا گھر آ جایا کرتا تھا۔ اسے اپنا گھر، اپنی امو جان اور اپنے پاپا سب بہت یاد آتے تھے۔ یاد تو اسے زین بھی بہت آتا تھا۔ مگر اسے لاس اینجلس اتنا پیارا ہو گیا تھا کہ چھٹیوں پر بھی بمشکل ہی گھر آیا کرتا۔ اسے زین کی یاد آتی تو وہ خود اسے فون کر لیا کرتا تھا۔

"کیا بات ہے امو جان! کس کا فون تھا؟" ڈرائی فروٹس کی پلیٹ اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ نمکین پستے اور کاجو انجوائے کر رہا تھا۔

"زین کا فون تھا۔" امو جان نے اس کی طرف دیکھا، وہ قدرے سنجیدہ تھیں۔ سکندر ان کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا۔

"زین ٹھیک تو ہے نا؟" ماں کے سنجیدہ چہرے کو دیکھ کر اسے فکر لاحق ہوئی تھی۔ اپنا چھوٹا بھائی اسے کتنا پیارا تھا کوئی اس کے دل سے پوچھتا۔

"ہاں وہ ٹھیک ہے، سب خیریت ہے۔" امو جان نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اسے اطمینان دلایا۔

"تمہارے چھوٹے بھائی صاحب کو یونیورسٹی میں کوئی لڑکی پسند آ گئی ہے۔" انہوں نے اسے اصل بات سے آگاہ کیا۔

"اوہ تو یہ بات ہے۔" وہ کھل کر مسکرا دیا۔

"تب ہی میں کہوں... محترم چھٹیوں میں میرے اس قدر اصرار کے باوجود بھی گھر آنے کا نام کیوں نہیں لیتے۔ لاس اینجلس میں ان کے اس قدر دل لگ جانے کی وجہ اب سمجھ میں آ رہی ہے۔ امو جان!"

"زین کہہ رہا ہے میں تمہارے پاپا سے اس بارے میں بات کروں۔"

"تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے امو جان؟ ہمارا زین بہت سمجھدار ہے۔ اس نے یقیناً" ایک اچھی لڑکی ہی کو اپنے لیے چُنا ہو گا۔ آپ پاپا سے بات کریں۔ اگر وہ لڑکی آپ کو اور پاپا کو پسند آ جاتی ہے تو منگنی کر دینے میں تو کوئی حرج نہیں؟

اس کی سمجھداری پر وہ مسکرائی تھیں۔

"لگے ہاتھوں تم بھی بتا دو اگر تمہیں کوئی پسند ہے تو، تاکہ میں تمہارے پاپا سے ایک ہی وقت میں تم دونوں بھائیوں کی بات کر لوں۔" وہ جواباً" قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

"جو سکندر شہریار کو اچھی لگ جائے ایسی کوئی لڑکی ابھی تک تو ملی نہیں ہے۔ جس دن مل جائے گی سب سے پہلے آپ کو بتاؤں گا امو جان!"

اس نے شرارتی سے انداز میں بولتے ہوئے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دی تھیں۔ وہ بھی اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔

باقی آئندہ شمارے میں

قرۃ العین حنا

اپنے حصے کا

آج جب میں میڈم کے آفس سے نکلی تو بے انتہا خوش اور مسرور تھی۔ میرے ہاتھ میں تنخواہ کا لفافہ تھا' جسے اسٹاف روم میں آکر میں نے اپنے پرس میں رکھا۔ آج سے پہلے جب بھی میں یہ لفافہ تھامتی تھی تو میرے اندر غصہ اور جھنجلاہٹ ابھرتی تھی۔ آپ حیران ہو رہے ہوں گے بھلا تنخواہ ہاتھ میں لیتے ہوئے دنیا کا کون سا انسان ناخوش ہوتا ہوگا۔ پیسہ تو ہر ایک کی ضرورت ہے۔ ہر کسی کے لیے خوشی اور اطمینان کی وجہ ہے۔ لیکن اپنی محنت اور خون پسینے سے کمایا گیا پیسہ' جب کسی دوسرے کے اوپر خرچ کرنا پڑے تو کلیجہ یوں ہی کٹتا ہے۔ دل رنجیدہ ہوتا ہے۔ اور طبیعت پر بوجھل پن اور چڑچڑاہٹ طاری ہوتی ہے۔ پہلے میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا تھا۔ لیکن اب میں آزاد تھی۔ مکمل طور پر آزاد۔

"کیا بات ہے سعدیہ! بہت خوش نظر آرہی ہو؟" میری دوست فرزانہ جو کہ میری ہمراز بھی تھی' مجھے ترنگ میں آتا ہوا دیکھ کر دلچسپی سے پوچھنے لگی۔

"ہاں بھئی خوشی تو ہوں بہت۔ آخر میری زندگی کا سب سے بڑا کانٹا جو نکل گیا ہے۔" میرے لہجے میں سُرور تھا۔

"کیا کہہ رہی ہو؟ تو آخر تم نے اپنے میاں کو راضی کر ہی لیا؟" اس نے حیرت سے بھرپور لہجے میں ——— کہتے ہوئے نظریں میرے چہرے پہ ٹکادیں۔

وہ حیران کیوں نہ ہوتی' یہ میرا وہ مسئلہ تھا جس پر میں پچھلے چار سال سے رو رہی تھی۔

"ہاں بھئی' مسلسل کوشش سے تو پتھروں میں بھی شگاف پڑ جاتے ہیں۔ پھر یہ تو میرے میاں تھے۔ مٹی کے بنے انسان۔ آخر کار انہیں میری بات ماننی ہی پڑی۔" میں نے فخر سے گردن اکڑائی اور فرزانہ کو ساری کہانی بتانے لگی۔

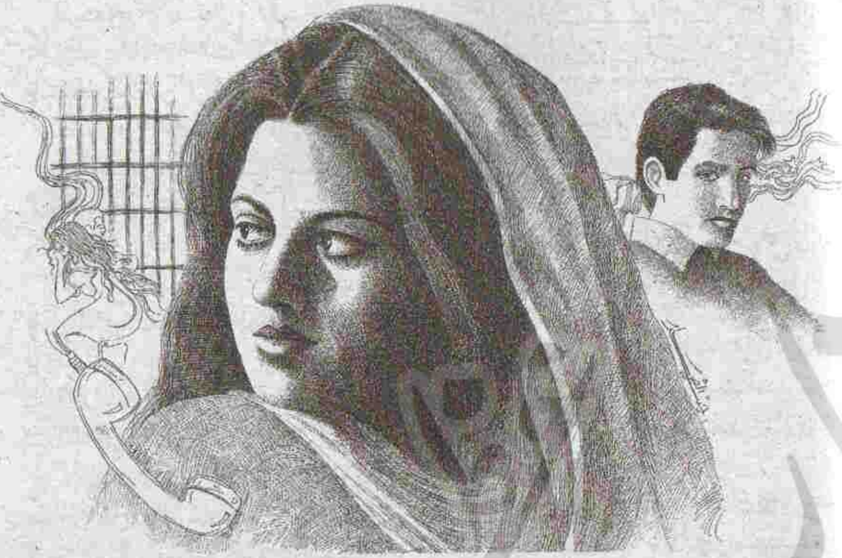
☆ ☆ ☆

میرے شوہر عاطف انکم ٹیکس کے محکمے میں بطور کلرک کام کرتے ہیں ہم کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ ہم پہلے دو تھے۔ پھر ایک سال کے عرصے میں ہی' ہم دو سے پانچ ہو گئے۔

نہیں نہیں' آپ ایسا مت سمجھیں کہ میں نے ایک وقت میں تین بچوں کو جنم دیا ہوگا۔ اصل میں ہما کی پیدائش کے فوراً" بعد عاطف کی اکلوتی بہن بیوہ ہو گئیں۔ ان کا ایک بیٹا تھا۔ عاطف کو جوان بہن کی بیوگی کا بڑا دکھ تھا۔ اس کے سسرال والے بھی کوئی امیر کبیر نہیں تھے۔ سو' شوہر کی وفات کے بعد ان کی کفالت کی ذمہ داری کوئی بھی اٹھانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ عاطف سگے بھائی تھے ایسے کیسے بہن کو حالات کی تپش میں تنہا چھوڑ دیتے۔ ان کو ہمدردی کا ایسا بخار چڑھا کہ بہن بھانجے کو اپنے گھر لے آئے۔

"اب آپ یہیں رہیں گی۔ جب تک آپ کا بھائی سلامت ہے' آپ کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔" انہوں نے بہن کو تسلی دی۔

میں خاموش ہی کیا کہتی۔ اور فی الحال ہمدردی کا بخار



مجھ پر بھی چڑھا ہوا تھا۔ سو بہ خوشی زینب آپا کو خوش آمدید کہا۔

وہ اچھی تھیں۔ بہت خیال رکھتی تھیں۔ ہما کی پرورش اور اسے سنبھالنے میں انہوں نے میرا بھرپور ساتھ دیا۔ جب ہما چار ماہ کی ہوئی تو اچانک مجھے بیٹھے بٹھائے نوکری کرنے کا خیال آگیا۔

کرائے کا گھر' بجلی گیس کے بل' بچوں کے اخراجات' زینب آپا اور ان کے بچے کے اسکول کا خرچا اور مہنگائی کا منہ زور طوفان..... میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں عاطف کی ذمہ داریوں میں ان کا ہاتھ بٹاؤں گی۔

پہلے میں نے عاطف سے مشورہ کیا۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا' چونکہ گھر میں زینب آپا موجود تھیں۔ اس لیے وہ بچوں اور گھر کی طرف سے بے فکر تھے۔ ان کے خیال میں اگر میں نوکری کر بھی لوں تو میری غیر موجودگی میں زینب آپا گھر اور بچوں کو اچھی طرح سنبھال سکتی ہیں۔ بس پھر کیا تھا میں نے پی ایس ٹی (پرائمری اسکول ٹیچر) کے لیے درخواست دی اور

خوش قسمتی سے پہلے ہی ٹیسٹ میں کامیاب بھی ہو گئی اور مجھے محلے کے ہی ایک پرائمری اسکول میں جاب بھی مل گئی۔ میں خوش تھی کہ آمدنی میں اضافہ ہوا۔ اب مہینے کے مہینے میرے ہاتھ پر بھی معقول رقم آنے لگی تھی۔

اگلے سال میرے یہاں کبیر کی پیدائش ہوئی۔ دنیا کی تمام ماؤں کی طرح مجھے بھی بیٹے کی خواہش تھی۔ سو اللہ نے پوری کردی تھی۔ زینب آپا نے اس دفعہ بھی بہت ساتھ دیا۔

میں جب اسکول جاتی تو کبیر کو وہی سنبھالا کرتی تھیں۔ میرے بچے چھوٹے تھے۔ ان کے اخراجات اتنے نہیں تھے۔ جتنے زینب آپا کے بیٹے اشعر کے تھے' وہ دس سال کا تھا۔ تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔

عاطف نے اس کا داخلہ ایک بہت اچھے پرائیویٹ اسکول میں کروایا تھا۔ جہاں کی فیس' کتابیں' ٹیوشن' وین کا کرایہ ہر چیز ہی بہت مہنگی تھی۔

زندگی میں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ محنت ہم کر رہے ہیں اور پھل کوئی اور کھا رہا ہے۔

گھر سے باہر کام کرنے والی ہر عورت جانتی ہوگی کہ گھر سے باہر نکلنا اور مشقت کرنا، اتنا آسان نہیں۔ چاہے وہ ایئر کنڈیشنڈ آفس میں بیٹھ کر ہی کام کیوں نہ کرے، ہوتی وہ مشقت ہی ہے۔ اور پھر اس مشقت سے کمایا جانے والا پیسہ اگر اپنے بجائے کسی اور پہ خرچ ہو جائے تو کس قدر تکلیف ہوتی ہے اس کا مجھے پہلی بار احساس ہوا۔

"عاطف! مجھے لگ رہا ہے۔ ہمیں کچھ بچت بھی کرنا چاہیے۔" میں نے موقع دیکھ کر عاطف سے بات کرنا چاہی۔

"اخراجات دیکھ رہی ہو.... اور پھر مہنگائی کتنی ہے؟" انہوں نے میری بات کو عام سے انداز میں لیا۔

"اخراجات تو کم نہیں ہوں گے، بڑھتے ہی جائیں گے اور مہنگائی... اس کے لیے تو کوئی یقینی بات نہیں کی جاسکتی۔ کل، آج سے زیادہ ہی ہوگی۔ پھر ہم کیا کریں گے؟ آج ہمارے بچے چھوٹے ہیں۔ کل کو انہیں بڑا ہونا ہے۔ ہمیں کچھ ان کے لیے بچانا چاہیے۔" میرا لہجہ فکر مند تھا۔

"کل کس نے دیکھا ہے اور پھر آج بھی تو اللہ دے ہی رہا ہے۔ کل بھی دیتا رہے گا، بچوں کے نصیب کیے۔ ان کے حصے کا آتا رہے گا۔" وہ مکمل طرح سے توکل کیے بیٹھے تھے۔

"ہاں، مگر خود بھی تو کچھ کرنا چاہیے ناں کہ سب نصیب پر ہی چھوڑ دیں۔" میں کچھ ناراض سی ہوئی۔

"تم چاہتی کیا ہو سعدیہ؟" انہوں نے میری طرف رخ موڑا۔

"میں چاہ رہی ہوں کہ آپ اشعر کا ایڈمیشن کسی سرکاری اسکول میں کروادیں اس کی تعلیم پر اٹھنے والے خرچے میں کچھ کمی آئے گی تو ہم اپنے بجٹ کو کنٹرول کر کے کچھ بچت بھی کرلیں گے۔" میرا خیال تھا کہ عاطف کو میری تجویز پسند آئے گی مستقبل کے لیے میری فکر جان کر واہ واہ کر اٹھیں گے مگر وہ تو...

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا سعدیہ! تم اپنا مستقبل سنوارنے کے لیے اشعر کے مستقبل کو داؤ پر لگانے کا سوچ رہی ہو؟ پیسے تمہارے نزدیک اتنی اہمیت رکھتے ہیں؟"

وہ ایک دم ہی غصے میں آگئے اور میں چپکی رہ گئی۔ لیکن دل ہی دل میں کڑھنے لگی۔ بھلا ایسا کیا کہہ دیا تھا میں نے؟

اپنے بچوں کی بہتری کے لیے سوچنا میرا حق تھا مگر انہیں اپنے بچوں سے زیادہ دوسروں کے بچوں کی فکر تھی۔

☼ ☼ ☼

یکایک زندگی سے میرا دل اچاٹ ہوگیا۔ میں بے زار رہنے لگی تھی۔

ہما اب تین سال کی ہوگئی تھی اور کبیر دو سال کا۔ اب میں ان دونوں کو اپنے ساتھ اسکول لے جانے لگی تھی۔ پتا نہیں کیوں اب دل نہیں کرتا تھا کہ میں زینب آپا کے احسان لوں۔ میں اپنی بچوں کو خود سنبھالنے لگی۔

پہلے کی طرح اب میں زینب آپا سے زیادہ بات چیت بھی نہ کرتی۔ بس ضرورت کے تحت ہی کرتی۔

عاطف میرے گریز اور بدلے ہوئے رویے کو محسوس کر رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے میں پھر سے پہلے جیسی بن جاؤں مگر اب یہ ممکن نہیں تھا۔

پھر آہستہ آہستہ میں نے محسوس کیا کہ عاطف محتاط سے ہوگئے ہیں۔ پہلے کی طرح اب وہ زینب آپا کی ہر ضرورت خود سے پوری نہیں کرتے بلکہ ان کے ذاتی خرچے کے لیے انہوں نے چار ہزار ماہوار مقرر کردیے تھے اب زینب آپا کو بار بار عاطف کے آگے ہاتھ پھیلانے نہیں پڑتے تھے، وہ اسی میں اپنی ضروریات پوری کرتی تھیں۔

اشعر کی فیس، کتابیں کاپیاں، یونیفارم کپڑے، جوتے ور اپنی ذاتی ضرورت کی چیزیں وہ سب اسی رقم سے پوری کرتیں۔ چار ہزار یقیناً" ان کے لیے کم ہوں گے

یا مشکل سے گزارا ہوتا ہوگا۔ لیکن میرے لیے یہ ایک اچھی خاصی رقم تھی۔ جو بلاوجہ ہی ضائع ہو رہی تھی۔ ہر ماہ جب میں اور عاطف تنخواہ لاکر مہینے کا بجٹ بناتے تو چار ہزار کی رقم زینب آپا کے لیے نکالتے وقت میں کلس کر رہ جاتی۔

ان ہی دنوں اسکول میں کچھ ٹیچرز نے مل کر کمیٹی ڈالنے کا پروگرام بنایا۔ میں نے ایک دو بار کمیٹی ڈالی مگر اس دفعہ میں ہرگز متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ کیونکہ یہ بڑی کمیٹی تھی۔ دو لاکھ کی۔ جس کے لیے ماہانہ چار ہزار بھرنے تھے۔ اتنی بڑی رقم کا سنتے ہی میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں بھی اتنی بڑی رقم کی مالک بن سکتی تھی اگر میں ماہانہ چار ہزار بھرنے کے قابل ہو جاتی تو... ایک بار پھر میرا دماغ تیزی سے کام کرنے لگا۔

مجھے برسوں پہلے ایک نسبتاً" غیر آباد علاقے میں لیا گیا اپنا پلاٹ یاد آیا۔ جس پر حالات کی تنگی کی وجہ سے ہم ابھی تک گھر تعمیر نہیں کرواسکے تھے۔

اب تو وہ علاقہ بھی گنجان آبادی میں تبدیل ہوگیا تھا۔ لوگوں نے بڑی بڑی عمارتیں بنالی تھیں۔ ضروریات زندگی کی ہر سہولت ٹرانسپورٹ، پانی، بجلی گیس، وہاں میسر تھا۔ بس اک ہم ہی تھے، جو محروم رہ گئے تھے۔

اب جبکہ کمیٹی کی سہولت مل رہی تھی تو اس سے فائدہ اٹھا کر میرا اپنے گھر کی تعمیر کا خواب بھی پورا ہوسکتا تھا۔ دو لاکھ میں بلڈنگ نہ سہی، دو کمروں کا اچھا سا مکان تو بن ہی سکتا تھا۔ کم از کم کرائے کے گھر سے تو جان چھوٹتی۔

میں دل ہی دل میں پروگرام بنانے لگی۔ پھر میں نے عاطف سے بھی اس بات کا ذکر کیا۔ وہ خاموش ہوگئے۔ میں ان کے رویے سے کچھ اخذ نہ کرسکی، پھر اچانک ہی انہوں نے زینب آپا کو گاؤں بھیج دیا۔ اپنے آبائی گھر۔ میں حیران پریشان۔ آخر اتنا بڑا فیصلہ اتنی خاموشی سے انہوں نے کیوں کرلیا۔ میں نے کچھ پوچھنا چاہا لیکن انہوں نے ٹوک دیا۔

"تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو؟"

ان کا لہجہ سرد تھا۔ میں چپ ہوگئی۔ مزید کوئی بات نہیں کی۔ میرے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ زینب آپا کی مصیبت ہمارے سر سے ٹل چکی ہے۔ باقی رہا عاطف کی ناراضی کا سوال تو وہ آخر کب تک یوں ہی رہتے آخر کار میں انہیں منا ہی لیتی۔ میں خوش تھی حد سے زیادہ خوش.... دل ہی دل میں شیخ چلی کی طرح منصوبے بناتی رہتی اور پھر تصور میں اپنے نو تعمیر شدہ گھر کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتی۔ مہینہ ختم ہونے میں ابھی پندرہ دن باقی تھے۔ مجھے تنخواہ ملنے کا شدت سے انتظار تھا میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں یہ کمیٹی ضرور ڈالوں گی۔ اس حوالے سے میری مس رخشندہ سے بات بھی ہوچکی تھی۔ وہ ساتواں نمبر مجھے دینے کے لیے راضی تھیں۔ صرف سات ماہ بعد دو لاکھ کی رقم میرے ہاتھ میں ہوگی۔

☼ ☼ ☼

چھٹی کے وقت باہر نکلنے سے قبل میں نے احتیاط" ایک بار بیگ میں تنخواہ کا لفافہ دیکھ کر تسلی کی، پھر چادر ٹھیک سے اوڑھ کے باہر آگئی۔ ہما اور کبیر بھی میرے ساتھ ہی تھے۔ آج ہم نے پیدل گھر جانے کے بجائے رکشا کرلیا۔

رات کو میرا بریانی بنانے کا پروگرام تھا۔ راستے میں ہم نے چکن اور دیگر سامان بھی لے لیا۔ آج میں بڑے اہتمام سے ڈنر تیار کرنا چاہتی تھی۔ آزادی کا احساس تھوڑی بہت عیاشی کی رعایت دے ہی دیتا ہے۔ سو میں بھی اسی احساس سے محظوظ ہونے کا سوچ رہی تھی مگر.... جب میں تمام تیاریاں مکمل کر کے عاطف کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ تو وہ لٹکی ہوئی شکل لیے گھر میں داخل ہوئے۔

"کیا ہوا؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" میں ان کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر گھبرا گئی۔

"ہاں، بس ٹھیک ہی ہے۔" وہ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر کے کمرے میں چلے گئے میں بھی ان کے پیچھے ہی چل پڑی۔

"آپ فریش ہو جائیں۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔ آج میں نے آپ کی پسند کی چکن بریانی اور شامی کباب بنائے ہیں۔ میٹھے میں فیرنی بھی ہے۔ آپ بس جلدی سے کپڑے چینج کر کے آجائیں۔" میں نے لہجے کو ہشاش بشاش بنایا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" انہوں نے کورا جواب دیا۔

"ارے کیسے نہیں ہے؟ آج تو....."

"سعدیہ! میں نے کہانا، بھوک نہیں ہے۔ تم جاؤ بچوں کے ساتھ کھانا کھالو۔" انہوں نے کچھ اس سختی سے کہا کہ میں چاہنے کے باوجود مزید اصرار نہ کر سکی۔ مجھے لگ رہا تھا ان کی اداسی کی وجہ زینب آپا ہیں۔ شاید وہ انہیں یاد کر رہے تھے۔

میں نے بے دلی سے کھانا کھایا۔ کچن سمیٹ کے اور بچوں کو سلا کے جب میں بیڈ پہ آئی تو عاطف بے خبر سو رہے تھے۔

میں دل مسوس کے رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"عاطف۔ عاطف اٹھیں آٹھ بج چکے ہیں۔" صبح خلاف معمول عاطف کو دیر تک سوتا پڑا دیکھ کر میں نے ان کے اوپر سے چادر ہٹائی۔ انہوں نے سرخ سرخ مندی مندی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔

"عاطف! اٹھیں۔ دیکھیں کیا ٹائم ہو رہا ہے، طبیعت تو ٹھیک ہے، آفس نہیں جائیں گے کیا؟" مجھے کل رات والا ان کا رویہ یاد آیا۔

"نہیں" وہ اٹھ بیٹھے۔

"کیوں خیریت؟" مجھے شک سا ہوا۔

"مجھے فی الحال نوکری سے معطل کر دیا گیا ہے۔" ان کا لہجہ بے حد خشک تھا۔

"کیا؟" مجھے گویا کرنٹ لگا۔

"مجھ پر ٹیکس میں ہیرا پھیری کا الزام لگا ہے۔ دس دن میں انکوائری کا آرڈر ہے تب تک معطل ہوں۔ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا اس لیے میرے بچنے کے چانسز زیادہ ہیں۔ البتہ ڈی موشن ہو سکتا ہے اور اگر ایسا ہو گیا تو نہ صرف میرا اسکیل کم ہو گا بلکہ تنخواہ میں چار ہزار کی کمی کر دی جائے گی۔

آخری جملہ انہوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا تھا۔

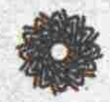
"کیا؟"

چار ہزار..... ڈی موشن..... کمیٹی..... دو لاکھ اور گھر کی تعمیر کا میرا خواب.....

میرے آگے بڑے بڑے سوالیہ نشان ناچنے لگے۔

"زینب آپا کو تم نے آسانی سے اپنے راستے سے ہٹا دیا۔ اب اس مصیبت سے کیسے نبٹو گی۔ کیا اب بھی تم ماننے سے انکار کرو گی کہ کسی کو کھلانے پلانے کا ذمہ اللہ کا ہے، کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے یہ۔

ہر انسان کا رزق اللہ تعالیٰ نے لکھا ہوا ہے اور ہر کسی کو اپنے حصے کا ہی ملتا ہے۔ اسے اللہ کی لوگوں پر مہربانی ہی سمجھ لو کہ وہ انہیں کسی دوسرے انسان کی کفالت کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔ ہم پر بھی اللہ نے یہ ذمہ داری عائد کی تھی مگر تم نے غرور کیا، تکبر کیا اب دیکھ لو انجام۔ جو تمہارے حصے کا تھا اب صرف وہی تمہیں ملا کرے گا۔ اور جو زینب آپا کے حصے کا تھا وہ انہیں وہیں گاؤں میں ملا کرے گا۔" عاطف سپاٹ لہجے میں کہہ رہے تھے۔ میرا سر شرم سے جھک گیا۔



نایاب جیلانی



مکمل ناول

اس نے جوں ہی کمرے میں قدم رکھا۔ فون کی بیل ایک دم بجنے لگی۔ اس نے ایک نظر سیل فون کی طرف دیکھا۔ پھر غصے کے عالم میں سفید رنگ کی گیند کو دیوار پر پوری شدت سے دے مارا۔ ہاتھ میں پکڑی ہاکی اور پسینے سے تربتر شرٹ اتار کر بیڈ پر پھینکی۔ فون کی بیل تواتر سے بجتی جارہی تھی۔ اب وہ صوفے پر بیٹھ کر جوتوں کے تسمے کھول رہا تھا۔ وہ ابھی تک بجتی بیل کی طرف متوجہ نہیں ہوسکا تھا' کیونکہ وہ ذہنی طور پر یہاں موجود ہی نہیں تھا۔ وہ تو ابھی تک خود کو ہاکی کے میدان میں محسوس کررہا تھا۔

سو گز لمبے اور ساٹھ گز چوڑے ہاکی کے اس میدان میں ابھی تک تماشائیوں کا ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ اور آج کی شکست بری طرح اسے تلملا رہی تھی۔

تھوڑی دیر اس نے فون کے بند ہوجانے کا انتظار کیا۔ پھر کچھ سوچ کر گویا کرنٹ کھا کے اٹھا۔

"مائی گاڈ! اگر لالہ کا فون ہوا تو...... وہ کس قدر پریشان ہورہے ہوں گے۔"

پھرتی سے فون اٹھا کر اس نے اسکرین کی طرف دیکھا اسکرین پر چمکتا نمبر اجنبی نہیں تھا۔ وہ پچھلے ایک سال سے اس نمبر سے آنے والی ہر کال نہ چاہتے ہوئے بھی اٹینڈ کررہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر مزید سوچتا رہا۔ شاید دوسری طرف موجود ڈھیٹ انسان کو کچھ شرم آجائے۔ مگر اسے غیرت بھلا کہاں آسکتی تھی۔ اس نے دانت پیستے ہوئے کال ریسیو کی۔

"عبید ڈارلنگ! کہاں تھے؟ اتنا انتظار کروایا۔" چہکتی ہوئی اس آواز میں بلا کی تازگی تھی۔ وہ گہری سانسیں خارج کرتے ہوئے خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

"مجھے پورا یقین تھا کہ تم اس وقت بہت سیڈ ہو رہے ہوگے۔ سو اسی لیے کال کرلی۔ کیا روتے رہے ہو بڑی ہمدردی کا مظاہرہ کیا جارہا تھا۔ گویا ان دونوں؟" میں بلا کی ذہنی ہم آہنگی اور دوستی ہو' حالانکہ وہ اس ہمدردی کے پردے میں چھپا طنز اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔



"جسٹ شٹ اپ!" وہ بری طرح تپ گیا تھا۔ وہ کچھ پل مزید خود کو ٹھنڈا کرتا رہا۔ "ہار اور جیت زندگی کا حصہ ہوتی ہے۔ میں اتنی معمولی بات پر رو نہیں سکتا۔" اس کے لہجے میں بلا کی مضبوطی تھی۔

تب ہی وہ شرارتی انداز میں چہکی۔

"حوصلے تو بہت بلند ہیں۔"

"ہر سپاہی کا حوصلہ بلند اور ہمت جواں ہوتی ہے۔" وہ چڑ کر گویا ہوا۔ جانتا تھا کہ وہ بات سے بات نکالتی جائے گی اور وہ اس کے جوابات نہ چاہتے ہوئے بھی دیتا رہے گا۔

"اے بلند ہمت سپاہی! آج کا معرکہ تمہارے لیے خاصا تکلیف دہ رہا۔ یہ شکست ہمیشہ یاد رہنے والی ہے۔ تمہاری گیند بھول کر بھی "فلیگ پوسٹ" (جہاں گول کیا جاتا ہے) کی طرف نہیں جاسکی' جبکہ جازم کی ٹیم نے یکے بعد دیگرے کئی گول کیے تھے۔ مائی گاڈ! ستر منٹ کے کھیل میں ایک بھی گول تم لوگوں سے نہیں



ہو سکا۔ ویری بیڈ! آج تو بہت خراب کھیلے ہو۔" اس کے ہمدردانہ لہجے میں چھپی شرارت کو محسوس کر کے عبد کا خون کھول اٹھا۔

"کیوں فون کیا ہے؟"

"سونے کی قیمت دن بہ دن بڑھ رہی ہے' بس یہی بتانے کے لیے فون کیا ہے۔" وہ ایک دفعہ پھر اسے بری طرح سے تپا گئی۔

"دیکھیے مس!" عبد کچھ بولنا چاہتا ہی تھا جب وہ سرعت سے اسے ٹوک گئی۔

"میں رمشا اکرام ہوں۔ ایک سال ہو چکا ہے۔ اب تک تو تمہیں میرا نام حفظ ہو جانا چاہیے۔"

"حفظ تو تب ہوتا' جب میں تمہارے نام کو یاد کرنے کی کوشش کرتا۔" عبد نے بھی طنزیہ لہجے میں اسے جلانا چاہا۔

"کوئی بات نہیں..... صرف حفظ ہی نہیں کرو گے بلکہ میرے نام کی مالا بھی جپنے لگو گے۔" وہ تلملاتی کہاں تھی' بلکہ تلملا کر رکھ دیتی تھی۔

"بڑی خوش فہمی ہے۔" وہ خون کے گھونٹ بھر کر رہ گیا تھا۔

"جو بھی کہہ لو۔" اسے کون سا پروا تھی۔

"جسٹ شٹ اپ!" عبد پھر سے سخت الفاظ کہتے کہتے رک گیا۔ خواتین سے نازیبا گفتگو کرنا اسے کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا' مگر یہ رمشا اکرام اسے زچ کر کے رکھ دیتی تھی۔

"تم نے فون کرنے کی وجہ نہیں بتائی۔" اس نے روکھے لہجے میں پوچھا۔

"اس لیے فون کیا تھا تاکہ تم سے پوچھ سکوں ہاکی کا کھیل برصغیر پاک و ہند میں کب متعارف ہوا؟" رمشا نے کھنکتی آواز میں اسے چڑایا۔ "ویسے آج تم بہت خراب کھیل رہے تھے۔ تین گول مس کیے۔ تم اچھے کھلاڑی نہیں ہو۔" وہ اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھے مسلسل بول رہی تھی۔

"میں' تمہیں....."

"لنچ کی آفر کرنا چاہتے ہو کیا؟" وہ جانتی تھی' اب عبد ضرور کچھ نہ کچھ بولے گا' اسی لیے اس کی بات سنے بغیر اپنی سناتی رہی۔

"تم....." وہ ایک دفعہ پھر لفظ ترتیب دینے لگا تھا جب رمشا نے اس کی بات درمیان میں اچک لی۔

"آج کل کلب کیوں نہیں آ رہے تم؟" اسے موضوع بدلنے میں بھی مہارت حاصل تھی۔

"میری مرضی۔" عبد چڑ کر رہ گیا۔

"کل ضرور آنا۔" رمشا کا انداز دھونس بھرا تھا۔

"کیوں' تم نے میرا ولیمہ ارینج کروایا ہے؟" وہ غصے میں پھنکارا۔

"بولنے سے پہلے سوچ تو لیا کرو۔" رمشا نے گویا خوب لطف لیا تھا۔ "ویسے' ایسا ہو بھی سکتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے تم "دولہا" بننے کے لیے تیار تو ہو جاؤ۔ ہم سارا ارینج منٹ کر لیں گے۔ اکیس توپوں کی سلامی بھی تیار رہے گی۔"

"تم آخر چاہتی کیا ہو؟" وہ زچ ہوا۔

"صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ تم جتنا اچھا جہاز اڑاتے ہو۔ اتنے ہی برے کھلاڑی ہو۔" وہ ہمیشہ فون بند کرنے سے پہلے ایسی ضرب لگا دیتی تھی کہ عبد کئی گھنٹے تک سلگتا رہتا تھا۔ اس وقت بھی وہ غصے کے عالم میں بیڈ پر رکھی ہاکی کو ہاتھ میں لے کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ہاکی کے پچھلے چپٹے سرے کو پکڑ کر اس نے پوری قوت سے ہوا میں اچھالا تھا اور یہ اس کی بدقسمتی تھی یا پھر فلائنگ آفیسر ثوب کی' بے چارے نے اسی پل دروازہ کھول کر کمرے کے اندر پاؤں رکھا تھا' جب لہراتی ہوئی ہاکی اس کے عین کندھے پر لگی۔ یہ تو اللہ کا شکر تھا کہ سر یا ماتھا محفوظ رہا تھا ورنہ تو جس قوت کے ساتھ اس نے ہاکی کو پھینکا تھا' ثوب کا سر تو ضرور ہی پھٹ جاتا۔

"سر! میں ادھار مانگنے تو نہیں آیا' پھر ایسا استقبال؟" اس نے اپنے کندھے کو پکڑ کر دہائی دی۔ عبد کو بے تحاشا خفت نے آن گھیرا۔

"سوری یار! مجھے بس پتا نہیں چل سکا۔"

"اگر ہڈی وڈی ٹوٹ گئی تو پھر؟" ثوب بھی خاصا نازک مزاج تھا۔ نجانے ایئر فورس اس نے کیسے جوائن کر لی تھی۔

"مجھے تو لگتا ہے۔ ضرور اندرونی طرف سے جلد پھٹ گئی ہو گی۔ اگر جلد کے اندر انفیکشن پھیل گیا تو۔" سدا کا وہمی ثوب اسے بھی دہلا رہا تھا۔

وہ دراز میں سے آیوڈیکس نکال لایا۔ اور اس کے کاندھے پر لگا دیا۔

پھر ہاتھ دھونے کے لیے واش روم میں چلا گیا۔ واپس آیا تو ثوب کو جوس پیتے اور فروٹ کی ٹوکری سامنے رکھے دیکھ کر چیخ اٹھا۔

"تم میں ذرا بھی مینرز نہیں ہیں۔ بغیر اجازت چیزوں میں گھستے ہو۔"

"اجازت کا کیا ہے۔ وہ تو میں ابھی بھی لے سکتا ہوں۔" ثوب نے فوراً" چہرے پر معصومیت طاری کر لی۔

"ویسے آج اتنے پر تشدد کیوں لگ رہے ہیں۔ خیر تو ہے؟" اس کی تمام تر توجہ فروٹ باسکٹ کی طرف تھی۔

"تم سے مطلب؟" وہ ناگواری سے بولا۔

"ہم سے مطلب رکھ کر بھلا آپ کو کیا ملے گا۔" ثوب نے معنی خیزی سے آنکھیں گھمائیں۔ "ویسے آج کل بڑی کالز آ رہی ہیں آپ کے نمبر پر۔"

"تمہیں کیسے پتا؟" وہ کچھ چونک کر بولا۔

"خبر تو رکھنی ہی پڑتی ہے۔ ویسے آج میں سارا دن آپ کے کمرے میں سوتا رہا ہوں اور پورا دن آپ کا سیل بجتا رہا ہے۔" ثوب نے اطمینان سے بتایا۔

"کوئی رانگ کالر ہو گا۔" اس نے خود کو لاپروا ظاہر کرنا چاہا۔ اب وہ لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ چکا تھا تاکہ ثوب کی معنی خیز نظروں سے بچ سکے۔

"رانگ کالر بھی خاصا مستقل مزاج لگتا ہے۔"

"تم یہ دو کیلے اور لو' اور بھاگو یہاں سے۔" عبد بھنّا کر بولا۔ ثوب اطمینان سے چھلکے اکٹھے کر کے ڈسٹ بن میں ڈال آیا تھا۔

"ایکچوئیلی! مجھے بھی یہاں بیٹھنے کا کوئی شوق نہیں۔ میں تو بس اظہار افسوس کرنے آیا تھا۔" جاتے جاتے اسے بھی تو کمینگی دکھانی تھی۔

"کیا مطلب؟" عبد کا ماتھا ٹھنکا۔ لگتا ہے پورے بیس میں خبر نشر ہو گئی ہے۔

"یہ بات چھپا کر رکھنے والی بھی نہیں ہے۔"

"دفع ہو یہاں سے۔" عبد کا پارہ چڑھ گیا تھا۔

وہ ہاکی اٹھا کر ثوب کے پیچھے لپکا تھا مگر وہ اسے ڈاج دے کر بھاگ گیا۔

ثوب کے جانے کے بعد وہ صوفے پر ڈھے گیا تھا۔ آج کی شکست نے سچ مچ اسے بے حد بددل کر دیا تھا۔ ہاکی کھیلنا اس کا شوق ہی نہیں' جنون بھی تھا۔ ان کے ادارے کی دو ٹیمیں تھیں۔ جن کے آپس میں میچز ہوتے رہتے تھے۔ جازم اس کا کولیگ بھی تھا اور مخالف ٹیم کا کپتان بھی۔ رسال پور اکیڈمی میں بھی یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ تھے۔ ایف ایس سی کے زمانے سے ہی دونوں کے درمیان مقابلہ رہتا تھا۔ آج اسے جازم کی ٹیم نے شکست سے دوچار کیا تھا۔ اوپر سے رمشا کے ریمارکس نے اس کا دماغ بری طرح سے کھولا کر رکھ دیا تھا۔ اگلے چار پانچ دن اسے

اسی کھولن کا شکار رہتا تھا۔ اس بات سے وہ اچھی طرح آگاہ تھا۔ فی الحال وہ جازم کی جیت کو بھلائے رمشا کے متعلق سوچنے لگا تھا۔

"آخر یہ ہے کون؟" اس کے اردگرد بڑا سا سوالیہ نشان چکرا رہا تھا۔

✲ ✲ ✲

وہ کالج کے زمانے سے ہی بہت اچھی ہاکی کھیلتا تھا۔ اگر عناس لالہ اسے اکیڈمی نہ بھیجتے تو شاید آج وہ قومی ٹیم کی نمائندگی کر رہا ہوتا۔ اتنی سخت ملازمت میں بھی وہ اپنے اس شوق کو ختم نہیں کر پایا تھا۔ اس کے جیسے ہاکی کے کئی شوقین اور جنونی لڑکوں نے دو ٹیمیں بنا رکھی تھیں۔ فرصت کے دنوں میں وہ میچ رکھ لیا کرتے تھے۔ فائنل سے پہلے کافی پریکٹس بھی کی جاتی تھی۔ جس دن ان کے سالانہ یا ماہانہ میچ شروع ہوتے تھے۔ تقریباً پورے بیس کے شائقین بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے وہ اور جازم اب محنت کے بعد میدان میں آئے تھے۔ مگر اس میچ میں قسمت نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

عبد جرار کا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے تھا۔ مگر اب اس کے پاس صرف تین مربع زمین تھی۔ عبد کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کی ماما تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنے بیٹوں کے مستقبل کی خاطر زمین بیچ کر شہر میں دو منزلہ مکان لے لیا تھا اور خود ایک پرائیویٹ کالج میں پڑھانے لگی تھیں۔ ان کی تمام تر توجہ اپنے بیٹوں کی طرف تھی۔ بیگم عدیلہ جرار نے اپنے بیٹوں کی زندگی بنانے کے لیے بے حد جدوجہد کی تھی۔ اپنے بچوں سے انہیں بے انتہا محبت تھی۔ اسی طرح عناس اور عبد بھی ماں کے ہر فیصلے اور ہر بات کو حکم کا درجہ دیتے تھے۔

بیگم عدیلہ کی ایک بیوہ بہن بھی ان کے گھر میں رہائش پذیر تھیں۔ عاشرہ کی تین بیٹیاں تھیں۔ مونسہ، مونا اور مینا..... ان کی رہائش اوپری منزل پر تھی۔ مونسہ ماسٹرز کر چکی تھی۔ اور اب ایک اچھی ساکھ رکھنے والے اسکول میں پڑھاتی تھی۔ مونا نے بی اے کر لیا تھا۔ ان دنوں انگریزی زبان سیکھنے کے خبط میں مبتلا تھی۔ سب سے چھوٹی مینا تھی۔ جو کہ فرسٹ ایر کی طالبہ تھی۔

مختلف تعلیمی اداروں میں عبد کو بے شمار دوستوں کا ساتھ ملا تھا، مگر جو دوستی عناس لالہ اور اس کے درمیان تھی۔ اس کی کہیں مثال نہیں ملتی تھی۔ عبد میں گویا عناس کی جان تھی۔ عبد کو معمولی سی تکلیف کیا ہوتی تھی، اس کا دل پہلے سے ہی اسے سگنل پہنچا دیتا تھا۔ وہ اس کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتا تھا۔ ایک مرتبہ چھوٹے سے ایکسیڈنٹ میں عبد معمولی سا زخمی ہو گیا تھا مگر بروقت طبی امداد نہ ملنے کی وجہ سے خون بہنا بند نہیں ہو رہا تھا۔ تب عناس گویا پاگل ہونے لگا تھا۔ وہ ڈاکٹروں سے چیخ چیخ کر کہتا رہا کہ "میرے جسم کا سارا خون نکال کر عبد کو لگا دو۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں زندہ نہیں رہ پاؤں گا۔"

شاید اس لیے بھی یہ دونوں بھائی ایک دوسرے کے زیادہ قریب آگئے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ان کے بہت بچپن میں ہو گیا تھا، تب ماما نے عناس کو ایک بات گویا گھول کر پلادی تھی۔

"عبد کے تم بھائی نہیں ہو، باپ بھی ہو۔ زندگی کے کسی بھی موڑ پر عبی کو تنہا مت چھوڑنا..... عبی میرا دل ہے۔" ماما گویا اس سے وعدہ لے رہی تھیں۔

"اور عبی میرا بھی دل ہے۔" عناس کے دل نے بھی ماں کی بات پر مہر لگا دی تھی۔ بہت بچپن سے ہی عبی کو محبتیں سمیٹنے کی عادت ہو گئی تھی۔ ماما اور عناس سے لے کر خالہ اور مینا تک سب ہی اسے ہتھیلی کا چھالا بنائے رکھتے تھے۔

وہ جب بھی اکیڈمی سے گھر واپس آتا۔ گویا پورے گھر میں ایک خوشی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ سب ہی یوں مستعد ہو جاتے گویا کسی کمانڈر کی آمد کی اطلاع مل گئی ہو۔

مونسہ کچن میں گھس جاتی تھی۔ مونا اور مینا اس کا کمرا صاف کرنے کے لیے بھاگ اٹھتی تھیں۔ خالہ اس کے کپڑے استری کرتیں اور عناس اس کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا بھی خیال رکھتا۔

عناس ذاتی کلینک بہت کامیابی سے چلا رہا تھا۔ عناس نے ایم بی بی ایس لاہور سے کیا تھا۔ اس کے علاوہ ڈپلومیٹ ان ڈرماٹالوجی میں اعلا تعلیم انگلینڈ سے اور پھر چار سال پہلے کاسمیٹک سرجری میں بھی امریکہ سے اعلا تعلیم حاصل کی تھی۔ بے حد قابل اور لائق فائق سرجن تھا۔ اپنی فیلڈ میں خاصی شہرت رکھتا تھا مگر ماما کے ہزار مرتبہ کہنے کے باوجود ابھی تک تنہا تھا۔ نجانے کیوں شادی کے نام سے ہی بدکتا تھا، حالانکہ چوڑیاں چھنکاتی بھابھی کو گھر میں لانے کے لیے عبد بھی خاصا بے قرار تھا مگر عناس کی "نہ" ابھی تک "ہاں" میں نہیں بدلی تھی۔

پچھلے دو دن سے وہ چھٹی کے مزے لوٹ رہا تھا۔ مگر فی الحال تازہ تازہ شکست کا غم ابھی زندہ تھا۔ سو وہ ابھی تک کسی کا سامنا کرنے سے گریزاں تھا۔

وہ اس وقت بھی اپنے کمرے میں موجود تھا اور پروفیسر غفور احمد کی "پھر مارشل لا آگیا" پڑھنے میں بری طرح سے محو تھا جب دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر کیڈٹ ہارون اندر داخل ہوا۔ وہ لابی میں موجود فون بوتھ کا آپریٹر بھی تھا۔ عبد کا دھیان فوراً اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔

"سر! آپ کی کال آرہی ہے۔"

"کہاں سے؟" وہ خاموش پڑے سیل کی طرف دیکھ کر بولا۔

"آپ کے بھائی ہیں..... اور کہہ رہے ہیں کہ اپنا موبائل آن کریں۔ انہیں کوئی ضروری بات کرنا ہے۔" ہارون پیغام پہنچا کر باہر کی طرف چلا گیا۔ عبد نے فوراً کتاب بند کر کے سیل فون آن کر لیا۔ ابھی وہ عناس کا نمبر ملانے ہی لگا تھا کہ اسکرین پر "لالہ کالنگ" جگمگاتا نظر آگیا۔ عناس نے چھوٹتے ہی سیل فون کی خاموشی کے متعلق جاننا چاہا تھا۔

"بیٹری لو ہو چکی تھی..... اور چارجر ثوب کے قبضے میں تھا۔" اسے فی الحال یہی بہانہ سوجھا۔

"کوئی اور بہانہ سوچتے..... میری ابھی ثوب سے بات ہوئی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا، میچ ہارنے کا سوگ منا رہے ہو۔" عناس نے اگرچہ اس کا جھوٹ ٹھیک پکڑا تھا، تاہم سوگ منانے والی بات نے اسے بے حد مشتعل کر دیا تھا۔ اس کا جی چاہا کال منقطع کر کے ثوب کو دو جھانپڑ لگا آئے، مگر اپنی امن پسند فطرت کے باعث تحمل کا مظاہرہ کرتا رہا۔ اُدھر عناس اسے سمجھائے جا رہا تھا۔

"میری جان! دل چھوٹا کیوں کر رہے ہو۔ ہار جیت تو زندگی کا لازمی جز ہے۔ تم تو صرف ایک کھیل میں ہارے ہو۔ بھلا ان لوگوں کو دیکھو، جو دل ہار کر صبر سے بیٹھے ہیں۔ پوری کی پوری متاع لٹا کر پھر بھی صبر کا دامن نہیں چھوڑتے۔"

"لالہ! ایسی بات نہیں ہے۔" عبد نے کچھ جھنجلا کر وضاحت کرنا چاہی۔ "یہ ثوب تو میرا ازلی دشمن ہے۔ اگر آپ کے دوست کا بھائی نہ ہوتا تو سچ، میرے ہاتھوں اب تک شہید ہو چکا ہوتا۔ مجھے نہ کبھی ہار کا اتنا غم ہوا ہے، نہ جیت کی ڈھیروں خوشی..... بس فون ایسے ہی بند کر رکھا تھا۔"

"تو میرے چاند! ایسے فون نہ بند کیا کرو نا..... جن کی دھڑکنیں تمہارے دل کے تاروں سے جڑی ہیں، انہیں کیونکر پریشان کرتے ہو۔ رات سے ماما اور مونسہ وغیرہ سخت پریشان ہیں۔ تم مونسہ اور مونا کے میسجز کا ریپلائی بھی نہیں کر رہے تھے۔" عناس نے بہت محبت سے اس کی غلطی کی نشاندہی کی تھی۔ عبد خاصا شرمندہ ہو گیا۔

"سوری لالہ! آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔"

اس نے ندامت سے کہا تھا اور پھر کپڑے اٹھا کر اسٹینڈ کی طرف آگیا۔

"تم اس وقت کیا کر رہے ہو؟" عناس یقیناً اس کی کھٹ پٹ سے اندازہ لگا چکا تھا کہ صاحب بہادر کچھ کام وغیرہ میں بھی مصروف ہیں۔

"اپنے کپڑے استری کرنے کی کوشش۔ سچ لالہ! جب سے گھر سے باہر نکلنا پڑا ہے۔ سارے "زنانیوں" والے کام سیکھ لیے ہیں۔ کبھی کبھی تو بڑا ہی رونا آتا

ہے۔ پچھلی مرتبہ ثوب نے میرے کپڑے "لانڈری" میں نہیں دیے تو خود ہی دھونے پڑے۔ ہر شرٹ کو دھوتے ہوئے مونسہ اور خالہ کی بڑی شدت سے یاد آئی تھی۔ آٹھ آٹھ آنسو بہاتے ہوئے ایک ایک موزہ دھویا تھا۔"

عناس کو ہنسی آگئی۔ "چلو' اسی بہانے تمہیں "خواتین" کی قدر تو آئی۔"

"جناب! ہم تو دل سے قدر کرتے ہیں۔ بس آپ ہی خواتین کی قدر نہیں پہچانتے۔" وہ گویا مزے سے بولا۔ "آج اگر شادی کر چکے ہوتے تو میں تین چار پیارے پیارے بچوں کا چاچو ہوتا۔"

"تو پھر تیاری پکڑو نا۔ میں تمہیں چاچو بنانے کے لیے تیار ہوں۔" عناس نے گویا ایک خوشگوار دھماکہ کیا تھا۔ عبد کی ساری بیزاری پل بھر میں اڑن چھو ہو گئی۔

"لالہ! آپ سچ کہہ رہے ہیں؟" وہ بے حد حیران ہوا۔

"سو فیصد سچ....." عناس اس کی خوشی پر خود بھی مسرور ہو گیا تھا۔

"کون ہے وہ خوش نصیب؟"

"ڈاکٹر حوریہ..... میری کلاس فیلو تھی اور بعد میں ہم دونوں نے تقریباً" سال بھر تک میڈیکل کالج میں پڑھایا بھی تھا' پھر حوریہ انگلینڈ اور میں امریکہ چلا گیا تھا۔ اس پر کچھ گھریلو ذمہ داریاں تھیں' سو اسی لیے اس نے مجھے کبھی کوئی اگلا قدم اٹھانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اب جبکہ وہ اپنے مسائل سے آزاد ہو گئی ہے اور میں بھی اپنا کلینک اسٹیبلش کر چکا ہوں تو پھر سوچا کیوں نہ ماما اور ماما کے لاڈلے کو خوش کر دیا جائے۔" عناس کے لہجے سے خوشی اور شادمانی کے فوارے پھوٹ رہے تھے۔

"یعنی بندوق میرے اور ماما کے کندھے پر رکھ کر چلانا ہے؟" عبد نے شرارتی انداز میں کہا۔ "ٹھیک ہے جی! ہمیں پھر بھی منظور ہے۔ آپ مانے تو سہی۔"

"گھر کب آؤ گے؟" عناس اب کچھ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"اس ویک اینڈ پر کوشش کروں گا۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"کوشش نہیں کرنا' ضرور آنا ہے۔ مونسہ کے سسرالی بھی ڈیٹ فکس کرنا چاہ رہے ہیں اور پھر ماما کہہ رہی تھیں' تم آؤ گے تو حوریہ کے گھر چلیں گے۔"

"بڑی بے چینی ہو رہی ہے۔" عبد کو اسے چھیڑنے کا موقع مل گیا تھا۔ مزید آدھ گھنٹہ لالہ سے بات کرنے کے بعد وہ بڑے ہی خوش گوار موڈ میں سونے کے لیے بیڈ پر لیٹ گیا۔ ذہن سے رمشا کی فون کال اور جازم کی طرف سے ملنے والی شکست خود بخود نکل گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ویک اینڈ پر جب وہ گھر آیا تو ہمیشہ کی طرح اسے وی آئی پی پروٹوکول دیا گیا تھا۔ دونوں پورشنز میں گویا رونق اتر آئی تھی۔ خالہ' مونا' مینا اور مونسہ نیچے آگئی تھیں۔ ویسے بھی ان کا کچن ایک ہی تھا۔ ایک ہی جگہ کھانا تیار کیا جاتا تھا۔ سو کھانے کے اوقات میں بڑی رونق نظر آتی تھی۔

آج کل گھر کے دو بڑوں کی شادیوں کی تقریبات کے منصوبے بنائے جا رہے تھے۔ مونسہ کی شادی کی تمام تر تیاریاں مکمل تھیں..... ان لوگوں کو بس سادگی سے نکاح کرنا تھا' کیونکہ مونسہ کو بیرون ملک اپنے شوہر کے ساتھ چلے جانا تھا۔

گھر آنے کے بعد اس نے مزید تین چھٹیاں لے لی تھیں۔ مونسہ کی رخصتی سے اگلے دن وہ حوریہ کو بھی رسما" انگوٹھی پہنا آئے تھے۔ ماما کو ہونے والی بہو بہت پسند آئی تھی اور عبد بھی لالہ کی چوائس کو سراہے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ حوریہ واقعی تعریف کے لائق تھی۔ وہ اعلا اخلاق کی مالک تھی۔ خالہ اور ماما اتنی اچھی بہو ڈھونڈنے پر عناس کی مشکور' جنہوں نے انہیں لڑکی ڈھونڈنے کی زحمت سے بچا لیا تھا۔ خالہ تو مسلسل عبد کو چھیڑے جا رہی تھیں۔

"اب عناس کی طرح تم بھی ہماری جوتیوں کو گھسنے سے بچا لینا۔"

"کیوں نہیں خالہ! آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔" عبد نے فرماں برداری کے تمام تر ریکارڈز توڑ دیے تھے۔

"بھائی! لڑکی خود پسند کر لیجیے گا' مگر شرط صرف اتنی ہے کہ حوریہ بھابھی سے کم نہیں ہونی چاہیے۔" مونا نے گویا وارننگ دی تھی۔ عبد نے مسکین سی صورت بنالی۔

"اب میں لالہ جیسا ڈیشنگ تو نہیں کہ کوئی خوب صورت لڑکی مجھے گھاس ڈالے۔"

"جی نہیں' ہمارے تو دونوں بھائی بہت خوب صورت ہیں..... کوئی ایک دوسرے سے کم نہیں۔" مینا اس کے کندھے سے جھولتی لاڈ سے بولی۔ یہ سچ تھا کہ خالہ کی تینوں بیٹیوں کو وہ بھائیوں جیسا مان دیتے تھے اور وہ بھی سگی بہنوں سے بڑھ کر ان کا خیال رکھتی تھیں۔ ان دونوں کی موجودگی میں خالہ کو کبھی اولاد نرینہ کی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

عناس کی شادی کی تاریخ طے کرنے کے بعد وہ فوراً" اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا تھا۔ ان دنوں انہیں خصوصی تربیت دی جا رہی تھی لہٰذا یہ دن خاصے مصروف تھے۔ سات آٹھ گھنٹے مسلسل فضا میں رہنا ہوتا تھا۔ فلائنگ کے دوران وہ بے حد مسحور ہو جاتا تھا۔ کچھ گھنٹوں کے لیے اسے دنیا کا ہر رشتہ اور ہر خواب بھول جاتا۔

ایئر فورس جوائن کرنا صرف عبد کا خواب نہیں تھا بلکہ اس کے ابو اور لالہ کی خواہش بھی تھی۔ اس نے ان دونوں کی خواہش اور اپنے عشق کو پایہ تکمیل تک پہنچایا تھا۔

فضاؤں کا سینہ چیرنے کے بعد' اپنا مطلوبہ ہدف حاصل کر کے جوں ہی اس نے زمین کی پتھریلی سطح پر جہاز کے قدم جمائے' دل و روح اور جسم میں دوڑتے لہو کی گردش پل بھر کے لیے تھم کر رہ گئی۔

اپنے کمرے میں آنے کے بعد وہ فوراً" ٹھنڈے ٹھار پانی سے شاور لے کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ اگرچہ اسے تھکاوٹ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ تاہم ہر پرواز کے بعد آرام کرنا بے حد ضروری ہوتا تھا۔ جسم کا پورا نظام

انہضام الٹ پلٹ ہو کر رہ جاتا تھا۔ اکثر تو جی بھی متلانے لگتا تھا۔ ایسی صورت حال کا سامنا عبد کو کم ہی کرنا پڑتا تھا۔ تاہم ثوب تو لازمی فلائنگ کے بعد ایک چکر ڈاکٹر کی طرف لگا — آتا تھا۔ وہ نازک مزاجی میں کبھی کبھی لڑکیوں کو بھی مات دے دیتا تھا۔

پرواز کے دوران موبائل بند کر کے وہ کمرے میں ہی رکھ جاتا تھا۔ ابھی اس نے لیٹے لیٹے ہی تکیے کے نیچے سے موبائل نکال کر آن کیا تھا کہ اس کی گھنٹی بج اٹھی۔ وہ اسکرین پر نظر آتے نمبر سے نگاہ چرا کر میسجز پڑھنے لگا۔ لالہ، مونا اور مینا کے علاوہ ثوب کے دو تین میسجز تھے۔ اس کے علاوہ جازم کی طرف سے بھی میسج موصول ہوا تھا۔

"عبو چاند! ابھی سے عید کا چاند بن کر نخرے دکھانے لگے ہو۔ شہزادے! ابھی تو رمضان میں دو تین ماہ باقی ہیں۔ عید تو رمضان کے بھی بعد آئے گی۔ اور تم اپنی امپورٹنس جتا رہے ہو یا پھر شکست کے بعد ہمارا سامنا کرنا بہت مشکل لگ رہا ہے۔"

وہ بلا کا کمینہ تھا۔ سو اپنی کمینگی تو اسے دکھانا ہی تھی۔

ابھی وہ جازم کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا، جب ایک دفعہ پھر موبائل بجنے لگا۔ اب کے عبد نے کال ریسیو کرلی کیونکہ وہ اچھی طرح — جانتا تھا، جب تک اس کی کال اٹینڈ نہ کی جاتی۔ وہ مسلسل فون کرتی رہے گی۔

"جہاز یوں اڑاتے ہو گویا فضاؤں کو تسخیر کر کے ہی دم لو گے۔" اس کے موبائل کو کان سے لگانے کی دیر تھی۔ رمشا فوراً شروع ہو گئی۔

"آسمان کا سفر اسی لیے تو کرتے ہیں۔" اگرچہ وہ اس کی آواز سن کر خاصا بے مزا ہوا تھا تاہم اس کے طنز کا جواب طنز میں دینا بھی ضروری تھا۔

"گھر گئے تھے کیا؟" اب بڑے دوستانہ انداز میں پوچھا جا رہا تھا۔ وہ چپ ہی رہا۔

"مونسہ کی شادی ہو گئی، یہ تو اچھی بات ہے۔ البتہ ایک نئی خبر بھی سنی ہے۔" رمشا اس کی خاموشی کے جواب میں مسلسل بولے جا رہی تھی۔ وہ جو لب بھینچے اس کی بکواس سن رہا تھا، ایک دم چونکا۔

"کون سی خبر؟" اب نجانے محترمہ کو کون سا انکشاف کرنا تھا۔

"عناس کی بات طے ہو گئی۔" اس کا لہجہ خاصا کٹیلا تھا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" عبد بے حد حیران ہوا۔

"یہ مت پوچھا کرو۔ میری نظر صرف تم ہی پر ہوتی ہے۔"

"کیوں؟ صرف مجھ پر کیوں؟" وہ قدرے روکھے انداز میں بولا۔

"کیونکہ جو بات تم میں ہے، وہ کسی اور میں نہیں۔" حاضر جواب تو وہ بلا کی تھی۔ اس بات کے جواب میں وہ بھلا کیا کہتا، حالانکہ نہ تو وہ اس کے انگریزی لب و لہجے سے مرعوب ہوتا تھا اور نہ ہی عبد کو اس سے ربط بڑھانے کا کوئی شوق تھا۔ اس کے حلقہ احباب میں کوئی ایسی لڑکی نہیں تھی، جو اتنی بولڈ اور مستقل مزاج بھی ہو۔ وہ پورے ایک سال سے اس پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ اگرچہ اس نے عبد سے بات کرتے ہوئے کبھی نازیبا کلمات نہیں کہے تھے اور نہ ہی بدتمیزی کی تھی مگر عبد کو اس رانگ کالر سے شدید چڑ ہو گئی تھی۔ اس نے ہر طرح کا سراغ لگا کر دیکھ لیا تھا مگر ابھی تک وہ اس لڑکی تک پہنچ نہیں پایا تھا۔ نجانے وہ کون تھی اور اس سے کیا چاہتی تھی۔ تاہم اتنا تو وہ پُریقین تھا کہ لڑکی نہ تو اس کے خاندان سے ہے اور نہ ہی اس کے اردگرد رہنے والوں میں سے ہے۔ وہ اس کے لیے قطعاً "انجان" تھی۔

وہ دوران تعلیم، کالج اور اکیڈمی میں خاصا خشک مزاج مشہور تھا۔ خواتین سے غیر ضروری بات کرنا اسے پسند نہیں تھا اور نہ ہی وہ جلد بے تکلف ہونے والوں میں سے تھا۔ سو اس کے حلقہ احباب میں لڑکیاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اس کے باوجود وہ اجنبی نمبر پر کسی سے بھی بات کرتے ہوئے خاصا محتاط ہو جاتا تھا کہ شاید فون کے دوسری طرف کوئی اس کے

جاننے والوں میں سے نہ نکل آئے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ رمشا سے بات کرتے ہوئے بھی احتیاط برتتا تھا۔

"اچھا، تو جناب کے لالہ جان محترمہ ڈاکٹر حوریہ کے انتظار میں عمر یا بتا رہے تھے۔" رمشا کا انداز ناقابل فہم قسم کا تھا۔ بظاہر وہ بڑی خوش اخلاقی برت رہی تھی۔ تاہم لہجہ خاصا سلگتا ہوا تھا۔ عبد ایک دفعہ پھر سے ٹھٹھکا

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"جو ہماری نظر میں اور دل میں رہتے ہیں، ان کے بارے میں ہر خبر رکھنا پڑتی ہے۔ یاد رہے، ہماری نظر میں صرف تم ہو۔" اس کا انداز صاف جتانے والا تھا۔

"ڈاکٹر حوریہ کے بارے میں تم کیسے جانتی ہو؟"

"میں تو عناس جرار، مونسہ، مونا اور مینا کے بارے میں بھی جانتی ہوں۔ تم اپنی ماما، خالہ اور لالہ کے بے انتہا لاڈلے ہو، بلکہ لالہ کی جان تم میں ہی ہے۔ میں تو یہ تک جانتی ہوں۔ اور بھی جو جو پوچھنا چاہتے ہو، پوچھ لو۔" وہ خاصی فراغ دلی سے کہہ رہی تھی۔

"مجھے تم سے کچھ نہیں پوچھنا۔" عبد چڑ کر بولا۔

"تو اب تک کیا کر رہے تھے؟" وہ اسے اور بھی چڑانے لگی۔

"بکواس کر رہا تھا۔"

"بہت اچھی بکواس کرتے ہو۔" دھیمے سے لہجے میں بلا کی کھنک تھی۔

"میں جانتا ہوں۔"

"اور کیا جانتے ہو؟" وہ بات سے بات نکال رہی تھی۔ اسی لیے عبد ایک دم چپ سا ہو گیا۔

"مجھے فون کیوں کرتی ہو؟" بہت دیر بعد اس نے تحمل سے پوچھا۔

"اچھے لگتے ہو۔"

"اچھا لگنے سے کیا ہوتا ہے۔"

"محبت۔" وہ برجستہ بولی۔

"اور محبت کیا ہوتی ہے؟"

"جب کوئی دل سے بہت قریب محسوس ہونے لگتا ہے۔"

"دیکھیں مس! مجھے یہ دل اور محبت کے قصے اٹریکٹ نہیں کرتے۔ دل کا کام صرف خون پمپ کرنا ہے۔ سو اسے یہی کام کرنے دیجیے۔ فضول کام اس کے ذمے مت لگائیے۔ اپنا نقصان کر بیٹھیں گی۔" وہ روکھے سے لہجے میں بولتا چلا گیا۔

"ہمارا اتنا خیال رکھنے کا شکریہ۔" وہ گویا کھلکھلا اٹھی تھی۔ عبد اس کی ہنسی کی جلترنگ سن کر چپ ہو گیا۔

"بہت ڈھیٹ ہو تم۔" عبد بھنایا۔

"وہ تو میں ہوں۔ بتانے کی ضرورت نہیں۔"

"تم آخر چاہتی کیا ہو؟" وہ زچ ہو گیا۔

"صرف اتنا چاہتی ہوں کہ تم میری چاہت میں مبتلا ہو جاؤ۔"

"یہ ممکن نہیں۔" وہ صفائی سے بولا۔

"کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔"

"بڑی خوش فہمی ہے۔"

"نہیں، خوش فہمی کیوں؟ وقت ثابت کرے گا۔ تم میری محبت کو ایک دن تسلیم کرلو گے۔"

"اب اجازت دو گی کیا؟" اس نے بڑی نرمی سے اجازت چاہی تھی۔ اگر فون ایسے ہی منقطع کر دیتا۔ تو وہ دوبارہ کال کر دیتی اور اگر فون آف کر دیتا، پھر تو اور بھی قیامت آجانی تھی۔ وہ لابی میں رکھے فون پر اس کی جان کھاتی رہتی۔ اگر وہ فون سننے نہ جاتا تو بھی سب کی نظروں میں آجاتا۔

"نہیں۔" ترنت جواب آیا۔

"کیوں؟" وہ پھر سے ضبط کیے پوچھ رہا تھا۔

"میری مرضی۔"

"میں ابھی کچھ مصروف ہوں۔" عبد نے گویا دانت پیسے۔

"عبد!" اس کی آواز میں واضح تحکم تھا۔ "تم مجھ سے بات کرو گے۔"

"ہونہہ، نہیں کروں گا۔" عبد نے سلگتے ہوئے فون آف کر دیا تھا۔ اس کی کنپٹیاں تک سلگ رہی تھیں اور وہ خود سے عہد کر رہا تھا کہ آج کے بعد رمشا

اکرام سے کبھی بات نہیں کرے گا۔ مگر اس کے یہ عہد خود بخود بودے ثابت ہونے لگتے تھے جب وہ ایک دفعہ پھر سے تلملاتے ہوئے اس کی فون کال نہ صرف اٹینڈ کرلیتا تھا بلکہ اسے مجبوراً "بات بھی کرنا پڑتی۔ ورنہ آپریٹر ہارون تھوڑی دیر بعد اس کے روم میں جھانک کر اطلاع دینے لگتا تھا۔

"سر! آپ کا فون ہے۔" اور اسی بات سے بچنے کے لیے وہ موبائل کا نمبر بدلنے کے بارے میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ وہ جو اس کے گھر کی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی جانتی تھی' نیا نمبر ڈھونڈنا اس کے لیے کچھ مشکل امر نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

آج پھران کا میچ تھا۔ اس دن عبد کی ٹیم بہت محنت کے بعد میدان میں اتری تھی۔ آج بھی شائقین نے پوسٹرز تھام رکھے تھے اور مسلسل ہوٹنگ کی جارہی تھی۔ چند من چلے فضائیہ کے سائن بورڈ پکڑے چیخ رہے تھے۔ کچھ شوخ مزاج لڑکیاں بھی برابر نعرہ بازی کر رہی تھیں۔

رمضان سے پہلے یہ ان کا آخری میچ تھا۔ اسی لحاظ سے یہ میچ عبد اور جازم کے لیے بہت اہمیت کا حامل تھا۔

جب وہ اپنی ٹیم کو بریفنگ دے رہا تھا' اسی پل ایک کیڈٹ نے اس کے کان میں آکر سرگوشی کی۔

"سر! کوئی رمشا اکرام ہیں۔ پارکنگ میں اپنی گاڑی کے پاس کھڑی ہیں۔ انہوں نے یہ موبائل فون دیا ہے۔ کہہ رہی ہیں کہ ابھی ان سے بات کریں۔"

"کیا؟" عبد کے گویا ہر طرف آگ لگ گئی تھی۔ وہ یکدم لب بھینچ کر گویا دہاڑا اور ننھا سا اسٹائلش موبائل اس نے دیوار سے دے مارا تھا۔ تب ہی ثوب اس کے قریب چلا آیا۔

"موڈ ٹھیک کر کے گراؤنڈ میں جائیے گا..... ورنہ نتیجہ پچھلے میچ جیسا ہی ہو گا۔"

"تمہاری کسر باقی رہ گئی تھی۔ تم بھی آکر دل جلا لو۔" عبد غصے میں سیڑھیاں اتر گیا۔ اس کی پوری ٹیم پہلے سے ہی میدان میں موجود تھی۔

اگرچہ وہ سخت بیزار اور بد دل ہو چکا تھا۔ مگر حیرت انگیز طور پر صرف تیس منٹ کے دوران اس نے تین گول کر لیے تھے' جبکہ جازم صرف ایک دفعہ گیند کو فلیگ پوسٹ کی طرف لے جا پایا تھا مگر ایک کھلاڑی نے پھرتی سے اس کی کوشش کو ناکام بنا دیا۔

اس میچ میں جازم نے بری طرح سے ناکامی کا منہ دیکھا تھا۔ لڑکوں نے اس جیت کی خوشی میں ہنگامہ مچا دیا۔ آج کا میچ اس لحاظ سے بھی خصوصیت کا حامل تھا کہ اس میچ کو دیکھتے ان کے سینئرز کمانڈر' اسکوارڈن لیڈر اظفر اور ونگ کمانڈر عادل کے ساتھ ساتھ ایئر کموڈور نجم بھی شریک ہوئے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے ایک بہت ہی عزیز دوست کو خط لکھ رہا تھا۔ علی سے اس کی بہت پرانی جان پہچان تھی۔ ان دنوں علی سعودیہ میں مقیم تھا۔ ان کی ٹیلی فونک گفتگو نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو لمبے لمبے خط لکھنے کے مرض میں مبتلا تھے' خصوصاً "علی تو بہت ہی تفصیل کے ساتھ آٹھ دس صفحات کا خط لکھتا تھا۔ حتیٰ کہ اپنا کھایا پیا تک بتاتا۔ وہ اس کے خط کی ایک ایک چیز کو بہت غور سے پڑھتا تھا۔ خط کے اختتام پر یہ چار لفظ تو ضرور لکھے ہوتے۔

"تمہارے لیے بطور تحفہ اپنے پڑوسی فلاں بن فلاں کی ایک مرغی چرا کر لے آؤں گا..... پورا سال اس کا گوشت کھانا..... پھر بھی چار پانچ بوٹیاں بچ جائیں گی۔" وہ علی کو خط کے جواب میں لکھ رہا تھا۔

میرے پیارے اور بے حد موٹے علی!

ان دنوں تمہاری یاد بے حد بے قرار کیے رکھتی ہے۔ ہر موٹے آفیسر کو دیکھ کر تم یاد آجاتے ہو۔ میرا تو خیال تھا' سعودیہ جا کر تم کچھ پگھل جاؤ گے' یعنی تمہارے وجود کی کچھ چربی کم ہو جائے گی' مگر میری یہ خام خیالی ہی رہی۔ ظاہر ہے' پڑوسی کی مرغیوں پر جو نظر ہے اور مجھے لگتا ہے کہ بے چاری مرغیاں تمہارے عتاب سے بچ بھی نہیں پاتی ہوں گی۔

تمہاری جنگجو طبیعت کے بھلا کیا کہنے..... وہاں بھی اپنی "اوقات" دکھانے سے باز نہیں آئے۔ یہ ہاتھا پائی' یہ مار کٹائی..... پنجابی فلمیں۔ زیادہ مت دیکھا کرو۔ کسی دن "وحشی ڈوگر" کے روپ میں سامنے آجاؤ گے۔

اور ہاں تمہیں خالہ اور ماما بہت یاد کرتی ہیں۔ ہمارے لیے چوری شدہ مرغیاں لانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں بھی "فارمی ککڑیوں" کا بزنس بہت اچھا چل رہا ہے۔ اگر کچھ لانا چاہتے ہو تو خالہ کے لیے عقیق اور اصلی زعفران لانا۔ ماما کے لیے ویلوٹ کی جائے نماز اور مونا' مینا کے لیے تسبیح اور کھجوریں۔ عناس لالہ کے لیے اصلی کھجوری ٹوپی' ثوب کے لیے پورے ہزار شمارے والی لمبی سی تسبیح..... جبکہ میرے لیے ان چیزوں میں سے تو کچھ بھی نہیں رہ گیا' سوا ایک جاپانی میوزک سسٹم ضرور لے آنا۔ اور جو تم نے پیانو لانے کا وعدہ کر رکھا تھا' وہ بھی ابھی تک پورا نہیں کیا۔ بس فرمائشوں کی لسٹ بنوا لیتے ہو۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے' آج تک تم نے ایک بھی فرمائش پوری نہیں کی۔"

وہ بڑے خوش گوار موڈ میں خط لکھنے میں مگن تھا۔ علی بہت عرصہ تک اس کا پڑوسی بھی رہا تھا۔ اس کے والدین حیات نہیں تھے اور کوئی بہن بھائی بھی نہیں تھا۔ وہ اپنی نانی کے ساتھ رہتا تھا۔ نانی کا انتقال ہو گیا تو وہ اپنے ماموں کے پاس سعودیہ چلا گیا۔ ماموں بے اولاد تھے۔ سو یہ ان کے ساتھ رہنے لگا۔

عبد کے پاس اس وقت علی کے کوئی ڈیڑھ سو کے قریب خط محفوظ تھے۔ جب کبھی وہ ذرا بوریت محسوس کرنے لگتا تھا' علی کے خطوط کا خزانہ نکال کر بیٹھ جاتا اور پھر مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے چپک کر رہ جاتی تھی' مگر اس موبائل فون کو گویا عبد کے ہونٹوں کی مسکان سے بیر ہو چلا تھا۔ تب ہی تو پرسکون ماحول میں ایسا بے ہنگم ارتعاش پیدا ہوا تھا کہ عبد کی ساری توجہ اور محویت ایک چھناکے سے ٹوٹ گئی۔ اس نے قلم ہاتھ میں پکڑے پکڑے موبائل اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

"فلائٹ لیفٹیننٹ عبد جرار سے بات کروا دیں۔"

وہ ہی کھنکتی آواز اور شگفتہ لہجہ۔ عبد نے اک گہری سانس بھری اور دھیمی آواز میں بولا۔

"فرمائیے۔"

"ہم نے کیا فرمانا ہے..... فرماتے تو آپ ہیں۔ ایسا تلخ مزاج..... اللہ کی پناہ۔" اس نے گویا موبائل چھوڑ کر کانوں کو ہاتھ لگائے تھے۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔

"میرے گفٹ کا بھلا تم نے کیا حشر کیا تھا۔ ننھا سا موبائل اپنی ناقدری پر روتا رہا۔ خیر' یہاں تو انسانوں کی قدر نہیں۔ چیزوں کا بھلا کیا رونا۔" وہ خواہ مخواہ دکھی ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔

"خیر' چھوڑو' اس بات کو' یہ بتاؤ..... اس وقت کیا کر رہے تھے؟" اب بڑے دوستانہ انداز میں پوچھا جا رہا تھا۔

"تم سے مطلب؟" وہ کاغذ اور قلم ایک طرف رکھ کے کارپٹ پر لیٹ گیا تھا۔

"مجھے ہی تو مطلب ہے..... ویسے تم نہ بھی بتاؤ' میں پھر بھی جانتی ہوں۔ تم کیا کر رہے تھے....." اس کا انداز معنی خیز تھا۔

"اچھا' تو پھر بتا دیں..... میں کیا کر رہا تھا۔" عبد نے جھنجھلاتے لہجے میں پوچھا۔

"علی کو خط لکھ رہے تھے نا۔" اس نے وثوق سے کہا تھا۔ وہ چونک گیا۔ وہ اسی طرح اسے چونکائے رکھتی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ وہ ہے کون؟ کم از کم اس کے قریب کوئی ایسی لڑکی نہیں تھی' جو اس کے روزمرہ معمولات تک سے باخبر رہتی۔ تو پھر یہ رمشا اکرام کون تھی؟

"تم جانتی ہو' علی کون ہے؟" اس نے بہت محتاط انداز میں پوچھا۔

"ہاں..... "ادھر سے فوراً "جواب آیا۔

"تو پھر بتاؤ۔"

"تمہارا دوست ہے۔" وہ سوچتے ہوئے بولی تھی' حالانکہ وہ یہ بات جانتی تھی' مگر انداز یوں تھا گویا سوچ

بچار کے بعد تکامار آگیا ہو۔

"ہاں۔" عبد بڑبڑایا۔

"اس کے علاوہ پتا ہے علی کون ہے؟" اب پھر سے وہ تجسس کی مار مار رہی تھی۔

"کون ہے؟"

"تمہاری خالہ کا ہونے والا داماد......"

"تم کیسے جانتی ہو......؟"

عبد گویا ششدر رہ گیا تھا۔ وہ کوئی عام رانگ کالر تو نہیں لگتی تھی۔ آج سے پہلے تک وہ اس سے بس عام سے انداز میں بات کرتا رہا تھا۔ اسی لیے تو عبد نے کبھی اس کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی تھی، مگر اس وقت وہ حیران رہ گیا تھا۔ یہ بات آج کل امی اور خالہ کے درمیان ڈسکس ہو رہی تھی۔ علی کے ماموں نے بھی ڈھکے چھپے لفظوں میں مونا کے لیے پسندیدگی ظاہر کی تھی مگر یہ انتہائی گھریلو بات بھلا اس اجنبی لڑکی کو کیسے پتا چلی تھی۔ اس کا دماغ چکرا کر رہ گیا تھا اور اس کے پورے وجود میں عجیب سی بے چینی بھر گئی تھی۔ اب رمشا اکرام کے بارے میں جاننا ناگزیر ہو گیا تھا۔

"یہ مت پوچھا کرو..... میں کیسے جانتی ہوں اور تمہارے بارے میں کیا کیا جانتی ہوں؟" وہ جتا جتا کر بولی۔

"ویسے تمہارا دوست علی، مونا کو خاصا پسند کرتا ہے۔ اسی کی خواہش پر رشتے کی بات چلائی گئی ہے۔"

"تم کون ہو؟" بہت سنبھل کر عبد نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"تمہاری عاشق۔"

"میں پوچھ رہا ہوں..... تم ہو کون؟" اس نے ذرا تیز لہجے میں اپنا سوال پھر دہرایا۔

"رمشا اکرام، تمہاری راہوں میں کھڑی منتظر محبت..... تمہاری نظر التفات کی بوند بوند کو ترسنے والی خشک زمین۔"

"تم مجھے افسانوی باتوں میں الجھا نہیں سکتیں۔" عبد کو غصہ آگیا۔

"تمہیں اپنی باتوں میں نہیں محبت میں الجھانا چاہتی ہوں، مگر تم ہو کہ دامن بچا کر نکل جاتے ہو۔" اس کا لہجہ خاصا بوجھل اور دھیما ہو گیا تھا۔

"یہ بے فائدہ باتیں ہیں۔ مجھ پر اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔"

"تم مان لو گے ایک دن....."

"یہ ممکن نہیں۔"

"کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔"

"خوش فہمی ہے تمہاری۔" وہ سلگ کر بولا۔

"نہیں، خود پر اعتماد ہے اور اس محبت پر اعتماد ہے، جو میرے اور تمہارے درمیان صف باندھے کھڑی ہے۔" اس کی مزید کوئی بات سنے بغیر اس نے کھٹاک سے فون بند کر دیا۔ جبکہ عبد خون کے گھونٹ بھر کر رہ گیا۔

اس نے دل میں پختہ عہد کر رکھا تھا کہ آئندہ کی کوئی کال اٹینڈ نہیں کرے گا۔ نجانے کون لڑکی تھی۔ کس مقصد کے تحت اسے تنگ کر رہی تھی۔ نجانے اس کا کیا منصوبہ تھا۔ وہ جس حساس ادارے سے منسلک تھا، یہ لڑکی اس کے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ اسے بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت تھی۔

☼ ☼ ☼

رمشا نے بہت دنوں سے کال نہیں کی تھی اور وہ جو اس کا سراغ لگانے کے متعلق سوچ رہا تھا۔ ایک دم پُرسکون ہو گیا۔

ویسے بھی ان دنوں فضائی مشقیں وقفے وقفے سے جاری تھیں۔ دن بے حد مصروفیت میں گزر جاتا تھا۔

عناس لالہ نے صبح ہی اسے خوشخبری سنائی تھی کہ خالہ نے مونا کے لیے علی کا رشتہ قبول کر لیا ہے۔ علی اور مونا کی پسندیدگی کی بھنک خالہ کے کانوں میں پڑ چکی تھی، مگر مسئلہ یہ تھا کہ خالہ دوسری بیٹی کو بیرون ملک نہیں بھیجنا چاہتی تھیں۔ پہلے مونسہ چلی گئی تھی اور اب مونا کی باری تھی۔ خالہ شاید اسی محبت میں علی کے رشتے کو انکار بھی کر دیتیں مگر مونا کی آنکھوں میں

اترے رنگوں نے انہیں یہ رشتہ قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔

ہفتہ کو وہ گھر آیا تو ہمیشہ کی طرح شاندار استقبال کیا گیا تھا۔ مونا کی شادی اس بار علی کی آمد کے بعد ہونا قرار پائی تھی۔ ان دنوں عبد کو علی کے خط کا انتظار تھا۔ وہ جانتا تھا، علی جب تک اپنی محبت کی داستان بیان نہ کر لے، اُسے چین نہیں آنا تھا۔

مونا اس کے لیے شربت بنا کر لائی تو عبد نے ٹھنڈی آہیں بھرنا شروع کر دی۔

"خالہ! آنگن کی ساری چڑیاں اڑ رہی ہیں..... کون اتنے پیار سے شربت بنا بنا کر پلائے گا۔"

"غم کیوں کھاتے ہیں بھائی! ہم آپ کی خدمت کرنے کے لیے "مستقل خادمائیں" لے آئیں گے۔" مینا نے اپنی عقل کے مطابق چہک کر جواب دیا۔

"کیا مطلب؟ خادمائیں؟ یعنی لالہ اور عبی کی دو دو بیویاں؟" مونا چیخی۔

"جی نہیں، اب اتنی "خادمائیں" بھی دستیاب نہیں ہیں۔" مینا نے سر نفی میں ہلایا۔ "صرف ایک ایک ملے گی۔"

"یعنی ایک اور ایک دو....." عبی نے فوراً بات اچک لی۔ "ایک ماما کی پسند کی اور ایک ایک ہم دونوں بھائیوں کی پسند کی..... پتا ہے کیا کریں گے؟" وہ پورا جگ خالی کر کے میدان میں اتر آیا۔

"بھلا کیا؟" مونا اور مینا نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہم دونوں اپنی ایک بیوی، ماما اور خالہ کے پاس ان کی خدمت کے لیے چھوڑ دیں گے، کیونکہ تم لوگوں کو تو چلے ہی جانا ہے، پھر ہماری اماؤں کا کون خیال رکھے گا۔ میں نے سوچا ہے کہ....."

"تم اپنی ایک بیوی کو ادھر چھوڑ جاؤ گے اماؤں کی خدمت کے لیے اور دوسری کو اپنی خدمت کے لیے ساتھ لے جاؤ گے۔ بہت چالاک ہو تم عبی! یعنی ایک تیر سے اتنے شکار خالہ خوش، ماما خوش، خاتون اول بھی خوش..... مگر خاتون دوم جو ناخوش ہو گی۔ اس کا کیا کرو گے؟" مونا نے اس کے کندھے پر دھپ لگائی تھی۔

"بہت زبان چل رہی ہے تمہاری۔" عبی اپنے رنگ میں واپس آ رہا تھا۔ "یہ جو میری اونچی ناک کے نیچے لو اسٹوری چلتی رہی ہے نا..... اس لو اسٹوری چلانے والے کا انجام میرے ہاتھوں اچھا نہیں ہو گا۔ اتنے طویل ترین "محبت نامے" لکھتا رہا ہے مگر مجال ہے جو اس موٹے نے اس راز کو اگلا ہو۔"

"علی اتنا بھی موٹا نہیں ہے۔ بس تھوڑا صحت مند ہے۔" مونا نے مری مری آواز میں کہا۔

"تھوڑا صحت مند کہاں..... "عبد چیخا..... "پورا ڈرم ہے۔"

"تو تمہیں کیا تکلیف ہے۔" مونا روہانسی ہو گئی۔

"میں امی اور خالہ کو بتاتی ہوں۔"

"کیا بتاؤ گی؟" عبد مزے سے بولا۔ "علی سے کہیں، ڈائٹنگ کر لے۔" وہ مسلسل اسے چھیڑ رہا تھا۔

"اللہ کرے..... تمہاری بیوی اتنی موٹی ہو، جتنا ڈھول ہوتا ہے۔ اتنی چالاک ہو کہ تمہیں تگنی کا ناچ نچادے۔" مونا زچ ہو کر بد دعاؤں پر اتر آئی۔

"اے لڑکی! میرے سونے جیسے بیٹے کو بد دعائیں تو نہ دو..... اگر ایسی صفات کی کوئی لڑکی آ گئی نا، تو سب سے پہلے ہم دو بڈھیوں کو کان سے پکڑ کر چلتا کرے گی، پھر ہم کہاں جائیں گے۔" خالہ کفگیر سمیت کچن میں سے برآمد ہوئی تھیں۔

"یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔" مونا بھی دہل گئی۔

"موٹی عقل جو ہے، علی کے جیسی۔" اس نے پھر چھیڑا۔

"عبی کے بچے!" مونا ناراضی سے چیخی تھی اور پھر دھپ دھپ کرتی کچن میں چلی گئی۔

کچھ دیر بعد ازالے کے طور پر وہ ان دونوں کو شاپنگ کروانے لے کر جا رہا تھا۔ مارٹ میں گھومتے ہوئے اس کا سیل مینا نے لے لیا تھا۔ وہ اپنی کسی فرینڈ سے میسجز پر بات کرنے لگی۔ جبکہ عبد اور مونا گھوم پھر کر شاپنگ کر رہے تھے۔ عبد کی چوائس بہت اعلا تھی۔

مینا اور مونا کے علاوہ اس نے حوریہ کے لیے بھی ایک بہت نفیس سوٹ لیا تھا۔

مینا کی شاپنگ مکمل ہو گئی تو ہاتھ میں کون پکڑے گاڑی میں جا کر بیٹھ گئی۔

اس نے کون ختم کر لی تو سیل فون پر مخصوص بیل بجنے لگی۔ انجان نمبر تھا' سو اس نے کال اٹینڈ نہیں کی' مگر فون اس تسلسل سے بجنے لگا تھا کہ مینا نے سوچا شاید کوئی ضروری کال ہو۔ جوں ہی اس نے لیس کا بٹن دبایا۔ دوسری طرف سے بے حد رسیلی' آواز سنائی دی۔

"عبی! اتنے دن لگا دیے کیا واپس نہیں آنا؟"

"جی آپ کون؟" عبد کے سیل پر صنف نازک کی کال۔ اور پھر بے تکلفانہ انداز مینا کے کان فوراً" کھڑے ہوئے تھے

"تم کون ہو؟" دوسری طرف کی آواز قدرے محتاط ہو گئی تھی۔

"میں مینا ہوں..... عبد بھائی کی بہن..... آپ کون ہیں؟" مینا نے جلدی سے تعارف کی رسم نبھائی۔

"مجھے رمشا کہتے ہیں۔ عبد کہاں ہے؟"

"وہ تو شاپنگ کر رہے ہیں..... میں گاڑی میں بیٹھی ہوں۔ کوئی میسج ہے تو دے دیں۔" مینا نے گھبرا کر کہا تھا۔ ایک تو یہ خوف بھی تھا کہ عبد کال اٹینڈ کرنے پر ناراض نہ ہو۔

"میسج.....!" وہ کچھ دیر سوچ میں پڑ گئی۔

"ایکچوئیلی! بات یہ ہے کہ تم اپنے عناس لالہ سے میری بات کروا دو۔"

"ابھی تو ممکن نہیں..... ان سے رات دس بجے کے بعد بات ہو سکتی ہے۔" مینا نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "آپ عبد بھائی کی فرینڈ ہیں؟" مینا زیادہ دیر اپنے تجسس پر قابو نہیں پا سکی تھی۔

"تمہارے عبد بھائی مجھ سے پیار کرتے ہیں..... یہ بات تم سے کہنے والی نہیں' مگر اس لیے بتایا ہے تاکہ تم اپنی امی اور خالہ کو بتا دو۔" وہ بہت تول تول کر بول رہی تھی۔

"اچھا' تو کیا آپ ہماری ہونے والی بھابھی ہیں.....!" مینا کی چہکتی آواز کو بریک تب لگے تھے' جب عبد فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا اور ساتھ ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر مینا کے کان سے لگا سیل جھپٹ لیا۔

"بھائی.....!" مینا کچھ سہم سی گئی تھی۔ عبد کے تاثرات ہی ایسے تھے فون کان سے لگائے وہ پھنکارا۔

"آئندہ اس نمبر پر کال کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔" وہ جتنی نرمی اس کے ساتھ برت سکتا تھا برت چکا تھا' مگر یہ ڈھیٹ تو اسے گھر والوں کے سامنے بھی ذلیل کرنے پر تل گئی تھی۔ عبد مارے اشتعال کے کچھ دیر بول ہی نہ پایا۔ کافی دیر بعد وہ مینا سے مخاطب ہوا۔

"اس لڑکی نے جو بکواس کی ہے۔ اس پر دھیان دینے کی ضرورت نہیں۔"

"جی بھائی.....!" مینا نے زور سے سر ہلا دیا۔

☼ ☼ ☼

رمشا اکرام اس کے لیے سچ مچ درد سر بن چکی تھی۔

ان دنوں پھر سے فلائنگ کی مصروفیت نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ پورے ڈیڑھ ماہ تک وہ گھر جا ہی نہیں سکا تھا اور نہ ہی گھر والوں سے تفصیلاً" بات ہو سکی تھی رمشا کا بھی کوئی فون نہیں آیا تھا۔

پھر لالہ کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے اور اس کے دماغ سے رمشا بالکل ہی نکل گئی۔ حوریہ بھابھی کی آمد اور مونا کی رخصتی' دو شادیوں کی تقریبات تھیں' سو عبد کو سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ ایک طرف عزیز از جان دوست تھا اور دوسری طرف بھائی۔

لالہ کی شادی بے حد یادگار رہی تھی۔ مونا اور علی ولیمہ کے کچھ دن بعد سعودیہ چلے گئے تھے اور حوریہ بھابھی مستقل ان کے گھر میں رونق بن کر اتر آئی تھیں۔

شادی کے تین ماہ بعد عناس لالہ اس سے ملنے کے لیے چلے آئے۔ عبد خوش بھی ہوا اور حیران بھی۔

"بھابھی نے کیسے آنے دیا؟" وہ انہیں چھیڑ رہا تھا مگر لالہ کافی سنجیدہ تھے۔ چنانچہ عبد کو بھی سنجیدہ ہونا پڑا۔

"مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنا ہے عبی!" وہ بے حد الجھے الجھے دکھائی دے رہے تھے۔

"جی لالہ!"

"تم رمشا اکرام کو جانتے ہو؟"

"وہ آپ تک بھی پہنچ گئی ہے؟" عبد کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔

"وہ نہیں پہنچی۔ اس کا باپ آیا تھا' میرے پاس۔" عناس لالہ کا انداز کچھ سوچتا ہوا اور کھویا کھویا سا تھا۔

"کیا مطلب؟" عبد چونک گیا۔

"جانتے ہو' اس کا باپ کون ہے؟" لالہ نے سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" وہ اس سے ناواقف تھا۔

"اس کا باپ اس شہر کا نامور بزنس مین ہے۔ فیکٹریاں چلتی ہیں اس کی۔ رمشا اس کے تین بیٹوں کے بعد پیدا ہونے والی بیٹی ہے۔ اور جیسی محبت ہم تم سے کرتے ہیں' ٹھیک ویسی ہی محبت وہ اپنی بیٹی سے کرتا ہے اور جانتے ہو' باپ کب اور کیوں بے بس ہوتا ہے؟" ان کی آواز اور لہجہ دونوں ہی دھیمے تھے۔

"ظاہر ہے..... میں کیسے جان سکتا ہوں۔" عبد چڑ کر بولا۔ وہ ان کی تمہید کا متن کچھ کچھ جان رہا تھا۔

"عبی! تم اور رمشا اگر ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے تو پھر تم نے ہمیں کیوں نہیں بتایا؟ ہم ایک طریقے کے ساتھ تمہارا رشتہ لے کر جاتے۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔

"کیا مطلب؟ میں رمشا کو نہیں جانتا۔ وہ میرے لیے صرف ایک رانگ کالر ہے..... اور ایک سال سے....."

وہ لالہ سے یہ سب کہنا چاہتا تھا' مگر نجانے کیوں نہیں کہہ پایا۔ شاید ایک لڑکی کے لیے ایسے کلمات ادا کرنا اس جیسے مہذب بندے کے اختیار میں نہیں تھا۔

"عبی! میں نے اور ماما نے باہمی صلاح مشورے کے بعد واجد اکرام کو فی الحال ٹالا ہے۔" انہوں نے گویا اس کے چھکے چھڑا دیے تھے۔

"مگر لالہ!" وہ سخت مضطرب ہو گیا۔

"کوئی اگر مگر نہیں..... ایک باپ کی بے بسی کو صرف وہ ہی محسوس کر سکتا ہے' جو ایک ہمدردانہ دل رکھتا ہے۔ وہ اپنی بیٹی کی وجہ سے مجبور تھے۔ تب ہی ہمارے گھر ہاتھ باندھے چلے آئے۔ انہیں یقیناً" رمشا نے مجبور کیا ہو گا اور تم بھی تو یہی چاہتے ہو۔ واجد صاحب بتا رہے تھے کہ ایک ڈیڑھ سال سے تمہارا اور رمشہ کا رابطہ ہے۔ بہرحال اچھی طرح سے سوچ لو' میں اور ماما تمہارا رشتہ طے کرنا چاہتے ہیں اور واجد صاحب کہہ گئے ہیں کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح تمہارے علاوہ کسی اور سے نہیں کر سکتے' اگر ایسا کرنے کی انہوں نے کوشش بھی کی تو رمشا خود کو ختم کر لے گی۔ انہیں اپنی بیٹی کی زندگی عزیز ہے اور ہمیں تمہاری خوشی۔"

لالہ تو اپنا نقطہ نظر واضح کر کے چلے گئے تھے تاہم وہ سوچوں کے بھنور میں ڈوبتا ابھرتا رہا تھا۔ اس کے تو گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک رانگ کالر اس کی محبت میں مبتلا ہو کر اتنا بڑا قدم اٹھا لے گی۔ نجانے کیوں پہلی مرتبہ اس کے دل میں رمشا کے لیے خود بخود نرم جذبات ابھر آئے تھے۔

اور وہ اس وقت حیران رہ گیا تھا جب رمشا کی فون کالز کا اسے انتظار رہنے لگا۔ لاشعوری طور پر دھیرے دھیرے وہ اس کے دل و دماغ پر قابض ہونے لگی تھی۔ ابھی تک اس نے رمشا کو دیکھا نہیں تھا۔ مگر وہ اسے سوچنے لگا تھا۔ وہ اس کے خوابوں اور خیالوں میں بسنے لگی تھی۔ دھیرے دھیرے ہی سہی عبد کو اس کی مدھر آواز سننے کی عادت سی ہو گئی تھی۔

اور ایک دن ماما اور حوریہ بھابھی' رمشا کو انگوٹھی پہنا کر سادگی سے رسم بھی کر آئیں۔

☼ ☼ ☼

منگنی کے بعد رمشا پہلی مرتبہ خود اس سے ملنے کے لیے آئی تھی اور پھر عبد نجانے کیوں اس سے ملاقات کے بہانے ڈھونڈنے لگا تھا۔ شاید وہ رمشا کی شدتوں کے سامنے سر تسلیم خم کر چکا تھا یا پھر رمشا نے اپنے باپ کو اس کے گھر بھیج کر عجیب سی ندامت میں مبتلا کر

دیا تھا۔ وہ ایک بیٹی کے باپ کو جھکانا نہیں چاہتا تھا۔ اگر واجد اکرام بے بس ہو کر اپنے کندھے جھکا چکے تھے تو پھر اس کی شرافت نے گوارا نہیں کیا کہ وہ ایک بیٹی کے باپ کو ذلیل کرتا یا پھر رمشا کو اپنے گھر والوں کی نظر میں ہلکا کر دیتا۔

اس نے عناس لالہ کے سامنے اعتراف کر لیا تھا۔

"لالہ! ہماری فون پر ہی دوستی ہوئی تھی اور میں رمشا سے محبت کرنے لگا۔ میں سمجھا' آپ کبھی نہیں مانیں گے' کیونکہ ہمارے اور رمشا کے اسٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ سو مجبوراً اسے اپنے باپ کو ادھر بھیجنا پڑا۔"

"دفع کرو' اوکے میری جان! محبت کرنا جرم نہیں..... مگر محبت طریقے سلیقے سے کرنا چاہیے۔ تم اگر مجھے بتا دیتے تو واجد صاحب کو خود آنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔" لالہ نے محبت سے اس کا شانہ تھپک کر کہا تھا۔

پھر رمشا اور اس کی ملاقاتوں کا ایک طویل سلسلہ چل پڑا تھا۔ حالانکہ شادی سے پہلے کا میل ملاپ اسے پسند نہیں تھا' مگر رمشا میں نجانے کیسی مقناطیسی کشش تھی۔ وہ اس کی محبت میں دن بدن اور آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

وہ بے حد خوب صورت تھی' تعلیم یافتہ تھی۔ ہر لحاظ سے مکمل تھی اور سب سے بڑی بات عبد جرار کی محبت میں مبتلا تھی اور یہ محبت کے ساتھ سب سے بڑی ناانصافی ہوتی کہ اسے بدلے میں نفرت یا بے اعتنائی ملے۔

"تم نے مجھے کہاں دیکھا تھا رمشا؟" وہ اکثر اس سے یہی سوال کرتا تھا' جس کا جواب وہ کافی شاعرانہ انداز میں دیتی تھی۔

"میری اور تمہاری روح دنیا میں آنے سے پہلے ملاقات کر چکی ہے عبد!"

"پھر بھی رمشا! بتاؤ نا۔" اس کا اصرار ہمیشہ قائم رہتا۔

"شاپنگ مال میں دیکھا تھا۔" اس نے سچ بتا دیا۔

"اور پھر نمبر کیسے لیا؟"

"بس لے لیا۔ جذبے خالص تھے۔" وہ ہنس دیتی۔

"میں ایک غریب سا سپاہی ہوں۔ تمہاری نظر مجھ تک کیسے پہنچی؟"

"عبی! یہ دل کے معاملے ہوتے ہیں۔ ہماری تمہاری سمجھ سے بالاتر ہیں۔"

"اور تمہارا دل مجھ پر آکے ٹھہر گیا؟" وہ حیران ہو کر پوچھتا۔

"ہاں' میں تمہارے سارے میچ دیکھنے کے لیے آتی تھی۔"

"میں ایک اچھا کھلاڑی نہیں ہوں' پھر بھی؟"

"ہاں' پھر بھی..... کیونکہ میرا دل چاہتا تھا' تم بہت اچھے اور معصوم ہو۔ سچی عبی! تمہاری آنکھیں اتنی معصوم' صاف و شفاف ہیں۔ یوں لگتا ہے' گویا کوئی نومولود دنیا کو حیرانی سے دیکھ رہا ہو۔" اس کی اپنی آنکھیں اس لمحے ستاروں کی طرح چمکنے لگتی تھیں۔

"توبہ' اتنی بھی مبالغہ آرائی نہ کیا کرو۔" وہ ہنس پڑتا۔

"تم مجھ سے بہت محبت کرتی ہو نا؟" اب وہ نجانے کون سی یقین دہانی چاہ رہا تھا۔ رمشا کا سر خود بخود اثبات میں ہل گیا۔

"ایک بات تو بتاؤ عبی!" کچھ سوچ کر وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"پوچھو؟"

"تم میری طرف کیسے ملتفت ہو گئے؟ پچھلے ایک سال سے میں تمہارے پیچھے پاگل ہو رہی تھی مگر تم توجہ ہی نہیں دیتے تھے۔ پھر ایسا کیا ہوا؟"

"مجھے تمہاری محبت کی شدت نے متاثر کیا تھا رمشا! اس دنیا میں خالص محبت اب ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ کون کسی سے محبت کرتا ہے' وہ بھی بغیر کسی غرض کے۔ میں نے تمہاری محبت میں خلوص دیکھا اور مجھے اچھا لگا۔ مجھے تم سے اچانک یا لمحوں میں محبت نہیں ہو گئی تھی۔ پورے ایک سال سے کہیں میرے اندر بھی یہ جذبہ خود بخود پنپنے لگا تھا۔ خود سوچو' اگر میرے دل

میں یہ نرم سا بیج نہ ہوتا تو میں تمہاری کالز کیوں کر اٹینڈ کرتا۔ میں نے تم سے بہت سوچ بچار کر کے محبت نہیں کی۔ بس وہ لمحے ہی کچھ ایسے تھے جب تمہارا نام میرے دل کی خالی مسند پر خود بخود سج گیا۔ شاید اسی وقت جب لالہ نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارے پاپا ہمارے گھر آئے ہیں۔ مجھے لگا تھا' اگر ہم نے ان کے شکستہ کندھوں پر کچھ اور بوجھ لاد دیا تو وہ جی نہیں پائیں گے..... شاید ایک باپ کی بے بسی کا جذبہ بھاری تھا یا پھر تمہاری خالص محبت کا۔ بس عبد جرار تو بن دیکھے تمہاری محبت میں گوڈے گوڈے ڈوب گیا۔"

وہ سحر انگیز آواز میں کہہ رہا تھا رمشا کا دل لحہ بھر کے لیے ڈوب کر ابھرا۔

"تم ہمیشہ میری رہو گی نا؟" وہ محبت کی سرزمین پر قدم رکھنے کے بعد پہلا وعدہ لے رہا تھا۔

"ہاں۔" وہ مسکرائی نہیں تھی۔ مگر اس نے مسکرانے کی کوشش ضرور کی تھی' مگر اس کوشش میں وہ بری طرح سے ناکام ہو گئی۔



واجد اکرام ایک معروف بزنس مین تھے۔ دولت ان کے گھر کی باندی تھی۔ تین بیٹوں کے بعد اللہ نے انہیں بیٹی کی نعمت سے نوازا تھا۔ رمشا شروع سے ہی کافی نخریلی اور ضدی بچی تھی۔ کچھ لاڈ پیار نے اسے بلا کا نازک مزاج بنا دیا تھا۔ گھر کے ہر فرد سے لے کر نوکروں تک وہ سب پر حکم چلاتی تھی۔ مجال تھی کسی کی کہ کوئی اس کی مرضی کے خلاف کوئی بھی کام کر دے۔ نوکر چاکر چوبیس گھنٹے ارد گرد پھرتے تھے۔

وہ مغرور اور تنک مزاج ہوتی چلی گئی۔ ایک خرابی اس میں یہ بھی تھی کہ وہ بے حد منتقم مزاج تھی۔ جب تک بدلہ نہ لے لیتی۔ اسے چین نہیں پڑتا تھا۔ اگر کوئی اسے جھڑک دیتا' ڈانٹ دیتا یا پھر دل دکھا دیتا' وہ رمشا ہی کیا جو کسی کو معاف کر دے۔ بدلہ لے کر ہی اس کے سینے میں ٹھنڈک پڑتی تھی۔ اپنی توہین اور بے عزتی تو کسی بھی صورت اسے گوارا نہیں ہوتی تھی۔

اس کی عادتوں کی بدولت ممی کو ہر وقت خدشات لاحق رہتے تھے کہ نجانے اگلے گھر جا کر اس کا کیا بنے گا؟

بیگم واجد بلا کی نرم مزاج خاتون تھیں۔ اسی طرح واجد صاحب بھی بے حد شریف آدمی تھے۔ اپنی سوسائٹی کے لوگوں سے بے حد مختلف..... تینوں بیٹے بھی ذہین اور فرماں بردار تھے۔ البتہ بیٹی کی وجہ سے کئی مرتبہ وہ دل مسوس کر رہ جاتے تھے۔

کافی عرصہ تک تو رمشا شادی کے نام سے ہی بھاگتی رہی تھی۔ پھر اچانک اس نے ایک پی اے ایف کے آفیسر کا نام لیا تھا۔ واجد صاحب جو اس کی شادی کے لیے سخت بے چین تھے' فوراً ہی رضا مند بھی ہو گئے۔

چھان بین سے پتا چلا کہ لڑکا نہ صرف تعلیم یافتہ' مہذب اور خوب صورت ہے بلکہ بہت اچھا شریفانہ پس منظر بھی رکھتا ہے۔ پھر پتا چلا کہ لڑکا رمشا کو پسند نہیں کرتا' مگر رمشا ہر صورت اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ تب بیٹی کی وجہ سے مجبور ہو کر وہ دونوں میاں بیوی عبد کے گھر چلے گئے تھے۔ اب جبکہ بات طے ہو چکی تھی تو لاڈلی بیٹی کو گھر بار والی دیکھنا ان کی اولین خواہش تھی۔

اس دن بھی اسے ناشتے کی میز پر نہ دیکھ کر بیگم واجد اس کے بیڈ روم میں چلی آئی تھیں۔

"رشی! میری جان! اٹھ گئی ہو تو' سب کے ساتھ ناشتہ کر لو۔"

"آپ کو پتا ہے کہ میں تنہا ہی ناشتہ کرتی ہوں۔ پھر بھی مجھے بلانے چلی آتی ہیں۔" وہ لاڈ سے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی۔

"تو کبھی ہمارا ساتھ بھی دے دیا کرو۔ لنچ بھی اپنے روم میں یا کبھی فرینڈز کے ساتھ۔ بریک فاسٹ بھی اکیلے کرنا۔ ڈنر کے وقت بھی مرضی سے ہی ڈائننگ روم میں آتی ہو۔ بیٹا! تمہارے پاپا کی خواہش ہے کہ تم بھی ہمارے ساتھ بیٹھا کرو۔ گپ شپ کیا کرو۔ بھابھیاں ہیں' بھائی ہیں۔ بچے ہیں..... کبھی انہیں بھی

ٹائم دے لیا کرو۔ سب تمہارا پوچھتے ہیں۔" وہ نرمی سے اس کے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہیں۔

"مگر مجھے ان سب کی کمپنی بور کرتی ہے۔" اس نے کافی نخوت سے کہا۔

"تو پھر کس کی کمپنی پسند ہے؟" ان کا لہجہ ہنوز نرم تھا۔

"کسی کی بھی نہیں۔" اس نے برا سا منہ بنایا۔

"عبد کی بھی نہیں؟" وہ اسے چھیڑ رہی تھیں۔

"ہوں۔" رمشا چونکی۔ "عبد کہاں سے بیچ میں آ گیا؟"

"عبد ہی تو بیچ میں ہے۔" انہوں نے نرمی سے اس کی پیشانی کو چوما۔

"وہ تو ہے۔"

"کیا خیال ہے عبد کو لنچ پر بلائیں؟ بہت دن ہو گئے اس نے ادھر کا چکر نہیں لگایا۔" بیگم واجد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"اس کی فلائنگ چل رہی ہے ان دنوں...... لنچ پر تو نہیں آ سکے گا۔" رمشا نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"مشقیں تو سارا سال چلتی ہیں...... اپنے لیے بھی وقت نکالنا چاہیے۔ لنچ نہ سہی ڈنر سہی...... میں خود اسے فون کرتی ہوں۔ پھر منع بھی نہیں کر سکے گا۔" رمشا کے حوالے سے عبد انہیں بے انتہا عزیز ہو گیا تھا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" وہ شانے اچکا کر واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ واپس آئی تو ممی کو ابھی تک وہیں بیٹھا دیکھ کر حیران ہو گئی۔

"عبد سے بات ہو گئی ہے...... رات کو وہ آئے گا۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے بیٹی کو اطلاع دی تھی۔ مگر رمشا کے تاثرات پہلے جیسے تھے۔ بالکل سپاٹ۔ کبھی کبھی تو انہیں بیٹی کے انداز غیر فطری لگتے تھے۔ وہ عام لڑکیوں سے بہت مختلف تھی یا پھر خود کو مختلف ظاہر کرتی تھی۔

"تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟" وہ ہمیشہ بیٹی سے دوستانہ انداز میں بات کرتی تھیں۔

"روز تو ملاقات ہوتی ہے۔" رمشا لاپروائی سے بولی۔

"بیٹا! روز روز ملنا کچھ اچھا نہیں ہوتا۔ شادی کے بعد ساتھ ہی تو رہنا ہوتا ہے تمام عمر...... پوری زندگی ایک دوسرے کو جاننے کے لیے پڑی ہوتی ہے۔" وہ بے ارادہ اسے ٹوک گئی تھیں۔

"مجھے کوئی شوق نہیں روز روز کی ملاقاتوں کا۔ عبد خود اپنے ٹف شیڈول سے ٹائم نکال کر آتا ہے۔ ویسے بھی ان دنوں ہاکی سے دور ہے، سو وہ کبھی کبھی فری ہوتا ہے۔" اس نے ناک چڑھا کر وضاحت کی۔

"تم کبھی اس کی ماما سے بات کر لیا کرو۔ ہمیشہ وہ ہی تمہاری خیریت پوچھنے کے لیے فون کرتی ہیں۔" جاتے جاتے انہیں کچھ یاد آیا تو وہ پلٹ آئیں۔

"جتنی بات کرنا تھی، کر لی ہے۔ مجھ سے نہیں ہوتیں خوشامدیں۔" رمشا نے ٹیپ ریکارڈر آن کر لیا تھا۔

"خوشامد کیوں؟ یہ تمہارا فرض ہے۔" وہ پھر سے سمجھانے لگیں۔

"یہ میرا فرض نہیں۔" اب وہ اپنے لمبے ریشمی بالوں میں برش کر رہی تھی۔ "اور نہ ہی میرے پاس لوگوں سے بات کرنے کے لیے فالتو وقت ہے۔"

"وہ کوئی اور نہیں، عبد کی ماں ہیں...... اس لحاظ سے تمہاری بھی ماں ہوئیں۔" انہوں نے ناراضی سے جتایا۔ "آج تم عدیلہ سے ضرور بات کر لینا۔ عبد بھی خوش ہو گا۔"

"میں نے کسی کو خوش رکھنے کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔" وہ چہرے اور ہاتھوں پر لوشن کا مساج کرنے لگی۔

"رشی......" وہ محض اسے گھور کر رہ گئی تھیں۔

"بیٹا! اپنے مزاج کو بدلو میری جان! ایک نئے گھر اور نئے ماحول میں جانا ہے تمہیں۔" ان کا انداز ناصحانہ تھا۔

"جب جاؤں گی تو دیکھا جائے گا۔" اس کی بے نیازیاں عروج پر تھیں۔

"کہتے ہیں جس سے محبت ہو، اس کی خاطر کو خود کو

بدل لیتے ہیں۔"
"بدل لوں گی۔" انداز سراسر ٹالنے والا تھا۔
وہ گلاس رکھ کر اٹھ گئی تھیں۔
رمشا نے اٹھ کر لباس تبدیل کیا۔ آدھے گھنٹے بعد جب نیچے آئی تو سب مرد حضرات آفس جاچکے تھے۔ اس نے ہلکا پھلکا سا ناشتا کیا۔ پھر پاپا کے آفس چلی آئی۔ وہ میٹنگ میں تھے جبکہ رمشا کو کچھ جلدی تھی۔ بیس منٹ بعد واجد صاحب میٹنگ ہال سے باہر نکلے تھے۔ رمشا جو ان کے انتظار میں بے زار سی بیٹھی تھی' انہیں دیکھ کر ٹھنکی۔
"اتنا ویٹ کرواتے ہیں۔"
"کیسے یاد آئی ہماری۔" وہ کوٹ اتار کر اپنی کرسی پر بیٹھ رہے تھے۔
"پاپا! سویرے سویرے طنز۔" وہ لاڈ سے ان کے کندھے سے آلگی۔
واجد صاحب نے سامنے کھلی فائل کو ایک طرف رکھ کر بیٹی کی طرف پیار سے دیکھا۔
"کچھ پیسے چاہیے تھے۔"
"او۔۔۔ تو اپنے مطلب کے لیے آئی ہو۔" وہ والٹ نکال کر پیسے چیک کرنے لگے۔ "کتنے چاہئیں؟"
"اونلی ففٹی تھاؤزنڈ۔" رمشا بے نیازی سے بولی۔
"یہ اونلی ہیں؟" انہوں نے کچھ نوٹ گن کر اس کی طرف بڑھائے۔
"یہ تھوڑے ہیں پاپا!" رمشا ٹھنکی
"اتنے میں گزارا کرو' عبد کی سیلری اتنی بھی نہیں' تھوڑے میں گزارا کرنے کی عادت ڈالو۔" ان کا انداز ناصحانہ تھا۔
"تو عبد بھی بزنس کرلے گا۔ ویسے بھی مجھے اس کی جاب اتنی اٹریکٹو نہیں لگتی۔" اس نے نخوت سے کہا۔ "جتنے روپے وہ مہینے میں کماتا ہے' اتنے میں ایک دن میں خرچ کردیتی ہوں۔"
"معبد تمہاری اپنی چوائس ہے' وہ جو ہے' جیسا ہے' تمہیں اسی حالت میں اسے قبول کرنا ہے۔ وہ تمہاری خاطر خود کو نہیں بدلے گا' بلکہ تمہیں اپنی سوچ' خیالات اور رہن سہن بدلنا ہوگا۔ خود میں تبدیلی لاؤ بیٹا۔"
"پاپا! ہر جگہ مجھے نصیحت کرنے بیٹھ جاتے ہیں' تنگ آگئی ہوں میں' ان تقریروں سے۔" وہ بے زاری سے بولی۔
"بیٹا! یہ تمہارے فائدے کی باتیں ہیں۔ اسے جسٹ ایڈوائس مت لیا کرو' جو اس گھر کا ماحول ہے' وہ اس گھر کا نہیں ہوگا۔ بعد میں تمہارے لیے ہی مسائل کھڑے ہوں گے۔ بہتر ہے ابھی سے اپنی شخصیت کی کمی بیشی کو دور کرلو۔ اگرچہ عبد بہت سمجھ دار اور تعاون کرنے والا لڑکا ہے' مگر مجھے تمہاری نادانیوں سے بہت خوف آتا ہے۔"
"آپ پیسے نہیں دینا چاہتے' نہ دیں۔"
وہ پیسے غصے میں وہیں چھوڑ کر دھپ دھپ کرتی چلی گئی تھی۔ اور واجد اکرام اسے پکارتے رہ گئے۔



اس کا مزاج ہی ایسا تھا۔ پل میں تولہ' پل میں ماشہ' کبھی دھوپ بن جاتی' کبھی چھاؤں' کبھی بادل کی طرح گرجنے لگتی اور کبھی بارش بن کر برسنے لگتی۔
مزاج کی اسی گرمی کی وجہ سے عبد سے بھی دو' تین مرتبہ معمولی جھڑپ کرچکی تھی۔ چونکہ بات معمولی نوعیت کی ہوتی تھی۔ اسی لیے عبد اسے منا بھی لیتا تھا' سو مزید بات بڑھتے بڑھتے رہ جاتی تھی۔ مگر اس دن ان کا سنجیدہ نوعیت کا جھگڑا ہوگیا۔ اس نے بات ہی کچھ ایسی کی تھی کہ عبد کو غصہ آگیا۔
اس دن عبد اس کے فون کرنے پر آیا تھا۔ اگرچہ وہ کافی مصروف تھا' مگر رمشا کی ضد کے سامنے اکثر ہتھیار پھینک دیتا تھا۔ سو جب وہ "نہ" کرنے کے باوجود بھی آگیا تو رمشا گویا فتح کے احساس سے سرشار ہوگئی۔
"مجھے یقین تھا' تم ضرور آؤ گے۔" وہ ہلکا سا مسکرائی تھی۔ عجیب سا مغرورانہ انداز تھا۔ گویا وہ جانتی تھی کہ عبد کبھی انکار کر ہی نہیں پائے گا۔
"آنا تو مجھے تھا ہی۔۔۔ آپ کے حسن میں کشش ہی

بہت ہے۔" وہ سادگی سے بولا۔
"ایک بات تو بتاؤ۔" ملازمہ جوس لے کر آئی تو اسے لنچ کی ہدایات دینے کے بعد رمشا نے سوچتے ہوئے کہا۔
"پوچھو۔"
"مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟" وہ اس سوال پر کچھ چونکا۔
"جتنی تم مجھ سے کرتی ہو' شاید اس سے بھی کچھ زیادہ۔۔۔ میں خود اپنے جذبات کو سمجھ نہیں پایا ہوں۔ تمہاری محبت میرے دل پر بہت اچانک یا بہت آہستہ آہستہ اتری تھی۔ تاہم میں خود کو بے بس پانے لگا تھا۔" عبد نے اپنی دلی کیفیت کا بے جھجکے اقرار کیا۔
رمشا سر سے پیر تک مسرور ہوگئی۔
"تم میری خاطر کوئی ایسا کام کرسکتے ہو جو تم نہیں کرنا چاہتے' مگر میری محبت تمہیں مجبور کردے؟" اس کا انداز بہت عجیب سا تھا اور لہجہ اور تاثرات عجیب تر۔
"کیا مطلب؟" وہ الجھ گیا۔
"اگر میں کہوں' تم جاب چھوڑ کر بزنس کرلو تو؟" رمشا گویا تول تول کر بول رہی تھی۔ عبد کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی۔
"میں اپنے کیریر کی شروعات میں جاب چھوڑ دوں؟ مگر کیوں؟ جبکہ میں اپنی جاب سے مطمئن ہوں۔"
"مگر میں تمہاری اس جاب سے مطمئن نہیں ہوں۔ کیا تم میری ضروریات پوری کرسکو گے؟" رمشا کا انداز چبھتا ہوا تھا۔
"جو کچھ میرے بس میں ہوا' ضرور کروں گا۔ تاہم اگر تم اپنے باپ کی دولت کے ساتھ میرا موازنہ کروگی تو پھر معذرت ہے۔ میں جو کچھ ہوں' تمہارے سامنے ہوں اور تم اچھی طرح سے جانتی ہو کہ میں ایک معمولی سا سپاہی ہوں۔ کسی لینڈ لارڈ کا بیٹا نہیں ہوں۔ مجھے اپنی جاب پر اور اپنے نسب پر فخر ہے۔" عبد نے دوٹوک لہجے میں گویا اپنی بات واضح کردی۔
"اگر تمہیں ایک چانس دیا جائے پھر بھی نہیں؟" وہ لائم جوس کو گھونٹ گھونٹ حلق میں اتار رہی تھی۔
"تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آرہی' آخر تم چاہتی کیا ہو؟"
"میں صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں' اگر تمہیں پارٹنر شپ کی آفر ہو تو؟" وہ ایک اور گلاس جوس سے لبالب بھر رہی تھی۔
"اس کے لیے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے' جو کہ میرے پاس نہیں ہے۔" عبد نے جوس کا گلاس میز پر رکھ دیا۔
"تمہارے لالہ نے اتنا بڑا بے حد اسٹائلش سا کلینک سیٹ کیا ہے۔ ان کے پاس اتنا سرمایہ کہاں سے آیا؟"
"تمہاری کچھ آبائی زمینیں تھیں' جو ماما نے بیچ دیں' کچھ پیسوں سے گھر بنا لیا تھا اور کچھ بینک میں محفوظ تھے جو کام آگئے۔" عبد نے تحمل سے بتایا۔ رمشا جانتی تھی کہ عبد کو اس کی باتیں ناگوار گزر رہی ہیں۔ مگر وہ پھر بھی باز نہیں آرہی تھی۔
"اگر پاپا تمہیں اپنے بزنس میں شمولیت کی آفر کریں؟"
"دیکھو رمشا! میرا مائنڈ کبھی بھی بزنس کی طرف نہیں رہا۔ میں اپنی جاب میں ریلیکس فیل کرتا ہوں۔ اگر مجھے بزنس کی فیلڈ میں جانا ہوتا تو میرے لیے یہ ناممکن نہیں تھا۔" عبد نے ابھی تک ضبط کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔
"پھر بتاؤ میری محبت میں تم کیا چھوڑ سکتے ہو؟ جاب نہیں' ہاکی نہیں؟ گھر والے بھی نہیں؟ تو پھر مجھے بتاؤ کہ تم میری محبت میں اپنی کس عزیز چیز کو چھوڑ سکتے ہو؟" اس کے لہجے میں بچوں جیسی ضد تھی۔
"تمہاری محبت میں اس دنیا کو چھوڑ سکتا ہوں۔" عبد مسکرایا۔
"میں کیسے یقین کروں؟" وہ بے یقین تھی۔
"اور میں کیسے یقین دلاؤں؟" عبد اس کی خواب ناک آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔
"پہلے تم میرے فون سے بہت چڑتے تھے۔ پھر اتنی جلدی یہ بدلاؤ کیسا؟"

"مجھے لگتا ہے تم شبہات اور ابہام کا شکار ہو۔ پاگل! محبت سوچ سمجھ کر یا باقاعدہ پلاننگ سے نہیں کی جاتی۔ میں تو خود حیران ہوں۔ بن دیکھے، بن پرکھے اور بن جانے، میں صرف تمہاری محبت سے متاثر ہو کر تمہیں دل میں بسا چکا تھا۔"

اس کے لہجے کی سچائیوں نے رمشا کے تمام تر خدشے جھاگ کی طرح بیٹھا دیے تھے۔ اسے خود پر ناز سا ہوا۔

رمشا اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتی رہی۔ ایسی نظر سے جو عبد کے دل کو شکنجے میں جکڑ کر گویا عمر بھر کے لیے قید کر لیتی۔ وہ اسے اپنی محبت میں انتہا تک لے جانا چاہتی تھی۔ یوں کہ کبھی عبد واپس مڑنے کی یا پلٹ جانے کی کوشش بھی کرتا تو واپسی کے راستے اس کے لیے کھوٹے ہو جاتے۔ وہ اسے اپنے وجود کا عادی کر لینا چاہتی تھی۔ وہ اس کی ہر سوچ، ہر خیال اور ہر خواب پر قابض ہو جانا چاہتی تھی۔

رمشا اکرام بھلا چاہتی کیا تھی؟

اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا تھی؟

عبد جرار کے دل کی ہر دھڑکن کو اپنے اختیار میں کر لینا یا اس کے سچے موتی جیسے دل پر کوئی بھاری ضرب لگانا؟ یہ تو وقت بتا سکتا تھا۔ خاصی حد تک وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو بھی چکی تھی۔

عبد جرار اس کی محبت میں بہت آگے تک نکل آیا تھا۔

وہ جانتی تھی عبد رشتہ اور تعلق نبھانے والوں میں سے ہے۔ پھر کچھ ماہ بعد عبد کی طرف سے نکاح پر بے حد اصرار کیا گیا۔ یہاں پر رمشا کی ایک نہیں چلی تھی۔ اس کے بھائیوں اور پاپا نے عبد کی بات پر سوچ بچار کے لیے بھی وقت نہیں لیا تھا۔

یوں ایک بہت بڑی تقریب کا اہتمام کیا گیا اور بہت دھوم دھام کے ساتھ ان کے نکاح کا مبارک فرض ادا کیا گیا۔

رمشا آج کے دن کی مناسبت سے بہت سجی سنوری تھی۔ عروسی لباس، زیورات اور میک اپ نے اس کے حسن کو دو آتشہ کر دیا تھا۔ عبد کی ماما اور خالہ کے علاوہ عباس لالہ اور حوریہ بھابھی بھی بے انتہا خوش تھیں۔ خود اس کا دل بھی اس وقت خوشی اور مسرت کی آخری انتہا تک پہنچا ہوا تھا۔

نکاح کے بعد رمشا میں بہت سی تبدیلیاں نظر آنے لگی تھی۔ حتی کہ عبد کے گھر والے بھی نوٹ کرنے لگے تھے کہ رمشا کی فون کرنے کی رفتار میں تین گنا اضافہ ہوا تھا۔ تقریباً" ہر دو گھنٹے بعد اس کا فون آجاتا تھا اور عبد اٹھ کر الگ کمرے میں چلا جاتا۔

وہ ہفتہ واری تعطیل پر بھی اسے گھر نہیں جانے دیتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ گھر والوں کے درمیان عبد اسے بالکل فراموش کر دیتا ہے۔ وہ تقریباً" ہر روز ملتے تھے۔ اگر کبھی عبد مصروفیت کی بنا پر جا نہیں پاتا تو وہ خود آجاتی تھی۔

اکثر لوگ اس کی قسمت پر رشک کرتے تھے۔ ان رشک کرنے والوں میں سر فہرست جازم، ثوب اور علی بھی شامل تھے۔ جازم کی علی کے ساتھ خاصی دوستی تھی، بلکہ جازم کی رمشا کے ساتھ بھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ نظر آتی تھی۔ کیونکہ جازم اور رمشا آپس میں کزن بھی تھے۔

جب وہ اکرام ہاؤس جاتا تو اکثر جازم سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ اب وہ روایتی حریفوں کی طرح اس سے نہیں ملتا تھا، بلکہ کافی دوستانہ انداز میں بات چیت ہوتی تھی۔

عبد کی ماما کا خیال تھا کہ عید کے فوراً" بعد رمشا کو گھر لے آئیں گے۔ مگر رمشا نہ جانے کیوں ٹال مٹول کر رہی تھی۔ اس دن بھی اسی بات پر دونوں کے درمیان تکرار ہو گئی تھی۔

"تم اپنی ماما کو ابھی ڈیٹ فکس کرنے کے لیے مت بھیجنا۔" اس دن وہ لانگ ڈرائیو کے لیے شہر کی سڑکیں روند رہے تھے۔

"کیوں؟" عبد نے حیرت سے پوچھا۔

"بس، ابھی میرا موڈ نہیں۔" لہجے میں بلا کی بے نیازی تھی۔

"واہ، کیا کہنے محترمہ کے موڈ اور مزاج کے۔" عبد طنزیہ انداز میں گویا ہوا۔

"اچھا، طنز کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں جو کہہ رہی ہوں وہ ہی ہوگا۔" وہ حکمیہ انداز میں انگلی اٹھا کر بولی۔

"تم جو کہہ رہی ہو وہ نہیں ہوگا۔ اب جو میں چاہوں گا وہ ہی ہوگا۔" عبد بھی اسی کے انداز میں بولا۔

"تم زبردستی کرو گے؟"

"کر بھی سکتا ہوں۔ آفٹر آل تم میری منکوحہ ہو۔" وہ اسے چھیڑتے ہوئے بولا۔

"میں اسی لیے نکاح نہیں کروانا چاہتی تھی، کیونکہ تمہارے جیسے پینڈو فوراً" حق جتانے لگتے ہیں۔" اس نے نخوت سے ناک چڑھائی۔

"یہ پینڈو آپ کی چوائس ہے۔" عبد نے گویا اسے چڑایا تھا اور وہ چڑ بھی گئی۔

"اب ساری زندگی اسی بات کے طعنے دینا۔"

"یہ کوئی غلط بات بھی نہیں، میں نے ٹھیک ہی تو کہا ہے۔" عبد نے کمال اطمینان سے کہا۔

"تم بھلا غلط کہہ سکتے ہو، بہرحال مجھے ابھی دو، تین سال تک رخصتی نہیں کرانا۔" اس نے حتمی انداز میں کہا۔

"کیوں پی ایچ ڈی کا ارادہ ہے؟"

"ہونہہ! مجھے پڑھائی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ جب میں ڈاکٹر نہیں بن سکی تو پھر کچھ اور کیوں بنتی؟ یہ تو پاپا کی ضد تھی جو میں نے بمشکل گریجویشن کر لیا۔" اس کا انداز عجیب سی تپش لیے ہوئے تھا۔

"تو کیا ڈاکٹر بننے کا شوق تھا؟"

"پلیز! میرے اس شوق کا ذکر مت کرو۔ جب میں کسی ڈاکٹر کو دیکھتی ہوں یا کسی ڈاکٹر کی تعریف ہوتی سنتی ہوں تو مجھے آگ لگ جاتی ہے۔" وہ ایک دم چلا اٹھی تھی۔ اس کا انداز عبد کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ پریشان ہو گیا۔

"اگر تم کوشش کرتیں تو ڈاکٹر بن سکتی تھیں۔"

"پلیز عبد! کچھ اور بات کرو۔" وہ ناگواری سے بولی۔

"شادی کی بات بھی پسند نہیں، اسٹڈیز کی بات بھی پسند نہیں، تو پھر کون سی بات کی جائے؟" وہ بے بسی سے بولا۔

"کوئی بہت اچھی بات، جو میرا دل خوش کر دے، جو میری انا اور سلگتے دل پر پھوار بن کر برسے، جو میرے غصے کو ٹھنڈا کر دے یا میرے دل میں ہمہ وقت بھڑکنے والی انتقام کی آگ کو بجھا دے۔" وہ عجیب سے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں بڑبڑاتی چلی گئی تھی۔

"یہ جو تم نے فلسفہ بگھارا ہے، میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"یہ فلسفہ تمہاری سمجھ میں آ بھی نہیں سکتا۔" وہ تلخ ہوئی۔

"میں تمہیں ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔" عبد نے کچھ سوچ کر گاڑی کی رفتار آہستہ کر دی۔

"بتاؤ!" وہ متوجہ ہوئی۔

"تم بہت عجیب لڑکی ہو رمشی!"

"وہ تو میں ہوں۔" اس نے اعتراف کر لیا۔

"کچھ سرپھری بھی ہو۔"

"تم نے سچ کہا۔" وہ ٹھنڈے پانی کی طرح سرد ہو گئی۔

"کچھ خبطی بھی ہو۔"

"بالکل..."

"دیوانی... دیوانی بھی لگتی ہو۔"

"پہلے نہیں تھی، جب سے تمہیں دیکھا ہے بس دیوانی ہو گئی ہوں۔ کچھ اور سوچ کے تمہاری طرف آئی تھی۔ مجھے تو پتا بھی نہیں تھا کہ تم اتنا پیارا دل رکھتے ہو۔" وہ آہستگی سے بولی تھی۔

"کچھ پراسرار بھی لگتی ہو، اک پہیلی ہو۔"

"ہاں واقعی۔" اس نے تسلیم کر لیا۔

"کچھ انوکھی بھی ہو۔"

"مانتی ہوں۔"

"عجیب نہیں، عجیب تر ہو۔" وہ گویا گردان کیے

جارہا تھا اور رمشا "ہاں' ہاں" کی مہر لگا رہی تھی۔

✲ ✲ ✲

عبد اور رمشا کے درمیان جھڑپ ہوئی تھی۔ ایک معمولی سی بات پر ہونے والی یہ لڑائی سنجیدگی اختیار کیے جارہی تھی۔ عبد کے تو گمان میں بھی نہیں تھا کہ رمشا اتنی معمولی سی بات پر جھگڑا کرنے کے بعد قطع تعلق بھی کرلے گی۔

وہ نہ تو اس کا فون سن رہی تھی اور نہ ہی ملنے پر رضامند ہو رہی تھی۔ وہ فون کر کر کے تقریباً" تھک چکا تھا اور اکرام ہاؤس کے چکر لگا لگا کر عاجز آگیا تھا۔ مگر وہ تھی کہ کچھ سننے پر تیار ہی نہیں تھی۔ اس کی ناراضی نے عبد کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ پورے چار دن ہوگئے تھے رمشا کا اس کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں تھا۔ عبد کو لگتا تھا گویا اس کی زندگی کا مقصد ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ عجیب سی بے قراری نے اس کے دل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور اسی وجہ سے اس کی آفیشل کارکردگی بھی متاثر ہو رہی تھی۔

وہ پورا پورا دن دیوانوں کی طرح اسے فون کرتا رہتا تھا' مگر رمشا نے کبھی فون سننے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ کبھی کبھی تو عبد کو لگتا تھا کہ اسے مضطرب کر کے وہ جان بوجھ کر کال اٹینڈ نہیں کرتی۔ محض عبد سے بدلہ لینے کے لیے' کیونکہ وہ بھی تو اس کی بے چینیوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ مگر اس وقت بات بھی تو کچھ اور تھی۔

ان دنوں عبد کو یوں لگتا تھا کہ گویا رمشا کو منانے کے علاوہ دنیا میں کوئی اور مقصد اس کے لیے نہیں بچا۔
اس نے ہر طرح کی کوشش کر کے دیکھ لی وہ جانتا تھا کہ اس کا محبوب بلا کا انا پرست ہے۔ رمشا کی انا کو توڑنے کے بجائے وہ خود کو اور بھی اس کے لیے نرم کر چکا تھا اور یہ رمشا کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔
وہ گویا ان دنوں ہواؤں میں اڑتی پھر رہی تھی۔ وہ عبد کو آزمانا اور پرکھنا چاہتی تھی اور اس نے عبد کو جیسا سمجھا تھا' بالکل ویسا ہی پایا۔ وہ جانتی تو تھی کہ عبد اس کی محبت میں بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ مگر اس کی رت جگوں کی سرخیوں سے مزین آنکھیں دیکھ کر رمشا کو خود پر ناز ہونے لگا تھا اور جب رمشا کو یقین ہو گیا کہ عبد جرار کبھی واپس پلٹ نہیں سکتا تب اس نے بڑے ہی اطمینان کے ساتھ اپنے ہاتھ سے انگوٹھی اتار کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

"یہ کیا ہے؟" وہ چونک گیا تھا۔ وہ اسے چونکاتی ہی تو رہتی تھی۔

"تمہاری ماما کی پہنائی گئی انگوٹھی۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

"مگر مجھے واپس کیوں کر رہی ہو؟" وہ الجھن آمیز نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"ظاہر ہے' جس کی چیز ہوگی اسی کو لوٹائی بھی جائے گی۔"

"جسے چیز دے دی جائے' ہم اس سے واپس نہیں لیتے۔" عبد نے ناگواری دبا کر کہا۔

"میں یہ تعلق ختم کرنا چاہتی ہوں۔" اس کی بے نیازیاں عروج پر تھیں۔ عبد کچھ دیر اس کی طرف سنجیدگی سے دیکھتا رہا۔

"یہ تعلق تمہاری خواہش پر جوڑا گیا تھا' مگر تمہاری مرضی پر ختم نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ میں یہ رشتہ کبھی ختم نہیں کروں گا —— جو رشتہ ہمارے بزرگوں نے باہمی رضامندی سے جوڑا ہے اسے میں تمہاری نادانی کی وجہ سے ختم نہیں کر سکتا۔"

"یہ نکاح میری ضد کی وجہ سے ہوا تھا اور میری خواہش پر ہی ختم ہوگا۔ انڈر اسٹینڈ!" وہ ایک دم بھڑک اٹھی۔

"خوش فہمی ہے تمہاری۔" اس نے سر جھٹکا۔

"مجھے غصہ مت دلاؤ۔" وہ تنک اٹھی۔ "یہ نہ ہو کہ میں اپنے باپ کو نکاح ختم کرنے پر مجبور کر دوں۔" اس کا انداز دھمکانے والا تھا۔

"تم کچھ بھی کر کے دیکھ لو' میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔ یہ کوئی کھیل یا تماشا نہیں محبت کی' نکاح کیا اور پھر ختم کر دیا۔"

"اور تم کیا کرو گے؟"

"وہ' ہی جو تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ تمہاری سوچ وہاں تک جا بھی نہیں سکتی۔" وہ اسٹیئرنگ وہیل کو انگلیوں سے بجا رہا تھا۔

"کیا کرلو گے تم؟"

"رمشا عبد جرار کو اغوا۔" وہ اس کی غضب ناک ہوتی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

"کیا مطلب؟" وہ چیخی۔ "تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"میں ایسا ضرور کروں گا۔"

"میں ابھی پاپا کو کال کرتی ہوں۔" وہ غصے کے عالم میں ڈیش بورڈ سے اپنا سیل اٹھانے لگی۔

"آپ کے موبائل میں کریڈٹ نہیں ہے میری جان! یہ میرا سیل لے لو۔" اس نے جان بوجھ کر اسے چڑایا۔

"مجھے گھر چھوڑ دو۔"

"ہرگز نہیں۔" اس نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی تھی۔

"عبد! میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" وہ چلائی۔

"تو مار دو نا۔" وہ شوخ ہو رہا تھا جبکہ اس کا پارہ چڑھتا جارہا تھا۔ مٹھیاں بھینچے وہ عبد کو گھور رہی تھی۔

"گاڑی روکو۔"

"یہ چلتی گاڑی ہے' رک نہیں سکتی۔" وہ انجان راستوں کی طرف گاڑی دوڑائے لے جارہا تھا۔ رمشا بازی الٹتی دیکھ کر سخت متوحش ہو رہی تھی۔

"عبد! تم میرے ہاتھوں ضائع ہو جاؤ گے۔"

"میں تمہارے ہاتھوں ضائع ہونے کا دل سے خواہش مند ہوں۔ رشتہ توڑ کر بھی تو مارنا چاہتی ہو' سو ایسے ہی مار دو۔" عبد کی مخمور سی آواز نے یک دم رمشا کے اندر خاموشیاں اتار دیں۔ وہ کچھ پل کے لیے بالکل چپ ہو کر رہ گئی تھی اور پھر جب بولی تو لہجہ ٹوٹا پھوٹا سا تھا۔

"اتنی محبت کرتے ہو مجھ سے؟" وہ گویا خواب کی کیفیت میں تھی۔

"اتنی سے کہیں زیادہ' جہاں تمہاری سوچ کی انتہا ہو جاتی ہے' وہیں سے میری محبت کی شروعات ہوتی ہے ..... کیوں ستاتی ہو رمشا! دل کو اتنا آزمائش میں مت ڈالا کرو۔"

"مجھے گھر چھوڑ دو۔" رمشا ایک دم پوری جان سے کانپ گئی تھی۔

"اپنے گھر لے چلوں؟" وہ شوخی سے بولا۔

"نہیں' میرے گھر۔"

"تمہارا گھر تو وہ ہے' جو میرا ہے۔" اس نے جتایا۔

"فی الحال تو یہ ہی میرا گھر ہے اور شاید ہمیشہ کے لیے۔" رمشا کا دل یک دم پوری دنیا سے اچاٹ ہو گیا تھا۔

"ہمیشہ کے لیے نہیں' صرف چند دنوں کے لیے۔" عبد نے ایک مرتبہ پھر جتایا۔

"مجھے ابھی شادی نہیں کرنا۔" وہ متوحش سی بولتی رہی۔ "ابھی میں ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں۔"

"تو اپنا مائنڈ میک اپ کرلو نا' رمضان کے بعد تمہیں لینے کے لیے آجاؤں گا۔"

"ابھی نہیں۔ مجھے کچھ اور وقت چاہیے۔"

"سوری جان! یہ وقت آپ کے ہاتھ سے اب نکل چکا ہے۔" عبد نے گویا ہاتھ جھاڑ کر کہا۔ "پہلے سوچا تھا کہ رمضان کے بعد تمہیں لینے کے لیے آئیں گے' مگر اب تمہارے اتھرے پن کی وجہ سے فوری فیصلہ کرنا پڑے گا۔"

"ہرگز نہیں..... تم ایسا کچھ بھی نہیں کرو گے۔"

"مجھے تمہارے اس انکار کی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی۔" اب کے عبد کافی ناگواری سے بولا تھا۔

"میں کب انکار کر رہی ہوں' میں تو بس....." وہ ایک دم گھبرا گئی تھی۔

"تو پھر تیار رہنا مائی ڈیر وائف' میں جلد تمہیں لینے کے لیے آؤں گا' کیونکہ اس رانگ کالر کے رنگ بدلنے کا بالکل پتا نہیں چلتا' نہ جانے کس جگہ' کس موڑ پر ڈاج دے دے۔" وہ شرارتی انداز میں کہتا چلا گیا تھا۔

گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ اکرام ہاؤس کے گیٹ کے سامنے رک گئی تھی۔ رمشا بہت بوجھل قدموں سے باہر نکلی۔ ڈرائیو وے پر چلتے ہوئے اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ اس کے قدم بہت شکستہ تھے' حالانکہ وہ جو چاہتی تھی' ویسا ہی تو ہوا تھا۔ وہ عبد جرار کو اپنے پیار میں دیوانہ بنانا چاہتی تھی اور وہ دیوانہ بن گیا۔ پھر رمشا اکرام کے دل میں اتنے سناٹے کیوں اتر آئے تھے... شاید ضمیر کی چبھن کی بدولت۔

☼ ☼ ☼

عید کے فوراً" بعد اس کی شادی کی تیاریاں ہونے لگی تھیں۔ اس کا تمام غصہ' ضد' اکڑ اور رونا دھونا ناکام ثابت ہوا تھا۔ ممی اور پاپا کچھ سننے کو تیار نہیں تھے۔ اس کے بار بار کے انکار نے ممی جیسی نرم مزاج کو بھی خاصا مشتعل کر دیا تھا۔

"تم سائیکو کیس ہوتی جا رہی ہو رشی! بہت دفعہ تمہارے پاپا کو کہا تھا کہ تمہیں کسی ماہر نفسیات کو دکھائیں۔ عجیب پاگل پن ہے یہ... پہلے عبد کے لیے مر رہی تھیں' ہم عزت ہاتھوں میں لیے اس کے گھر چلے گئے کہ لاڈلی بیٹی کی آنکھ کے آنسو برداشت نہیں ہوتے تھے اور اب بلاوجہ کا انکار... یہ نکاح ہے' کوئی کھیل نہیں' جو ایک گھنٹے کے ڈرامے کے بعد ختم ہو جائے۔"

"ممی! پلیز' میں ابھی ذہنی طور پر تیار نہیں۔" اس سے بات بھی تو بن نہیں پائی تھی۔

"یہ ہمارا درد سر نہیں۔ ڈیٹ فکس ہو چکی ہے۔ کارڈز بٹ گئے ہیں۔ سوسائٹی میں ہمیں اور ان شریف لوگوں کو — کیوں ذلیل کرنا چاہتی ہو۔" ممی تھک کر بولیں۔ آزمائش چاہے بیٹے کی صورت میں ہو یا بیٹی کی شکل میں' ماں' باپ کو بالکل ڈھا کر رکھ دیتی ہے۔

"بھرا پرا خاندان ہے ہمارا... تمہاری بھابھیاں' ان کے میکے والے... ہم کس کس کو جواب دیتے پھریں گے۔ جبکہ عبد کے لیے تمہاری پسندیدگی کسی سے ڈھکی چھپی بھی نہیں۔ حالانکہ جازم کے لیے اپنے دہلیز پکڑ رکھی تھی' مگر میں نے اور تمہارے پاپا نے صرف اور صرف تمہاری خوشی کا خیال رکھا۔ ہم نے رشتے داری میں تمہارے دل کو قربان نہیں کیا۔ کیوں اتنا ستاتی ہو رشی!" وہ گویا بالکل ڈھے گئیں تھیں۔

"سوری ممی! میں ایسا چاہتی تو نہیں' پھر بھی نہ جانے کیوں مجھ سے ایسا ویسا ہو جاتا ہے' غیر ارادی طور پر... میری شخصیت میں یہ کمی کیوں ہے؟ میں عام نارمل لوگوں جیسی کیوں نہیں؟"

رمشا سسکنے لگی۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ اس شادی کے لیے رضامند تھی ہی نہیں۔ کھیل کھیل میں وہ آگ کے بھانبھڑ جلا بیٹھی تھی۔ اس آگ کی لپیٹ میں خود اس کا اپنا دل جل جائے گا' یہ تو رمشا اکرام نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اگرچہ ہار تو وہ چکی ہی تھی' مگر اس کی انا اسے ہار ماننے نہیں دیتی تھی۔

وہ عبد کو دیکھ لینے کے بعد اس کی محبت میں مبتلا ضرور ہو گئی تھی۔ یہ سب سے بڑا سچ تھا' مگر وہ اس کے گھر والوں کے خلاف دل میں کینہ رکھتی تھی اور یہ اس سے بھی بڑا تلخ ترین سچ تھا۔

عبد کی مختصر فیملی کے افراد اول روز سے ہی رمشا کی نظر میں کھٹکتے تھے۔ وہ ان کے خلاف دل میں نفرت اور بغض رکھتی تھی اور یہ نفرت اس وقت مزید بڑھ گئی تھی جب اسے مستقل طور پر اس گھر میں آ کر رہنا پڑا۔

☼ ☼ ☼

پہلے روز ہی سے اس نے ان سب سے کافی سرد رویہ رکھا تھا۔ وہ لوگ اس کی خاموشی اور سرد انداز کو شرم یا جھجک پر محمول کر رہے تھے۔ سو مطمئن بھی تھے' مگر شادی کے دوسرے روز ہی ان کا اطمینان جاتا رہا تھا۔

"دلہن! ناشتا کرنے کے لیے نیچے نہیں آ رہی۔" کسی خاتون نے اطلاع پہنچائی تھی۔

"کیوں؟ کیا ابھی تک تیار نہیں ہوئی؟" حوریہ ناشتے کے لوازمات میز پر سجا رہی تھی۔ آج نئی دلہن کے لیے خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ یہ اس گھرانے کی

روایت تھی کہ گھر کے افراد ہمیشہ ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ نئے آنے والے ہر فرد کو بھی اول روز سے باور کروادیا جاتا تھا' تاکہ وہ بھی بغیر جھجکے گھر والوں سے گھل مل سکے۔

آج بیگم عدیلہ جرار بھی کافی پرجوش تھیں اور بہو کے ساتھ کچن میں برابر کام کروا رہی تھیں۔

"حوریہ بیٹا! تم ایک دفعہ رمشا سے پوچھ لیتیں کہ ناشتے میں وہ کیا لینا پسند کرے گی۔" وہ اتنے اہتمام کے باوجود بھی مطمئن نہیں تھیں۔

"میں ابھی پوچھ کے آتی ہوں۔" حوریہ نے فرماں برداری سے سرہلا کر کہا اور پھر اوپر آگئی۔ رمشا اٹھ چکی تھی' نہانے کے بعد ہلکے پھلکے لباس میں بہت شگفتہ اور تروتازہ لگ رہی تھی۔

"لگتا ہے عبی پوری رات چاند تاروں اور گلابوں کی باتیں ہی کرتا رہا ہے۔ ماشاء اللہ سے سراپا گلاب ہی بنی ہوئی ہو۔" حوریہ نے شرارتی انداز میں اسے چھیڑا۔

"آپ نے ٹھیک کہا۔ مجھے عبی کی محبت پر فخر ہے۔" وہ کافی مغرورانہ انداز میں چہکی۔

"ماشاء اللہ' اللہ نظر بد سے بچائے۔ اور ہمیشہ تمہاری خوشیوں کو سلامت رکھے۔" حوریہ نے صدق دل سے کہا۔ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر اپنے سلکی بالوں میں بڑے اسٹائل کے ساتھ برش پھیرتی رہی تھی۔

"ناشتے میں کیا لوگی؟" حوریہ جس مقصد کے لیے کمرے میں آئی تھی' اسی کے متعلق پوچھنے لگی۔

"صرف جوس۔"

"سیب اور انار موجود ہیں' کون سا جوس بناؤں؟"

"ایپل جوس۔" وہ بے نیازی سے بولی۔

"او کے! پھر تم تھوڑی دیر تک نیچے آجانا۔ عناس اور عبد بھی جاگنگ سے واپس آجائیں گے۔ ناشتا سب اکٹھے کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے نا۔" حوریہ نے اس کے گلابی چمکیلے گالوں کو چھو کر پیار سے کہا اور باہر کی طرف جانے لگی تھی' جب رمشا کی آواز سن کر رک گئی۔

"یہ ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟" حوریہ قطعاً" سمجھ نہیں پائی۔

"مطلب تو بہت واضح ہے۔ میں ناشتے میں صرف جوس لیتی ہوں' سو اوپر بھجوا دیجیے گا۔ مجھے سب کے ساتھ ناشتا نہیں کرنا۔" اس نے برش ہوا میں اچھالا تھا جو صوفے پر سیدھا جاگرا۔

حوریہ ابھی تک الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ گویا وہ اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"مگر رشی۔۔۔! ماما چاہتی ہیں کہ تم بھی ناشتے میں ہمارا ساتھ دو۔ اس طرح تمہاری عادت بھی پختہ ہوگی اور آپس کی محبت بھی بڑھے گی۔" حوریہ نے نرمی سے وضاحت کرنا چاہی تھی' مگر رمشا نے کافی بدتمیزی سے اسے ہاتھ اٹھا کر ٹوک دیا۔

"مجھے آپس کی محبت بڑھانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔"

"رشی! کچھ مسئلہ ہے' کیا عبی نے کچھ کہا ہے؟" حوریہ بری سے گھبرا گئی تھی۔ ظاہر ہے اپنی کوئی غلطی تو اس کی نظر میں تھی نہیں' سو اس کا دھیان فوری طور پر عبی کی طرف گیا تھا۔

"عبی بھلا کیا کہے گا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے اور مجھے اس کی محبت پر فخر بھی ہے۔" اس کا انداز بلا کا شاہانہ تھا۔ حوریہ کو اس کا انداز ذرا بھی نہیں بھایا۔ مگر وہ پھر بھی تحمل کا مظاہرہ کرتی رہی۔

"پھر آخر مسئلہ کیا ہے؟ مجھے بھی نہیں بتاؤ گی؟" وہ مان بھرے لہجے میں بولی تھی مگر رمشا کو مان رکھنا بھلا کہاں آتا تھا۔

"اگر کوئی مسئلہ ہوا بھی تو آپ لوگوں سے ہرگز شیئر نہیں کروں گی۔ اس خوش فہمی میں مت رہیے گا۔" اس نے نخوت سے کہا۔

"ابھی تمہارا موڈ ٹھیک نہیں لگتا' پھر بات کریں گے۔ میں ابھی فریش جوس بھجواتی ہوں۔" حوریہ نے بلا کے ضبط کا مظاہرہ کیا تھا اور پھر الجھی الجھی سی نیچے

چلی آئی۔ مسز عدیلہ نے بغیر مڑے حوریہ کی موجودگی محسوس کر کے پوچھا۔

"رشی نہیں آئی؟"

"ماما! وہ ابھی تیار ہو رہی ہے۔" حوریہ سے فوری طور پر بات بن نہیں پائی۔

"ناشتے میں کیا لے گی؟" ان کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ وہ بچوں کی پسند ناپسند کا بہت خیال رکھتی تھیں۔

"صرف ایپل جوس۔" حوریہ فریج کھول کر سیب نکالنے لگی۔

"بھلا اس لیکویڈ سے پیٹ بھرے گا؟ میں ایپل پائی یا فرنچ ٹوسٹ بنا لیتی ہوں۔"

"ماما! وہ صرف جوس ہی پیتی ہے۔" حوریہ نے عام سے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تھا تاکہ وہ کچھ سمجھ نہ پائیں' ورنہ تو حوریہ کا دل رمشا کی باتوں سے خاصا بجھا ہوا تھا۔ اور وہ اپنے تاثرات پر قابو پائے خاصی بشاشت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اسی پل عبد اور عناس بھی آگئے تھے۔

"ناشتے میں کچھ ملے گا؟" عبد سیدھا کچن میں آگیا' جبکہ عناس اپنے بیڈ روم میں فریش ہونے کے لیے چلا گیا تھا۔

"کچھ نہیں' بہت کچھ ملے گا' مگر پہلے آپ فریش ہوجائیے۔" حوریہ نے بشاشت سے کہتے ہوئے جوس کا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

"جاتے جاتے اپنی بیگم کے لیے جوس بھی لے جائیے۔"

"بیگم خود ہی نیچے آجائے گی۔ مجھ سے اتنا تردّد نہیں ہوتا۔" اس نے مصنوعی کاہلی سے کہا۔

"یہ کوئی پہاڑ نہیں جسے اٹھا کر نہیں لے جاسکتے۔" حوریہ نے زبردستی گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ برے برے منہ بناتا سیڑھیاں چڑھ گیا۔

وہ بیڈ روم میں داخل ہوا تو بجتے میوزک نے اس کا استقبال کیا تھا۔ وہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولا۔

"صبح ہوگئی ہے محترمہ۔"

"تم کہاں تھے؟" وہ عبد کو دیکھ کر کھل اٹھی۔

"دیکھ نہیں رہیں' پسینے میں نہا کر آیا ہوں۔" وہ بھیگی گیلی شرٹ کو کھینچ کر اتارتے ہوئے بولا۔

"تو پھر جلدی سے فریش ہو کر آجاؤ۔"

"اور تم نیچے جانے کی تیاری پکڑو۔۔۔ میں ابھی آیا۔" اس کے گال پر چٹکی بھر کر شرارتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے وہ واش روم کی طرف بڑھ گیا۔

وہ واپس آیا تو رمشا ابھی تک میوزک سسٹم سے چھیڑ چھاڑ کرنے میں مصروف تھی۔

"چلو! ناشتا کرلو۔" وہ بالوں میں برش کر کے سیدھا اس کی طرف آگیا۔

"مجھے بھوک نہیں۔"

"نہ سہی' ساتھ دینے کے لیے تو چلو۔" وہ اس کے ہاتھ سے کیسٹ پکڑ کر ریک میں رکھتے ہوئے بولا۔

"مجھے نہیں جانا۔۔۔ سونا ہے۔" رمشا ٹھنکی۔

"مجھے بھوک بھی نہیں ہے۔"

"چلو! ہمارے نوالے گنتی رہنا۔" وہ اصرار کر رہا تھا۔

"یہ کام بھی نہیں کر سکتی۔"

"ایک دفعہ نیچے چلو' ماما سے مل کر آجانا' پھر سارا دن سوتی رہنا' تمہیں کوئی بھی ڈسٹرب نہیں کرے گا' میں بھی نہیں۔" وہ معنی خیزی سے مسکرایا۔

"ماما سال بھر کے لیے کہیں جا رہی ہیں' جو ان سے ملنے کے لیے جانا ہے۔" رمشا بڑی معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔

"اف' سلام کرنے کے لیے کہہ رہا ہوں' کیا تمہارے گھر میں بزرگوں کو سلام کرنے کا رواج نہیں ہے؟"

"نہیں۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"چلو پھر میرے ساتھ آؤ۔ میں طریقہ سکھا دیتا ہوں۔" وہ اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے کر نرمی سے کہنے لگا۔

"مجھے نہیں سیکھنا' کچھ اور سکھا دو۔" وہ ضدی پن سے بولی۔

"مثلاً "کیا؟"

"جہاز اڑانا ہی سکھا دو یا پھر ہاکی۔"

"تمہیں ماما کی ٹریننگ میں چھوڑ کر جاؤں گا۔ کوکنگ سیکھ لینا۔ بھلا جہاز اڑا کر تمہیں کیا ملے گا۔"

"کوکنگ سے مجھے سخت الرجی ہے عبی!" وہ چیخ پڑی۔

"ہائے، پھر تو بھوکا ماروگی۔" عبد نے گویا دہائی دی۔

"تم خانساماں رکھ لینا۔" مشورہ مفت میں حاضر تھا۔

"اور تمہیں کس لیے اتنا خرچہ کرکے لایا ہوں۔" وہ اس کی ناک دبا کر بولا۔

"اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ میں تمہارا کوئی کام کروں گی۔" رمشا نے لاڈ جتایا۔

"نہیں جی! میں اتنا خوش فہم بھی نہیں ہوں، خیر چھوڑو اس بات کو، نیچے چلو، مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے اور چوہے میرے پیٹ میں ہاکی کا میچ کھیل رہے ہیں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اٹھاتے ہوئے بولا۔

"بچی عبد! مجھے بہت نیند آرہی ہے، تم جاؤ نا، مجھے سونا ہے۔" اس نے گویا التجا کی تھی اور عبد کو بھی اس کی گلابی نیند سے بوجھل آنکھوں کو دیکھ کر ترس آگیا۔

"اوکے میری جان! تم آرام سے سو جاؤ۔" وہ مسکراتے ہوئے باہر چلا گیا تھا۔ جبکہ رمشا بیڈ پر گر کر کھل کر مسکرا دی۔ وہ عبد کے گھر والوں پر جتا تو چکی ہی تھی کہ اس کی نظروں میں ان کی وقعت ذرہ بھر نہیں۔

☼ ☼ ☼

ولیمہ کے بعد زندگی معمول پر آچکی تھی۔ مگر عبد کی ابھی بہت ساری چھٹیاں باقی تھیں۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ ان چھٹیوں کو کسی کھاتے میں لگا دیا جائے۔

یہ ولیمہ سے دس روز بعد کی بات تھی، اس دن رمشا بھی ڈائننگ میز پر موجود تھی۔ چونکہ چھٹی کا دن تھا، سو عناس لالہ اور حوریہ بھابھی بھی گھر میں تھے۔ ہمیشہ کی طرح حوریہ، ماما اور خالہ کے ساتھ کچن میں مصروف تھی۔ مینا اور عناس لالہ نہ جانے کس بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ عبد اخبار دیکھ رہا تھا۔ جب ماما میز پر ناشتے کے لوازمات سجاتے ہوئے بولیں۔

"ہنی مون پہ نہیں جانا تم لوگوں نے؟" وہ عبد اور رمشا سے بیک وقت مخاطب ہوئیں۔

"ہاں، کیوں نہیں، ضرور جائیں گے۔" عبد نے فی الفور اخبار تہہ کرکے ایک طرف رکھ دیا۔

"تو کب جانا ہے؟ جب چھٹی ختم ہو جائے گی؟" عناس لالہ بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

"ابھی کچھ فیصلہ نہیں کیا کہ جانا کہاں ہے۔" عبد کا انداز سوچتا ہوا تھا۔ وہ پیر سے رمشا کے پیر کو ٹھوکا دے کر آنکھ کے اشارے سے اسے بھی کچھ بولنے کا کہہ رہا تھا۔

"ناردرن ایریاز چلے جاؤ، گھومنے پھرنے کے لیے ہمارے ملک سے زیادہ خوب صورت کوئی دوسری جگہ مجھے تو نظر نہیں آتی۔" حوریہ اور خالہ بھی کرسی پر بیٹھ گئی تھیں۔

"تو پھر ٹھیک ہے، میں انتظامات کروا دیتا ہوں۔" عناس نے تائید طلب نظروں سے عبد کی طرف دیکھا تھا۔ وہ جو اثبات میں سر ہلانے لگا تھا، ایک دم رمشا کو بولتے دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

"ہمیں ناردرن ایریاز نہیں جانا۔ ایک سو چالیس مرتبہ تو دیکھ چکی ہوں۔ ہر ویکیشنز پر ہم لوگ گھومنے پھرنے کے لیے سوات کاغان جاتے رہے ہیں۔ آپ برائے مہربانی ہمارے لیے تردد مت کیجیے گا۔ ممی نے دبئی کے لیے ہمارے ٹکٹس خرید لیے ہیں۔ ہنی مون کا ٹرپ ممی کی طرف سے گفٹ ہوگا۔" وہ کافی کھردرے لہجے میں بولی تھی۔

عناس اور حوریہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئے، جبکہ خالہ اور ماما ہکا بکا تھیں۔ مینا منہ کی طرف نوالہ لے جاتے ہاتھ کو واپس پلیٹ تک لے آئی تھی۔ وہاں بیٹھے سب افراد کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ عبد نے ماحول میں پھیلی کشیدگی کو محسوس کیا اور پھر قدرے خفا خفا سے انداز میں بولا۔

"یہ بات تم سلیقے کے ساتھ بھی کر سکتی تھیں۔"

"مجھے سلیقے، قرینے نہیں آتے۔" وہ بدتمیزی سے گویا ہوئی۔ عبد کا سب کے سامنے نرم انداز میں سمجھانا بھی اسے بہت برا لگا تھا۔

"نہیں آتے تو سیکھ لو۔" عبد دبی آواز میں بولا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بات بڑھے، مگر رمشا شاید بات کو بڑھانے کے موڈ میں تھی۔

"نہیں سیکھ سکتی۔ ویسے بھی یہاں کے لوگوں میں بڑے "قرینے" ہیں۔"

"جسٹ شٹ اپ رمشا! اگر تم اچھا نہیں بول سکتیں تو خاموش رہو۔" عبد نے اپنی آواز پھر بھی بلند نہیں ہونے دی تھی۔

"میں اسی لیے ان لوگوں کے درمیان نہیں بیٹھنا چاہتی تھی۔ مڈل کلاس، دقیانوسی سوچ رکھنے والے بیک ورڈ لوگ۔ تمہیں یہاں بیٹھنا مبارک ہو۔ چاہے صبح سے شام تک بیٹھو یا پھر شام سے صبح تک اپنے کان بھرواتے رہو۔"

وہ تلخی سے کہتی دھپ دھپ کرتی اٹھ کر چلی گئی تھی۔ وہ سب دم بخود سے اسے جاتا دیکھ رہے تھے۔ بہت دنوں سے ماما اور حوریہ، رمشا کی بدمزاجی کو نوٹ کر رہی تھیں۔ اس کا اکھڑا اکھڑا سا انداز، روکھا لہجہ نجانے اس کے ساتھ مسئلہ کیا تھا۔ ان کی ہر سیدھی بات بھی اسے الٹی نظر آتی تھی۔ وہ کچھ کہتی تھیں اور رمشا سمجھتی کچھ تھی اور اب تو وہ عناس پر بھی بات بات پر طنزیہ جملے پھینک دیتی تھی۔

گھر میں خالہ اور مینا کے علاوہ ان تینوں سے تو اس نے خواہ مخواہ کا بیر باندھ لیا تھا۔ خصوصاً" ماما سے تو انتہا درجے کی بدتمیزی بھی کر دیتی۔ وہ دس دن کی نئی نویلی بیاہتا کی عبد سے بھلا کیا شکایت کرتیں۔ ویسے بھی ابھی تک تو وہ اس کے مزاج کو سمجھ ہی نہیں پا رہی تھیں۔ نجانے وہ چاہتی کیا تھی، اس کی خواہش کیا تھی؟ کیا وہ عبد پر صرف اپنا تسلط قائم رکھنا چاہتی تھی؟ وہ ان سب سے عبد کو دور کرنا چاہتی تھی؟

صبح صبح اس بدمزگی کے بعد عبد کا موڈ بگڑ گیا تھا، مگر وہ کب تک اس سے ناراض رہ سکتا تھا۔ کچھ عناس لالہ کے سمجھانے، بجھانے اور کچھ اپنے دل کے مجبور کرنے پر وہ رات کو اس کے سامنے اس کی بدتمیزی کو بھلا کر ہی آیا تھا۔

جب وہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس وقت وہ روٹھی روٹھی سی بیڈ پر بیٹھی تھی۔ اسے دیکھتے کے ساتھ ہی چادر تان کر سوتی بن گئی۔ یعنی محترمہ ناراضی ظاہر کر رہی تھیں۔ عبد کو ہنسی آگئی۔

"وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے نرمی سے بولا۔

"رشی!" اس نے اس کے چہرے سے چادر ہٹائی۔

"میرے ساتھ بات کرنے کی ضرورت نہیں عبی! ورنہ بہت بری طرح سے پیش آؤں گی۔" رمشا نے ناگواری کا برملا اظہار کیا۔

"تم اچھی طرح سے کب پیش آتی ہو؟" عبد نے معصومیت سے پوچھا۔

"میں تم سے ناراض ہوں۔" وہ پاس رکھا تکیہ منہ پر رکھنا چاہتی تھی، مگر عبد نے اس کی کوشش کو ناکام بنا دیا۔

"غلطی صرف اور صرف تمہاری تھی۔ ذرا اپنے صبح والے لہجے پر غور کرنا تھا۔" عبد نے نرمی سے جتانا چاہا۔

"تم نے مجھے سب کے سامنے کیوں ڈانٹا تھا؟" وہ ناراضی کے دفتر سیاہ کیے بیٹھی تھی۔ وہ اس الزام پر اچھل پڑا۔

"کیا؟ ڈانٹا تھا؟"

"اب مکرنا مت۔" رمشا نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی تھی۔

"چھوڑو اس بات کو۔ آؤ صلح کر لیتے ہیں۔" عبد انا کو بیچ میں لا کر بات کو طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ یہ لالہ کی نصیحتوں کا بھی اثر تھا اور وہ خود اپنے دل کے ہاتھوں مجبور بھی تھا، جو رشی سے ناراضی کے ان چند گھنٹوں میں ہی بری طرح سے گھبرا اٹھا تھا۔

"مجھے تم سے صلح نہیں کرنی۔" وہ ضدی لہجے میں بولی۔

"رشی جانو! ماش کی دال مت بنو۔" عبد نے اسے

گدگدانا چاہا۔

"پلیز عبد! وہ اس کی پیش قدمی پر چڑی۔ "میں بالکل نہیں مانوں گی۔ پیچھے ہٹ کر بیٹھو۔"

"ہم پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں۔ جانباز سپاہی ہیں۔ جان اور دل کی بازی لگا رکھی ہے۔ بھلا اب پیچھے ہٹا جا سکتا ہے۔" وہ اسے زچ کیے دے رہا تھا۔ جیسے وہ اسے زچ کر کے رکھ دیتی تھی۔

"ڈائیلاگز تو کوئی تم سے سیکھ لے۔"

"کم بولتے ہیں مگر اچھا بولتے ہیں۔" عبد نے اس کے دونوں گال زور سے کھینچے تھے تب ہی وہ چیخ اٹھی۔

"جنگلی انسان۔"

"کچھ بھی کہہ دو۔ ہمیں منظور ہے۔" اب اس کے بال عبد کے ہاتھوں میں آچکے تھے۔ رشی کا جب ناک میں دم ہو گیا تو اس نے ناراضی ختم کرنا ہی مناسب سمجھا۔ تب ہی وہ مزاحمت ترک کر کے قدرے اس کے قریب کھسک آئی۔

عبد! مجھے تم سے کچھ کہنا ہے؟"

"بولو' میری جان!" وہ گویا نثار ہو گیا تھا۔

"میں یہاں نہیں رہوں گی۔ تمہارے ساتھ جاؤں گی۔" اس نے بالآخر کہہ ہی دیا تھا۔

"اوکے جناب! کوئی اور حکم ویسے میں بھی تمہارے بغیر رہ نہیں سکتا۔" وہ اپنی شدتوں کا اعتراف بغیر جھجکے کر رہا تھا۔ رمشا گویا پوری جان سے مسرور ہو گئی۔

"عبی! تم کبھی بھی بدلنا مت۔ ہمیشہ مجھے اسی طرح سے چاہتے رہنا اگر تم ذرا بھی بدل گئے تو میں خود کو ختم کر لوں گی۔" وہ اسے دھمکا نہیں رہی تھی بلکہ سچ کہہ رہی تھی۔ وہ اسی طرح سے شدت پسند تھی۔ محبتوں میں بھی اور نفرتوں میں بھی۔

☼ ☼ ☼

عبد کی چھٹی ختم ہو چکی تھی' سو وہ واپس چلا گیا تھا۔ جاتے جاتے وہ اسے بھرپور تسلی دے کر گیا تھا۔

"میں گھر کا بندوبست کر لوں' پھر تمہیں لے جاؤں گا۔" عبد کی تسلی نے اسے مطمئن کر دیا تھا۔ اس دوران وہ اپنی ممی سے بھی مل آئی تھی۔ وہ بیٹی کو مسرور اور شاد دیکھ کر اندر تک سرشار ہو گئی تھیں۔ روایتی ماؤں کی طرح انہوں نے بھی اس کے گھریلو حالات کے بارے میں کرید کرید کر پوچھا تھا۔

"گھر والے ٹھیک ہیں تمہارے ساتھ؟ عبد کا رویہ کیسا ہے؟ خیال رکھتا ہے تمہارا؟" اسی طرح کے چھوٹے چھوٹے سوالات کے بدلے میں وہ انہیں مطمئن کرتی رہی تھی۔

"شکر ہے تم کچھ تو نارمل ہوئیں۔" ان کے دل سے سارے وسوسے دور ہو گئے تھے۔

"کہاں ممی! دل نے جو بے عزتی کا داغ سجا رکھا ہے' وہ اسی وقت ڈھل پائے گا جب میں بھی ویسا ہی ایک داغ لگاؤں۔" وہ پیر جھلاتے ہوئے مزے سے بولی تھی۔ ممی نے شاید سنا نہیں تھا' ورنہ ان کا دل ضرور دھک سے رہ جاتا۔

☼ ☼ ☼

چند ماہ بعد وہ عبد کے ساتھ واپس اسلام آباد چلی آئی۔ تب اس نے ترپ کا پہلا پتا جھاڑ' پھونک کر ایک پرانے بوسیدہ لفافے میں سے نکالا۔

ان دنوں عبد اور وہ ہنی مون سے واپس آئے تھے۔ عبد کا موڈ بھی خوشگوار تھا اور اس کا خوشگوار ترین۔ عبد کا خیال تھا' انہیں کچھ دنوں کے لیے گھر والوں سے ملنے کے لیے جانا چاہیے' سو وہ عبد کی بات مان گئی تھی۔

وہ گھر آئے تو ہمیشہ کی طرح ان کا بھرپور استقبال کیا گیا تھا۔ یہاں آکر عبد کے پوچھنے پر رشی کو خیال آیا تھا کہ وہ ان سب کے لیے دبئی سے لائے گفٹ اسلام آباد ہی بھول آئی ہے۔

ابھی انہیں آئے ہوئے صرف دو گھنٹے ہی ہوئے تھے' جب عبد کو بینک کا کوئی کام یاد آگیا تھا۔ عبد کے چلے جانے کا یقین کر کے رمشا قدرے مطمئن ہو گئی تھی۔

گھر کی دونوں بزرگ خواتین کے اِدھر اُدھر ہوتے ہی

وہ حوریہ کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ اسے دیکھ کر خوش ہو گئی۔

"آؤ رشی! بیٹھو۔" اس نے بیڈ پر ہی اپنے قریب اس کے لیے جگہ بنائی۔

"سوری' میں یہاں بیٹھنے کے لیے نہیں آئی ہوں۔" اس نے ازلی روکھے انداز میں چبا چبا کر کہا۔

"تو پھر؟" حوریہ نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ اپنے مجازی خدا تک ہمارا ایک میسج پہنچا دیجیے گا۔"

"کیسا میسج؟" حوریہ قطعاً" سمجھ نہ پائی۔ رشی کے انداز و بیان سب بدلے ہوئے تھے۔

"اول تو یہ کہ ہمارے حصے کی جو زمین ہڑپ کر کے انہوں نے اپنا کلینک سیٹ کر رکھا ہے' اس میں سے ہمارا حصہ دیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس گھر کو چاہے بیچ دیں یا چاہیں تو عبد کا جو حق بنتا ہے' وہ اسے لوٹا دیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ اس معاملے کی ہوا عبد کو نہیں لگنی چاہیے' ورنہ میں آپ لوگوں کے ساتھ وہ کچھ کروں گی جو آپ کے گمان تک میں نہیں ہو گا۔"

اس کی آواز میں عجیب سی پھنکار تھی۔ حوریہ بالکل سفید پڑ گئی۔ اسی پل دروازہ کھلا تھا اور مسز عدیلہ جرار اندر داخل ہوئیں۔

"پہلے تم مجھے بتاؤ تم کون ہو؟ کیا چاہتی ہو؟ کیوں میرے بیٹے کے پیچھے پڑی تھیں؟ آخر تمہارا مقصد کیا ہے؟"

ان کی آواز سے ان کے تاثرات سے رمشا کو اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ اس کی تمام باتیں سن چکی ہیں' مگر اسے کون سی پروا تھی۔ وہ ان کے سامنے بے خوفی سے کھڑی ہو گئی۔

"عبد آپ کا "دل" ہے نا۔ میں نے آپ کا دل چرا لیا ہے۔"

"تم چاہتی کیا ہو؟"

بیگم عدیلہ گویا لرز کر رہ گئیں۔

"میں آپ کے اور عناس کے دل کو بہت کاری ضرب لگانا چاہتی تھی۔ میرا مقصد بھی یہی تھا کہ عناس کے دل کو کوئی گہری چوٹ لگاؤں تاکہ عمر بھر وہ اس درد کو محسوس کر کے بلبلاتا رہے۔ پھر مجھے خبر ہوئی کہ عناس کا "دل" تو عبد ہے' سو میں نے اسے ہی سیڑھی بنا لیا' مگر میں نہیں جانتی تھی کہ مجھے عبد سے محبت ہو جائے گی۔ یہاں میرا منصوبہ کچھ ناکام ہونے لگا تھا۔ مگر عناس سے انتقام اور نفرت نے مجھے ہر شے سے بے نیاز کر دیا۔ مجھے عناس کے غرور کو توڑنا تھا۔ اس کا سر جھکانا تھا اور جس مرتبے پر اسے ناز ہے۔ وہ مرتبہ اور مقام اپنے پیروں میں روند دینا تھا۔

پھر میں نے سوچا کہ میرا انتقام تو عبد کی صورت میں پورا ہو ہی جائے گا۔ جب میں اسے ہمیشہ کے لیے آپ لوگوں سے چھین کر لے جاؤں گی۔۔۔ اور میں ایسا کر کے رہوں گی۔" اس کے لفظ لفظ سے شرارے پھوٹ رہے تھے۔

اس کی بات ختم ہوتے ہی بیگم عدیلہ کے وجود میں گویا حرکت ہوئی تھی۔ وہ صدمے کی کیفیت میں چلتی ہوئی اس تک آئیں۔ اور پھر انہوں نے اس کے منہ پر دو تین تھپڑ دے مارے تھے۔ عین اسی لمحے عبد نے کمرے میں قدم رکھا۔

"ماما! یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟" عبد اس منظر کو دیکھ کر گویا جم کر رہ گیا۔

"عبی! یہ لڑکی دھوکے باز ہے۔ اس نے تمہیں فریب دیا۔ یہ تمہیں ہم سے چھین کر لے جائے گی۔ یہ عناس سے بدلہ۔۔۔"

وہ ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھیں۔ جبکہ رمشا مسلسل روئے جا رہی تھی۔ اسے ایک پل کے لیے خوف محسوس ہوا تھا کہ عبد ماں کے آنسوؤں سے متاثر ہو کر ساری کہانی جان نہ لے۔ مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ رمشا اکرام ایک ذہین آفیسر کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ وہ سسکتے ہوئے اس کے کندھے سے آلگی۔ وہ عبد کو ماں کی طرف متوجہ نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔

"پلیز عبد! مجھے یہاں سے لے چلو۔ میرا دم گھٹ

رہا ہے۔ میں مر رہی ہوں۔ مجھے یہاں سے لے جاؤ۔" وہ مسلسل چیخ رہی تھی۔

"ہاں' عبد! اسے واقعی یہاں سے لے جاؤ۔ اگر یہ ادھر سے نہ گئی تو ہمارا دم ضرور نکال کر رہے گی۔" حوریہ نے سلگتے لہجے میں التجا کی تھی۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ کچھ پل پہلے یہاں کون سے ڈرامے کا سین چل رہا تھا؟" وہ حوریہ کی طرف دیکھتے ہوئے زہر خند لہجے میں بولا۔

"تم اپنی بیوی سے ہی تفصیل پوچھ لو۔ ہماری سچائی تمہیں جھوٹ لگے گی اور اس کے جھوٹ پر تمہیں یقین آجائے گا۔" حوریہ تلخی سے کہتی ہوئی ماما کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

"عبد! اس سے کہو' ہمارے گھر سے چلی جائے۔ یہ تمہارے قابل نہیں ہو سکتی۔" ماما گویا تھک کر بولیں۔

"عبد! آؤ چلیں۔ ہم اپنے گھر چلیں۔" وہ اس کا بازو تھام کر التجائیہ انداز میں بولی تھی۔

اور پھر وہ دونوں ایک ساتھ باہر نکل گئے بیگم عدیلہ جرار بس پتھرائی نظروں سے انہیں جاتا دیکھ رہی تھیں۔



وہ اپنی چھوٹی سی جنت میں بے حد مگن تھی۔ عبد کی ہمراہی میں اسے کوئی پچھتاوا چھو کر بھی نہیں گزر تا تھا۔ اور سچی بات تو یہ تھی کہ وہ ہمیشہ کی طرح "بدلہ" لے کر مطمئن ہو چکی تھی۔ یکسر بھلا چکی تھی کہ وہ عبد تک کس مقصد کے حصول کے لیے آئی تھی۔

اسے یاد تھا تو بس اتنا کہ عبد سے اسے اپنے آپ سے بھی بڑھ کر محبت ہو گئی تھی۔ وہ آفس جاتا تو پہلے کی طرح کئی کئی مرتبہ فون کرتی۔ میسجز میں اس کا حال احوال پوچھتی رہتی۔ اسے اپنی ماں کا گھر تو بھول ہی چکا تھا۔ پاپا کے گھر آسائش و آرام' سب بھلا چکی تھی۔ وہ اس چھوٹے سے سرکاری کوارٹر میں بہت خوش تھی۔

عبد کے اپنے گھر والوں سے تعلقات اب پہلے جیسے نہیں رہے تھے۔ دل ہی دل میں رمشا اس وجہ سے خاصی مطمئن تھی وہ عبد کو اب چھٹیوں میں بھی گھر نہیں جانے دیتی تھی۔

جب بھی وہ جانے کا ارادہ کرتا' رمشا کو کچھ نہ کچھ ضرور ہو جاتا۔ کبھی شدید گھبراہٹ اور کبھی بلڈ پریشر کا مسئلہ بن جاتا تھا۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس کے دل سے عبد کے گھر والوں کی نفرت بھی خود بخود کم ہو رہی تھی مگر وہ پھر بھی عناس اور عبد کو ایک ساتھ بیٹھا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اسے بہت مسرت محسوس ہوتی تھی جب وہ عناس کی فون کال کے جواب میں یہ میسج کر دیتی۔

"رانگ نمبر' عبد یہاں نہیں رہتا۔ آئندہ اس نمبر پر کال مت کریں۔"

اس نے عبد کی غیر موجودگی میں عناس کو کئی مرتبہ دروازے سے واپس لوٹا دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ عناس اور عبد کبھی اکٹھے بیٹھ سکیں۔ اپنے تئیں وہ عناس کے لیے یہی "سزا" منتخب کر چکی تھی۔ اس بات سے بے نیاز کہ کبھی کبھی جیتی بازی بھی ہار سے دوچار ہو جاتی ہے۔

یہ بھی ایک عام سا چھٹی کا دن تھا۔ آج عبد نے ثوب کی فیملی کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد وہ ملازمہ کے ساتھ کچن سمیٹ کر اپنی ممی کے گھر آگئی تھی۔

ممی کے گھر میں بھی خاصی رونق لگی ہوئی تھی۔ اس کے بھائی اور بھابھی کراچی سے آئے ہوئے تھے' سو وقت گزرنے کا پتا نہیں چلا تھا۔

کچھ دیر بعد جازم بھی چلا آیا تھا۔ بہت عرصے بعد رمشا کی اس سے ملاقات ہو رہی تھی۔

"عبد جرار صاحب کا کیا حال احوال ہے؟"

"تم تو یوں پوز کر رہے ہو گویا تمہاری عبد سے ملاقات نہیں ہوتی۔" رمشا نے اسے گھور کر دیکھا۔

"کبھی کبھی "جم" میں ٹاکرا تو ہو ہی جاتا ہے۔ تاہم آج کل ہمارا کوئی میچ نہیں ہو رہا۔ جب سے اس کی شادی تم سے ہوئی ہے' بس تمہارا ہی ہو کر رہ گیا ہے۔ مجھے تو عبد کے علاوہ کسی اور کے خلاف ہاکی کھیلنے میں

مزا ہی نہیں آتا۔" جازم نے سچائی سے کہا تھا۔

"تم دونوں ایک دوسرے کے حریف جو ہوئے۔" وہ ہنس رہی تھی۔

"سو تو ہے۔ بہر حال' تمہاری غداری سے میں خاصا جلا بیٹھا تھا۔"

"کیا مطلب؟" وہ سمجھ نہیں پائی۔

"جب سے عبد تمہیں مل گیا ہے' تم ہمیں تو بھول ہی چکی ہو۔" جازم شکووں کی پٹاری کھول بیٹھا۔

"اب میں تمہارا اچار ڈالوں؟ عبد کے بارے میں ساری انفارمیشن اکٹھا کرنے اور پل پل کی رپورٹ لینے کے لیے تمہاری خدمات لیتی تھی۔ اب جبکہ میرا کام ہو چکا ہے تو..."

"اور تم مطلب پرستوں کی طرح اپنا آپ دکھا چکی ہو۔" جازم نے منہ بنا کر کہا۔ رمشا ہنس ہنس کر بے حال ہو گئی۔

"اچھا خاصا ڈاکٹر عناس سے بدلہ لیتے لیتے اس کے بھائی پر عاشق ہو گئیں اور میں بے چارہ مفت میں مارا گیا۔" جازم کا تاسف کسی طور کم نہیں ہو پا رہا تھا۔

"ڈاکٹر عناس کے لیے تو اب بھی میرے اندر زہر بھرا ہوا ہے۔ انہیں تو میں کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ اور ان کے مارے گئے' وہ دو تھپڑ تو مجھے تمام عمر نہیں بھول سکتے۔"

"چلو' اب جانے بھی دو خونخوار بلا! کبھی کسی کو معاف بھی کر دیا کرو۔ ہر کسی سے بدلہ لینے پر تل جاتی ہو۔" جازم کا انداز ناصحانہ تھا۔

"ڈاکٹر عناس کو تو میں کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ ان کی وجہ سے میرا ڈاکٹر بننے کا خواب ادھورا رہ گیا تھا' بلکہ مجھے "ڈاکٹر" لفظ سے ہی نفرت ہو گئی۔" وہ تنفر سے بولی۔

"عبد کی خاطر ہی معاف کر دو۔ کہتے ہیں' محبت کا ظرف بہت وسیع ہوتا ہے۔"

"میں نہیں کر سکتی۔ انہوں نے میرے ساتھ اچھا کیا تھا؟ اور دیکھو' مجھے پہچان تک نہیں پائے۔ ظاہر ہے' اتنے بے شمار اسٹوڈنٹس میں سے بھلا وہ کس کس کا چہرہ یاد رکھتے' مگر دیکھو' میں ڈاکٹر عناس کو پہلی نظر میں ہی پہچان گئی تھی۔ اور عبد کو دیکھ کر تو یوں لگتا تھا گویا کچھ سال پیچھے کی طرف سفر کرو تو ڈاکٹر عناس مجسم کھڑے نظر آئیں۔"

وہ بغیر رکے مسلسل بول رہی تھی' اس بات سے بے نیاز کہ ایک تیسرا وجود بھی ان کی گفتگو سن رہا تھا۔

"فرض کرو رشی! اگر کسی دن عبد کو پتا چل جائے کہ تم اس کے قریب اس لیے آئی تھیں تاکہ بدلے کے طور پر عبد کو اس کے بھائی اور فیملی سے دور کر دو یا پھر وہ جان جائے کہ تم اسے فون پر اسی لیے ستاتی رہتی تھیں تاکہ ایک دن خود بخود وہ تمہاری طرف متوجہ ہو جائے۔ وہ تم سے محبت کرنے پر مجبور ہو جائے۔ یہاں تک کہ ایک دن اگر تم کہو کہ "عبد اپنے گھر والوں کو چھوڑ دو" اور وہ تمہارے کہنے پر انہیں چھوڑ بھی دے۔ فرض کرو رشی! اگر تمہاری محبت کا یہ دائرہ کسی دن عبد توڑ دے۔ وہ اس حصار سے نکل آئے جو تم نے اس کے ارد گرد کھینچ رکھا ہے۔ وہ تمہاری فطرت کو سمجھ جائے کہ تم بلا کی کینہ پرور ہو' منتقم مزاج ہو تو پھر سوچو تو سہی' تمہارا انجام کیا ہو گا؟ وہ تم سے نفرت کرنے لگے گا۔"

جازم کے لفظوں کے کوڑوں نے رمشا کو دہلا دیا تھا۔ مگر وہ اپنی فطرت کے عین مطابق بھڑک اٹھی۔

"میں کیوں ایسا فرض کروں؟ تمہارے منہ میں کیڑے پڑیں۔ عبد کیوں مجھ سے نفرت کرے گا۔ اگر اس نے ایسا کیا تو میں خود کو ختم کر لوں گی۔"

"یہ شدت پسندی تمہیں نقصان پہنچائے گی رشی!" جازم اسے سمجھانا چاہتا تھا مگر وہ غصے سے بھناتی ہوئی اٹھ کر باہر نکل آئی اور گویا اس کے پیروں تلے سے زمین کھسکنے لگی تھی۔ اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور پھر ٹھنڈے فرش پر بیٹھتی چلی گئی۔ حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں برآمد ہونے لگی تھیں۔ اس نے بیرونی گیٹ سے عبد جرار کو باہر نکلتے دیکھ لیا تھا۔ اس کے قدموں کی دھمک اسے اپنے دل میں سنائی دے رہی تھی۔



اور وہ سچ مچ اس سے بددل ہوگیا تھا۔ جو کچھ وہ سن چکا تھا' وہ اس کی غیرت کے لیے تازیانے سے کم نہیں تھا۔

"میں ایک عورت کے ہاتھوں بے وقوف بن گیا۔" بس اسی سوچ نے اس کے ذہن کو منتشر کردیا تھا۔

"رشی نے مجھے دھوکا دیا۔ مجھے استعمال کیا۔ مجھے میرے باپ جیسے شفیق بھائی سے بدظن کردیا۔ مجھے میری ماں کا نافرمان بنادیا۔ مجھے میرے اپنوں سے جدا کردیا۔ ایک عورت کی جھوٹی محبت نے فلائٹ لفٹیننٹ عبد جرار کو لوٹ لیا۔"

اس کی شریانیں گویا پھٹ رہی تھیں۔ اسے ماما کے ان تھپڑوں کا "راز" اب پتا چلا تھا اور بے اختیار اس کے دل نے خواہش کی تھی کہ ماما رمشا کو اس وقت تھپڑ نہ مارتیں' بلکہ اس کا گلا ہی دبادیتیں تاکہ اسے اتنی بڑی دھوکہ دہی اور غلط بیانی پر کچھ تو سزا ملتی۔

وہ حیران تھا کہ کوئی لڑکی اس قدر منتقم مزاج اور کینہ پرور بھی ہوسکتی ہے۔ جو اپنے استاد کی ایک غلطی کو نظر انداز یا معاف نہیں کرسکی۔

یہ کوئی بہت پرانی بات بھی نہیں تھی۔ سات سال پہلے جب عناس جرار ایم بی بی ایس کرکے ابھی فارغ ہی ہوئے تھے۔ ان کے ایک دوست کے والد نے اپنے ذاتی کالج میں انہیں پڑھانے کی پیش کش کی' سو وہ وہاں پڑھانے لگے۔

ان ہی دنوں کی بات تھی' جب ایک لڑکی اسلام آباد سے آئی تھی۔ بلا کی نخریلی' نازک اندام' مغرور اور اپنی "میں" کو بلند رکھنے والی۔

وہ ایف ایس سی کے بعد میڈیکل کالج میں جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اور ڈاکٹرز سے اسے کچھ خاص قسم کی عقیدت تھی لہٰذا وہ عناس جرار کو بہت پسند کرتی تھی۔ تاہم یہ پسندیدگی صرف ایک استاد اور پھر ڈاکٹر ہونے کے حوالے سے تھی' اس کے تمام ہم جماعت اس بات سے واقف بھی تھے۔ اس کی کچھ ہم جماعت لڑکیاں اس کی خوبصورتی اور ذہانت سے حسد میں مبتلا ہوگئی تھیں۔ ان ہی کے گھناؤنے منصوبے نے رمشا کو سب کی نظر سے گرادیا۔ انہوں نے رمشا کی طرف سے ایک عامیانہ سا محبت نامہ لکھا اور چند تصویروں کے ساتھ عناس جرار کو دے دیا' وہ محبت نامے اور اس کی تصویروں کو دیکھ کر سخت مشتعل ہوگئے۔ انہوں نے پورے کالج کے سامنے رمشا کی نہ صرف بے حد بے عزتی کی تھی بلکہ اسے دو تھپڑوں سے بھی نوازا تھا۔

رمشا کے نزدیک ان یہ جرم ہلکا نہیں تھا۔ وہ اپنی توہین اور ذلت پر پاگل ہورہی تھی۔ پھر وہ کالج چھوڑ کر بھی چلی گئی تھی۔

عناس بھی اپنے ہاؤس جاب میں مصروف ہوکر اس واقعے کو بھول بھال گئے تھے۔ پھر وہ مزید تعلیم کے لیے بیرون ملک چلے گئے تھے۔ اس قصے پر سالوں کی گرد پڑ چکی تھی عناس نے یہ واقعہ اسے بھی بتایا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنے عرصے بعد وہ لالہ سے ان دو تھپڑوں کا اس طرح بدلہ لے گی۔ ایک مکمل اور جامع منصوبہ بناکر۔ ایک مکمل پلاننگ کے ساتھ۔ عبد جرار کو عناس جرار سے ہمیشہ کے لیے دور کردینے کا منصوبہ۔

وہ بے حد مشتعل ہوکر سوچ رہا تھا۔ ان لمحوں' ان یادوں اور باتوں کو جنہیں وہ کبھی بھلا نہیں سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک فلم چل رہی تھی۔

رمشا کا اس تک پہنچنا' وہ فون کالز کے سلسلے' وہ محبت بھرے نامے' وہ اس کے پیار میں خود کو مٹا ڈالنے کی باتیں۔ اور وہ پاگل پن کی حدود کو چھوتی محبت' جس پر وہ دل سے ایمان لے آیا تھا۔

"تو کیا وہ ایک فریب کو محبت سمجھ بیٹھا تھا۔"

وہ آنکھوں کے سامنے آئی آنسوؤں کی چادر کو ہٹانے کی کوشش میں سامنے سے آتی سفید کار کو دیکھ نہیں پایا تھا۔ بس ایک دھماکے کی آواز سنائی دی تھی۔ اور پھر پورے عالم پر گویا سکوت طاری ہوگیا۔

☆ ☆ ☆

پورے آٹھ گھنٹے ہوچکے تھے۔ وہ مسلسل ایک ہی پوزیشن میں ہسپتال کے ٹھنڈے کوریڈور میں ہر شے سے بے نیاز بیٹھی تھی۔ اس کے لبوں پر صرف ایک ہی ورد تھا۔ دل کی ایک ایک دھڑکن اور ہر ہر سانس عبد کی زندگی کے لیے دعا کررہی تھی۔

"یا اللہ! اسے زندگی دینا۔ میرے مالک! میں اس کی جدائی کبھی سہ نہیں پاؤں گی۔ مالک! مجھے میرے گناہ پر ایسی سزا مت دینا جس کا بوجھ میرے وجود کو ریزہ ریزہ کردے۔ یا اللہ! ہم تیرے حقیر بندے' عقل اور شعور کو خود سے دور رکھے اپنی من مانیاں کرتے ہیں۔ ہم نہ کسی کو معاف کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور نہ ہی ایسا ظرف لاسکتے ہیں۔ مگر اے میرے اللہ! تجھے تیری رحیمی کا واسطہ' مجھے عبد کی زندگی کی بھیک چاہیے۔ مجھے خالی مت لوٹانا۔ اے میرے اللہ! تجھے تیری کریمی کا واسطہ! میرے خالی ہاتھ کو دیکھ لے۔ مجھ گناہ گار کی فریاد کو سن لے۔"

اس نے آنسوؤں کے گویا دریا بہا دیے تھے۔ برسوں کا بغض تھا' کینہ تھا' غصہ تھا' نجانے کیا کچھ تھا ان آنسوؤں میں' جو بہتا چلا گیا۔ دھلتا چلا گیا۔ اور جب اس نے سجدے سے سر اٹھایا تو اس کا دل ہلکا ہوچکا تھا۔ اپنی غلطیوں پر ندامت کا ایک ایک اشک بہاکر وہ مطمئن ہوگئی تھی۔ اور یہ اطمینان اس بات کا اشارہ تھا کہ اس کی دعاؤں کو شرف قبولیت حاصل ہوگیا تھا۔ عبد جرار کی بند آنکھیں دھیرے دھیرے کھلنے لگی تھیں۔ اسے ہوش آگیا تھا۔ اور یہ خوشخبری سنانے والے عناس لالہ تھے۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گئے۔ اور پھر انہوں نے اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"رشی!"

"لالہ!" وہ ان کی آواز سن کر ندامت کی دلدل میں پھر سے گر پڑی۔ "لالہ! مجھے معاف کردیں۔ میری وجہ سے عبد کی یہ حالت ہوگئی۔ میں بہت بری ہوں۔ بہت ظالم ہوں۔ بہت خود غرض ہوں۔ مجھے معاف کردیں لالہ۔" وہ ان کے کندھے سے لگی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"رشی گڑیا! بس کرو ۔۔۔ خود کو سنبھالو دیکھو' عبد کو ہوش آگیا ہے۔ اس کے سامنے روگی تو اسے تکلیف ہوگی۔" وہ اس کا سر تھپک کر مسلسل تسلیاں دے رہے تھے۔ اور جب وہ تھوڑا سنبھلی تو پھر انہوں نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں بولنا شروع کیا۔

"معافی تمہیں نہیں' بلکہ مجھے مانگنی چاہیے۔ غلطی کسی اور کی نہیں' سراسر میری تھی۔ میں نے جانچ پڑتال کیوں نہ کی تھی۔ میں نے وضاحت کیوں نہ طلب کی؟ مجھے چاہیے تھا کہ معلم ہونے کے ناتے تم سے باز پرس کرنے سے پہلے بات کی تہہ میں اترتا۔ تمہیں بے عزت کرنا' تم پر ہاتھ اٹھانا' یہ سب میرے جرم ہیں رشی! مجھے معاف کردو بیٹا! میں خود کو بھی معاف نہیں کرپاؤں گا کہ ایک بچی میرے فعل سے دل برداشتہ ہوکر مسیحائی جیسے پروفیشن سے نفرت کرنے لگی۔ تم نے اپنا خواب ادھورا چھوڑ دیا۔ صرف اور صرف میری وجہ سے۔"

وہ لب کچلتے ہوئے شاید ضبط کی کڑی منازل سے گزر رہے تھے۔ رمشا کے دل میں چبھا ایک اور کانٹا بھی نکل گیا تھا۔ لالہ کی وضاحت نے اس کے دل کو پرسکون کردیا تھا۔

"اگر میرا ڈاکٹر بننے کا خواب پورا ہوجاتا تو پھر مجھے عبد جرار کبھی نہ ملتا۔ اللہ نے میرے ایک خواب کو ادھورا کرکے میری زندگی کی ہر خوشی کو مکمل کردیا' مگر میں اپنی نادانی میں سمجھ نہیں پائی۔ اگر آپ کی وجہ سے میرا دل اس حد تک شکستہ نہ ہوتا تو پھر میں بھلا عبد تک کیسے پہنچتی؟ آپ سے انتقام لینے کے جنون نے مجھے عبد کے بے حد قریب کردیا تھا۔ میں تو آپ کی احسان مند ہوں' مجھے آپ کے توسط سے سچے موتی جیسے دل والا عبد جرار مل گیا۔ جس کی سوچوں پر' خیالوں پر' خوابوں پر صرف میرا ہی قبضہ ہے۔"

وہ کھل کر مسکرادی تھی۔ تب ہی اس نے اپنے اردگرد ایک ہجوم کو دیکھا۔ وہ ہجوم اس کے اپنوں کا تھا۔ اس کی ممی' پاپا' بھابھیاں' علی' مونا' خالہ' مینا' ماما اور حوریہ بھابھی۔ وہ سب عبد کے ساتھ ہونے والے حادثے کی وجہ سے مرجھائے ہوئے تھے۔

وہ اس سارے ہجوم کو نظر انداز کر کے عبد کی ماں کی طرف بڑھ آئی تھی۔ اس کے آنسو، اس کی جھکی جھکی پلکیں اور زرد چہرے کی طرف دیکھ کر انہوں نے کوئی سوال نہیں کیا۔ بلکہ بہت محبت کے ساتھ اسے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

"میں تم سے ہمیشہ ——— پیار کرنا چاہتی تھی رشی! کیونکہ تم میرے عبد کی محبت ہو۔"

اسی پل ڈاکٹر نے عبد کو روم میں شفٹ کر دینے کی خوشخبری سنائی تھی۔

"آپ لوگ باری باری ان سے مل سکتے ہیں۔" ڈاکٹر نے ہدایات دیں۔ سب نے اسے سب سے پہلے گھسیٹ کر کمرے میں دھکیل دیا۔

وہ اس قدر شرمندہ تھی کہ عبد سے نظر بھی ملانے کا حوصلہ نہیں تھا، مگر یہ ہمت، یہ حوصلہ تو خود میں لانا ہی تھا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھے گئی۔ وہ بولتی بھی کیا، اس کے پاس الفاظ ختم ہو گئے تھے۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

"رشی! بس کرو ـــ" وہ بہت دیر اسے خاموشی سے تکنے کے بعد دھیرے سے بولا، مگر اس کے رونے کی شدت میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ عبد نے بے بسی سے اس کے آنسوؤں کو دیکھا۔

"رشی! میں اٹھ کر تم تک نہیں آ سکتا۔ پلیز، خاموش ہو جاؤ۔ کیوں میرے صبر کا امتحان لیتی ہو۔"

"مجھے معاف کر دو عبد!" رمشا نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے پیروں پر رکھ دیے۔ اس کے شفاف موتیوں جیسے گرم آنسو عبد کے پیروں پر گر رہے تھے وہ تڑپ کر رہ گیا۔

"میں نے جو کچھ کیا، میں اس پر....." وہ کچھ کہنا چاہتی تھی جب عبد نے بے اختیار اسے ٹوک دیا۔

"میں تم سے کوئی وضاحت نہیں طلب کر رہا۔ بھول جاؤ میں بھی بھول گیا ہوں۔ خوشی اس بات کی ہے کہ تمہارے دل سے نفرت کا خاتمہ ہو گیا ہے۔"

رمشا اس کے قریب چلی آئی۔

"تمہیں میری محبت پر شک ہے؟"

"نہیں" وہ سچائی سے بولا۔

"تم مجھ سے بدگمان بھی نہیں؟" نجانے وہ کیسی یقین دہانی چاہتی تھی۔

"ہرگز نہیں۔"

"تم مجھ سے ہمیشہ محبت کرو گے؟" اب وہ اس کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ کے گویا وعدہ لے رہی تھی۔

"ہاں۔" عبد کو ہنسی آ رہی تھی۔

"کبھی بدلو گے تو نہیں؟"

"بالکل بھی نہیں۔" عبد کھل کر مسکرا دیا۔ "اب میں بھی ایک دو وعدے لے لوں۔" وہ گویا اجازت طلب کر رہا تھا۔

"ہاں۔" اسے مسکراتے دیکھ کر رشی کا دل ایک دم ہلکا ہو گیا۔

"تم کسی سے بدلہ تو نہیں لوگی؟"

"نہیں۔"

"غصہ تو نہیں کرو گی؟" وہ مسکان دبا کر پوچھنے لگا۔

"نہیں۔"

"معاف کرنا اور درگزر کرنا سیکھ جاؤ گی؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل۔"

"ہمیشہ خیال رکھنا چاہیے رشی! کہ کہیں آپ کے انتقام کی لپیٹ میں کسی کا نازک دل تو نہیں آ گیا۔ دل تو اللہ کا گھر ہوتا ہے رشی اور اللہ کا گھر ڈھانے والے اللہ کے مجرم۔"

وہ اس کی گلابی ہتھیلی کو بے ساختہ چوم کر کہہ رہا تھا جبکہ رمشا کا سر بے اختیار اثبات میں ہل گیا۔ کہ معاف کرنا افضل ترین عمل ہے۔ اور وہ اس عمل کو اپنی زندگی میں ہمیشہ کے لیے شامل کر لینے کا عہد کر چکی تھی۔

عبد کی آنکھوں کی روشنیاں رمشا کی آنکھوں میں اتر آئی تھیں۔ اور ان دونوں نے ان روشنیوں کے ہمیشہ قائم رہنے کی دل سے دعا کی تھی۔



نگہت عبداللہ

میرے خواب لوٹا دو

توصیف احمد اور یاسمین کا ایک بیٹا حماد اور دو بیٹیاں، سارہ اور اریبہ ہیں۔ یاسمین کی مستقل بدمزاجی اور بدزبانی سے تنگ آکر توصیف احمد نے اپنے بڑے بھائی کی سالی، خالدہ سے دوسری شادی کرلی۔ یاسمین اس پر اپنے جیٹھ، جٹھانی سے بھی شاکی ہے۔ اریبہ ماں سے قریب ہے، جب کہ سارہ اپنے باپ سے محبت کرتی ہے۔ اریبہ کی منگنی اس کے تایا زاد، اجلال رازی سے ہو چکی ہے جو اعلا تعلیم کے لیے امریکا گیا ہوا ہے۔ یاسمین، اریبہ کو باپ اور ددھیالی رشتے داروں کے خلاف بھڑکاتی رہتی ہے۔ اریبہ کو جب باپ کی دوسری شادی کا پتا چلا تو وہ اپنے تایا اور تائی سے بھی بدظن ہوگئی اور اس نے اجلال سے منگنی توڑ دی۔ اجلال تعلیم مکمل کرکے واپس آیا تو اسے منگنی ٹوٹنے کا پتا چلا۔ وہ اریبہ سے محبت کرتا ہے اور یہ رشتہ ختم نہیں کرنا چاہتا۔



اجلال رازی اس بارے میں اریبہ سے بات کرتا ہے، مگر وہ خاصی رکھائی سے پیش آتی ہے، تاہم وہ تحمل سے کام لیتا ہے کیونکہ وہ یہ مسئلہ بردباری کے ساتھ حل کرنا چاہتا ہے۔ اریبہ بے حد خود سر ہوتی جا رہی ہے۔ وہ ماں کی شہ پر سب کی مرضی کے خلاف موٹر سائیکل لے لیتی ہے۔ توصیف احمد کو اریبہ کے منگنی توڑ دینے کا بھی علم ہو جاتا ہے۔ وہ ساجدہ بیگم سے بات کرتے ہیں تو وہ انہیں کچھ دن یاسمین کے گھر میں رہنے کا مشورہ دیتی ہیں۔ سارہ کا کزن عمیر اس سے اظہار محبت کرتا ہے۔ سارہ بھی اسے پسند کرتی ہے۔

شمشیر علی شہر میں ملازمت کرتا ہے۔ اسے گاؤں میں مقیم اپنی بہن تاجور کی فکر رہتی ہے کیونکہ وہ وہاں سوتیلی ماں کے ظلم و ستم اور باپ کی عدم توجہ کا شکار ہے۔ وہ تاباں کو پسند کرتا ہے۔ وہ اپنے باپ کو فون کرتا ہے کہ تاباں کے باپ سے رشتے کی بات کرے تاکہ وہ شادی کے بعد تاجور کو اپنے ساتھ رکھ سکے۔

۴
چوتھی قسط

توصیف احمد صبح معمول کے مطابق اٹھ گئے تھے۔ انہیں بیڈ ٹی کی عادت تھی اور خالدہ تو یہ فریضہ خوش اسلوبی سے انجام دیتی تھیں لیکن یاسمین سے یہ توقع رکھی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ وہ تو پہلے جب وہ یہاں رہتے تھے تب بھی اکثر ان کے آفس جانے کے بعد ہی اٹھتی تھی۔ اس لیے وہ پہلے کی طرح اٹھ کر سیدھے کچن میں آ گئے۔

وہاں بوا حسب سابق نماز کے بعد تسبیح میں مصروف تھیں انہیں دیکھتے ہی اٹھنے لگیں تو وہ ہاتھ سے بیٹھے رہنے کا اشارا کرتے ہوئے پلٹ آئے اور پہلے حماد کے کمرے میں جھانک کر دیکھا پھر ڈرائنگ روم کا پردہ ہٹایا تو یاسمین صوفے پر سوئی نظر آئی۔ انہوں نے سوچا بچوں کے اٹھنے سے پہلے اسے اٹھا دیں لیکن پھر وہ سر جھٹک کر لان میں نکل آئے۔

ان کی طبیعت مکدر ہو رہی تھی۔ صبح کی دلکشی نے بھی ان کے ذہن اور احساسات پر کوئی اچھا اثر نہیں ڈالا۔ وہ عجیب سا محسوس کر رہے تھے اور اجنبی بھی، حالانکہ اس گھر سے گئے ہوئے انہیں کوئی بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا بس ایک سال۔ اس سے پہلے تو وہ بزنس ٹور کے بہانے ہی خالدہ کے پاس رکتے تھے۔ مستقل قیام تو یہیں تھا اور اس وقت بھی ان کی یہی روٹین تھی۔ بیڈ ٹی کے بعد لان میں نکل آتے تھے، لیکن یوں خود کو اکیلا محسوس نہیں کرتے تھے، جیسے اب کر رہے تھے۔

ان کا دل چاہا اسی وقت اپنے گھر کی راہ لیں اور دوبارہ کبھی یہاں قیام کا سوچیں بھی نہ، لیکن پھر اریبہ اور سارہ کا خیال کر کے انہیں خود کو پابند کرنا پڑا۔

بوا ان کے لیے چائے لے کر آئیں تو ناشتے کا بھی پوچھنے لگیں۔

"ناشتا بچوں کے ساتھ کروں گا۔" انہوں نے کہہ کر اخبار اٹھا لیا۔ بوا واپس چلی گئیں۔

وہ چائے پینے کے ساتھ شہ سرخیوں پر بھی نظریں دوڑانے لگے اور ابھی ان کی چائے ختم نہیں ہوئی تھی کہ یاسمین دندناتی ہوئی ان کے سر پر آن کھڑی ہوئی۔

"میں پوچھتی ہوں توصیف احمد آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

"تم سے؟ تمہارا مطلب ہے تم سے کیا چاہتا ہوں؟" انہوں نے پیشانی پر بل ڈال کر یاسمین کے تلملائے ہوئے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے وضاحت چاہی۔

"مجھ سے تو خیر تمہیں کچھ ملنے والا نہیں۔ میں تمہارے یہاں قیام کا مقصد پوچھ رہی ہوں۔" یاسمین مزید چیخ کر بولی تھی۔

"میری اولاد۔ میں اپنے بچوں کے لیے یہاں رہنے پر مجبور ہوں بلکہ یہ کہوں گا کہ تمہیں یہاں برداشت کرنے پر مجبور ہوں اور تم الٹا مجھ سے یہاں آنے اور قیام کرنے کا مقصد پوچھتی ہو۔ آخر تم کس خوش فہمی میں مبتلا ہو۔ کس زعم میں ہو؟"

وہ بہت ضبط سے بول رہے تھے پھر بھی ان کی آواز سے غصہ جھلک رہا تھا۔

"میرا زعم میرے بچے ہیں توصیف احمد! جنہیں تم کبھی میرے خلاف نہیں ورغلا سکتے۔" یاسمین نے گردن اکڑا کر کہا تھا۔

"او..." توصیف احمد کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ مچلی تھی۔ "تو تمہیں یہ خوف ہے کہ میں بچوں کو تمہارے خلاف ورغلا دوں گا۔"

"کوشش کر دیکھو! اپنا یہ شوق بھی پورا کر لو لیکن تمہیں کبھی کامیابی نہیں ہو گی، کبھی نہیں۔"

یاسمین اندر سے خائف ہو گئی تھی اور خفت چھپانے کو ہی جو منہ میں آیا بولتی چلی گئی۔

توصیف احمد اس کی اندرونی کیفیت بہت اچھی طرح سمجھ رہے تھے لیکن جتانے کے بجائے تحمل سے بولے۔

"بیٹھ جاؤ یاسمین! آرام سے بیٹھ کر میری بات سنو۔"

یاسمین بظاہر جارحانہ انداز میں کرسی کھینچ کر بیٹھی تھی ورنہ درحقیقت یہ اس کی مجبوری تھی۔

"کیا سنانا چاہتے ہو تم مجھے؟"

"دیکھو، تم نہ تو میری کمزوری ہو نہ مجبوری، مجھے صرف اپنے بچوں کا خیال ہے خصوصاً" اریبہ اور سارہ جن سے میں غفلت نہیں برت سکتا۔ اگر تم اچھی ماں ہوتیں تب تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں تمہاری خواہش کے مطابق ہمیشہ کے لیے تم سے دور ہو جاتا لیکن تمہارا رنگ ڈھنگ تمہارا چلن ابھی بھی وہی ہے۔ تم بچوں کی خاطر بھی خود کو بدلنے پر تیار نہیں ہو تمہاری ہر شام گھر سے باہر گزرتی ہے۔ تمہارے پیچھے یہاں کیا ہوتا ہے کیا نہیں، کبھی سوچا؟"

توصیف احمد ذرا دیر کو سانس لینے رکے تھے کہ یاسمین لہجے میں حد درجہ تاسف سمو کر بولی۔

"تم اپنی بیٹیوں سے بھی بدگمان ہو رہے ہو، بھروسا نہیں ہے تمہیں ان پر، مائی گاڈ اریبہ اور سارہ کو پتا چلے تو۔"

توصیف احمد بری طرح چکرا گئے۔ انہیں ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ وہ بات کا رخ یوں موڑ دے گی اور ابھی سنبھلے نہیں تھے کہ وہ کہنے لگی۔

"اریبہ اور سارہ دونوں ماشاءاللہ بہت سمجھ دار ہیں۔ زمانے کی اونچ نیچ سمجھتی ہیں۔ کیا اچھا ہے کیا برا اس کا ادراک ہے انہیں۔ مجھے ان کی رکھوالی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ مجھے ان پر پورا بھروسا ہے۔"

"تمہارا بھروسا غلط نہیں ہے۔" توصیف احمد دبے لہجے میں چیخے تھے۔

"پھر...؟" یاسمین نے سلگتے لہجے میں ٹوکا۔

"پھر یہ کہ تم اپنی فکر کرو۔ اگر اولاد کا تم پر سے اعتماد اٹھ گیا تو پھر تم کہیں کی نہیں رہو گی۔" توصیف احمد سخت لہجے میں کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے تو وہ بھی تلملا کر اٹھی تھی۔

"اولاد کا اعتماد تم کھو چکے ہو... تم... اور تمہارے اندر اسی بات کا غصہ ہے کہ میرا مقام کیوں برقرار ہے۔ بچے تم سے زیادہ مجھے کیوں اہمیت دیتے ہیں۔ اور اپنی اہمیت تم نے خود کھوئی ہے۔ اس کا بدلہ مجھ سے مت لو۔ چھوڑ دو مجھے اور میرے بچوں کو ہمارے حال پر۔"

"تمہیں چھوڑ سکتا ہوں، بچوں کو نہیں۔" انہوں نے پھر سخت انداز میں باور کرایا اور اندر کی طرف بڑھ گئے۔ کمرے میں آ کر انہوں نے پہلے سگار سلگایا پھر سیل فون اٹھا کر گھر کا نمبر ملایا۔



"امی! میں سوچ رہا ہوں بلال کو ایم بی اے کے لیے باہر بھیج دوں۔"
رازی ناشتے کے بعد ساجدہ بیگم کے ساتھ ان کے کمرے میں آیا تھا اور ادھر کچھ دنوں سے وہ بلال کے لیے جو سوچ رہا تھا وہ ساجدہ بیگم کے سامنے بیان کیا تو وہ فوراً" کچھ نہیں بولیں۔ خاموشی سے اسے دیکھے گئیں۔
"دو سال کی بات ہے کیریئر بن جائے گا اس کا' میرا خیال ہے اسے شوق بھی ہے۔ آپ کیا کہتی ہیں؟" آخر میں وہ سوالیہ نشان بن گیا۔
"میں تو یہ سوچ رہی تھی بیٹا! کہ اسے اب تمہارے ساتھ کام میں لگنا چاہیے۔ دو سال باہر رہ کر آئے گا تب بھی تو تمہارے ساتھ لگے گا۔" ساجدہ بیگم نے اپنی سمجھ کے مطابق کہا تھا۔
"بے شک میرے ساتھ لگے گا لیکن امی! اس کے اندر اپنی ذاتی حیثیت بنانے کی خواہش بھی تو ہو گی۔ ہمیشہ میرے اشاروں پر تو نہیں چلنا چاہے گا اور اس کے لیے تعلیم بہت ضروری ہے۔ پھر ابھی وقت بھی ہے۔ میرا مطلب ہے ابھی تو آپ اس کی شادی کا نہیں سوچ رہیں ناں؟"
"لو پہلے تمہاری تو ہو۔" ساجدہ بیگم فوراً" بولی تھیں۔
"یہی میں کہنا چاہ رہا ہوں کہ ابھی تو میری شادی میں بھی کافی وقت ہے۔ پھر کیوں نہ اس وقت میں ہم بلال کو اسٹیبلش کریں۔" اس کی بات معقول تھی۔ ساجدہ بیگم سوچ میں پڑ گئیں۔ تب ہی ثنا اندر آتے ہوئے بولی۔
"دیکھیں امی! کون آیا ہے۔" ساجدہ بیگم کے ساتھ رازی بھی متوجہ ہوا تھا۔ ثنا کے پیچھے خالدہ دونوں بچوں کے ساتھ آ رہی تھیں۔
"آہا' خالدہ آنٹی۔ السلام علیکم!" رازی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔
"وعلیکم السلام!" خالدہ نے اسے جواب دیا پھر ساجدہ بیگم کے گلے لگ گئیں۔
"کیسی ہو؟ توصیف بھی آئے ہیں؟" ساجدہ بیگم بہن کے آنے پر خوش ہو گئی تھیں۔
"نہیں' شام میں آئیں گے۔" انہوں نے رسان سے کہا۔
خالدہ کے جواب پر وہ حیران ہو کر پوچھنے لگا۔
"کیا... توصیف چچا آج چھٹی کے دن بھی آفس گئے ہیں؟"
"نہیں' وہ اصل میں کل سے وہاں گئے ہوئے ہیں' اپنے گھر۔" خالدہ نے سیدھے سادے انداز میں بتایا پھر بھی ساجدہ بیگم نظریں چرا گئیں کیونکہ توصیف احمد کو یہ مشورہ انہوں نے ہی دیا تھا۔ گو کہ یہ مشورہ انہوں نے غیر جانبداری سے سوچ کر نیک نیتی سے دیا تھا پھر بھی خالدہ کے سامنے انجان بننا پڑا۔
"آپ نے جانے دیا خالدہ آنٹی؟" ثنا کو یہ بات ہضم نہیں ہوئی تھی۔
"ثنا... ساجدہ بیگم نے جہاں فوراً" ٹوکا وہاں رازی نے بھی ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔
"میں نے تو یونہی پوچھ لیا۔" ثنا بدتمیزی سے کہتے ہوئے چلی گئی... رازی نے ٹھٹک کر اسے دیکھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ وہ اس طرح تو بات نہیں کرتی تھی۔ پھر بمشکل اس نے ثنا کی طرف سے دھیان ہٹایا اور خالدہ سے کہنے لگا۔
"خالدہ آنٹی! میں آج آپ کی طرف آنے کا سوچ ہی رہا تھا۔"
"ہاں بس سوچتے ہی رہا کرو۔ حالانکہ ابھی آرام سے آ سکتے ہو۔ شادی کے بعد تو پتا نہیں اریبہ آنے دے گی کہ نہیں۔" خالدہ شاکی ہو کر بولیں۔
"وہ کیوں منع کرے گی۔ اس کے تو ڈیڈی کا گھر ہے۔" وہ بے اختیار کہہ گیا پھر فوراً" سنبھل کر وضاحت بھی

کرنے لگا۔ "میرا مطلب ہے آپ کا گھر بھی تو اس کا میکہ ہو گا ناں اور میکے تو لڑکیاں شوق سے جاتی ہیں۔"
"ہاں' لیکن اریبہ کے شوق کچھ الگ ہی ہیں۔" خالدہ نے جتایا نہیں تھا' نہ ہی ان کے اندر اریبہ کے لیے کوئی ناراضگی یا شکایت تھی بس جو انہوں نے دیکھا' محسوس کیا' کہہ دیا۔
"اس عمر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ نئے نئے شوق چراتے ہیں۔ پھر وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ طبیعت میں ٹھہراؤ آ جاتا ہے۔" ساجدہ بیگم نے ایک طرح سے اریبہ کا دفاع کیا تھا۔
"جی آپا بیگم!" خالدہ نے تائید میں اسی قدر کہا پھر اپنے میکے کا ذکر چھیڑ دیا تو ساجدہ بیگم بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئیں۔
رازی کے لیے خالص گھریلو باتوں میں کوئی کشش نہیں تھی اس لیے وہاں سے اٹھ آیا اور اپنے کمرے میں جانے لگا تھا کہ لاؤنج میں ثنا کو بیٹھے دیکھ کر اس کے پاس آ گیا۔
"آج دوپہر کے کھانے کا کیا پروگرام ہے؟ میرا مطلب ہے کوئی اچھی سی ڈش بنا دو۔" اس نے محض ثنا کا موڈ جانچنے کی غرض سے بات کی تھی۔
"خالدہ آنٹی کی وجہ سے کہہ رہے ہیں یا خاص آپ کے لیے۔" ثنا نے نروٹھے انداز میں پوچھا۔ کوئی مشکل سوال نہیں تھا پھر بھی وہ سمجھ نہیں پایا کیا کہے' پھر اس کے پاس بیٹھ کر پوچھنے لگا۔
"ایک بات بتاؤ! تمہارا موڈ کیوں آف ہے؟"
"چھوڑیں بھائی! آپ کو کیا پروا۔ میرا موڈ کیسا بھی ہو۔ اور صرف موڈ ہی نہیں۔ میں بھی جیوں مروں کسی کو کیا۔"
ثنا کے اندر حد درجہ ناراضی بھری ہوئی تھی۔ وہ حیران رہ گیا۔
"یہ تم کیا کہہ رہی ہو ایسا کیسے سوچ لیا تم نے۔ کیسے پروا نہیں ہے تمہاری۔"
ہاں! نہیں ہے' سب کو صرف توصیف چچا اور ان کے گھر والوں کی پروا ہے۔ امی ہیں تو ہر وقت ان کی فکر میں رہتی ہیں اور آپ... آپ کو بھی سوائے ان کے اور کوئی نہیں سوجھتا..." ثنا جیسے پھٹ پڑی تھی۔
"میں کچھ کہہ دوں تو فوراً" ڈانٹ پڑ جاتی ہے۔ ابھی بتایئے میں نے ایسا کیا کہہ دیا تھا جو امی اور آپ بھی مجھے گھورنے لگے۔"
"اب میں کیا کہوں۔" وہ پریشان ہو گیا تھا۔
"کچھ نہ کہیں۔" ثنا ایک دم اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ اس کے پیچھے دیکھتا رہ گیا تھا۔



"تاج' روٹی لے آ۔" ابا نے گھر میں داخل ہوتے ہی تاجور کو پکارا اور نل پر ہاتھ منہ دھو کر برآمدے میں بچھی چارپائی پر آ بیٹھے تھے۔ تاجور نے فوراً" روٹی سالن لا کر ان کے سامنے رکھ دیا۔
"تیری خالہ کہاں ہے؟" ابا نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"پڑوس میں گئی ہے تاباں کے گھر۔" تاجور بتاتے ہوئے قدرے مشتاق ہو گئی تھی۔
"اچھا... اچھا۔" ابا نے کھانا شروع کر دیا' پھر بھی تاجور ذرا ہمت کر کے پوچھنے لگی۔
"ابا... بھائی کی شادی ہو رہی ہے؟"
"مت ماری گئی ہے اس کی' بیٹھے بٹھائے شادی کا شوشہ چھوڑ دیا' حیا نہیں ہے بے حیا کو گھر میں جوان بہن بیٹھی ہے' اسے اپنی شادی کی پڑی ہے۔"
ابا نوالہ چباتے ہوئے بولے چلے جا رہے تھے۔ تاجور کی ساری خوشی کافور ہو گئی۔ یعنی ان کو بیٹے کی شادی کی

خوشی نہیں ہے۔ وہ اگر لاڈلی بیٹی ہوتی تو ابا کو ٹوکتی' لیکن اب پریشان کھڑی تھی۔

"باقی سارے سوتیلے ہیں' پر تو تو سگی ہے اس کی۔ ایسے تو بڑا بولتا ہے' تاج کمزور ہوگئی ہے' اس کا خیال کرو۔ سارا کچھ میں کروں' اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ کمانے والا ہوگیا ہے۔ حرام ہے جو ایک پیسہ میرے ہاتھ پہ رکھا ہو۔ شکر ہے میں محتاج نہیں ہوں اس کا' پر اس کا تو فرض بنتا ہے۔"

ابا نوالوں کے ساتھ جیسے انگارے چبا رہے تھے۔ تاجور چور سی بنی کھڑی تھی جیسے سارا قصور اس کا ہو۔ تب ہی اماں آگئیں اور ابا کے سامنے بیٹھتے ہی پہلے اس سے بولیں۔

"تو یہاں کھڑی کیا کر رہی ہے' جارات کی ہانڈی روٹی دیکھ' اور پہلے کپڑے پلیٹ کے رکھ۔"

"یہ برتن بھی لے جا۔" ابا اپنے کندھے سے رومال کھینچ کر ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولے۔ تاجور ان کے سامنے سے برتن اٹھا کر چلی گئی تو وہ فوراً" بیوی کی طرف متوجہ ہوگئے۔

"ہاں! کیا کہتا ہے تاباں کا باپ؟"

"کیا کہتا۔ خوش ہوگیا تھا۔" اماں نے ابھی اسی قدر کہا تھا کہ ابا فخریہ بول پڑے۔

"خوش کیوں نہیں ہوگا۔ شمشیر جتنا پڑھا لکھا سارے پنڈ میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے' پر وہ اپنی لڑکی نہیں دے رہا' کہتا ہے بدلے میں شادی کروں گا۔" انہوں نے بتایا تو وہ فوری طور پر سمجھے نہیں۔ حیرت سے پوچھنے لگے۔

"بدلے میں' اس کا کون سا لڑکا ہے جس کے ساتھ ادلے بدلے میں لڑکی بیاہے گا؟"

"تم کورے کے کورے رہے' شمشیر کے ابا' وہ لڑکے کی نہیں اپنی بات کر رہا تھا' کہہ رہا تھا تاباں کو بیاہ دوں گا تو پھر مجھے روٹی پانی کون پوچھے گا' اس کی برادری والوں کا بھی یہی مشورہ ہے کہ وہ پہلے گھر میں بیوی لے آئے پھر تاباں کو رخصت کرے۔"

اماں تفصیل سے بتا کر منہ ہی منہ میں جانے کیا بڑبڑانے لگیں۔ ابا یہی سمجھے تاباں کے باپ کو ملامت کر رہی ہیں۔ جب ہی خاموش بیٹھے رہے۔

"سنو' اپنی تاجور بھی تو بڑی ہوگئی ہے۔" کچھ رک کر اماں نے آواز دبا کر کہا تو ابا یکدم ہتھے سے اکھڑ گئے۔

"مت ماری گئی ہے تیری' تاجور اس کی بیٹی سے بھی چھوٹی ہے۔ بڈھے سے بیاہ دوں اسے۔"

"خیر اتنا بڈھا بھی نہیں ہے' کام کاج والا آدمی ہے' پھر گھر میں دوسرے بکھیڑے بھی نہیں ہیں۔ ایک تاباں' اسے بھی بیاہ دے گا تو پھر راج کرے گی تاجور۔" اماں طریقے سے روشن پہلو سمجھانے لگیں تو ابا ڈھیلے پڑ گئے۔

"بات تو تیری ٹھیک ہے پر۔"

"پر کیا؟"

"دیکھو شمشیر کیا کہتا ہے' اس سے مشورہ کروں گا پھر فیصلہ ہوگا۔" ابا کا پرسوچ انداز اماں کو کھل رہا تھا۔

"تو کہیں ہاں تو نہیں کر آئی؟" ابا اچانک ٹھٹکے تھے۔

"لو' میری کیا مجال ہے' جو میں اپنی مرضی سے ہاں کر آتی۔ تم جانو تمہاری اولاد۔ اب جو کہنا سننا ہو خود چلے جانا' مجھے اور برا نہیں بننا' ویسے ہی سوتیلی ہوں۔" اماں غصے سے بولتے ہوئے اٹھ کر چلی گئیں۔

☼ ☼ ☼

شام اتر رہی تھی۔ اس نے پردے سمیٹ کر کھڑکیاں کھول دیں' پھر کچھ سوچ کر وارڈ روب کی طرف بڑھی تھی کہ یاسمین کے آنے پر اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"آیئے مما!"

"سارہ چلی گئی؟" یاسمین نے انجان بن کر پوچھا ورنہ توصیف احمد کے ساتھ جاتے ہوئے سارہ باقاعدہ اس سے کہہ کر گئی تھی۔

"جی' ڈیڈی مجھ سے بھی بہت اصرار کر رہے تھے۔ لیکن آپ نے منع کر دیا تو...." اریبہ بات ادھوری چھوڑ کر یوں مسکرائی جیسے وہ یاسمین کی بات ٹال ہی نہیں سکتی۔

"ہاں بیٹا! میں اصل میں تمہارے ڈیڈی کا ارادہ بھانپ گئی تھی اس لیے میں نے ان کے ساتھ جانے سے منع کیا۔" یاسمین کہتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"ڈیڈی کا ارادہ؟" اس نے ناسمجھی کے عالم میں یاسمین کو دیکھا پھر اس کے سامنے آبیٹھی۔ "کیا ارادہ تھا ڈیڈی کا؟"

"بیٹا! صاف لفظوں میں تو انہوں نے نہیں بتایا تھا' پھر بھی میں سمجھ گئی کہ آؤٹنگ کے بہانے وہ تمہیں ساجدہ بیگم کے پاس لے جاتے پھر تمہیں ان سے معافی مانگنے کو کہتے اور منگنی قائم رکھنے کی بات کرتے۔" یاسمین قصداً" سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔

"اوہ تو ڈیڈی اس لیے یہاں آئے ہیں۔" ماں کی بات سمجھ کر اس کی ساری محبت جھاگ کی طرح بیٹھ گئی' پھر تاسف سے کہنے لگی۔ "میں سمجھی شاید احساس جاگا ہے' منصف بن گئے ہیں۔ دونوں گھروں میں برابر وقت دے کر سرخرو ہونا چاہتے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو' میں سمجھنے میں غلطی کر رہی ہوں۔" یاسمین نے کن اکھیوں سے اسے دیکھ کر کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ ہونٹ بھینچ کر نفی میں سر ہلانے لگی۔

"ویسے بیٹا! مجھے بہت افسوس ہوتا ہے۔ میرا مطلب ہے جب میں رازی کو دیکھتی ہوں۔ ماشاء اللہ اچھا لڑکا ہے۔ پڑھا لکھا' سلجھا ہوا' اگر مجھے یہ یقین مل جائے کہ ساجدہ بیگم تمہارے ساتھ وہ کچھ نہیں کریں گی جو میرے ساتھ کیا تو میں خود جا کر ان سے معافی مانگ لوں۔"

"کس بات کی معافی' آپ نے کیا کیا ہے؟" وہ یکدم تیز ہو کر بولی تھی۔

"کچھ نہیں کیا پھر بھی تمہاری خاطر' تمہاری خاطر تو میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔" یاسمین یونہی کمال ہوشیاری سے اس پر گرفت کرتی تھی۔

"نہیں' آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ سختی سے کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ یاسمین کا مقصد پورا ہوگیا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر وہ پوچھنے لگی۔

"تمہاری کلاسز کب شروع ہو رہی ہیں؟"

"ہونے والی ہیں۔" اس کا ذہن اس سے پہلے والی باتوں میں الجھا ہوا تھا اس لیے بے دھیانی میں جواب دیا پھر خود کلامی کرنے لگی۔

"مجھے ڈیڈی پر حیرت ہو رہی ہے۔ ابھی تک تائی امی کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ کم از کم اپنی اولاد کے معاملے میں تو انہیں تائی امی پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔"

"قصور تمہارے ڈیڈی کا نہیں ہے بیٹا! وہ عورت بہت چالاک ہے۔" یاسمین نے فوراً" اسے ساجدہ بیگم کے خلاف اکسایا۔

"مجھے ایک بار ان کے پاس جانا پڑے گا' اور اب اچھی طرح سمجھا آؤں گی کہ آئندہ اگر اپنے بیٹے کے ساتھ میرا

نام لیا تو...“ وہ انتہائی غصے میں بول رہی تھی۔ یاسمین ایک دم کھڑی ہو گئی۔

”بس بیٹا! تم خود کو ہلکان نہ کرو۔ چلو آؤ کہیں باہر چلتے ہیں۔“

”میرا موڈ نہیں ہے آپ چلی جائیں۔“ اس کے لہجے میں اکتاہٹ تھی۔

”ارے نہیں ہمیں تو تمہاری وجہ سے کہہ رہی تھی۔ دھیان بٹاؤ‘ فریش ہو جاؤ۔ اچھا یہ بتاؤ رات کے کھانے میں کیا کھاؤ گی؟ میں خود تمہارے لیے اچھی سی ڈش بناتی ہوں؟“ یاسمین اسے بہلانے لگی۔ وہ ہنس پڑی پھر قریب آکر یاسمین کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

”آپ بہت سویٹ ہیں مما! آئی لویو۔“ یاسمین نے مسکرا کر اس کا گال تھپکا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

اور وہ ادھر ادھر نظریں دوڑا کر سوچنے لگی کہ وہ کیا کام کرنے جا رہی تھی‘ یاد نہیں آیا تو سر جھٹک کر اپنی کتابوں کا ریک سیٹ کرنے لگی۔ اس کام میں کافی حد تک اس کا دھیان بٹ گیا تھا‘ یوں بھی پڑھائی کے معاملے میں وہ بہت سنجیدہ تھی۔ جو ٹائم ٹیبل بنا لیتی اس پر سختی سے عمل کرتی تھی۔ ابھی بھی نئی کلاسز کا آغاز ہونے والا تھا اس لیے اس نے اپنی اسٹڈی کے اوقات مقرر کیے پھر نئی کتابوں کا جائزہ لیتے ہوئے وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔

دس بج گئے تھے جب سارہ کمرے میں آئی تھی۔ اپنی دھن میں مگن اس کے سامنے بیڈ پر دھم سے بیٹھی تو وہ کتاب سے سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی‘ لیکن اس کا ذہن سارہ کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

”کیا ہوا؟“ سارہ نے اس کی غائب دماغی محسوس کر کے ٹوکا تب وہ چونکی اور کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے سرسری انداز میں بولی۔

”گھوم آئیں؟“

”ہاں سچ بہت مزا آیا‘ تم بھی چلتیں نا ڈیڈی بھی بہت مس کر رہے تھے تمہیں‘ اور پتا ہے جہاں بھی گئے سب نے تمہارا پوچھا۔“ سارہ پوری روداد سنانے کو بے چین ہو گئی۔

”کہاں کہاں گئے؟“ اس کی تمام حسیات آنکھوں میں سمٹ آئی تھیں۔

”سب سے پہلے پھپھو کے گھر گئے۔ وہاں گھنٹہ بھر بیٹھے۔ بہت خوش ہوئیں امینہ پھوپھو اور آنے ہی نہیں دے رہی تھیں۔“ سارہ تفصیل سے بتانا شروع ہوئی تھی کہ اس نے ٹوک دیا۔

”اگر تم مختصراً بتا دو تو مہربانی ہو گی۔“

”بہت بور ہو تم۔“ سارہ نے برا سا منہ بنایا‘ پھر روانی سے بولنے لگی۔ ”امینہ پھوپھو کے بعد تائی امی کے پاس گئے‘ وہاں خالدہ آنٹی موجود تھیں۔ ہما اور فہد بھی تھے۔ انہیں ساتھ لے کر ڈیڈی ہمیں پی ایف میوزیم لے گئے۔ پھر ابھی مجھے یہاں چھوڑ کر ڈیڈی لوگ چلے گئے۔“

”ہاہا....“ اس نے تاسف بھری لمبی آہ کھینچ کر بیڈ کراؤن پر سر رکھ لیا یعنی یاسمین کی بات سچ تھی۔

”اس کا کیا مطلب ہے؟“ سارہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تو وہ اسے دیکھ کر بولی۔

”اچھا ہوا نا میں نہیں گئی۔“

”کیوں؟“

”خوامخواہ بدمزگی ہوتی۔“ وہ بات کو طول نہیں دینا چاہتی تھی‘ جب ہی سر جھٹکتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی پھر بالوں کو سمیٹ کر ہیر بینڈ میں قید کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”کھانا کھایا تم نے؟“

”کھانا تو نہیں دوسری بہت چیزیں کھالیں۔ اب کھانے کی گنجائش بالکل نہیں ہے۔“ سارہ نے پیروں سے

سینڈل اتارتے ہوئے بتایا‘ پھر کھڑی ہوئی تو مسکرا کر بولی۔

”رازی بھائی تمہارا پوچھ رہے تھے۔ سلام بھی کہا ہے انہوں نے۔“

”کھانا کھانا ہو تو آجاؤ۔“ وہ سارہ کی بات یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کمرے سے نکل گئی تھی۔



اماں تھوڑی دیر کا کہہ کر گئی تھیں اور گھنٹہ بھر سے اوپر ہو گیا تھا۔ ابھی تک نہیں لوٹی تھیں۔ ان کے پیچھے سال بھر کی گڈی رو‘ رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔ تاجور نے اسے چپ کرانے کے کتنے جتن کر ڈالے‘ پھر اسے کندھے سے لگا کر ٹہلتے ٹہلتے اس کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں۔ تب کہیں جا کر گڈی سوئی تھی۔ مسلسل رونے کے باعث نیند میں بھی معصوم بچی ہچکیاں لے رہی تھی۔ تاجور کو اس پر ترس آ رہا تھا اور اماں پر افسوس جو اتنی سی بچی کو چھوڑ کر جانے کس کے گھر جا بیٹھی تھیں۔

تاجور کا گڈی کے پاس سے اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا‘ لیکن تاباں کے آنے پر وہ جلدی سے برآمدے میں آگئی‘ کیونکہ تاباں پکارتی ہوئی آ رہی تھی اور اس ڈر سے کہ کہیں گڈی اٹھ نہ جائے۔ اس نے تاباں کو برآمدے ہی میں روک لیا۔

”چاچی نہیں ہے؟“ تاباں آرام سے چارپائی پر بیٹھ گئی۔

”نہیں... پتا نہیں کہاں گئی ہیں۔ شاید گمو خالہ کے گھر۔“ تاجور نے بتایا تو تاباں اس کا ہاتھ کھینچ کر بولی۔

”اچھا تو تو بیٹھ۔“ تاجور بیٹھ گئی۔

”تجھے پتا ہے چاچی میرا رشتہ لے کر آئی تھی؟“ تاباں نے پوچھا۔

”سب پتا ہے‘ تجھے تو میرے بھائی کی دلہن بنے گی۔“ تاجور خوش ہو کر بولی تو تاباں بے تابی سے پوچھنے لگی۔

”تو تو راضی ہے؟“

”لے‘ میں راضی کیوں نہیں ہوں گی۔ میرے بھائی کی خوشی ہے۔ مجھے پتا ہے بھائی تجھ سے بہت پیار کرتا ہے۔“ تاجور خوش خوش کہہ رہی تھی۔

”وہ تو کرتا ہے اور تو....“ تاباں جانے کیا جاننا چاہ رہی تھی۔

”میں بھی... مجھے بھی تو بہت اچھی لگتی ہے‘ میری بھابھی بن جائے گی تو اور زیادہ اچھی لگے گی۔“ تاجور کی خوشی میں شوخی بھی شامل ہو گئی تھی۔ تاباں جھنجلا گئی۔

”میں اپنی بات نہیں کر رہی‘ تیری مرضی پوچھ رہی ہوں‘ تجھے پتا نہیں میرے ابا نے بدلے کی شرط رکھی ہے‘ تو کرلے گی میرے ابا سے شادی؟“

”ابا سے۔“ تاجور کی ساری خوشی کافور ہو گئی۔ چہرہ بالکل سفید پڑ گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے تاباں کو دیکھے گئی۔

”چاچی آئی تھی میرے پاس۔“ قدرے رک کر تاباں بتانے لگی۔ ”بہت پریشان تھی چاچی‘ کہہ رہی تھی شمشیر کا فون آیا تھا۔ کہہ رہا تھا اگر مجھے تاباں نہ ملی تو میں مر جاؤں گا۔“

”اللہ نہ کرے۔“ تاجور دہل گئی۔

”اب بتا میں کیا کروں‘ ابا تو ایسے مانتا ہی نہیں‘ بس یہ ہی ضد ہے۔ جہاں سے لاؤں گا وہیں لڑکی دوں گا۔ یہ سارا برادری والوں کا کیا دھرا ہے۔ انہوں نے ہی ابا کو ورغلایا ہے۔“ تاباں بولے جا رہی تھی۔ تاجور کی سماعتوں میں

صرف اس کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ کیا کہہ رہی ہے' کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے تاج! شمشیر تو کبھی نہیں مانے گا اور کیوں مانے' میرے ابا کے ساتھ تیرا جوڑ تھوڑی ہے۔ مت ماری گئی ہے ابا کی۔ میرے ساتھ کہیں اور زبردستی کی تو میں کنویں میں چھلانگ ماردوں گی۔ ہاں نہیں تو....." تاباں یہ دھمکی اسے نہیں دے رہی تھی' پھر بھی وہ یک دم جیسے ہوش میں آئی تھی۔

"یہ تو کیا کہہ رہی ہے تاباں! کنویں میں چھال (چھلانگ) مارے گی؟"

"ہاں' دیکھنا یہ ہی کروں گی' اور میرے بعد شمشیر بھی زندہ نہیں رہے گا۔ دو جنازے اٹھیں گے یہاں سے۔" تاباں بہت جذباتی ہو رہی تھی۔

"اللہ نہ کرے۔" تاجور سہم کر رونے لگی۔

"لے تو ابھی سے رونے لگی' پاگل نہ ہو تو' بچا کے رکھ آنسو جب....."

"بس کر اللہ کے واسطے' چپ کر جا تاباں! اللہ میرے بھائی کو سلامت رکھے۔" تاجور آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگی۔ "میں اپنے بھائی پر ہزار بار قربان جاؤں۔ اس کی شادی تیرے ساتھ ہی ہوگی۔ تو کہہ دینا میری اماں سے بے شک میری شادی تیرے ابا سے کروے۔"

"ہیں..... پاگل تو نہیں ہو گئی۔" تاباں اچھلی تھی۔

"نہیں....." تاجور پھر رونے لگی تھی۔



سارہ بہت خاموشی سے اریبہ کو بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ جب اریبہ نے جاتے ہوئے اسے پکار کر ہاتھ ہلایا' تب اس کے سینے سے آپ ہی آپ گہری سانس خارج ہو گئی۔ پھر جواباً" ہاتھ ہلانا چاہا' لیکن اریبہ گیٹ سے نکل چکی تھی۔ اس نے چوکیدار۔ کو گیٹ بند کرتے ہوئے دیکھا' پھر گود میں رکھی کتاب اٹھالی۔ لیکن پھر جلد ہی اکتا کر کتاب سامنے ٹیبل پر ڈال دی۔

آج سارا دن اس پر عجیب سی قنوطیت سوار رہی تھی۔ کسی کام میں دل لگا نہ کسی بات میں۔ خود اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی ایسی بات ہوئی ہے' جو نہیں ہونی چاہیے تھی اور اس نے کتنی بار سوچنے کی کوشش کی' لیکن سمجھ نہیں پائی۔ اب پھر سوچنے بیٹھ گئی۔

"ایسا کیا ہوا ہے۔ آج' کل' پرسوں یا اس سے پہلے۔ ہاں ڈیڈی آئے تھے۔ لیکن انہوں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جو دل پر بوجھ بن جائے۔ پھر؟" وہ اپنے ذہن کو کھنگالنے میں پورا زور لگا رہی تھی کہ سمیر نے ہاؤ کی آواز نکال کر اسے ڈرا دیا۔ وہ اچھل پڑی' پھر خشمگیں نظروں سے اسے گھورنے لگی۔

"سوری....." سمیر نے اس کے گھورنے پر کان پکڑے' پھر اس کے سامنے چیئر کھینچ کر پوچھنے لگا۔

"کیا سوچ رہی تھیں؟"

"تمہیں بہرحال نہیں سوچ رہی تھی۔" وہ خفگی سے بولی۔

"پتا ہے۔ مجھے سوچ رہی ہوتیں تو تمہاری شکل پر بارہ نہ بجے ہوتے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرایا' پھر فوراً" سنجیدہ ہو کر پوچھنے لگا۔ "کوئی مسئلہ ہے؟"

"نہیں' کوئی مسئلہ نہیں' تم بتاؤ اس وقت کیسے آئے؟" اس نے کسی تکرار سے بچنے کی خاطر اپنا موڈ ٹھیک کرتے پوچھا۔

"ارے۔ تم تو بالکل یاسمین آنٹی کی طرح پوچھ رہی ہو' کیسے آئے۔" سمیر نے ہنس کر کہا۔ وہ سٹپٹا گئی۔

"میرا مطلب ہے۔"

"بس بس مطلب سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے اور ہاں میں خاص طور پر تم سے ملنے آیا ہوں۔ تمہیں اس پر کوئی اعتراض ہو تو بتا دو۔ ویسے میں تمہارا اعتراض قبول نہیں کروں گا' کیونکہ اپنے دل سے تمہیں جو قبول کر چکا ہوں۔" وہ خود ہی بولتا چلا گیا۔

"یا اللہ۔" اس نے سر پیٹ لیا۔ "اتنی فضول بکواس کیوں کرتے ہو۔"

"اس۔۔۔ یعنی۔۔۔" اس نے ساکت ہونے کی ایکٹنگ کی تو وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"بس خدا کے لیے سمیر! مذاق چھوڑو' مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔" سمیر نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ جس پر بیزاری کے ساتھ الجھن بھی تھی اور کیونکہ وہ کہہ چکی تھی کہ کوئی مسئلہ نہیں ہے' اس لیے وہ ٹوکنے سے باز رہا اور اپنے طور پر اس کی الجھن قیاس کر کے کہنے لگا۔

"ابھی آتے ہوئے میں نے اریبہ کو دیکھا۔ بائیک پر جا رہی تھی' کہاں گئی ہے؟"

"میں نے پوچھا نہیں' ویسے اس وقت اکثر اکیڈمی جاتی ہے' اس نے بھی تمہیں دیکھا تھا؟" اس نے جواب کے ساتھ پوچھا۔ سمیر نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔ پھر قدرے رک کر کہنے لگا۔

"تم ایسی کیوں ہو رہی ہو' بے زار' پریشان' مانا کہ میں کسی قابل نہیں ہوں' لیکن سن سکتا ہوں' محسوس کر سکتا ہوں اور۔۔۔"

"تسلی بھی دے سکتے ہو۔" وہ اس کی بات پوری کر کے مسکرائی' تو وہ روٹھ گیا۔

"مذاق اڑا رہی ہو؟"

"ہرگز نہیں۔"

"تو پھر جلدی بتاؤ کیا بات ہے۔" وہ یوں اٹینشن ہو گیا جیسے وہ فوراً" شروع ہو جائے گی۔

"کیا بتاؤں جب مجھے خود ہی پتا نہیں ہے کہ میں کس بات سے پریشان ہوں۔ بس دل پر بوجھ سا محسوس ہو رہا ہے اور یہ بھی لگ رہا ہے جیسے کوئی بات ہوئی ضرور ہے۔" وہ بولتے ہوئے اچانک چونکی۔ جیسے الجھی ڈور کا کوئی سرا ہاتھ آیا ہو اور اس سرے کو تھام کر وہ بے دھیانی میں سمیر کو دیکھے گئی۔

"کیا ہوا؟" وہ اس کی خاموشی سے جزبز ہوا۔

"ایسا نہیں ہونا چاہیے۔" وہ بے دھیانی میں ہی بولی تھی۔

"اوہو۔۔۔ اب پہیلیاں تو مت بجھواؤ۔ صاف بتاؤ کیا بات ہے۔" سمیر نے بمشکل اپنی جھنجلاہٹ پر قابو پا کر کہا۔ اس نے سر جھٹک کر پہلے خود کو بے دھیانی والی کیفیت سے نکالا' پھر کہنے لگی۔

"بات وہ ہی رازی بھائی اور اریبہ کی ہے' میرا مطلب ہے اریبہ نے گو کہ انگوٹھی واپس کر کے منگنی ختم کرنے کا اعلان کر دیا' لیکن کوئی بھی اس بات کو تسلیم نہیں کر رہا' یعنی ڈیڈی' تائی امی اور خود رازی بھائی' سب کا یہ ہی کہنا ہے کہ اریبہ میڈیکل کرے' پھر شادی ہو گی' لیکن اس روز جب میں ڈیڈی کے ساتھ تمہارے ہاں آئی تھی تو پھر ہم تائی امی کے گھر گئے تھے۔" وہ بولتے ہوئے سوچ میں پڑ گئی۔

"پھر؟" وہ پوری توجہ سے اسے سن رہا تھا۔ جب ہی اس کی خاموشی گراں گزری تو فوراً" ٹوک دیا۔

"پھر بس وہیں کچھ ایسی باتیں ہوئیں جن کی سنگینی کا ادراک مجھے اب ہو رہا ہے۔" اس کے لہجے میں تشویش سمٹ آئی تھی۔ سمیر کو غصہ آنے لگا کہ وہ اتنی لمبی بات کیوں کر رہی ہے۔ فوراً" اصل بات کیوں نہیں کہہ دیتی۔ لیکن اسے ضبط کرنا پڑا۔ کیونکہ اب وہ اصل بات جاننا چاہتا تھا۔ اس لیے نرمی سے پوچھا۔

"مثلاً"... کیا باتیں ہوئیں۔ ممانی جان نے کچھ کہا؟"

"نہیں' ثنا نے۔ وہ مسلسل میرے سامنے اپنی کزن سنبل کی تعریف کرتی رہی اور ایک دو بار یہ بھی کہا کہ وہ رازی بھائی کے لیے سنبل جیسی لڑکی چاہتی ہے۔ پھر اس نے ان ڈائریکٹ اریبہ پر تنقید بھی کی تھی۔ اب بتاؤ ان باتوں کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔" وہ آخر میں سوالیہ نظروں سے سمیر کو دیکھنے لگی تو وہ جو کتنی دیر سے خود پر ضبط کر رہا تھا ایک دم پھٹ پڑا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے۔ ایک ایسی بات کو خود پر طاری کر رکھا ہے جس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ یہ بتاؤ اریبہ اور رازی کی شادی ہو گئی تو تمہیں کتنا فائدہ ہو گا اور نہیں ہو گی تو کتنا نقصان ہو گا۔ کوئی نفع نقصان پہنچنے والا نہیں ہے تمہیں' پھر تم کیوں فکر کرتی ہو۔"

"کیسے نہ کروں' اریبہ میری بہن ہے اور رازی بھائی بے چارے۔"

"ہاں رازی بھائی بے چارے' سارے زمانے میں ایک وہ ہی تو بے چارے ہیں۔ بس کرو سارہ! یہ تمہارے سوچنے کی باتیں نہیں ہیں۔ وہ دونوں خود سمجھ دار ہیں۔ تم ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتیں۔" وہ تپے ہوئے انداز میں بولا تھا۔

"کیوں نہیں کر سکتی۔" وہ منمنائی تھی۔

"کیا کر سکتی ہو' بتاؤ؟" اس کے جارحانہ انداز پر وہ منہ پھلا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ سمیر نے ہونٹ بھینچ کر پھر خود پر ضبط کرنے کی کوشش کی' لیکن کامیابی نہیں ہوئی تو پیر پٹختا چلا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اریبہ کی کلاسز شروع ہو گئیں تو وہ پھر پہلے والی روٹین پر آ گئی' بلکہ اب اسے زیادہ محنت کی ضرورت تھی۔ مزید یہ کہ پریکٹیکلز کی وجہ سے بھی اس کا زیادہ وقت کالج میں گزرتا تھا۔ گھر آتے آتے تین' کبھی چار بج جاتے۔ پھر دو گھنٹے آرام کر کے وہ اکیڈمی چلی جاتی۔ گو کہ گھر میں بھی جب وہ کہہ دیتی تو کوئی اسے ڈسٹرب نہیں کرتا تھا۔ وہ آرام سے اسٹڈی کر سکتی تھی' لیکن اکیڈمی جانے کو وہ یوں ترجیح دیتی تھی کہ وہاں لائبریری میں اسٹڈی کا ماحول مل جاتا تھا' جس سے اگر پڑھنے کا موڈ نہ بھی ہوتا تو خود بخود بن جاتا۔ بہرحال اس وقت وہ اکیڈمی سے لوٹی تو نو بج رہے تھے۔

اسی وقت سارہ رات کا کھانا لگاتی تھی۔ اس کی پکار سے پہلے ہی وہ منہ ہاتھ دھو کر کمرے سے نکل آئی اور ڈائننگ روم کی طرف جاتے ہوئے معاً" اس کی سماعتوں سے مردانہ قہقہے کی آواز ٹکرائی تو وہ ایک دم رک گئی اور کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں پلٹ کر دیکھا کہ یاسمین کے ساتھ وہ جو کوئی بھی تھا' اس کے لیے قطعی اجنبی تھا' جو ڈرائنگ روم سے نکل رہا تھا۔

"اریبہ! تم آ گئی بیٹا۔" یاسمین نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ وہ ذرا سا مسکرائی' پھر اس اجنبی کو دیکھنے لگی تو یاسمین نے تعارف کرایا۔

"بیٹا! یہ شہباز ربانی ہیں' میرے فرسٹ کزن' آج ہی امریکہ سے آئے ہیں۔"

"او شہباز انکل۔" اس نے خوشی کا اظہار کیا۔ "مما اکثر آپ کا ذکر کرتی ہیں۔"

"اچھا۔۔۔ لیکن آپ کی مما نے آپ کا تعارف تو کرایا نہیں۔" شہباز ربانی نے اس سے کہہ کر یاسمین کو دیکھا تو وہ حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

"کیا ابھی بھی تعارف کی ضرورت باقی ہے؟ اس وقت سے میں اس کی باتیں تو کر رہی ہوں۔ خیر یہ میری بیٹی

اریبہ ہے۔"

"ماشاءاللہ..." شہباز ربانی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"کھانا لگ گیا ہے' چلو باقی باتیں ٹیبل پر۔" یاسمین ان دونوں کو چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

سارہ ٹیبل پر آخری نظر ڈال رہی تھی' جبکہ حماد کھانے کو بے قرار بیٹھا تھا۔

"واہ... مدتوں بعد اپنے کھانوں کی خوشبو ملی ہے۔ ترس گیا تھا میں۔" شہباز ربانی نے انتہائی اشتیاق سے ٹیبل پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا' پھر سارہ کو دیکھ کر پوچھنے لگے۔ "یہ سارا اہتمام تم نے کیا ہے؟"

"نہیں انکل! کھانا بوا پکاتی ہیں' ویسے مجھے بھی آتا ہے' کبھی جب بوا بیمار ہوتی ہیں تو میں پکا لیتی ہوں۔ آپ کو کیا چیز پسند ہے؟ میں خاص طور پر بنا کر آپ کو کھلاؤں گی۔" سارہ جس بے تکلفی سے بول رہی تھی اس سے وہ سمجھ گئی کہ انکل کے ساتھ اس کی نشست ہو چکی ہے۔

"گڈ اور بیٹا آپ؟ آپ کو بھی کوکنگ آتی ہے؟" شہباز ربانی نے اس سے پوچھا۔

"بس اتنی کہ اگر سب پکانے کی اسٹرائک کر دیں تو میں اپنے لیے کچھ بنا سکتی ہوں۔ ویسے مجھے کوکنگ کا شوق نہیں ہے۔" اس نے صاف گوئی سے کہا تو یاسمین مسکرا کر بولی۔

"اس کے پاس وقت بھی تو نہیں ہے۔"

"جب وقت ہو گا میں تب بھی نہیں پکاؤں گی۔" اس نے اپنی پلیٹ میں چاول نکالتے ہوئے کہا۔ پھر حماد کو کہنی مار کر کھانے کا اشارہ کر کے خود بھی کھانے میں مصروف ہو گئی۔

یاسمین اور شہباز ربانی کے درمیان پرانی باتیں چھڑ گئیں' جن میں ان کے عزیز رشتہ داروں کا ذکر تھا۔ دونوں کبھی خوش ہوتے' کبھی اداس... وہ بار بار یاسمین کا چہرہ دیکھتی جسے برسوں بعد کوئی اپنا ملا تھا جو اس کے ساتھ اس کے میکے کی یادیں شیئر کر رہا تھا۔ اس کے دل میں اپنی ماں کے لیے ہمدردی مزید سوا ہو گئی کہ وہ کتنی تنہا تھی' پھر کھانے کے بعد شہباز ربانی نے جانے کی بات کی تو وہ پوچھنے لگی۔

"آپ کا گھر کہاں ہے انکل؟"

"گھر تو ابھی نہیں ہے بیٹا! ہوٹل میں ٹھہرا ہوں۔" شہباز ربانی نے بتایا تو وہ یاسمین کو دیکھنے لگی کہ وہ انہیں روکے گی' لیکن یاسمین اس سے کہلوانا چاہتی تھی جب ہی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئی بلکہ وہ شہباز ربانی سے بولی۔

"جب تک یہاں ہو شہباز! آتے رہنا۔"

"آتے رہنا سے کیا مطلب مما! آپ انہیں جانے کیوں دے رہی ہیں۔" وہ فوراً" مداخلت کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"شہباز انکل! گھر کے ہوتے ہوئے آپ ہوٹل میں کیوں ٹھہرے ہیں؟ چلیں ابھی آپ کا سامان لے کر آتے ہیں سارہ تم انکل کے لیے کمرہ سیٹ کر دو۔"

"لیکن بیٹا!" شہباز ربانی نے کچھ کہنا چاہا' لیکن وہ سننے پر تیار ہی نہیں ہوئی اور اسی وقت ان کے ساتھ سامان لینے چل پڑی۔

تقریباً" ایک گھنٹے بعد وہ شہباز ربانی کے ساتھ واپس آئی تو سارہ گیسٹ روم میں ان کی ضرورت کی ہر شے رکھ چکی تھی۔ وہ سیدھا انہیں اسی کمرے میں لے آئی۔ ان کا سوٹ کیس اور بیگ وغیرہ الماری میں رکھے' پھر کمرے پر نظر ڈال کر کہنے لگی۔

"میرا خیال ہے انکل! آپ یہاں کمفرٹیبل فیل کریں گے۔ پھر بھی اگر کوئی پرابلم ہو تو فوراً" کہہ دیجیے گا'

ہوٹل جانے کا مت سوچیے گا۔"

"نہیں... نہیں سوچوں گا۔" شہباز ربانی محظوظ انداز میں ہنسے تھے۔

"اچھا ابھی آپ کیا پئیں گے' چائے یا کافی؟" وہ اپنی عادت کے برعکس شہباز ربانی کو بہت اہمیت دے رہی تھی' صرف یاسمین کی وجہ سے۔

"کافی..." شہباز ربانی نے اب تکلف کو خیرباد کہہ دیا۔

"بس جب تک آپ چینج کریں میں کافی بھجواتی ہوں۔" وہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل آئی۔ کوریڈور میں سارہ اور حماد کھڑے جانے کیا باتیں کر رہے تھے۔ اس نے توجہ نہیں دی اور سارہ سے کافی کا کہہ کر یاسمین کے کمرے میں آ گئی۔

"مما! شہباز انکل آ گئے ہیں۔"

"اچھا..." یاسمن نے بوجھل انداز میں اچھا کہا۔ وہ چونکی پھر قریب چلی آئی۔

"کیا بات ہے مما! کیا سوچ رہی ہیں آپ؟"

"میں سوچ رہی ہوں بیٹا! شاید تمہارے ڈیڈی کو اچھا نہ لگے' وہ شہباز کے یہاں رہنے پر اعتراض کریں گے۔" یاسمین نے خود کو انتہائی خوفزدہ ظاہر کیا۔

"کیوں اعتراض کریں گے؟ خود تو وہ اپنے سارے رشتہ داروں سے ملتے ہیں' آپ کو کیوں نہیں ملنے دیتے۔" وہ یک دم تیز ہو کر کہنے لگی۔

"آپ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے مما! ڈیڈی اگر اعتراض کریں تو کہہ دیجیے گا میں لے کر آئی ہوں انہیں' کیونکہ میں اپنے ننھیال سے تعلق جوڑنا چاہتی ہوں۔"

"بیٹا! تمہارے ننھیال میں ہے ہی کون۔" یاسمین آزردگی سے بولی تھی۔

"یہ ہی تو میں کہہ رہی ہوں' کوئی اتنا لمبا چوڑا ننھیال نہیں ہے' پھر بھولے بھٹکے تو کوئی آتا ہے' اس پر بھی اگر ڈیڈی اعتراض کریں تو..." اس نے بات ادھوری چھوڑ کر سر جھٹکا' پھر یاسمین کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہنے لگی۔

"آپ ذرا' ذرا سی بات پر پریشان ہو جاتی ہیں مما! اور ایسی پریشان صورت لے کر شہباز انکل کے سامنے جائیں گی تو وہ کیا سمجھیں گے۔"

"کہاں ہے شہباز؟" یاسمین کو جیسے اب شہباز ربانی کا خیال آیا ہو۔ اس انداز میں پوچھا۔

"گیسٹ روم میں' چلیں آپ اپنا موڈ ٹھیک کریں اور جا کر ان کے ساتھ کافی پئیں۔" اس نے کہہ کر یاسمین کا گال چوما' پھر اس کے ساتھ ہی کمرے سے نکلی تھی۔



وہ بہت دیر سے کیلنڈر پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ دو دن بعد اریبہ کی برتھ ڈے تھی اور اس کی نظریں اسی تاریخ پر تھیں' جبکہ ذہن مسلسل یہ سوچنے میں مصروف تھا کہ وہ اسے کیسے وش کرے۔ اس سے پہلے تو وہ امریکہ میں تھا اور اتنی دور سے بھی اس کی برتھ ڈے کو یادگار بنایا کرتا تھا' اسے گفٹ بھیجتا' پھر اس رات اسے طویل کال کرتا تھا۔ ڈھیروں باتیں ہوتیں' مستقبل کے خوب صورت پلان بنتے اور اس دوران دونوں میں کہیں کہیں اختلاف بھی ہو جاتا تو پہلے دونوں اپنے اپنے موقف پر ڈٹے رہتے' پھر ایک دم کوئی ہتھیار ڈال دیتا۔ یہ نہیں تھا کہ ہمیشہ اسی نے ہتھیار ڈالے ہوں' اریبہ بھی زیادہ نہیں اڑتی تھی۔ اور اب جانے وقت نے کیسی کروٹ بدلی تھی کہ وہ لڑکی کچھ

سننے ماننے پر تیار ہی نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ اس کی برتھ ڈے سلیبریٹ کرنا چاہتا تھا اور اس وقت اسی فکر میں تھا کہ ایسا کیا کرے جو اریبہ وہ ہی پہلے والی اریبہ بن جائے۔ گزشتہ سال جب وہ امریکہ سے فون پر اسے وش کررہا تھا تو اس نے کہا تھا۔

"پتا ہے رازی! آج سارا دن میں کیا سوچتی رہی؟"

"کیا؟"

"کہ کتنا مزا آئے جو آج تم اچانک آجاؤ اور میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر ہیپی برتھ ڈے کہو اور یہ صرف سوچ ہی نہیں تھی، مجھے ایسا لگ بھی رہا تھا کہ تم ضرور آؤ گے، پھر پتا ہے میرا سارا دن انتظار میں گزرا۔ جتنی بار ڈور بیل بجی میں بھاگ کر گئی۔" اس کے لہجے میں فاصلوں کی چبھن اور قربتوں کی تمنائیں۔

"اچھا... فرض کرو میں آجاتا تو۔" وہ اس کے جذبات محسوس کرتے ہوئے خود بھی کھو سا گیا تھا۔

"تو آج میری زندگی کا سب سے حسین دن ہوتا۔ ہم سرِ شام سے ہی باہر نکل جاتے، رات میں کینڈل لائٹ ڈنر کرتے اور اس وقت تو رازی ہم لانگ ڈرائیو پر ہوتے، ہے نا۔"

"ہوں..." اس کا بس نہیں چل رہا تھا اسی وقت اڑ کر اس کے پاس پہنچ جائے۔

"کتنی پاگل ہوں میں۔ پتا نہیں کیا کیا سوچتی رہی ہوں۔" وہ یکدم چونکتے ہوئے بولی تھی۔

"تمہارے پاگل پن نے میرا قرار لوٹ لیا ہے ربا! میں آجاؤں گا، جلدی آجاؤں گا اور جیسا تم نے سوچا ہے سب ویسا ہی ہوگا۔"

"بہلا رہے ہو۔" اس کی آواز میں ہلکا سا شکوہ تھا۔

"نہیں... تم دیکھنا۔" اس نے کہا تھا اور اب وہ اس کی سوچ سے زیادہ اس دن کو خوب صورت بنانا چاہتا تھا، لیکن اسے کیسے منائے۔ پتا نہیں وہ اس کے ساتھ پر آمادہ ہوگی بھی کہ نہیں۔ اسی فکر میں وہ مقررہ دن اس کے گھر پہنچ گیا۔

اریبہ اس وقت اکیڈمی جانے کی تیاری کررہی تھی۔ اس سے پہلے کہ اس کی طرف متوجہ ہوتی وہ اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے بولا۔

"ہیپی برتھ ڈے۔" ایک پل کو تو وہ اپنی جگہ ساکت ہوگئی تھی، پھر ایک دم اس کے ہاتھ جھٹک کر ترشی سے بولی۔

"یہ کیا حرکت ہے؟"

"کیوں؟ کیا میں تمہیں وش نہیں کرسکتا، کزن ہوں تمہارا۔" اس نے کچھ جتانے کی کوشش نہیں کی اور سیدھے سادے انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے، لیکن یہ طریقہ غلط ہے، بہرحال تھینک یو۔" وہ نروٹھے پن سے کہہ کر اپنا بیگ چیک کرنے لگی۔

"کہیں جارہی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہوں..." اریبہ نے بیگ کی زپ کھینچی، پھر اسے دیکھ کر کہنے لگی۔ "میری برتھ ڈے یاد رکھنے کا شکریہ۔ سارہ کیک بنارہی ہے، کھا کر جانا، میں تو خیر دیر سے آؤں گی۔"

"کیا مطلب، اپنی برتھ ڈے کا کیک تم نہیں کاٹو گی؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"اچھا میں چلتی ہوں۔" اریبہ نے شاید اس کی بات کا جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ وہ جزبز ضرور ہوا، پھر بھی فوراً اس کے پیچھے بھاگا آیا تھا۔

"سنو، تم اس وقت میرے ساتھ چل رہی ہو۔"

"کہاں؟" اریبہ کے تیور کڑے تھے۔

"بس جہاں میں لے چلوں۔" اس نے کہنے کے ساتھ اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ گرفت اتنی مضبوط تھی کہ اریبہ نے زبانی احتجاج کے ساتھ پورا زور لگا لیا، لیکن اپنا ہاتھ نہیں چھڑا سکی اور اس نے نتیجے کی پروا کیے بغیر زبردستی اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر گاڑی دوڑا دی۔

"بہت ہیرو بننے کا شوق ہے تمہیں۔ کچھ بھی کرلو میری نظروں میں تم زیرو ہو، زیرو ہی رہو گے۔"

وہ دانت پیس رہی تھی، رازی نے ویو مرر میں اسے دیکھا، پھر اس کا ہاتھ چھوڑ کر کہنے لگا۔

"مجھے یقین ہے تم چلتی گاڑی سے چھلانگ لگانے کی بات نہیں کرو گی، کیونکہ تم بہت کم ہمت لڑکی ہو۔"

"کیا..." وہ مزید چیخی تھی۔

"فرار اختیار کرنے والے کم ہمت ہی کہلاتے ہیں۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی ہے تو اس کا جواب دو۔ تعلق توڑ لینا تو..." رازی نے قصداً بات ادھوری چھوڑ کر اسے دیکھا۔

"میرے نزدیک یہ ہی بہتر جواب ہے۔" وہ زہرخند لہجے میں بولی تھی۔ رازی اندر سے مضطرب ہوگیا تھا، جب ہی خاموشی اختیار کرلی تو قدرے رک کر وہ طنز سے پوچھنے لگی۔

"کیوں تمہیں میرا جواب پسند نہیں آیا؟"

"بس چھوڑو اس بات کو، تم نے جو کرنا تھا کرلیا، اب مجھے بھی کچھ اپنے دل کی کرنے دو۔" اس نے ضبط کی اذیت سہہ کر خود کو مصالحت پر آمادہ کیا تھا۔

"ضرور کرو، جو تمہارا دل چاہے کرو، لیکن اپنے دل کی خواہشات میں مجھے شامل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آخر تم یہ بات سمجھ کیوں نہیں لیتے۔"

وہ جیسے زچ ہو کر بولی۔

"کیا کروں، دل سمجھنا ہی نہیں چاہتا اور کیسے سمجھے، ایک دو دن کی بات تو نہیں ہے۔ برسوں محبت کے نشے میں مدہوش رہا اور اپنے آپ نہیں، ادھر سے جام لٹائے گئے۔" ونڈ اسکرین پر جمی اس کی آنکھوں میں گئے دنوں کا عکس جھلملانے لگا تھا۔

اریبہ کے اندر اتھل پتھل ہونے لگی، اور یہ ہی سچ تھا کہ وہ لاکھ خود کو اس سے متنفر ظاہر کرتی اس کا دل محبت کی لے پر مچلتا ضرور تھا، پھر اسے سمجھانے سنبھالنے میں بھی کچھ وقت ضرور لگتا تھا۔

"اگر محبت کا جام نہیں پلا سکتیں تو زہر کا پیالہ دے دو مجھے۔ قصہ ہی ختم ہوجائے گا۔"

رازی نے کنکھیوں سے اس کا چہرہ دیکھا، جس پر کوئی الگ ہی رنگ اتر رہا تھا، نہ سمجھ میں آنے والا اور اس نے پلکوں کو بھی دو، تین بار یوں جھپکا جیسے کسی منظر کو جھٹلانا چاہتی ہو، پھر جب بولی تو لہجے میں وہ طنطنہ بھی نہیں تھا۔

"قصہ ختم ہوچکا رازی! اگر تم اس حقیقت کو تسلیم کرلو تو پھر تمہیں جام کی ضرورت محسوس ہوگی، نہ زہر پیالے کی۔"

"تم بہت سنگدل ہو۔" رازی کے سینے سے گہری سانس خارج ہوئی، پھر کچھ سوچ کر اس نے راؤنڈ اباؤٹ سے گاڑی واپسی کے راستے پر ڈال دی تھی۔



"السلام علیکم!" سمیر نے لاؤنج میں داخل ہو کر سلام کیا، لیکن پھر ثنا کے ساتھ سنبل کو بیٹھے دیکھ کر کچھ ہچکچا کر وہیں رک گیا تھا۔

"آجاؤ کوئی پردہ نہیں ہے' یہ میری سنبل آپی ہیں۔ میرا خیال ہے پہلے تمہاری ان سے ملاقات ہو چکی ہے۔ سنبل آپی! آپ جانتی ہیں اسے امینہ پھوپھو کا بیٹا ہے سمیر۔" ثناء نے اس کے رکنے پر تفصیلاً" بتایا۔

"وہ بلال ہے؟" اس نے سنبل کو تصدیق یا تردید کی زحمت سے بچالیا۔

"بلال تو نہیں ہے اور رازی بھائی بھی ابھی آفس سے نہیں آئے' لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم کھڑے کھڑے واپس چلے جاؤ۔ بیٹھو' امی نماز پڑھ رہی ہیں' فارغ ہو جائیں تو ان سے مل لینا۔"

ثنا کو بے مروتی دکھاتے ہوئے جانے کیا خیال آیا جو رواداری نبھانے لگی۔

"شکریہ..." اسے سنبل کی وجہ سے اخلاقاً" کہنا پڑا۔ ورنہ اس گھر میں اس کا کوئی ایسا تکلف نہیں تھا۔

"ارے! تم تو خاصے مہذب ہو گئے ہو۔" ثنا ہنسنے لگی' اس نے گھور کر اسے دیکھا' پھر سنبل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"آپ کیسی ہیں؟"

"اچھی ہوں' تمہاری امی اور بہن ٹھیک ہیں؟" سنبل نے مسکرا کر پوچھا۔

"جی! آپ بھی ہمارے ہاں آئیے نا۔" اس نے پھر اخلاق کا مظاہرہ کیا' اصل میں تو وہ یہ دیکھنے آیا تھا کہ سارہ نے جو محسوس کیا اس میں کتنی سچائی ہے۔

"ہاں صبح رازی بھائی بھی کہہ رہے تھے تمہاری طرف جانے کو' آئیں گے ہم لوگ' سنبل آپی چلیں گے۔" ثنا کو جیسے موقع مل گیا تھا' رازی کے ساتھ سنبل کو ملانے کا۔

"ہاں رازی بھائی سے بھی بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی' کیا بہت دیر میں آتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"اکثر دیر سے ہی آتے ہیں' لیکن آج تو جلدی آجائیں گے۔" ثنا نے کہتے ہوئے شرارت سے سنبل کو دیکھا۔ سنبل کے ہونٹوں پر شرمیلی مسکراہٹ سج گئی اور ثنا کو کہنی مار کر گھورنے لگی — وہ نہ صرف حیران ہوا بلکہ وہاں بیٹھنا مشکل ہو گیا تو اٹھ کھڑا ہوا۔

"میرا خیال ہے ممانی جان نے نماز پڑھ لی ہو گی۔ میں ان سے مل لوں۔"

"چلو میں جب تک چائے بناتی ہوں' پیو گے نا؟" ثنا نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر ساجدہ بیگم کے کمرے میں آگیا۔

"السلام علیکم ممانی جان!"

"خوش رہو! بڑے دنوں بعد آئے' گھر میں سب خیریت ہے؟" ساجدہ بیگم نے دعا کے ساتھ پوچھا۔

"جی! آپ تو آتی ہی نہیں ہیں۔" وہ ان کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

"کیا کروں بیٹا! گھٹنوں کی تکلیف نے کہیں آنے جانے کے قابل نہیں رکھا' بالکل گھر کی ہو کر رہ گئی ہوں۔ تم ابھی آرہے ہو؟" ساجدہ بیگم نے اپنی معذوری ظاہر کرتے پوچھا۔

"کچھ دیر ہوئی ممانی جان! آپ نماز پڑھ رہی تھیں اس لیے میں وہاں لاؤنج میں بیٹھ گیا۔"

"چائے پی..." ساجدہ بیگم کے لہجے میں اچانک جو مٹھاس گھلتی تھی' وہ مغلوب کر دیتی تھی۔

"ثنا بنا رہی ہے۔"

"اچھا... اچھا تم آرام سے بیٹھو' طیبہ کیسی ہے' اسے بھی لے آتے۔" ساجدہ بیگم نے کھسک کر اس کے لیے مزید جگہ بناتے ہوئے کہا۔

"میں ابھی گھر سے نہیں آرہا' ویسے کسی دن لے آؤں گا طیبہ اور امی کو۔" اس نے کہا تب ہی ثنا چائے لے کر آگئی اور ٹرے اس کے اور ساجدہ بیگم کے درمیان رکھ دی۔

"شکریہ..." وہ چائے کا کپ اٹھاتے ہی ثنا کو دیکھ کر اب شرارتاً" مسکرایا تھا۔

"بس رہنے دو' پتا ہے کتنے تمیزدار ہو' ابھی سارے پول کھول دوں گی۔" ثنا نے فوراً" ٹوک کر معنی خیز انداز میں کہا' تو وہ سٹپٹا گیا۔

"کیا مطلب؟"

"پول کا مطلب نہیں پتا تمہیں؟" ثنا اس کے سٹپٹانے سے مزید شیر ہو گئی۔

"نہیں' میرا مطلب ہے کون سے پول؟ کیا' کیا ہے میں نے؟" وہ جی کڑا کر کے بھی ہکلایا تھا۔ صرف ساجدہ بیگم کی وجہ سے ورنہ ثنا سے خائف ہونے والا نہیں تھا۔

"بتا دوں؟" ثنا نے دھمکایا تب ہی۔ ساجدہ بیگم نے ثنا کو ٹوک دیا۔

"کیوں اس کے پیچھے پڑی ہو' جاؤ اپنا کام کرو' بیٹا تم چائے پیو۔"

"جی..." وہ چائے کا بڑا سا گھونٹ لے کر کنکھیوں سے ثنا کو جاتے ہوئے دیکھنے لگا' پھر دوسرے گھونٹ میں کپ خالی کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا ممانی جان! میں چلتا ہوں۔"

"کیوں بیٹا! آئے ہو تو بیٹھو' آرام سے جانا۔" ساجدہ بیگم نے محبت سے کہا۔

"پھر آؤں گا ممانی جان! ابھی ایک کام سے جانا ہے۔" اس نے بہانہ کیا اور انہیں خدا حافظ کہہ کر کمرے سے نکل آیا۔

ثنا پھر وہیں سنبل کے ساتھ بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ وہ خاموشی سے نکل جانا چاہتا تھا' لیکن ثنا کی ہنسی نے اس کے قدم روک لیے' کیونکہ صاف محسوس ہوا تھا کہ وہ اسی پر ہنسی تھی۔

"ہاں اب بولو' کیا کہہ رہی تھیں؟" وہ سنبل کی موجودگی یکسر نظرانداز کر کے براہ راست ثنا کو دیکھنے لگا۔

"ارے واہ' امی کے سامنے تو بھیگی بلی بنے ہوئے تھے۔" ثنا نے پھر مذاق اڑایا۔

"اسے ادب کہتے ہیں' تم بھی سیکھ لو' بہت ضروری ہے' چلتا ہوں۔" اس نے حتی الامکان لہجے کو نارمل رکھ کر کہا اور جانے کے لیے قدم بڑھایا ہی تھا کہ ثنا بول پڑی۔

"رازی بھائی سے نہیں ملو گے' بس آنے والے ہیں۔"

"آجائیں تو انہیں میرا اسلام کہہ دینا۔ میں پھر چھٹی کے دن آؤں گا۔" وہ قصداً" مسکرایا' پھر جاتے جاتے پلٹ کر بولا۔

"ویسے رازی بھائی ابھی نہیں آئیں گے' دیر ہو جائے گی انہیں۔"

"یہ تم کیسے کہہ رہے ہو؟" ثنا اپنے اندر اس کے لیے جانے کیا بغض لیے بیٹھی تھی جو مسلسل اسے زچ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"یہاں آتے ہوئے وہ مجھے اریبہ کے ساتھ نظر آئے تھے۔ آج اریبہ کی برتھ ڈے ہے نا۔"

اس نے بڑے آرام سے ثنا کے اندر آگ لگا دی اور تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

سمعیہ رئیس

رنگ زندگی کے

"بات سنو! تم آخر کب تک یونہی پھوپھو جانی کو ٹالتی رہوگی؟" کافی عاجز آکر عصمت نے رانیہ سے پوچھا۔

"جب تک ہے دم میں دم۔۔۔" وہ ہلکے سروں میں جواباً گنگنائی۔

"بہت خوب۔۔۔ پھوپھو جانی کا دم تمہارے اندر اٹکا ہوا ہے اور ایک تم ہو کہ اثر ہی نہیں ہے۔" عصمت کو اس کی بے نیازی پر شدید غصہ آیا۔

"تو تمہارا کیا مطلب ہے۔۔۔ کیا میں اتنی ہی ارزاں اور غیر اہم ہوں کہ سب کے بے وقوفانہ مشوروں پر عمل کرکے آنکھوں دیکھی مکھی نگل لوں؟" رانیہ نے بالکل اچانک ہی موڈ بدلا اور انتہائی ناراضی سے عصمت کو گھورا۔

"اب میرے کہنے کا یہ مطلب تو نہیں۔" وہ اس کے اچانک حملے پر خاصی گھبرا گئی۔

"ممانی کو تمہاری فکر تو ہے نہیں کہ تم تو ہو ہی ٹھیکرے کی مانگ اور بوڑم لڑکیوں کی طرح دل و جاں سے اپنے اس پینڈو منگیتر کو قبول بھی کرلیا ہے، جس کے نہ بات کرنے کا اسٹائل ہے اور نہ ہی کوئی پرسنالٹی۔" رانیہ نے براہ راست اس کی ذات پر حملہ کردیا۔

"بہت ہوگئی۔۔۔ نہیں شادی کرنی تو نہ کرو۔۔۔ براہ کرم میرے منگیتر کو بیچ میں گھسیٹنے کی ضرورت نہیں۔" عصمت تڑپ کر بولی۔

"او۔۔۔ ہو۔۔۔ لگ گئی نا تیر کی طرح سیدھی جا کر دل پر۔ تمہارا پینڈو تو بڑا ہی خوش قسمت ہے جسے شکل و صورت اور پرسنالٹی نہ ہونے پر بھی اتنی اچھی بیوی ملے گی۔"

رانیہ کی ڈھٹائی عروج پر پہنچ گئی اور وہ عصمت کی خجل حالت دیکھ کر مزے لے رہی تھی۔ عصمت اسے ناصح بن کر سمجھانے بجھانے آئی تھی، مگر اب الٹا اس کے ہاتھوں مذاق کا نشانہ بن کر کھسیا کر رہ گئی تھی۔

"اگر تمہارے پاس دیکھنے والی آنکھ ہوتی نا تو میں تم سے پوچھتی، مگر تم تو سدا کی ظاہر پرست لڑکی ہو، ویسے بھی ہر ایک کا اپنا اپنا حُسن نظر ہوتا ہے۔" عصمت نے خود کو سنبھال کر کافی ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس کی بات کا خاطر خواہ جواب دیا۔

"او۔۔۔ ہو۔۔۔" رانیہ نے حسب عادت لمبی سی طنزیہ "اوہو" کرکے پھر اس کا مذاق اڑایا۔

"اب اخلاقیات کا سہارا لے کر اپنا دفاع کرنا شروع کردو، صرف اس بونگے کے لیے، جو خالہ امی کی فرمائش پر آستینیں چڑھا کر دھڑا دھڑ مرغیاں ذبح کرنا شروع دیتا ہے۔ کھانا کھانے کے بعد لمبی سی ڈکار لیتا ہے اور ایک ہفتے پرانے سوٹ میں ملبوس بھی اکڑا اکڑا پھرتا ہے۔ ہاں بھئی اکڑے گا کیوں نہیں، بیٹھے بٹھائے اتنی حسین جمیل بیوی جو مل گئی۔" رانیہ اسے بخشنے پر تیار نہ تھی۔

"توبہ ہے! تم سے جیتنا مشکل ہے۔ میری ہی مت ماری گئی تھی جو تمہیں سمجھانے چلی آئی۔" عصمت اس کی غیر سنجیدگی محسوس کرکے بولی۔ رانیہ نے بے ساختہ قہقہہ بلند کیا۔

"تو تم مجھے چھوٹی خالہ کے عمیر کے لیے کنوینس کرنے آئی تھیں؟" اس نے خود ہی موضوع نکالا۔

"تو کیا برائی ہے عمیر بھائی میں؟ جانے پہچانے اچھے بھلے لوگ ہیں مگر تمہاری "نہیں" کی رٹ سمجھ میں نہیں آئی۔" عصمت اکتا کر بولی۔ اس کی دلچسپی بالکل ختم ہوگئی تھی کیونکہ جس جوش و خروش سے وہ رانیہ کو راضی کرنے آئی تھی، وہ اس کی اوٹ پٹانگ باتوں سے ختم ہوگیا تھا۔

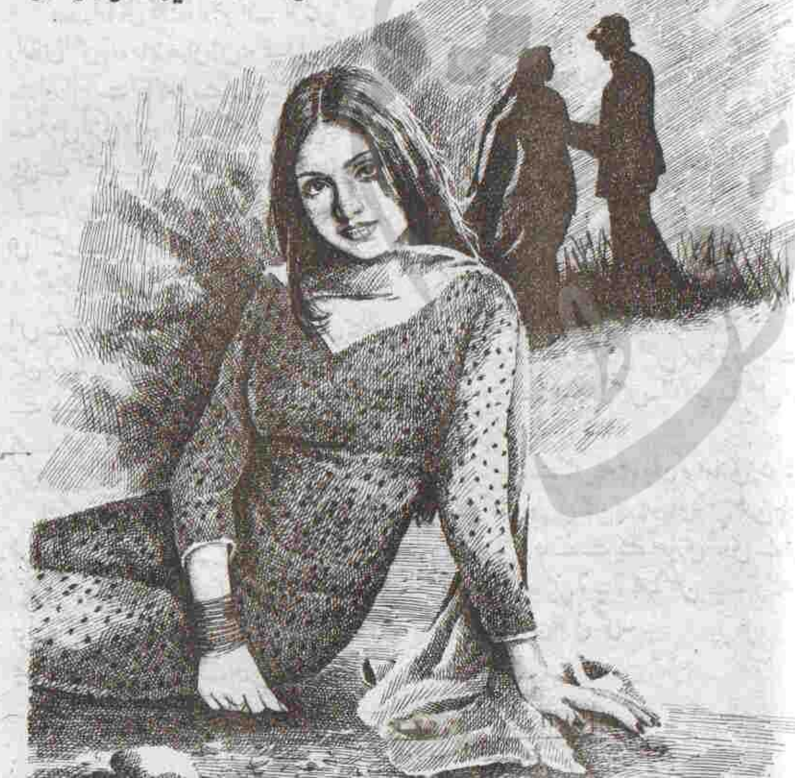
"چوٹ صرف پتھر مارنے سے تو نہیں لگتی۔" وہ ایک دم سنجیدہ ہوگئی۔

"کیا مطلب۔۔۔" عصمت بالکل نہ سمجھی۔

"بھئی دیکھو! مجھے نیچر وائز وہ لوگ سخت ناپسند ہیں۔ ان کے گھر کا ماحول بھی اسی قسم کا ہے، نوک جھونک تو الگ بات ہوتی ہے، وہاں تو بات بات پر طنز کے نشتر چبھوئے جاتے ہیں۔ اوچھی فقرے بازی سے دل دکھایا جاتا ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ عمیر بھی کتنا طنزیہ بولتا ہے۔ کبھی کبھار تو بالکل آپاؤں کی طرح زنانہ انداز اختیار کرلیتا ہے۔" اس نے صاف صاف بتادیا۔

"تم اتنی باریک بینی سے جائزہ لیتی رہوگی تو ساری عمر کنواری ہی رہ جاؤ گی۔ مجموعی طور پر چھوٹی ممانی کا گھرانہ اچھا بھلا اور خاصا خوش حال بھی ہے۔" عصمت نے کندھے اچکائے۔ "اب تمہارے لیے آسمان سے کوئی شہزادہ اتر کر تو آنے سے رہا۔" عصمت کو اس کے خیالات پر افسوس ہوا۔

"لیکن پھر بھی بندہ کچھ تو چارمنگ ہو۔۔۔ عمیر صاحب تو خود سے بھی بے خبر، مجهول بنے خدمت خلق کرتے پھرتے ہیں۔ کبھی بڑی ممانی کو



سودا لا کر دے رہے ہیں تو کبھی اپنے پھوپھا جان کی گاڑی کا ٹائر بدل رہے ہیں۔ بولنے کا انداز بھی بہت غیر شائستہ ہے کم از کم مجھے ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے، جس کا اپنا ایک امیج ہو اور کچھ اسٹیٹس بھی ہو۔" اس نے قطعی طور پر اپنی ناپسندیدگی ظاہر کر دی۔

حد کر دی تم نے۔ پھوپھو جان تمہاری طرف سے اتنی فکر مند ہیں۔ ان کی حج کی درخواست منظور ہونے کے چانسز ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ اپنی پیاری دختر نیک اختر کو رخصت کر کے حج کے لیے روانہ ہوں اور تم ہو کہ..." عصمت بڑبڑا کر رہ گئی۔

"تو بھئی ان کی جلدی کی وجہ سے میں خود کو قربان تو نہیں کر سکتی نا۔" رانیہ لاپروائی سے بولی۔ عصمت نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"تمہارے چچا کے لڑکے عزیز میں کیا برائی تھی؟ تم نے اس بے چارے کو بھی ریجیکٹ کر دیا۔" عصمت وجہ جاننے پر مصر تھی۔

"وہ... اوہ مائی گاڈ...! ادھر آؤ... آؤ میں تمہیں دکھاؤں ابھی تو وہ سانڈ گھر ہی میں ہو گا۔ ایک تو کھاتا اتنا ہے اور اوپر سے اتنا پھوہڑ ہے کہ... یہ دیکھو..." اس نے قریبی کھڑکی کا پردہ سرکایا، نیچے واش بیسن پر جھکا عزیز بڑی بے تکلفی سے غرارے کر رہا تھا۔ بڑی بڑی کلیاں کر کے اس نے تولیے سے منہ پونچھنے کے بجائے اپنی ہی آستین سے منہ رگڑ لیا۔

"دیکھا تم نے... کتنا بے ہودہ انداز ہے اس کا؟" وہ اس کے کان میں بولی۔ قریب ہی چھوٹی سی گول میز اور تین کرسیاں پڑی تھیں۔ میز پر اس کے لیے پہلے ہی سے چائے اور ناشتہ رکھا ہوا تھا۔ اس نے کافی عجلت بھرے انداز میں پراٹھے کے چار ٹکڑے کر کے انہیں کھانے کے بجائے نگلنا شروع کر دیا۔

"دیکھا اس کو... چار نوالوں ہی میں سارا پراٹھا ٹھونس لیا۔ کیا اب بھی کچھ کہنے کو باقی رہ گیا ہے؟ اب کچھ دیر بعد یہ اسی کرسی پر پسر کر اخبار پڑھے گا اور ساتھ ہی خلال سے دانت کرید کر ادھر اُدھر "پھو پھو" کر کے پھوسڑ اڑاتا رہے گا۔ اس کے بعد اپنی چپل کو پاؤں میں ڈال کر گھسیٹ گھسیٹ کر چلے گا جیسے کہ ٹانگوں میں دم ہی نہیں ہے۔ زہر لگتے ہیں ایسے لوگ مجھے... کم از کم زندگی میں کچھ ڈھنگ، اصول اور طریقے ہونے چاہئیں۔ مجھے اچھے انداز و اطوار قبول ہیں۔ دولت کو میں اتنی اہمیت نہیں دیتی۔ کم از کم بندہ برداشت کے قابل تو ہو۔ دیکھنے میں بھی اچھا لگے۔ اس کا کردار اچھا ہو اور کچھ مردوں والی شان بھی ہو۔" اس نے اپنا نقطہ نظر واضح کر دیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے رانیہ! تم بھی ایک طرح سے صحیح سوچ رہی ہو، لیکن ہمارا معاشرہ دراصل ایسے ہی مردوں سے بھرا پڑا ہے۔ ویسے بھی کسی ایک شخص میں تمام خوبیاں تو اکٹھی نہیں ہو سکتیں ناں! دو خوبیاں ہوتی ہیں تو دو خامیاں بھی ہوتی ہیں۔ بہرحال کمپرومائز تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ اسی طرح زندگی خوب صورت ہوتی ہے ورنہ وبال بن جاتی ہے۔" عصمت نے بہت دھیرے دھیرے اس کے بال سنوارتے ہوئے حقیقت سے آگاہ کیا۔

"لیکن کوشش تو بہرحال جاری رکھنی چاہیے۔ میں اسٹیٹس سے زیادہ معقول عادتوں اور ایک صاف ستھری پرکشش اور بااصول زندگی کو فوقیت دوں گی۔ "جس کا کام اسی کو ساجھے" لیکن یہاں کے مردوں کی تو ہر کام میں گھسنے کی عادت ہے۔ ککنگ میں بھی گھس جائیں گے تو گھریلو باتوں میں بھی انوالو ہو جاتے ہیں۔ مرد کا کام ہے کمانا، گھر چلانا اور بیوی بچوں کی کفالت کرنا۔ عمیر اور عزیز کی طرح گھر کے چھوٹے موٹے دھندے نمٹانا اور کچن میں گھس کر ہنڈیا روٹی سے نبرد آزما ہونا مجھے بالکل پسند نہیں۔" رانیہ نے کھل کر اس پر واضح کر دیا۔

"ٹھیک ہے، میں پھوپھو جان کو تمہاری پسند ناپسند سے آگاہ کر دوں گی لیکن پھوپھو جان جس طرح چاہ رہی ہیں کہ حج پر جانے سے پہلے تمہاری شادی کے فرض سے نمٹ جائیں تو یہ تو پھر ناممکن ہے۔" عصمت بالکل ہی مایوس ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس روز وہ کافی دیر سے اٹھی تھی۔ گھڑی پر نظر پڑی تو اچھل گئی۔ دس بج رہے تھے۔ آج کالج جانے سے بھی رہ گئی تھی۔ دھوپ نکل آئی تھی اور صحن کے ایک حصے کو گرماتی ہوئی اب اس کی شعاعیں اس کی کھڑکی پر دستک دے رہی تھیں۔ وہ کسلمندی سے باہر چلی آئی۔ باہر سارے معمولات روز کی طرح جاری و ساری تھے۔ سالن بھوننے کی خوشبو نتھنوں میں گھسی چلی آ رہی تھی۔ اس سے چھوٹی بہن ثمانہ نے آٹا گوندھ کر پرات ڈھک دیا تھا۔ عرصے سے اس گھر میں یہی معمول چلا آ رہا تھا کہ علی الصبح ہی کھانا پکانے کے کام سے فراغت حاصل کر لی جاتی تھی۔ اس کی امی نے اب تک اپنی ساس کے اصول کو اپنا رکھا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ جب رانیہ کی دادی کے راج میں ان کی سب بہوئیں یہیں رہتی تھیں، مگر اب نہ دادی رہی تھیں اور نہ ہی ان کا وہ راج پاٹ رہا تھا۔ رانیہ کے بڑے تایا نے دادی کے انتقال کے کچھ عرصے بعد اپنا گھر الگ کر لیا تھا۔ اب نچلی منزل پر رانیہ کے دونوں چچا رہائش پذیر تھے اور اوپری منزل پر رانیہ کے امی ابو کا قیام تھا۔ اس کی دونوں چچیاں اور امی آپس میں بہت میل محبت سے رہتی تھیں، گو کہ انہوں نے اپنا چولہا چوکی علیحدہ کر لیا تھا۔ مگر اکثر جمعہ کے روز سب اکٹھے کھانا کھاتے تھے یا پھر کسی روز کسی خاص پکوان کا اہتمام ہوتا تو سب ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے تھے۔ سب لوگ ایک دوسرے کے خیالات و احساسات کا بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ایکا اور یگانگت بھی اسی طرح قائم تھی۔

تینوں گھروں کا آپس میں میل جول اس حد تک تھا کہ بنا کہے یا پوچھے ناشتہ یا کھانا کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت بھی اس کے چچا کا بیٹا عزیز میز پر بیٹھا بڑی رغبت سے ناشتہ کر رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر بدمزا سی ہو گئی۔ ابھی کچھ دن پہلے تک عزیز اس کا طلب گار تھا اور اس کے صاف انکار کے بعد بھی بڑی ڈھٹائی سے اس نے رشتہ استوار کر رکھا تھا بلکہ اب تو سب نے مل کر اس کا ریکارڈ لگا رکھا تھا۔

"وہ... غلطی ہو گئی۔" اسے دیکھ کر عزیز نے حواس باختہ نظر آنے کی کوشش کی اور فوراً" ہی ہاتھ میں تھمے مگ کو بہت دھیان سے اس کی ڈنڈی کی طرف سے پکڑا کیونکہ وہ عموماً" مگ کو دوسری طرف سے انگلیوں سے پکڑتا تھا۔

"ارے بھئی ہم تو بڑے رف لوگ ہیں اور پبلک کو شاید ایسے لوگ پسند نہیں۔" اس نے فوراً" اس پر چوٹ کی اور ہنسی چھپانے کے لیے مگ لبوں سے لگا لیا۔ پاس کھڑی ثمانہ کھی کھی کر کے ہنس پڑی۔ رانیہ کی جان جل گئی۔ سب نے ہی اس کا پیچھا لے لیا تھا۔ نیچے چچا کی طرف چلی جاتی تو ان کا چھوٹا بیٹا فوراً" ہاتھ سے چھری اور آلو رکھ کر مونچھیں مروڑنے لگتا۔

"مردوں کو بھلا یہ کام کہیں زیب دیتا ہے۔"

چھوٹے چچا کا فرید اسے دیکھتے ہی کپڑے دھونا بند کر دیتا۔ "بھئی جس کا کام اسی کو ساجھے۔ رانیہ! ذرا میری ایک شرٹ تو کھنگال دو۔" وہ عاجزی سے کہتا۔ رانیہ تپ جاتی۔

"میں تمہاری نوکر نہیں ہوں۔" وہ برا سا منہ بنا کر کہتی۔

"اوہو، اچھا بھئی! میں تو بھول ہی گیا کہ صاحب لوگوں کو تو نوکروں کی عادت ہوتی ہے۔" وہ مزید سلگا دیتا۔

سارے گھر میں اس کی انوکھی پسند کی دھوم مچ گئی تھی۔

"اتنا پرفیکٹ بندہ تو شاید اللہ تعالیٰ کسی خصوصی سانچے میں ڈھال کر بھیجے گا۔" کسی کزن نے تو نخوت سے یہاں تک کہہ دیا۔ رانیہ بڑی دل برداشتہ ہوئی۔

"اب ایسی بھی کیا بڑی بات کہہ دی میں نے... ذرا سی پسند ہی تو بتائی تھی اور سب نے پیچھا ہی لے لیا۔" شکوہ اس کے لبوں پر آ گیا اور آنکھیں بھر آئیں۔

"ہاں تو ایسی نرالی پسند نہ ہم نے دیکھی، نہ سنی۔ اب یہ عادتیں خصلتیں تو وقت کے ساتھ ہی پتا چلتی ہیں۔ مجھے کیا معلوم کہ تمہاری مطلوبہ پسند کے لیے کسی کی ان

عادتوں کو فوراً" کس طرح پر کھا جائے۔ بھئی رہو شوق سے۔" امی نے اسے بے بھاؤ کی سنائیں' رانیہ مزید دکھی ہو گئی۔ ساتھ ہی عصمت پر غصہ بھی آیا' جس نے اس سے سارا بھید لے کر آگے نشر کر دیا تھا' لیکن وہ سوائے کڑھنے کے کچھ نہ کر سکتی تھی کیونکہ سارے گھر والوں نے اس کو ٹارگٹ بنا رکھا تھا۔ اگرچہ اس کے تمام کزنز طور اطوار میں شریف اور قابل بھی تھے' لیکن ان کا بے ڈھنگا پن اسے بالکل بھی پسند نہ تھا۔ اگر گھر کی خواتین گھر میں نہ ہوتیں یا مصروف ہوتیں تو وہ کچن میں گھس کر گوشت بھی دھو لیتے تھے' ہنڈیا بھی چڑھا دیتے تھے۔ وقت ہوتا تو صحن کی دھلائی بھی کر دیتے اور برتن بھی دھو لیتے۔ تربیت ایسی کہ وہ سب مل جل کر کام نمٹا لیا کرتے تھے۔ رانیہ کو ان کی یہی بات سخت ناپسند تھی۔ اسے لڑکوں کا زنانیوں کی طرح گھریلو کام کرنا' اول جلول حلیے اور ملگجے لباس میں نظر آنا' بہت برا لگتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مردوں پر یہ کام بالکل بھی نہیں سجتے۔ رانیہ چاہتی تھی کہ اس کا ہونے والا شوہر ایک مکمل مردانہ شخصیت رکھتا ہو۔

شاید سب کی توقع کے مطابق رانیہ اپنی پسند کے انتظار میں حسرت بھری آہیں بھرتی ہی رہ جاتی کہ اچانک ہی نصر کی آمد سے سارے گھر میں ایک ـــــ خوشگوار سی ہلچل مچ گئی اور رانیہ کی زندگی میں بھی ایک فیصلہ کن موڑ آ گیا۔ نصر اس کی بڑی چچی کا بھانجا تھا اور اس کی فیملی سرگودھا میں رہتی تھی۔ اسے اپنی جاب کے سلسلے میں کراچی آنا پڑا تو چچا جان کی شفقت سے مجبور ہو کر ان کے گھر میں قیام پذیر ہوا۔ اگرچہ پہلی نظر میں اسے وہ بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ یوں تو وہ سوٹڈ بوٹڈ بندہ خاصا معقول لگ رہا تھا' مگر اس کے چہرے پر سفر کی تھکان اور اجنبی جگہ کی وجہ سے کافی ہونق سے تاثرات تھے' لہٰذا پہلی دفعہ اسے دیکھتے ہی رانیہ کی ہنسی چھوٹ گئی' چونکہ نچلی منزل پر کوئی کمرہ خالی نہیں تھا اس لیے نصر کو رانیہ کے پورشن میں ایک کمرہ دے دیا گیا۔

رانیہ کو شروع میں اس کی آمد اور اپنے گھر میں ٹھہرنے پر کافی الجھن محسوس ہوئی کہ اچانک ہی ایک اجنبی لڑکا ان کے روزمرہ کے معمولات میں شامل ہو گیا البتہ نصر کی آمد سے رانیہ کو یہ فائدہ ضرور ہوا کہ سب کی توجہ نصر پر مرکوز ہو گئی اور رانیہ کہیں پس منظر میں چلی گئی۔ اس نے سکھ کا سانس لیا ورنہ اس کی جان عذاب میں آئی ہوئی تھی اسے دیکھتے ہی اس کے سارے کزنز اپنا ہر کام چھوڑ دیتے اور حتی المقدور معزز اور سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کرتے۔ اب سب لوگ نصر کی آؤ بھگت میں لگے ہوئے تھے۔ سارے لڑکے اس سے دوستی بگھارنے کے چکر میں تھے۔ نصر نے بھی ان لوگوں کو مایوس نہیں کیا۔ وہ سب لڑکوں میں گیا' لیکن رانیہ نے شدت سے یہ بات نوٹ کی کہ وہ نہ ہی بے ڈھنگے پن سے قہقہے لگاتا تھا اور نہ ہی اوچھے پن سے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنستا تھا۔ وہ بہت شگفتہ اور سلجھے ہوئے مذاق کرتا۔ لڑکوں سے اس کی خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی' لیکن اس کے باوجود اس نے کبھی ان کے ساتھ کچن میں گھس کر چائے نہیں بنائی تھی چائے کے ایک کپ کے لیے وہ دوسروں کا محتاج ہوتا تھا۔ اس کے کپڑے بھی لانڈری سے دھل کر آتے تھے۔

رانیہ کو اس کی یہ بات بہت پسند آئی۔ جب رانیہ کالج جانے کے لیے اٹھتی تو وہ شیو کیے ہوئے اور خوشبوؤں سے معطر ناشتے کی میز پر بیٹھا ہوتا تھا۔ اس کے ذوق کی بھی وہ معترف ہو گئی تھی' مگر یہ ساری کیفیات ابھی تک دل ہی دل میں ابھر رہی تھیں۔ خود پروارد ہونے والی اس نئی کیفیت سے وہ بہت گھبرا رہی تھی اور زیادہ پریشان اس بات پر تھی کہ اب اس کی امی کو اس کی شادی کی فکر بھی نہیں کھا رہی تھی۔ اب بھلا وہ اپنے منہ سے اپنی پسند کا اظہار کیسے کرتی۔ وہ اتنی ـــ بے باک نہیں تھی۔ عام لڑکیوں کی طرح اس معاملے میں وہ بھی جھینپو واقع ہوئی تھی۔ اپنے بارے میں اس انکشاف پر وہ ٹپٹا کر رہ گئی۔ وہ تو یہ تک نہیں جانتی تھی کہ نصر پہلے سے کسی سے منسوب ہے یا نہیں۔ یہ ساری معلومات حاصل کرنے سے وہ قاصر تھی۔

آخری راستہ اسے عصمت ہی نظر آئی جو اس کی ماموں زاد بھی تھی اور سہیلی بھی' لیکن اس کے پیٹ میں کوئی بات نہیں ٹکتی تھی۔۔۔ بیچ چوراہے پر سب کچھ اگل دیتی۔ وہ اس کے ہاتھوں پہلے بھی سبکی اٹھا چکی تھی اور اب مزید کا کوئی ارمان نہ تھا' لہٰذا وہ اس سے بھی اپنی دلی کیفیات بیان نہیں کر سکتی تھی۔

ادھر اس کی امی تو جیسے اس کی شادی کے مسئلے کو بالکل بھول چکی تھیں۔ اور حج پر جانے کی خوشی میں مگن اپنے چھوٹے بڑے کام نمٹانے میں لگی ہوئی تھیں۔ رانیہ کی دو بڑی بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ اب صرف رانیہ اور ثمانہ باقی رہ گئی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ پہلے رانیہ کے فرض کی ادائیگی کر لیں اور بعد میں ثمانہ کی فکر کریں' کیونکہ ہمارے مذہب میں یہ حکم بھی ہے کہ تمام ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے نمٹانے کے بعد فریضہ حج ادا کیا جائے۔

نصر کی آمد کے بعد سے سب لوگوں نے اسے بالکل فراموش کر دیا اور رانیہ اپنی بے بسی پر پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔



اس نے بہت گہری نظر سے نصر کا جائزہ لیا۔ وہ بہت سلجھا ہوا اور شائستہ مزاج لڑکا تھا۔ لڑکوں کے مذاق میں شریک ضرور ہوتا تھا مگر صرف ہنسنے کی حد تک۔ اس نے اسے کبھی ملگجے لباس میں نہیں دیکھا۔ وہ ہنس مکھ بھی تھا اور موقع کے لحاظ سے اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرتا تھا۔ رانیہ کو وہ اپنی پسند کے عین مطابق لگا۔ صبح وہ اپنی جاب پر نکل جاتا۔ شام تک واپسی ہوتی تو شاور لے کر ترو تازہ ہونے کے بعد سب کے درمیان بیٹھ کر چائے نوش کرتا۔ اس دوران ہلکے پھلکے مذاق بھی چلتے رہتے۔ اس کے بعد وہ اپنے دیگر کاموں میں مصروف ہو جاتا یا پھر کوئی کتاب لے کر اس میں غرق ہو جاتا لیکن اس کی نوبت کم ہی آتی تھی۔ لڑکے اسے تنہا رہنے ہی نہ دیتے تھے۔ کسی نہ کسی بہانے کھینچ کھانچ کر اپنے درمیان لے آتے یا پھر باہر سیر سپاٹا ہوتا اور آج کل تو اس کے خالہ زاد عمیر کی آمد و رفت بھی بڑھ گئی تھی۔ ہر لڑکا نصر کو کمپنی دینے کے لیے تیار تھا۔

"نصر ذرا بھی تو میچ نہیں کرتے ان بڑبولوں سے۔" رانیہ کلس کر رہ جاتی۔ عمیر کی آمد بھی بڑی مشکوک سی تھی۔

"اب جبکہ میں اس کو انکار کر چکی تو یہ کس خوشی میں یہاں چکر لگا رہا ہے۔" رانیہ کو تشویش ہوئی۔ وہ تو اپنی ہی دنیا میں گم تھی کھوئی ہوئی تھی' اس کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد اب عمیر نے اس کی چھوٹی بہن ثمانہ کو منتخب کر لیا تھا اور ثمانہ نے فرمانبردار بچیوں کی طرح سر جھکا دیا تھا۔

"نری بے وقوف ہو۔ اتنا پڑھ لکھ گئیں مگر رہیں وہی بدھو کی بدھو۔ آرام سے عمیر کے سر منڈھ دی گئیں' جسے بولنے تک کی تمیز نہیں ہے۔" اس نے ثمانہ کو اچھی خاصی ڈانٹ پلا دی۔ ثمانہ نے اس کی ڈانٹ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دی' کیونکہ وہ خود بہت خوش اور مطمئن تھی۔ اس کے دماغ میں رانیہ کی طرح کوئی خناس نہیں بھرا ہوا تھا۔ وہ بڑوں کی رضا میں راضی تھی اور معقول صورت عمیر کی ہم راہی پر اسے کوئی اعتراض بھی نہ تھا۔

"پھوپھو جان تمہارے لیے جتنی متفکر تھیں' تم نے انہیں اتنا ہی تنگ کر کے رکھ دیا۔ اب ثمانہ۔ بھی تو ہے "فوراً" ہی راضی ہو گئی۔ تمہارا ابھی کوئی ایسا خاص مسئلہ نہیں لیکن تم نے خود کو مسئلہ بنایا ہوا ہے۔" ثمانہ کی منگنی کے موقع پر عصمت نے اسے پھر چھیڑ دیا۔

"تم خود تو بہت جلدی مطمئن ہو جاتی ہو' مگر میرے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ زندگی میری ہے تو سوچ سمجھ کر اپنی پسند کے مطابق اسے گزارنے کا حق مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ تمہارے اور ثمانہ جیسی لاکھوں لڑکیاں ہیں جو والدین کی اطاعت و فرمانبرداری کی مثال بن کر خود کو قربان کر دیتی ہیں۔"

اس مرتبہ وہ کافی تلخی سی بولی۔ عصمت اسے دیکھتی رہ گئی' کیونکہ رانیہ لاکھ خود پسند لڑکی سہی' مگر چڑچڑی

نہیں تھی۔
اس کی چڑچڑاہٹ کی اصل وجہ نصر تھا جو اس کی دسترس میں ہوتے ہوئے بھی اس سے دور تھا۔ صبح و شام اس کی نظر کے سامنے تھا اور اس کے جذبے سے ناآشنا تھا۔ اس نے ثمانہ کی منگنی کے موقع پر نصر کی توجہ خود پر مرکوز کرنے کی بہت کوشش بھی کی، مگر نصر اسے دوسرے افراد کی طرح عام انداز میں لیتا رہا۔ کئی دنوں سے نصر کے کمرے کی صفائی بھی وہی کروا رہی تھی اور روز تازہ پھولوں کا گل دستہ بھی رکھ رہی تھی، مگر نصر کے کان پر کوئی جوں نہ رینگی۔ ثمانہ کی منگنی کے موقع پر اس کا سوٹ اسی نے پریس کیا تھا اور ایک مسکراہٹ کے ساتھ اسے تھمایا تھا، مگر وہ انجان بنا رہا۔ ایک موقع پر نصر کی نگاہیں اسے خود پر محسوس ہوئیں، مگر اس کے دیکھتے ہی وہ انجان بن کر مخالف سمت دیکھنے لگا۔ رانیہ کے دل میں دھکڑ پکڑ شروع ہو گئی۔ گویا آنکھ مچولی کا کھیل شروع ہو چکا تھا لیکن بظاہر نصر کا گریز اور لاتعلقی دیکھ کر وہ مخمصے کا شکار ہی رہی۔ ثمانہ کی منگنی کی تقریب میں نصر کی والدہ اور بڑی بہن خاص طور پر شریک ہوئی تھیں۔ رانیہ کھٹک گئی۔ بعد میں یہ بات عیاں ہو گئی کہ دراصل انہیں نصر کے لیے لڑکی کی تلاش تھی۔ رانیہ کا دل ڈول گیا اور بے اختیار ہی نصر کی تمنا کرنے لگا۔ اس کی دعائیں بار آور ثابت ہوئیں۔ اس کی خواہش کے عین مطابق نصر کی والدہ نے نصر کے لیے رانیہ کا ہاتھ مانگا تھا۔ اس کی امی تو خوشی سے بے حال ہو گئی تھیں۔ کیونکہ اس بار رانیہ نے بھی کوئی چوں چرا نہیں کی اور "آپ کی مرضی" کہہ کر بات ختم کر دی۔
سو انہوں نے ہاں کرنے میں دیر نہ لگائی۔ وہ حج پر جانے سے پہلے رانیہ کو رخصت کرنا چاہتی تھیں کیونکہ وہ اس کی غیر مستقل مزاجی سے خوف زدہ بھی تھیں کہ کہیں حج سے واپسی پر رانیہ انہیں انکار کر دے اور وہ ماتھا پیٹتی رہ جائیں۔
رانیہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس رشتے میں نصر کی پسند اور مرضی بھی شامل ہے۔ وہ اس کی شرافت کی قائل ہو گئی، جس نے اسے اوچھے ہتھکنڈوں سے زیر کرنے کی کوشش نہیں کی اور باعزت طریقے سے پیام بھجوایا۔
نصر کی والدہ ابھی رخصتی کے لیے راضی نہ تھیں کیونکہ انہی دنوں نصر کو اپنی کمپنی کی طرف سے رہائش ملی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ اطمینان سے نصر کا گھر سیٹ کرنے کے بعد اور رانیہ کی امی کی حج سے واپسی کے بعد رخصتی ہو، لیکن رانیہ کی امی پر اس کی فوری رخصتی کا سودا سمایا ہوا تھا، سو تاریخ رکھ دی گئی۔
رانیہ جب نصر کی گہری آنکھوں میں اپنے لیے جذبہ شوق کے بپھرتے مچلتے طوفان دیکھتی تو گھبرا جاتی اور فوراً اِدھر اُدھر ہو جاتی، مگر اس دن نصر نے اسے گھیر ہی لیا۔ وہ بیرونی بالکنی میں کھڑی اپنی امی کی حج روانگی اور اپنی رخصتی کے ملے جلے احساسات پر آبدیدہ سی کھڑی تھی کہ جب ہی نصر چلا آیا۔ رانیہ جھینپ گئی۔ وہ عین دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا اور فرار کا کوئی رستہ نہ تھا۔
"کیا تم اس فیصلے سے خوش نہیں ہو؟" اس کے لباس کا بادامی رنگ اور ٹھہرا ہوا لہجہ رانیہ کے دل کی دنیا میں قیامت مچا گیا۔ اس کی آنکھ کے آنسو دیکھ کر وہ یہی نتیجہ اخذ کر سکا تھا۔ رانیہ پریشان ہو گئی۔
"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ وہ دراصل امی جا رہی ہیں نا، اس لیے ذرا سا خیال آ گیا تھا۔" اس نے پلکیں جھپکا کر آنسو روکے۔ نصر کے ہمدردانہ لہجے سے اس کا دل گداز ہو گیا۔
"نہ، رونا نہیں۔" اس نے بے اختیار چوکھٹ پر دھرے دونوں ہاتھ ہٹا لیے کیونکہ اس طرح وہ اس کا راستہ روک کر کھڑا ہوا تھا۔
"تمہاری امی خدا کے گھر جا رہی ہیں۔ فکر کی کوئی بات نہیں اور رہیں تم..... تو تم اپنے مجازی خدا کے گھر جا رہی ہو، اس لیے اس کی فکر کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔" نصر نے مسکراتے ہوئے اسے تسلی دی۔
رانیہ اس کے برملا اظہار سے سٹپٹا گئی۔ اس نے اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا تھا اور اب اس کے چہرے کے تاثرات سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اسی وقت اس نے دونوں ہاتھ جھاڑے۔

"اوہ! میرا خیال ہے دروازے پر کافی گرد ہے۔" وہ رومال نکال کر نادیدہ گرد جھاڑنے لگا۔ رانیہ شرمندہ ہو گئی، وہ ہو بہو اس کا ہم مزاج تھا۔
"دراصل یہ دروازہ بالکنی کی طرف کھلتا ہے اس لیے زیادہ تر بند ہی رہتا ہے۔" اس نے معذرت طلب انداز میں وضاحت دی۔
"کوئی بات نہیں، میں ہاتھ دھو لوں گا اور تو کوئی مسئلہ نہیں ہے نا؟" اس نے جانے سے پہلے تسلی چاہی۔ رانیہ نے جھٹ انکار میں گردن ہلا دی۔
"پلیز ذرا ایک کپ چائے تو بھجوا دو۔ میرے سر میں شدید درد ہے۔" اس نے بڑی اپنائیت سے اسے حکم دیا۔ رانیہ تو اس انداز پر قربان ہو گئی۔
"اب گھر والی آئے تو میں بھی بے فکر ہوں۔" جاتے ہوئے اس نے رنگین سی پھلجھڑی چھوڑی اور رانیہ کے دل میں دیر تک پھلجھڑیاں چھوٹتی رہیں۔



"ارے بھئی! سنا ہے عید قرباں کی آمد سے پہلے ہی اپنی رانیہ نے بھی ایک بکرا خرید لیا ہے۔" عمیر اپنی منگنی کے بعد سے بہت زیادہ شوخ ہو رہا تھا۔ رانیہ تلملا کر رہ گئی۔
"بکرا بھی بڑا شاندار ہے۔ ٹھونک بجا کر دیکھا گیا ہے۔" سب لوگ اس کے صبر اور حوصلے کو اپنی فقرے بازیوں سے آزما رہے تھے۔ رانیہ سب سے شاکی تھی کہ سب نے اسی کو نشانہ بنایا ہوا تھا۔ جو اس کے رشتے کے بارے میں سن رہا تھا، اسے مبارکباد دینے کے ساتھ ساتھ چھیڑ بھی رہا تھا۔
عزیز کے لیے بھی لڑکی ڈھونڈلی گئی تھی اور رانیہ کی شادی کے بعد عزیز کی شادی متوقع تھی۔ اس دن وہ نیچے چلی آئی۔ اس کی چچازاد نے اپنے چہرے پر ماسک لگایا ہوا تھا۔
"اوہو بھئی! یہ کیا کر رہی ہو؟ سیدھی سیدھی پارلر جاؤ اور وہاں سے یہ کام کرواؤ، اس لیے کہ ہر کام اس پر سجتا ہے جو ان کا اہل ہو۔ خواہ مخواہ وقت بھی برباد ہو رہا ہے اور کام بھی پرفیکٹ نہیں ہوتا۔" اس نے بے اختیار مشورہ دیا۔
"ارے باجی! یہ تو میں یوں ہی کر رہی ہوں۔ آپ کی بارات کے لیے تو میں پارلر جاؤں گی۔"
"تو کیا میں بھی اپنی مونچھیں جینٹس پارلر سے سیٹ کرواؤں؟" عزیز کے معصوم انداز میں دخل اندازی کرنے پر رانیہ نے گھور کر اسے دیکھا۔
"سنا ہے اپنے نصر صاحب تو بڑے ٹپ ٹاپ والے بندے ہیں، تمیز دار اور بااصول۔ ان کے گھر میں نوکروں کی قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ ہر کام کا الگ نوکر ہے۔ واہ بھئی! خوبیٔ قسمت تو دیکھو کہ لوگوں کو اتنے شاندار بر مل بھی جاتے ہیں۔" وہ شیونگ کریم لگاتے ہوئے بدستور بولتا رہا اور رانیہ دل ہی دل میں کڑھتی رہی۔
نصر کے اپنے گھر میں شفٹ کر جانے کے بعد سے سب نے کھلے عام ہی اس کا پیچھا لے لیا تھا۔
بالآخر وہ خوبصورت دن بھی آ گیا جب اس نے میرون و گولڈن کنٹراسٹ کا بھڑکیلا عروسی لباس پہن کر دلہن کر روپ دھارا۔ لباس اس پر بہت جچ رہا تھا کیونکہ وہ اس کی اور نصر کی مشترکہ پسند تھا۔ نصر نے ساری جھجک بالائے طاق رکھ کر شادی کی خریداری میں اسے اپنے ساتھ ہی رکھا اس کی اس فرمائش پر وہ کافی جزبز بھی ہوئی تھی۔
"چلی جاؤ نا، اچھا ہے اپنی پسند سے سب کچھ لے لینا ورنہ تمہاری نظروں میں آسانی سے کب کچھ سماتا ہے۔"
امی نے فون پر نصر کو آنے کی اجازت دے دی۔ وہ بھی مصلحتاً چپ ہو گئی کہ اب وہ امی کی ناراضی کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ اب تو جدائی کا سمے قریب آ رہا تھا۔ اس کا دل ویسے ہی چھوٹا ہو رہا تھا لیکن بعد میں اسے امی کے اس اقدام سے کافی تشفی ہوئی، کیونکہ نصر کے ساتھ خریداری کرتے ہوئے اسے اس بات سے ایک گونا سکون حاصل ہوا کہ نصر اور اس کی پسند تقریباً ایک جیسی تھی۔ ابھی وہ جس سوٹ کو پسند کر کے اس کا

اظہار کرنا ہی چاہتی تھی کہ اس سے پہلے ہی نصر اس سوٹ پر ہاتھ رکھ دیتا۔ رانیہ اس مشترکہ پسند پر حیران رہ گئی۔ اُسے یقین نہ آرہا تھا مگر تسلسل کے ساتھ اس طرح ہوتے دیکھ کر اسے یقین کرنا پڑا اور وہ یہ سوچ کر اندر تک سرشار ہو گئی کہ اس کا ہونے والا شوہر اس کے قلب کی طمانیت کا باعث تھا۔

رخصتی کے بعد وہ نصر کی سنگت میں، بہت تفاخر اور مان سے اس کے گھر میں اس کی خلوتوں میں جلوے بکھیرنے چلی آئی۔

گھر خاصا بڑا تھا اور اس کے خوابوں سے زیادہ خوب صورت بھی۔ فی الحال نصر کی امی یعنی رانیہ کی ساس کا یہاں عارضی طور پر قیام تھا۔ ان کا سرگودھا واپس جانے کا ارادہ تھا کیونکہ انہیں اس گھر کے جدید طرز تعمیر کی وجہ سے یہاں گھٹن محسوس ہوتی تھی۔ بند کمروں کے بعد مرکزی دروازے کے پاس صرف اتنی جگہ بچتی تھی کہ نصر کی گاڑی کھڑی ہو سکے۔ اس سے ملحق چپس کے چمکتے دمکتے فرش پر دو عدد سنگ مرمر کے ستون کھڑے تھے، لیکن یہاں بھی حفاظتی اقدامات کے تحت نصر نے سب طرف گرل لگادی تھی، جس کے باعث اس کی امی کو بہت گھٹن محسوس ہوتی تھی۔ ایک راہداری بھی مگر وہاں بیٹھنے سے بے پردگی کا احتمال تھا کیونکہ سامنے والے گھر کی چھت سے سامنا ہوتا تھا۔ چھت البتہ بہت صاف اور کشادہ تھی اور وہاں بڑی اچھی ہوا آتی تھی۔ رانیہ کی اکثر سہانی شامیں چھت پر گزرتی تھیں۔ اس کی ساس کو بلاوجہ دخل اندازی کی عادت بھی نہیں تھی وہ اپنے وظیفوں اور نماز میں مصروف رہتی تھیں یا پھر باورچی خانہ کا نظم و نسق سنبھالتی تھیں، کیونکہ انہوں نے ابھی تک رانیہ کو کوئی بھی گھریلو کام نہیں کرنے دیا تھا۔ اس لیے رانیہ کی شادی کے ابتدائی ایام بہت خوشگوار گزرے نصر اس کی توقعات سے بھی بڑھ کر تھا۔ اس کے لیے وہ رب کا جتنا بھی شکر کرتی، کم تھا، بلکہ اکثر تو اسے ایسا لگتا تھا کہ اس ذات پاک نے اس پر اپنی رحمتوں کی برسات کردی ہے ساس کی طبیعت اور انکساری بھی اس کے لیے بڑا انعام تھی۔ وہ کسی معاملے میں روک ٹوک نہیں کرتی تھیں اور نہ ہی آنے جانے پر کوئی اعتراض کرتی تھیں، بلکہ ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر ان کی آنکھوں میں لو دیتی محبت امنڈنے لگتی تھی اور نصر تو اس قدر نفیس انسان تھا کہ کبھی کبھار رانیہ کو خود اپنا آپ لاپروا اور غیر ذمہ دار لگتا، کبھی کبھار وہ تیار ہونے میں سستی دکھا دیتی، مگر جب نصر کو تیار دیکھتی تو اپنے آپ سے شرمندہ ہو کر خود ہی جلدی سے اپنا حلیہ صحیح کر لیتی۔ اس نے نصر کو کبھی بے قاعدگی اور لاپروائی کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

سودا سلف فہرست کے مطابق وقت سے پہلے ہی آجاتا اور اکثر اشیاء کا اضافہ وہ خود اپنی مرضی سے کر لیتا تھا، تب رانیہ اپنی بھول پر بڑی شرمندہ ہوتی، اسی لیے وہ بھی پلڑا برابر رکھنے کے لیے اس کے میز پر بیٹھنے سے پہلے ہی ناشتہ لگانے کی کوشش کرتی تھی، لیکن کبھی کبھار اسے دیر ہو ہی جاتی تھی۔ جب وہ میز تک پہنچتی تو پینٹ شرٹ میں ملبوس خوشبوؤں میں بسا نصر کا وجود وہاں پہلے سے موجود ہوتا تھا۔ چھٹی والے روز بھی وہ لاپروائی کا کوئی مظاہرہ نہیں کرتا تھا۔ اس کے جوتے اسے کبھی لاؤنج میں پڑے نظر نہیں آتے۔ اس کے کپڑے بھی کہیں گودڑ بنے ہوئے نہیں ملتے تھے۔ شیونگ کا سامان، آفٹر شیو کلون، باڈی اسپرے سب کچھ جگہ پر ہوتا تھا۔ رسٹ واچ وہ ہمیشہ بیڈ کے سرہانے سائیڈ ٹیبل پر رکھتا تھا۔ رانیہ کو اس کے مقابلے میں اپنی کوتاہیاں نظر آنے لگتیں۔ اس کا رویہ، اپنائیت اور محبت بھی کچھ کم نہ تھی۔ اس کی جادو بھری آواز، اپنائیت بھرا لمس اور اظہار کے نت نئے خوبصورت انداز دن بدن رانیہ کو اس کا اسیر کرتے جارہے تھے۔



کچھ ہی دن میں رانیہ کی ساس کو اپنا گھر شدت سے یاد آنے لگا تو انہوں نے جانے کا قصد کر لیا۔ ان کے جانے کے بعد رانیہ کو صحیح معنوں میں ان کی اہمیت کا اور اپنی خامیوں کا بھی احساس ہوا۔ اب تک تو گھر کا سارا انتظام ہی انہوں نے سنبھالا ہوا تھا۔ رانیہ تو صرف چھوٹے موٹے کام کر دیتی تھی مگر اب تو اسے سب طرف ہی دیکھنا تھا۔ ایک خاتون خانہ کی حیثیت سے سارا گھر سنبھالنا اور خود کو بھی سجا سنوار کر رکھنا بہت مشکل امر تھا۔ وہ اپنی طرف سے بھی غافل نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ اس کی شادی کو ابھی پندرہ دن ہی ہوئے تھے۔ کام اگرچہ کچھ زیادہ نہیں تھا، صرف اسے کھانا ہی پکانا تھا مگر یہی اس کا بہت بڑا امتحان تھا۔ اگرچہ وہ امور خانہ داری میں اتنی کوری نہیں تھی مگر بات اب عزت کی تھی۔ اسے نصر کی نظروں کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں اپنے مقام کو اسی طرح برقرار رکھنا تھا اور یہ بات تو وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ مرد کے دل کا ایک راستہ اس کے معدے سے ہو کر بھی گزرتا ہے۔ اب اسے نصر کا حسب پسند کھانا بنانے کے لیے دل و جان سے کچن میں بھی وقت دینا تھا کیونکہ اسے پہلا خدشہ یہی تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ نصر کو اس کے ہاتھ کے کھانے پسند نہ آئیں۔ وہ خود تو نصر کی طرف سے بہت زیادہ مطمئن تھی، لیکن اب اس کی زیادہ کوشش یہ ہوتی تھی کہ خود وہ بھی نصر کی نگاہوں میں سرخرو رہے۔

صبح کا وقت مصروف گزار کر دوپہر کے بعد سے وہ بالکل فارغ رہتی تھی۔ ساس کے جانے کے بعد سے اتنے بڑے گھر میں بسی تنہائی سے وحشت ہونے لگتی۔ اس بے چینی کی وجہ یہ تھی کہ وہ بچپن سے ہی کافی زیادہ لوگوں کے درمیان رہی تھی۔ نیچے اپنے چچاؤں کے ہاں اس کی ہم عمر کزنز تھیں۔ کبھی وہ ان کے گھر چلی جاتی تھی اور کبھی وہ لوگ اس کے پاس آجاتی تھیں۔ اب یہاں ایک دم سناٹا دیکھ کر وہ مضطرب ہو گئی۔

ثمانہ کچھ روز تو اس کے پاس رہی، پھر نئی جگہ پر وہ بہت زیادہ بے چین ہو گئی تو رانیہ نے اسے زیادہ روکنے کی کوشش نہیں کی۔ ثمانہ نے بہت چاہا کہ وہ اس کے ساتھ کچھ دن کے لیے گھر چلی چلے، مگر رانیہ بالکل بھی راضی نہ ہوئی۔ اب اسے عزیز، عمیر اور فرید وغیرہ کی چھچھوری حرکتوں کا سوچ کر ہی الجھن ہوتی تھی۔ ان کی لاپرواہیاں اور غیر ذمہ داریاں تو اسے ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ وہ خود پر بہت نازاں تھی جو اس ماحول کا حصہ بننے سے بچ گئی۔ اگر اس کی شادی وہیں کسی لڑکے سے ہو جاتی تو وہ اب تک کڑھ کڑھ کر آدھی ہو چکی ہوتی۔

ذی الحج کا چاند نظر آگیا تھا اور بقر عید کی گہما گہمی عروج پر تھی۔ ہر گھر سے بکروں اور مینڈھوں کی "میں میں" کی صدائیں بلند ہو رہی تھی۔ بقر عید گزرنا رانیہ کے لیے ہمیشہ سوہان روح ہوتا تھا کہ جانوروں کی آمد سے ہونے والی گند اور بُو وہ بمشکل برداشت کر پاتی تھی، پورے گھر میں گھاس اور چارہ بکھر جاتا گویا ہر طرف بکرا راج ہوتا۔ ان دنوں وہ اپنے کمرے میں ہی محصور ہو جاتی تھی۔

عید والے دن قربانی کا نظارہ دیکھنے کی تاب بھی اس میں نہ تھی۔ خون کے ابلتے ہوئے فوارے دیکھنے سے اس کا موم سا دل پگھلنے لگتا تھا۔ چاروں طرف خون کے چھینٹے اور خون کے سمندر میں قصائیوں کی چھپ چھپ ان کے میلے اور خونی دھبوں والے کپڑے دیکھ کر اسے سخت الجھن ہوتی تھی۔ قربانی کے گوشت اور خون کی بساند اسے سخت گراں گزرتی تھی۔ اس موقع پر سب اسے چھیڑتے تھے، لیکن اس بار اس کی بقر عید خاصی پرسکون تھی۔ نصر تو بکرا وغیرہ لانے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔

"شاید یہ عید والے دن ہی بکرا لا کر قربانی کا فرض ادا کرتے ہیں۔" نصر سے اس بارے میں کچھ پوچھنا اسے مناسب نہ لگا، سو وہ دل ہی دل میں سوچ کر رہ گئی۔ اپنے میکے بھی وہ اسی لیے نہیں جارہی تھی کہ وہاں بکرے آگئے تھے، اور سارے گھر پر بکرا راج تھا۔ حج شروع ہو چکا تھا۔ ٹی وی پر مناسک حج کی نشریات جاری تھیں۔ امی سے وہ دوبار ٹیلی فون پر بات کر چکی تھی مگر چونکہ موبائل پر کم بات ہو پاتی تھی۔ اس لیے تشنگی رہ جاتی۔ ثمانہ نے اسے بلاوا بھیجا کہ امی نے خصوصی کال بک کروائی ہے اور وہ سب سے "فردا" "فردا" بات کریں گی، تو اسے بادل نخواستہ اس ناپسندیدہ ماحول میں جانا ہی

پڑا۔ نصر نے اسے آفس جاتے ہوئے اس کے میکے چھوڑ دیا تھا۔ سب نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ حسب توقع گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی گھاس پھوس اور بکرے کی مینگنیوں نے اس کا استقبال کیا۔

"بکرے آنے پر کیا ضروری ہے کہ یہاں سے وہاں تک چارہ پھیلایا جائے اور گھر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک بکروں کو گھمایا پھرایا جائے؟ ویسے بھی اتنی جلدی بکرے لانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟" وہ برداشت نہ کر سکی اور شروع ہو گئی۔

"ویسے تو بڑی سمجھ دار بنتی ہو۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ یہ عید قرباں سنت ابراہیمیؑ ہے۔ ہمارا مذہبی تہوار ہے۔ کمال حیرت ہے کہ اس پر بھی تمہیں اعتراض ہے۔ تم کہیں سیکولر تو نہیں ہو گئیں؟" عزیز کے تبصرے پر وہ چراغ پا ہو گئی۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو تم لوگوں کے اس گند پھیلانے پر کہہ رہی ہوں۔ جب طریقے سے کام نہیں کر سکتے تو کیا ضرورت ہے اتنا پہلے سے بکرے لانے کی؟" رانیہ اس سے بحث پر آمادہ ہو گئی۔

"طریقے سلیقے تو بھئی تم لڑکیوں کے لیے ہیں۔ ہم تو ہیں لڑکے۔۔۔ اور لڑکے ذرا ایسے ہی ہوتے ہیں کیونکہ شاید یہ تم ہی کہتی رہتی ہو کہ جس کا کام اسی کو ساجھے۔۔۔ اور دوسری بات یہ کہ اتنے پہلے سے بکرے لانے کی اشد ضرورت اس لیے ہے کہ جب قربانی کے جانور کو پال کر اور اس کی خدمت کر کے اس کو قربان کیا جائے تو اس کی بہت فضیلت ہے۔ یہ کیا کہ سر سے بوجھ اتارنے کے لیے ایک رات پہلے بکرا لیا اور چھری پھیر دی۔" عزیز نے اس کی بات اسی پر جما دی وہ لاجواب ہو گئی۔

"مگر تھوڑا بہت ڈھنگ تو اپنانا چاہیے۔ زندگی گزارنے کے کچھ اصول اور قاعدے ضروری ہیں۔" وہ کمزور سے انداز میں دلائل دینے لگی۔

"لیکن یہ ڈھنگ اور طور طریقے لڑکیوں پر ہی سجتے ہیں۔ کبھی تم نے یہ سنا کہ شادی کے وقت کسی لڑکے کے ڈھنگ اور سلیقے کو دیکھا جاتا ہے؟ ارے یہ خصوصیت لڑکیوں میں دیکھی جاتی ہے۔ مرد کی تو صرف کمائی ہی دیکھی جاتی ہے۔ شکل صورت پر بھی اتنی توجہ نہیں دی جاتی۔"

وہ بڑی بوڑھیوں کے انداز میں سمجھانے لگا۔ رانیہ اس بحث سے تھک کر خود ہی چپ ہو گئی۔

وہ منہ بناتے ہوئے اٹھی ہی تھی کہ ثمانہ نے مکہ سے امی کے فون کی اطلاع دی۔ سارے گھر والے ٹیلی فون کے گرد جمع ہو گئے۔

نصر اسے رات کو کافی دیر سے لینے آیا تھا۔ رانیہ شدت سے اس کی منتظر تھی۔ اس نے اندر آنے سے "ضروری کام ہے۔" کہہ کر انکار کر دیا تھا۔ رانیہ نے اس ناپسندیدہ ماحول سے چھٹکارا پانے کی خوشی میں جلدی جلدی اپنا بیگ لیا اور دوپٹہ سر پر جما کر باہر چلی آئی، جہاں نصر گاڑی میں اس کا منتظر تھا۔ اس نے نصر کے انتظار میں کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ نصر بھی خالی پیٹ تھا۔ دونوں نے فوڈ کارنر سے ڈنر کیا۔ نصر کافی تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

"کیا بات ہے کیا آج زیادہ کام تھا؟" وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"ہاں ذرا مصروفیت بڑھ گئی تھی۔" اس نے سرسری سا جواب دیا۔ وہ بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔

رانیہ کو اس کے انداز سے الجھن ہونے لگی۔ آج سے پہلے تک وہ اس کی توجہ کا مرکز ہی رہتی تھی۔ جب وہ اس کے پاس موجود ہوتی تھی تو نصر کا دھیان کہیں اور جاتا ہی نہیں تھا مگر آج اس کا ذہن کسی اور طرف تھا۔

"آج میں تمہیں ایک سرپرائز دوں گا۔" واپسی میں نصر نے اسے مزید حیرت میں ڈال دیا۔ گھر سے کچھ فاصلے پر اس نے ایک میدان کے آگے گاڑی روک دی۔

"میں بکرے لے آیا ہوں۔" اس کے انکشاف پر رانیہ بری طرح چونکی۔

"دیکھو وہ سامنے جو براؤن اور وائٹ بکرا ہے، ایک وہ اور ایک یہ دوسرا سفید بکرا۔۔۔ میں نے یہاں کے چوکیدار سے بات کر لی ہے۔ علاقے کے کچھ اور لوگ بھی یہاں جانور باندھیں گے۔ اچھا ہے، گھر میں گند بھی نہیں ہو گی اور گھر صاف ستھرا رہے گا۔ کچھ پیسے وغیرہ دے دوں گا اس غریب کو، بے چارہ خوش ہو جائے گا۔ اس کا بھی بھلا ہو جائے گا اور ہمارا بھی۔" نصر کی تمام بات سن کر رانیہ نے طمانیت بھری سانس لی۔ کبھی کبھی تو اسے یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ دونوں بظاہر الگ الگ ہیں مگر درحقیقت ان کی روح ایک ہے جو کبھی الگ ہٹ کر نہیں سوچتی۔ اسے بے اختیار ہی نصر پر پیار آگیا جو اس کی سوچوں سے بے خبر بکروں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جذبہ قربانی کی چمک پھیلی ہوئی تھی۔

"کیسے لگے؟" اس نے رانیہ سے پوچھا۔

"بہت اچھے ہیں۔" رانیہ لگاوٹ سے بولی۔



یہ بقر عید، رانیہ نے امی ابو کے بغیر گزاری، لیکن نصر کے سنگ پہلی بار عید گزارنے کا تصور یاسیت پر غالب آگیا۔ اس بار اس نے عید پر اپنے لیے خاص اہتمام کیا تھا۔ کاسنی اور گلابی امتزاج کے سوٹ پر ریشم کی ڈوری کا دیدہ زیب کام اس کی اور نصر کی مجموعی پسند تھا۔ نصر نے از خود ہی اسے میچنگ جیولری اور میک اپ کا سامان دلوا دیا تھا۔ اسے کسی چیز کی فکر نہیں کرنی پڑی۔ وہ اپنے ہمسفر پر جتنی بھی نازاں ہوتی، کم تھا۔ اس نے بھی نصر کو ایک کلون اور کارڈ تحفہ میں دیا تھا، مگر نصر عید قرباں پر خود سے زیادہ اپنے فرائض کو اہمیت دے رہا تھا۔ وہ اپنے مذہبی معاملے میں کوئی کوتاہی نہیں برتنا چاہتا تھا۔ آفس سے واپسی کے بعد وہ بکروں کے چارے کی فکر اور ان کی آؤ بھگت میں لگ جاتا۔ یہ نئی صورت حال رانیہ کے لیے تکلیف دہ تھی کیونکہ ابھی تو وہ نئی نئی ہی تھی اور اسے بھی نصر کی توجہ درکار تھی۔ پہلے تو نصر آفس سے واپسی کے بعد ہمہ وقت اس کے پاس رہتا تھا مگر اب عارضی طور پر اس کی توجہ بٹ گئی تھی۔ رانیہ نے بھی اس صورت حال کو قبول کر لیا تھا کہ بکروں کی دیکھ بھال بھی نصر کے فرائض میں شامل تھی۔

رات بھی وہ تھکا ماندہ بستر پر لیٹتے ہی بے خبر سو جاتا۔ لیکن وہ یہ سوچ کر صبر کر رہی تھی کہ بہرحال اسے واپس اسی کی طرف متوجہ ہونا ہے اور وہ اپنے فرائض کی ادائیگی بھی اسے بنا تکلیف پہنچائے کر رہا تھا۔ رانیہ کو اس کے کسی بھی عمل سے کوفت نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا پیارا سا گھر اسی طرح صاف ستھرا تھا۔

رانیہ کے امی ابو کی غیر موجودگی کی وجہ سے اس کے چچا نے رانیہ کی سرپرستی کے طور پر اپنا فرض نبھایا اور بقر عید والے دن اس کی دعوت کر دی۔

"مگر اس دن تو ہمارے ہاں بھی قربانی ہو گی۔ ہم کیسے جا سکیں گے؟" نصر نے سنا تو صاف انکار کر دیا۔

"مگر ہم تو رات کو وہاں جائیں گے۔ چلتے ہیں ناں۔" رانیہ کو تھوڑا سا اختلاف ہوا کیونکہ اسے چچی جان کے ہاتھ کے سیخ کباب اور بھنے ہوئے تکے بڑے پسند تھے۔ اس کی امی بھی کھانا پکانے میں بہت ماہر تھیں۔ عید قرباں پر وہ گھر میں ہی سالم ران روسٹ کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ دم کے کباب اور شامی کباب بھی بڑے لذیذ اور خستہ ہوتے تھے۔ سوچ کر ہی رانیہ کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے خود بھی چند چٹ پٹی ترکیبیں نظر میں رکھی ہوئی تھیں اور اس بار انہیں آزمانے کا پورا ارادہ تھا۔ نصر اس کے اصرار پر بھی راضی نہ ہوا۔

"دعوت تو دوسرے یا تیسرے روز بھی ہو سکتی ہے۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے اور مجھے کہاں فرصت ہو گی۔ میں تو قربانی میں لگا ہوں گا۔ اس دن بہت زیادہ تھکاوٹ ہو جاتی ہے۔ نہ بھئی! ایسی دعوت میں مزا نہیں آئے گا۔ تھکی تھکی سی دعوت رہے گی۔" اس نے قطعی انکار کر دیا۔ اس کا جواز بے بنیاد نہیں تھا۔ رانیہ کو اس کی بات سننی پڑی۔

اور پھر قربانی کا دن بھی آپہنچا۔ رانیہ نے پہلی پہلی عید کی خوشی میں اپنے ہاتھوں میں بہت اچھی مہندی لگائی تھی کیونکہ وہ بہت اچھی مہندی لگانا جانتی تھی۔ اس کے ہاتھوں پر بنے گل بوٹوں کو دیکھ کر نصر خوش

ہو گیا اور بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"تمہارے ہاتھ تو اس حنائی رنگ کے چڑھنے کے بعد اور زیادہ خوبصورت لگتے ہیں۔" اس نے بے اختیار اس کے سرخ گل بوٹوں والی ہتھیلی پر پیار کی مہر ثبت کردی۔ رانیہ اس کے بے ساختہ اظہار پر لجا کر رہ گئی۔ اور وہ سفید کھڑکھڑاتا ہوا کرتا شلوار پہنے نماز عید کو روانہ ہو گیا۔

ابھی وہ خود تیار نہ ہوئی تھی کیونکہ اسے کچن سمیٹنا تھا اور قربانی کے لحاظ سے برتن وغیرہ نکال کر پہلے سے تیاری کرکے رکھنی تھی۔ فی الحال تو اس نے چھولے اور دہی بڑے تیار کر رکھے تھے۔ نصر رات کو مٹھائی بھی لے آیا تھا۔ اس کی پہلی عید کے خیال سے وہ خود ہی اس کا خیال کر رہا تھا۔ اسے چھوٹے چھوٹے کام نمٹانے میں کافی دیر ہو گئی، پھر وہ نہانے چلی گئی۔ کاسنی اور گلابی امتزاج کا سوٹ پہن کر جب وہ باہر آئی تو نصر بکروں کو گھر میں لا چکا تھا۔ گاڑی اس نے باہر ہی کھڑی کردی تھی اور پورچ میں بکروں کی قربانی کا بندوبست کیا تھا۔ یہ بات اس نے رات کو ہی اسے بتادی تھی۔ اس نے عارضی طور پر ایک ملازم لڑکے کو بھی رکھ لیا تھا۔

"اس کی کیا ضرورت تھی؟" اس نے منع کیا۔

"ارے جانِ جاں! یہ تمہاری پہلی عید ہے۔ اب ان نازک ہاتھوں سے میں کیا کام کرواؤں گا۔ یہ ذرا دھلائی وغیرہ کردے گا اور اس کی تھوڑی بہت مدد بھی ہو جائے گی۔ گوشت کا ایک حصہ ہم اسے بھی دے دیں گے کیونکہ اس قربانی کے گوشت پر غریبوں کا بھی اتنا ہی حق ہوتا ہے جتنا کہ ہمارا اور ہمارے رشتہ داروں کا۔ اسی لیے حصے بھی اسی طرح لگائے جاتے ہیں کہ سب کے حصے میں گوشت آجائے۔" نصر نے رسان سے اسے جواب دیا تو وہ خاموش ہو گئی۔ پورچ سے آتی ہوئی آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ بکروں کی قربانی عمل میں آچکی تھی۔

"اللہ اکبر، اللہ اکبر" کی صدائیں اور بکروں کے حلق سے خارج ہونے والی خرخراہٹیں اسے اندر باہر سے ہلا گئیں۔

اسی وقت محلے کا ایک بچہ اندر چلا آیا۔

"باجی! ایک بڑا برتن دے دیں گوشت رکھنے کے لیے۔ بھائی جی منگوا رہے ہیں۔" اس نے نصر کا پیغام دیا۔ وہ باورچی خانے سے برتن لے کر باہر آئی تو بچہ وہاں سے غائب تھا۔ چھوٹے سے برآمدے میں لگی ہوئی گرل کی وجہ سے پورچ کا منظر اتنا زیادہ نمایاں نہیں تھا۔ وہ برتن لے کر خود ہی وہاں چلی آئی مگر جب اس کی نگاہ باہر کے منظر پر پڑی تو حیرت اور صدمے سے برتن اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ سامنے ہی خون آلود چھری تھامے بنیان اور شلوار میں ملبوس نصر بڑی تندہی سے قصائی کا کردار ادا کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت کے مارے پھٹ گئیں۔ نصر کو اس حلیے میں دیکھ کر اسے اپنی بصارت پر یقین نہیں آرہا تھا۔

"ہر عید پر یہ مبارک فریضہ میں خود اپنے ہاتھوں سے انجام دیتا ہوں۔ فرض کی ادائیگی میں کبھی پیچھے نہیں رہتا۔" اس کے کپڑوں پر خون کے نشانات نظر آرہے تھے۔ رانیہ ہونق بنی اسے تکے جارہی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ فرض کی ادائیگی میں اس قدر بااصول اور مستقل مزاج ہوگا۔ اس کے اول جلول سراپے میں اسے اپنے لاپروا کزنز کی شبیہہ نظر آنے لگی۔

اس نے نصر کا جو خاکہ اپنے ذہن میں قائم کر رکھا تھا، اس وقت وہ اس کے بالکل برعکس دکھائی دے رہا تھا۔

عید قرباں پر قربانی کی فضیلت و اہمیت سے وہ اچھی طرح آگاہ تھی۔ اس لمحے نصر کو اس روپ میں دیکھ کر کھلے دل سے قربانی کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس نے یہ بھی سیکھ لیا تھا کہ زندگی میں سب کچھ ہماری پسند اور خواہش کے مطابق نہیں ہوتا، چنانچہ زندگی گزارنے کے لیے بہرحال چھوٹے چھوٹے سمجھوتے کرنے ہی پڑتے ہیں۔ اگر اپنے پیاروں کے لیے دل میں جگہ ہو تو ان کے لیے اپنی پسند کی قربانی دینا بھی کچھ مشکل نہیں ہوتا۔

اور یہ تو طے ہے کہ دل سے ادا کی جانے والی قربانی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔

ناولٹ

ساغرِ جم سے میرا جامِ سفال اچھا ہے

انسان شخصی ارتقا کے ابتدائی ادوار میں "گیلی مٹی" کی مانند ہوتے ہیں۔ جنہیں معاشرے کا "کمہار" تربیت کے "چاک" پر دھرتا ہے اور بازارِ حیات کی "مانگ" کو مدِنظر رکھ کر اپنی نیت اور چاہت کے ہاتھوں سے ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اس قالب سازی کے دوران اس کی "انگلیاں" ہر "برتن" کے بدن پر رتبوں، رواجوں، مذہب، سیاست، جذبوں، خوابوں اور سرابوں کی ان گنت پیچیدہ تحریریں رقم کرتی ہیں۔

گیلی مٹی کے یہ "سانچے" حالات کے "آوے" میں ڈھلتے ہیں۔ ان مراحل سے گزرتے ہوئے ہر برتن کا "ظرف" اور "نصیب" اس کی ہیئت کا تعین کرتا ہے۔ کچھ "سفال گر" کی بے توجہی کا شکار ہو جاتے ہیں، کچھ اس کے اناڑی پن کی نذر ہوتے ہیں۔ کچھ "آوے" کی "دہک" برداشت نہیں کرپاتے اور ترخ جاتے ہیں، کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بازار تک تو پہنچتے ہیں مگر انہیں کوئی "خریدار" میسر نہیں آتا۔ ان کا نصیب اور بازار کا اسلوب ہر "ظرف" کا مقام طے کرتا ہے۔ گل دان اور پیک دان میں ساخت کا فرق بھلے نہ ہو، مگر نصیب کا فرق ضرور ہوتا ہے۔ یہی میرے ناول کی تھیم ہے۔

محض چند واقعات کو اپنے انداز میں آپ کے سامنے پیش کر رہی ہوں۔ کرداروں کے ساتھ انصاف کرنے کی زحمت میں نے نہیں اٹھائی، کیونکہ میرا فہم و ادراک ناقص اور نامکمل ہے۔ میں یہ کام آپ پر چھوڑ رہی ہوں، میں آپ کو خود سے بہتر منصف پاتی ہوں۔ میں اپنی رائے بھی نہیں دے رہی۔ صرف آپ کی رائے مانگ رہی ہوں۔

آپ اس ناول کو جس بھی تناظر میں دیکھیں، مگر اسے مٹی کے بے جان برتنوں کی کہانی مت سمجھیے گا۔

یہ جیتے جاگتے وجود رکھنے والے اور جہد کرنے والے انسانوں کی داستان ہے۔

بشریٰ سعید

بشریٰ سعید

سفال گر



۱۳

تیئسویں قسط

مادیو کی نظر دروازے سے اندر آتے اوٹو اور عبدل پر پڑی تو اس نے جوش سے اپنی ران پر ہاتھ مارا تھا۔

"شکر ہے وہ دونوں پہنچ گئے ہیں۔"

رافیل نے' جو گلاس سے چسکیاں لے رہا تھا۔ اس اطلاع پر گلاس رکھتے ہوئے گردن گھما کر دیکھا اور خوشی کا اظہار کیا۔

"مجھے تو یقین ہو چلا تھا کہ آج رات کا پروگرام تہس نہس ہو جائے گا۔ ان لوگوں کو دس منٹ کی مزید تاخیر ہو جاتی تو میں لازما" گھر جا چکا ہوتا۔"

عبدل اور اوٹو ان کے ہاتھ ہلانے پر سیدھے ان کے پاس آئے تھے۔ حال احوال دریافت کرنے اور چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد وہ بار کے سامنے رکھے ہوئے اسٹولز پر بیٹھ گئے۔

"تم دونوں اتنی دیر سے کیوں آئے ہو؟ کیا بھول گئے تھے؟" رافیل نے عبدل اور اوٹو کو دیکھتے ہوئے بھنوئیں اچکائیں۔

"سب اس جرمن کا قصور ہے۔" عبدل نے تمباکو گزیدہ دانتوں کی نمائش کی "اس نے کہا کہ آج ایک شارٹ کٹ سے لے کر جاؤں گا اور وہ شارٹ کٹ شیطان کی آنت نکلا راستے میں کچھ تعمیراتی کام ہو رہا تھا۔"

اوٹو بالوں سے عاری سر پر ہاتھ گھماتے ہوئے بولا "قصور تو ہمیشہ جرمنوں کا ہی ہوتا ہے۔ ہٹلر کی ماں نے اسے پیدا کیا۔ وہ بھی تو جرمن تھی۔"

چاروں نے قہقہہ لگایا پھر ماریو نے اوٹو کی آنکھوں کے سامنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں نچائیں اور لفظ چباتے ہوئے بولا۔

"تمہاری حس مزاح کی خوبی کے ہم قائل ہوئے مگر اتنی سی تصحیح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہٹلر کی ماں آسٹرین تھی' جرمن نہیں۔"

اوٹو جلد شرمندہ ہونے والوں میں سے نہیں تھا۔ وہ ڈھٹائی سے ہنس دیا۔ "اب مجھے کیا معلوم تھا کہ تم ہٹلر کے اتنے بڑے مداح ہو کہ اس کی ماں کا برتھ سرٹیفکیٹ تک دیکھ رکھا ہے۔"

عبدل نے دونوں بازو ہوا میں معلق کر کے انہیں بلندی پر ساکت کر دیا۔ "مسٹر ایڈولف ہٹلر کے اعزاز میں پھر کبھی محفل جمائیں گے۔ بارہ بجنے میں صرف بیس منٹ باقی ہیں۔ آج کے لیے منصوبہ کیا ہے۔ پہلے اس کی تفصیلات طے کر لیں۔"

"وہ تو رافیل ہی بتا سکتا ہے۔" ماریو نے کہا اور وہ تینوں مشتاق نظروں سے رافیل کو دیکھنے لگے۔ وہ اس گروہ کا غیر اعلانیہ گرو تھا۔ "منصوبہ" ہمیشہ وہی تیار کیا کرتا تھا۔

ان کی ملاقات ایک دلچسپ اتفاق کا شاخسانہ تھی۔ چند سال پہلے وہ چاروں ایک امیوزمنٹ پارک کی لفٹ میں ایک دوجے سے متعارف ہوئے تھے۔ رات کا وقت تھا اور لفٹ میں ان چار افراد کے سوا کوئی اور نہ تھا کہ اچانک لفٹ رک گئی۔ وہ سب پریشان ہو گئے۔ وہ دو منزلوں کے درمیان اٹکے ہوئے تھے۔ چند منٹ بعد مائیکرو فون پر ایک آواز نے اعلان کیا کہ "کسی تکنیکی خرابی کی وجہ سے لفٹ جام ہو گئی' لہٰذا انہیں باہر نکالنے کے لیے امدادی کارکنوں کو بلوایا جا رہا ہے۔"

کئی منٹ گزر گئے اور کچھ بھی نہ ہوا' حتیٰ کہ ہلکی سی آہٹ بھی نہ ابھری۔

"میرا اندازہ ہے کہ جس لفٹ سے امدادی گروہ کے کارکن ہم تک آ رہے تھے' وہ بھی خراب ہو گئی ہے۔"

گنجے جرمن نے اونچی آواز میں کہا تو کوئی بھی مسکرایا نہیں۔

"میرے اس جملے پر تم لوگوں کو ہنسنا چاہیے تھا' کیونکہ یہ ایک مزاحیہ بات تھی۔ کیا تم میں سے کوئی واقف ہے کہ مزاح کیا ہوتا ہے؟" اس نے منہ بنا کر کہا۔

اسی پل دوبارہ وہ آواز گونجی۔ "ہم معذرت خواہ ہیں۔ امدادی ٹیم کی گاڑی کو سڑک پر حادثہ پیش آ گیا ہے۔ اس لیے آپ لوگوں کو تحمل سے کام لینا ہو گا۔ ہم جلد ہی آپ کو بحفاظت باہر نکال لیں گے۔"

جرمن نے باری باری سب کو جتاتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ میکسیکن کی ہنسی چھوٹ گئی اور دیکھا دیکھی سب ہی ہنسنے لگے۔

"پتا نہیں کتنا وقت ہمیں یہاں قید رہنا پڑے تو کیوں نہ آپس میں تعارف حاصل کیا جائے۔"

جرمن کی تجویز سے سب نے اتفاق کیا تھا۔

جرمن کا نام اوٹو تھا' وہ ایک بینک کے پے رول سیکشن میں ملازم تھا۔ بنگالی عبدل بھی اس کے ساتھ ہی کام کرتا تھا اور وہ دونوں تفریح کی غرض سے آج اس پارک میں آئے تھے۔ رافیل میکسیکن تھا۔ وہ ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کری ایٹو رائٹر کے طور پر کام کرتا تھا۔

"میں اپنی گرل فرینڈ کے ہمراہ آیا تھا اور پارک میں اچانک مجھے اپنی بیوی اور اس کا بھائی نظر آ گئے۔ اس وقت مجھے لفٹ میں چھپنے کے سوا اور کچھ نہیں سوجھا... تو اب میں تمہارے سامنے ہوں۔" اس نے ہنستے ہوئے بتایا۔

چوتھے فرد کا تعلق اسپین سے تھا۔ اس کا نام ماریو تھا اور وہ اپنے کسی جاننے والے سے ملنے کے لیے پارک میں آیا تھا۔

قریب آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد اچانک لفٹ میں برقی رو بحال ہو گئی اور ان کا استقبال پارک کی انتظامیہ نے بڑے والہانہ پن سے کیا۔

"تاریخ دیکھیے۔ اپریل کا اولین دن شروع ہو چکا ہے۔ اپریل فولز ڈے۔ یہ ایک پریکٹیکل پرینک (عملی مذاق) تھا۔ امید ہے آپ اس سے محظوظ ہوئے ہوں گے۔"

جب انہیں حقیقت کا علم ہوا تو وہ چاروں بہت ہنسے تھے۔ وہیں سے ان میں دوستی ہوئی اور انہوں نے ایک معمول ترتیب دیا کہ وہ ہر سال اکتیس مارچ کی رات بارہ بجے سے قبل ایک جگہ اکٹھے ہوتے اور کوئی زبردست پرینک کسی اجنبی پر آزماتے۔ وہ ہمیشہ watts میں واقع اسی بار میں جمع ہوا کرتے تھے۔ ایک تو یہاں hookers کی کثرت تھی اور دوسرے یہ رافیل کا انتخاب تھا اور رافیل کی بات وہ سب مانتے تھے۔ وہ ان کا سربراہ تھا۔ آج کی محفل بھی اسی تسلسل کی کڑی تھی اور اب رافیل اپنا منصوبہ بیان کر رہا تھا۔

"اس دفعہ مجھے ایک بڑا ہی انوکھا خیال سوجھا ہے۔ ہم کسی خوبصورت عورت کو یقین دلائیں گے کہ وہ بدصورت ہے۔"

"کوئی بدصورت عورت خود کو بدصورت ماننے پر آمادہ نہیں ہوتی تو خوبصورت عورت خاک مانے گی۔" حسب عادت اوٹو نے ٹانگ اڑائی تھی۔

"اسی مشکل میں تو سارا مزا ہے۔ ہم اسے اس طرح سے گھیریں گے کہ وہ جھوٹ اور سچ میں تمیز ہی نہ کر پائے گی۔"

"اور ایسی عورت ملے گی کہاں؟" ماریو نے سوال اٹھایا۔

"کوئی hooker۔ وہ سب سے آسان ہدف ثابت ہو گی۔ کیونکہ ان سے مخاطب ہونا سہل ہے اور کسی زیادہ سخت رد عمل کا امکان تقریبا" ناپید ہے۔ میں دعوا کرتا ہوں کہ یہ پرینک ہمارے تمام سابقہ کارناموں سے بڑھ کر دلچسپ ہو گا۔"

تین کورین لڑکے جو بار کے نزدیک ترین میز پر براجمان تھے اٹھ کر ان کے پاس آ گئے اور ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔ ان میں سے ایک بریسز لگے دانتوں والے لڑکے نے گرمجوشی سے کہا۔

"کیا ہم تمہارے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں۔ ہم نے تمہارا پلان سنا ہے اور یہ باکمال ہے۔"

"ہاں کیوں نہیں۔" رافیل نے فورا" کہا۔ "جتنے زیادہ لوگ ہوں گے' اتنا ہی زیادہ رنگ جمے گا۔ میں تمہیں خوش آمدید کہتا ہوں۔"

اندھا سیاہ فام ریمنڈ جو ایک طرف خاموشی سے بیٹھا ان کی بات چیت سن رہا تھا اچانک بولا۔

"مسٹر رافیل! میری بھی ایک درخواست ہے۔"

رافیل کئی سال سے اسے جانتا تھا۔ وہ پیدائشی اندھا تھا اور اس بار کے قریب بنی ہوئی ایک گفٹ شاپ کی مالک اس کی خالہ زاد تھی۔ دن کا بیشتر حصہ وہ گفٹ شاپ اور اس بار میں گزارا کرتا تھا۔ رافیل چونکہ watts کا رہائشی تھا اور ہر ہفتے کی شام کو اس بار میں باقاعدگی سے آیا کرتا تو اس کا سامنا ریمنڈ سے ہوتا رہتا تھا۔ ریمنڈ کا وتیرہ تھا کہ وہ کبھی اپنی جیب سے نہیں پیتا تھا۔ بار میں آنے والے گاہکوں میں سے کسی نہ کسی سے عارضی دوستی گانٹھ کر وہ ڈرنکس حاصل کرتا تھا۔ رافیل بھی اس کے ایسے ہی "دوستوں" میں شامل تھا۔

"کہو ریمنڈ! ڈرنک دلانے کے علاوہ کوئی درخواست ہے تو ضرور کرو۔" رافیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں بھی اس مذاق میں عملی کردار ادا کرنا چاہتا ہوں۔"

"اچھا، لیکن تمہیں یہ کیسے پتا چلے گا کہ کوئی عورت خوبصورت ہے یا نہیں۔ تم تو انتہائی اندھے آدمی ہو۔" رافیل نے اسے چھیڑا تھا۔

"وہ جتنی بھی بری شکل کی ہو، کم از کم مجھ سے تو بہتر ہوگی۔" اس نے کٹے ہوئے ہونٹ کو اوپر چڑھاتے ہوئے بے ہنگم قہقہہ لگایا۔

سب نے اس کی حاضر دماغی پر داد دی تھی۔

"آج جو بھی عورت مجھے مخاطب کرے گی، میں اسے یقین دلا دوں گا کہ وہ دنیا کی سب سے بدصورت عورت ہے، کیسا مزا آئے گا۔" ریمنڈ نے سیاہ چشمے کو ناک پر جماتے ہوئے زبان سے پٹاخہ بجایا۔

"جو عورت تمہیں مخاطب کرے، اسے تو واقعی خوبصورت کہلانے کا کوئی حق نہیں۔ اس سنگین جرم کی سزا اسے ملنا ہی چاہیے۔" اوٹو نے اس کا مذاق اڑایا تھا۔

"اوٹو! اب بکواس کا سلسلہ ختم کرو۔ دیکھو پورے بارہ ہوگئے ہیں۔" رافیل اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "ہمیں ایک ہی عورت کو نشانہ بنانا ہے اور اسے میں چنوں گا۔ تم لوگ بار سے نکل کر مختلف جگہوں پر ٹھہر جاؤ۔ اور مجھ پر نظر رکھو۔ جیسے ہی میں شروعات کروں، تم لوگ بقدر توفیق ناٹک میں رنگ بھرتے جانا۔" وہ ہدایات جاری کرتا ہوا ان سے الگ ہو کر باہر آیا اور ایک ایسی جگہ دیوار سے کمر جوڑ کر کھڑا ہو گیا، جہاں سے وہ بار کے داخلی دروازے اور ارد گرد کے مقامات کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ وقت گزاری کی غرض سے اس نے جیب سے مشروب کی چھوٹی بوتل برآمد کی اور اس میں سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگا۔

اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ ایک لڑکی نے اس کے قریب رکتے ہوئے لگاوٹ بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"اگر تم ایک سو bucks خرچ کرنے کا حوصلہ رکھتے ہو تو تمہارا وقت بہت عمدگی سے کٹ سکتا ہے۔"

اگر وہ کچھ کہے بغیر وہاں سے گزر جاتی تو رافیل کبھی اندازہ نہ لگا پاتا کہ وہ hooker تھی۔ اپنے حلیے سے وہ کالج کی طالبہ نظر آتی تھی اور وہ اتنی حسین تھی کہ اس سے سخت برتاؤ کرتے ہوئے رافیل کو تاسف ہو رہا تھا۔ اگر یہ کوئی دوسری رات ہوتی تو۔۔۔

"مجھ پر رحم کھاتے ہوئے فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔ کہیں تمہاری مکروہ شکل مجھے قے کرنے پر مجبور نہ کردے۔" دل پر جبر کرتے ہوئے اس نے رکھائی سے کہا تھا۔

وہ الجھن زدہ نظروں سے اسے دیکھتی رہی تھی اور پھر بددل ہو کر رخصت ہو گئی تھی۔

رافیل نے اسے گفٹ شاپ کے آئینے کے سامنے کھوئی ہوئی کیفیت میں کھڑے دیکھا تھا۔ اس نے خود کو شاباش دی تھی۔ لڑکی نے اس کی کہی ہوئی باتوں کا اثر قبول کر لیا تھا۔ جب وہ بار کی طرف جانے لگی تو رافیل نے بار کے دروازے میں ایستادہ کورین لڑکوں کو ہاتھ ہلا کر خبردار کیا اور اشارے سے اس لڑکی کی نشاندہی کی۔ وہ تینوں بیک وقت حرکت میں آئے تھے اور انتہائی

فطری انداز میں چلتے ہوئے لڑکی کے مقابل آگئے تھے۔ ان کے درمیان کچھ جملوں کا تبادلہ ہوا تھا۔ رافیل نے کورین لڑکوں کے اعتماد کو دل میں سراہا تھا۔ کم عمر ہونے کے باوجود وہ ذرا بھی گھبرائے ہوئے دکھائی نہ دیتے تھے۔ وہ لڑکی جب ان سے علیحدہ ہوئی تو واضح طور پر صدمے کے زیر اثر لگ رہی تھی۔ اب اس کا رخ پارکنگ لاٹ کی جانب تھا۔ رافیل نے پھرتی سے سیل فون نکالا اور پیغام لکھنے لگا۔

"وہ پارکنگ ایریا میں آرہی ہے۔ تم اپنی کار نکال کر اس کے راستے میں آجاؤ۔ جلدی کرو۔"

اس نے پیغام ماریو کے نمبر پر ارسال کر دیا۔ وہ دیکھ نہیں سکا کہ ماریو اس سے ٹکرایا تھا یا نہیں البتہ جب وہ دوبارہ سڑک پر دکھائی دی تو پہلے سے بڑھ کر بدحواس تھی۔ اوٹو اور عبدل ایک گوشے میں موجود اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ رافیل کے اشارے پر تیزی سے چل کر لڑکی کے سامنے آگئے۔

وہ hooker پاگلوں کی طرح ادھر ادھر چکرانے لگی تھی اور اسے ٹھوکریں لگ رہی تھیں۔ وہ پوری طرح ان کے بچھائے ہوئے دام میں پھنس چکی تھی، پھر کھیل میں ایک غیر متوقع موڑ آیا۔ اس نے حواس باختہ لڑکی کو گفٹ شاپ میں گھستے اور ریمنڈ کے پاس رکتے ہوئے دیکھا تھا۔ رافیل کے حلق سے ایک قلقاری نکل گئی، کیونکہ ریمنڈ تابوت کی آخری کیل ثابت ہوا تھا۔ وہ لڑکی کاؤنٹر کے قریب زمین پر گر کر تھر تھر کانپ رہی تھی۔ آج تک ان کا کوئی پرینک اتنے شاندار طریقے سے کامیاب نہیں ہوا تھا۔ رافیل نے اپنے ذہن رسا کو ایک فخر بھری تھپکی دی تھی۔

دنیا کے مختلف خطوں اور مختلف رنگ و نسل سے تعلق رکھنے والے وہ آٹھ افراد انجان تھے کہ وہ احمقوں کے عالمی دن کی کوئی رسم نبھانے وہاں یکجا نہیں ہوئے تھے، انہیں کسی کی دعا نے اس مقام پر بلایا تھا اور وہ کسی کی بقا کی جنگ کے بے خبر سپاہی تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ میٹرو اسٹیشن پر تھی جب اس کے سیل فون پر وہ کال آئی۔ متعجب ہوتے ہوئے اس نے وہ اجنبی نمبر دیکھا تھا۔ وقت معلوم کرنے اور گیم کھیلنے کے سوا اس کے سیل فون کا کوئی مصرف نہ تھا اور بعض اوقات وہ سنجیدگی سے سوچنے لگتی تھی کہ اس نے سیل فون رکھا ہی کیوں ہوا تھا۔

"ہیلو!" اس نے فون کان سے لگا لیا۔

"صوفیہ! یہ میں ہوں۔"

اسے بجلی کے ننگے تار نے چھو لیا۔ وہ مرتے دم تک اس آواز کو نہیں بھول سکتی تھی۔

"میں عمر ہوں صوفیہ! تم کہاں ہو؟"

وہ اس کے نام سے بھی واقف تھا۔ وہ اور کیا کیا جانتا تھا؟

اس نے کال کاٹ دی اور سہمی ہوئی نظروں سے گردو پیش کا جائزہ لیا۔ کیا وہ اسی اسٹیشن پر کہیں موجود تھا؟ اس سے کوئی بھی امید کی جاسکتی تھی وہ کوئی عام انسان تو نہیں تھا۔

گھنٹی دوبارہ بج رہی تھی۔ پھر وہی نمبر اسکرین پر جلتا اور بجھتا تھا۔ اس نے لرزتی انگلی سے کال ریجیکٹ کردی۔ کچھ لمحوں کی تاخیر سے پھر کال آنے لگی۔ اس نے اسکرین دیکھے بغیر سیل فون آف کر دیا تھا۔

تمام سفر میں اسے یہ وہم ستاتا رہا کہ کوئی اسے گھور رہا تھا۔ وہ چونک چونک کر ساتھی مسافروں کو دیکھتی رہی تھی۔ پزا پارلر میں کام کرتے ہوئے بھی یہ احساس اس پر حاوی رہا۔ جب وہ پارلر کے کچن میں استعمال شدہ پلیٹوں کو ڈش واشر میں ڈال رہی تھی تو ایک پزا ڈیلیوری بوائے نے اس سے سیل فون مانگا تھا۔ اسے کہیں بات کرنا تھی اور اس کا اپنا فون بلندی سے گر کر خراب ہو گیا تھا۔ وہ اسے فون لوٹانے آیا تو اس کی رنگ ٹون گونج رہی تھی۔

"ایک نمبر سے مسلسل کال آرہی ہے۔ لو بات کرلو۔"

صوفیہ نے اس سے فون لے لیا اور ایک نگاہ چمکتے ہوئے ہندسوں پر ڈالی۔ پھر وہ کچن کے دروازے سے

گزر کر عقب گلی میں آگئی۔ اس نے فون والا ہاتھ ہوا میں بلند کیا اور فون کو ایک کچرادان میں اچھال کر واپس مڑ گئی۔ رنگ ٹون کی آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

ابھی وہ گھر کے دروازے سے دور ہی تھی کہ اسے اپنا خوف مجسّم شکل میں نظر آیا۔ وہ اس سائبان کے نیچے کھڑا تھا جس پر مٹے مٹے حروف میں "گرانٹ اور البا کا اوون" لکھا ہوا تھا۔ وہ عمر کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ اس کے بدترین شکوک سچ ہو گئے تھے۔

وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگی۔ وہ کیوں اس کے پیچھے پڑ گیا تھا؟ آخر وہ اس سے چاہتا کیا تھا؟ وہ اپنی پوری زندگی میں کسی سے اتنی خائف نہیں ہوئی تھی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ اتنے فاصلے سے وہ اس کے قدموں کی آہٹ نہیں سن پائے گا تو وہ ناک کی سیدھ میں دوڑنے لگی۔ وہ پیچھے دیکھے بنا بھاگتی رہی، یہاں تک کہ رہائشی عمارت کا اختتام ہو گیا۔ وہ رک کر سانس درست کرنے لگی تھی۔

"میں کیا کروں؟ کہاں چھپ جاؤں؟ وہ مجھے ہر جگہ سے ڈھونڈ نکالے گا۔ وہ میری جان لیے بنا دم نہیں لے گا۔"

اب اسے اس گھر میں نہیں رہنا تھا۔ اسے فٹ پاتھ پر سونا منظور تھا لیکن وہ اس گھر کے قریب سے گزر تک نہیں سکتی تھی، جس کی دہلیز پر اس جادوگر کے قدم پڑ چکے تھے۔ اس نے سوچا کہ وہ وقتی طور پر ویٹرسز کی اس ٹولی کے ساتھ رہ لے گی جو ایک پے انگ گیسٹ کی تلاش میں تھی۔

☼ ☼ ☼

"سنو عمر! کیا تمہیں مجھ سے نفرت ہے؟" گرانٹ نے کراہ کر اسے پکارا تھا۔

"نہیں" اس نے نرمی سے جواب دیا۔

"تمہیں مجھ پر غصہ آتا ہے؟"

"نہیں۔" عمر نے اسی انداز میں کہا تھا۔

"کیوں نہیں؟ غصہ تو ضرور آنا چاہیے۔ کیا میں اس لائق بھی نہیں ہوں کہ تمہیں مجھ پر غصہ آئے۔" گرانٹ جانے اس سے کیا کہلوانا چاہ رہا تھا۔

"مجھے آپ پر غصہ کیوں آئے گا؟"

"کیونکہ میں نے تمہیں باپ سے محروم کر دیا۔ تمہاری ماں کی زندگی برباد کر دی۔ کیا غصہ آنے کے لیے یہ وجوہات ناکافی ہیں؟"

"میں نے کبھی اس طرح سے نہیں سوچا۔ بلکہ آپ سے ملنے سے پہلے میں نے آپ کے متعلق کچھ سوچا ہی نہیں تھا۔"

"میری اتنی تذلیل نہ کرو۔ کم از کم مجھ سے ناراض ہو جاؤ۔" گرانٹ نے منت آمیز لہجے میں کہا۔ گزشتہ رات سے اس کا سانس اکھڑا ہوا تھا اور اسے بولنے میں دشواری ہوتی تھی۔

"آپ سو جائیں۔ باتیں کر کے خود کو تھکائیں مت۔"

"اس amnesia (نسیان) کا کوئی فائدہ نہیں ہے، جو میں یاد رکھنا چاہتا ہوں وہ بھول جاتا ہے اور جو بھولنا چاہتا ہوں وہ یاد رہتا ہے۔" اس نے ہچکی بھرتے ہوئے ویران آنکھوں سے عمر کو دیکھا تھا۔

"مجھے موت سے خوف آتا ہے۔"

"آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ ایک لمبی زندگی جئیں گے۔ میں آپ کے لیے دعا کروں گا۔" عمر نے ایک ملائم مسکراہٹ سے اسے حوصلہ دیا تھا۔

"تم میرے لیے دعا کیوں کرو گے؟"

"کیونکہ میں آپ سے.... میں آپ کو صحت یاب دیکھنا چاہتا ہوں۔" اس نے رکتے ہوئے جملہ مکمل کیا۔

"لیکن تم مجھ سے پیار تو نہیں کرتے ناں۔ جب پیار نہیں ہے تو دعا بھی نہ کرو۔"

عمر خاموشی سے سنتا رہا۔

"مجھے معلوم ہے کہ میں مرنے والا ہوں۔ مجھے موت سے بڑا ڈر لگتا ہے۔"

"موت کوئی ہیبت ناک شے نہیں ہے یہ تو سفر میں

آنے والا ایک پڑاؤ ہے جیسے پیدائش، بچپن، جوانی اور بڑھاپا۔ کوئی بھی اپنی مرضی سے ان منازل سے نہیں گزرتا۔ اسے گزار دیا جاتا ہے۔ جو زندہ ہے، اسے مرنا تو پڑتا ہی ہے۔ موت کوئی انہونا واقعہ تو نہیں ہے اور مر کر ہم جہاں جاتے ہیں، وہ اس جگہ سے بہت اچھی ہے۔"

"مجھے جہنم سے ڈر لگتا ہے عمر! میرا دل سوکھے پتے کی طرح کانپتا ہے۔" اس کی آواز میں نقاہت بڑھ رہی تھی۔

"آپ جنت کی آرزو کریں۔ اللہ آپ کو ابتلا سے محفوظ رکھے گا۔"

"وہ ناراض ہے۔"

"آپ منالیں اسے۔"

"کیسے مناؤں؟"

"معافی مانگ کر۔"

"معافی مانگی تھی، پر وہ مانا نہیں۔"

"معافی مانگنے کا ڈھنگ صحیح نہیں ہو گا۔"

"کس ڈھنگ سے مانگتے ہیں؟"

"رو کر انکساری سے۔"

"رویا تو بہت ہوں۔"

"مایوسی اسے پسند نہیں۔ وہ معاف کرنے والا رحمان ہے۔"

"کچھ باتیں ایسی ہیں جو معافی کے لائق نہیں۔"

"وہ پھر بھی معاف کر دیتا ہے۔"

گرانٹ خاموش رہا۔ اس کی آنکھوں میں خالی پن تیرتا تھا۔ اس کے سانس لینے کی آواز ایک خرخراہٹ تھی جو کمرے میں گونج رہی تھی۔

"کیا تم میری قبر پر آؤ گے؟"

عمر نے کوئی جواب نہ دیا اور اس پر جھکتے ہوئے اس کا بازو سہلانے لگا۔

"مجھے قبر سے خوف آتا ہے۔" نمی کی پتلی لکیر اس کی آنکھ کے گوشے سے کان کی سمت رینگ رہی تھی۔

"تم پرنیاں کو مت بتانا کہ مجھے کہاں دفن کیا گیا ہے۔ اسے کبھی میری قبر پر لے کر نہ آنا.... اور میرا ایک کام کرو گے عمر؟" وہ اپنی اداس آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"جی میں کروں گا۔ آپ بولیے۔"

گرانٹ اسے وہ کام بتانے لگا تھا اور اس کی آنکھ سے بہتی ہوئی نمی کی لکیر پھیل رہی تھی۔

"کیا تم نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ اگر کہو تو میں دہرا دوں۔"

"نہیں۔ میں نے ذہن نشین کر لیا ہے۔" عمر نے اسے یقین دلایا تھا۔

"میرے مرنے کے بعد تم یہ کام ضرور کرنا۔ تمہارا تھوڑا سا وقت خرچ ہو گا۔ اسے بھولنا نہیں، تم کرو گے نا؟"

عمر کو اس کا سونپا ہوا کام عجیب لگا تھا لیکن اس نے یہ بات گرانٹ سے نہیں کہی۔

"تم اب جاؤ۔ اور ساری بتیاں جلتی رہنے دینا۔ تاریکی مجھے ڈراتی ہے۔"

کچن کی فضا پگھلتے ہوئے پنیر کی خوشبو سے بھری تھی۔ کک لینا ایک بڑے برتن میں گریوی تیار کرتے ہوئے ویٹرس ایلس کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ صوفیہ نے پزا پارلر کے لوگو والی ٹوپی سر سے اتارتے ہوئے ایک گلابی پرچی لینا کو دی اور سلیب پر بیٹھ کر سستانے لگی۔

آج ہفتے کی شام تھی۔ پزا پارلر میں آنے والوں کی تعداد معمول سے کہیں زیادہ تھی۔ شفٹ کی ابتدا سے ہی کسٹمرز کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ نتیجتاً" وہ ڈائننگ ہال اور کچن کے درمیان چکراتے چکراتے نڈھال ہو گئی تھی۔

"تمہارے سیکشن میں تو آج ایک بھی میز خالی نہیں ہو رہی۔" لینا نے اس کے اکتائے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کہا۔ "ٹپ جمع ہونے کی رفتار بھی اتنی ہی تیز ہے یا بس ٹانگیں ہی تڑوا رہی ہو"

"پتا نہیں۔" وہ بیزار تھی۔

لینا اور ایلس دوبارہ باتوں میں مگن ہو گئیں۔

وہ اخبار ہاتھ میں لے کر سرخیوں پر سرسری نظر دوڑانے لگی۔ جس خبر پر اس کی نظر ٹھٹکی وہ ٹوبی کریک Aka (المعروف) میبل پر چلنے والے قتل کے مقدمے کے بارے میں تھی۔ وہ تفصیل پڑھنے لگی۔

مرنے والی لڑکی کے گینگسٹر بھائی کے ایما پر نسلی فسادات شروع ہو گئے تھے۔ میبل کی حمایت میں سامنے آنے والی ایک نسل پرست سیاہ فام تنظیم تھی جو جارحیت کا جواب جارحیت سے دینے پر ایمان رکھتی تھی۔ دونوں جانب سے اشتعال انگیز بیانات جاری کیے جا رہے تھے اور کشیدگی میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ عدالتی فیصلے کی نوعیت پر علاقے کے امن کا دارومدار تھا۔ اخبار رکھتے ہوئے وہ سلیب سے اتر آئی اور لینا سے کہنے لگی۔

"اس دفعہ میں ان چار لڑکیوں کا آرڈر لیے بغیر ہال میں گئی تو مجھے شک ہے وہ چاروں مجھے پیٹنے لگیں گی۔ وہ دس بار پوچھ چکی ہیں کہ ابھی کتنی دیر ہے۔"

"گریوی میں چمچ ہلاتے ہوئے لینا ہنسی تھی۔ "اگر ایسا خدشہ ہے تو مزید تین منٹ ہال میں جانے سے پرہیز کرو۔ توقع ہے کہ میں تمہیں پٹنے سے بچالوں گی۔"

بھاری ٹرے کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر چلتے ہوئے وہ بدقت جسم کا توازن قائم رکھے ہوئے تھی۔ ابھی وہ برہم نظر آنے والی چار لڑکیوں کی میز سے تھوڑی دور ہی تھی کہ اس نے ایک چہرے کی سرسری جھلک سی دیکھی۔ وہ بلا ارادہ رک گئی اور اس سمت نظریں اٹھائیں اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں اور رنگت پنیر کی طرح پھیکی پڑ گئی۔ وہاں عمر موجود تھا۔

میز پر کہنیاں دھرے، تھوڑی کے نیچے ہتھیلی جمائے وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ روح کو چھیدنے والی نظریں ...... خوف نے اسے برف کے ٹکڑے میں ڈھال دیا۔ وہ ٹکٹکی باندھے عمر کو دیکھتی رہی۔

"تم نے ٹرے ترچھی کر دی ہے۔ چیزیں گر جائیں گی۔" عمر نے اچانک اسے خبردار کیا۔

وہ منہ سے کوئی آواز نکالے بنا اتنی تیزی سے گھومی کہ ٹرے نیچے گرتے گرتے بچی۔ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ اس کا رخ واپس کچن کی جانب ہو گیا تھا۔

"تم بہری ہو یا کوئی دوسرا مسئلہ ہے؟"

اپنے پیچھے اسے ایک چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ خالی الذہنی میں منہ کھولے ان چار لڑکیوں کو گھورنے لگی جو جانے کب سے اسے پکارے جا رہی تھیں۔

منوں وزنی قدم اٹھاتی ہوئی وہ ان کی میز تک گئی اور ٹرے کے مشمولات کچھ سوچے سمجھے بغیر میز پر پھیلانے لگی۔ ان میں سے ایک لڑکی مسلسل اسے جھڑک رہی تھی۔ مگر وہ اس کی آواز پر دھیان نہیں دے رہی تھی۔ عمر کے سوا وہ کسی بھی بات پر دھیان نہیں دے سکتی تھی۔

وہ یہاں بھی آپہنچا تھا۔ اس تعاقب میں بلاشبہ کوئی بھید مضمر تھا جس کے متعلق سوچتے ہوئے صوفیہ کا دل ڈوبتا تھا۔

خود کو اس سے پوشیدہ رکھنے کی خاطر اس نے کیا کیا نہ کیا تھا۔ وہ اپنا سیل فون تلف کر چکی تھی۔ گھر میں

رہنا چھوڑ چکی تھی، کہیں باہر جاتے ہوئے اسکارف اور چشموں کا استعمال کرنے لگی تھی تاکہ آسانی سے پہچانی نہ جا سکے مگر اس کی سب تدبیریں حماقت پر مبنی تھیں۔ جو چند الفاظ کے زور پر اسے ایک پیدائشی اندھے کے منہ سے بدصورت کہلوا سکتا تھا، وہ اسے ڈھونڈ نکالنے میں کیسے ناکام رہتا۔

کچن میں جاتے ہوئے اسے لامحالہ اس میز کے قریب سے گزرنا تھا۔ فرش پر آنکھیں مرکوز کیے وہ چل رہی تھی کہ پہلو سے عمر کی آواز ابھری۔

"صوفیہ! یہاں آؤ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ ان سنی کر کے آگے بڑھتی رہی۔

"صوفیہ! رک جاؤ۔ میں اس رات کے بعد سے مسلسل تمہاری تلاش میں بھٹک رہا ہوں۔ کیا تمہارے پاس میری بات سننے کے لیے چند لمحے بھی نہیں ہیں؟"

فلور منیجر آسکر، جو صوفیہ کی بے توجہی کا گواہ تھا، تیزی سے اٹھ کر آیا۔

"صوفیہ! کسٹمر تمہیں بلا رہا ہے اور تمہارے کان پر جوں نہیں رینگ رہی۔ کیا وجہ ہے اس لاپروائی کی؟"

"تم کسی دوسری ویٹرس سے کہہ دو۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"مگر کیوں؟ تم دیکھ نہیں رہی ہو کہ وہ تمہارے سیکشن میں بیٹھا ہے۔ اسے سنبھالنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ اب جاؤ جلدی اور کتنا وقت ضائع کرو گی۔" آسکر نے درشتی سے کہتے ہوئے اسے عمر کی طرف دھکیلا۔

"اگر تم انتخاب کر چکے ہو تو مجھے بتا دو۔ تم کیا کھانا پسند کرو گے؟" ایک گلابی صفحوں والی نوٹ بک اور قلم ہاتھ میں لے کر صوفیہ نے پوچھا۔ آواز میں سراسیمگی کو عیاں ہونے سے روکنے کے لیے اس نے پورا زور لگایا تھا۔

"جو کچھ بھی مینو میں درج ہے، وہ میری قوت خرید سے باہر ہے۔ ویسے مجھے بھوک بھی نہیں ہے۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں۔ بالکل اس رات کی طرح۔"

اس کی نظریں سختی سے گلابی کاغذ پر جمی تھیں۔

"فکر مت کرو۔ میں تمہیں قیمت ادا کروں گا، تمہارے وقت کی۔ تمہاری شفٹ ختم ہونے تک میں یہیں بیٹھ کر تمہارا انتظار کروں گا۔ جب تم فارغ ہو جاؤ تو میرے ساتھ چلنا۔"

صوفیہ کا چہرہ اور بھی بے رنگ ہو گیا۔ اس کے معدے میں گرہیں سی پڑ رہی تھیں۔ وہ مڑ کر فلور منیجر آسکر کے پاس گئی اور سرگوشی میں بولنے لگی۔

"مجھے رخصت چاہیے۔ اچانک مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔"

آسکر کی صورت پر ناگواری پھیل گئی۔ "یہ ممکن نہیں ہے۔ پارلر میں گاہکوں کی کس قدر فراوانی ہے۔ اس شفٹ کی ایک ویٹرس پہلے ہی چھٹی پر ہے۔ اب میں تمہیں بھی جانے کی اجازت دے دوں تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔ تم جا کر کام کرو۔"

"میں نہیں رک سکتی۔ میری طبیعت خراب ہو گئی ہے۔"

آسکر کے ماتھے پہ بل پڑ گئے۔

"یہ کس قسم کے عذر تراش رہی ہو۔ پہلے کہہ رہی تھیں کہ ضروری کام یاد آگیا ہے اور اب تمہاری طبیعت خراب ہے۔ خرابی اگر کہیں ہے تو تمہاری نیت میں ہے۔ اب جاؤ یہاں سے۔" اس نے چہرے کے آگے زور سے ہاتھ ہلایا۔

وہ کچن میں آکر چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر ایپرن اتار کر پھینک دیا۔

جب وہ لباس تبدیل کر کے کچن کے گلی میں کھلنے والے دروازے سے باہر جا رہی تھی تو کک لینا "ارے ارے۔" کرتی رہ گئی۔

صوفیہ طے کر چکی تھی کہ دوبارہ پزا پارلر کا رخ نہیں کرے گی بلکہ وہ لاس اینجلس چھوڑ دینے کے بارے میں بھی سنجیدگی سے غور کر رہی تھی۔ وہ لڑکا حقیقی معنوں میں اس کے قدموں تلے سے زمین کھینچ رہا تھا۔ آخر وہ تھا کون اور اس کے عزائم کیا تھے؟

وہ جتنا سوچتی اسی قدر الجھن بڑھتی جاتی اور وہ کتنا دیکھا بھالا سا لگتا تھا جیسے وہ برسوں سے اسے دیکھتی آ رہی ہو۔

"وہ جلد ہی میری غیر موجودگی کو محسوس کرلے گا اور پھر میری کھوج میں نکل کھڑا ہو گا۔ اسی مہلت کے دوران مجھے یہاں سے دور چلے جانا چاہیے۔" اسکارف کو پیشانی پر نیچے کھینچتے ہوئے وہ گردن گھما کر پیچھے دیکھنے لگی اور قدموں کی رفتار تیز کردی۔

"ہمیشہ سامنے دیکھ کر چلا جاتا ہے۔ اس طرح سے تو تمہیں ٹھوکر لگ سکتی ہے۔"

اس نے جھٹکے سے گردن سیدھی کی تو پیروں کے ساتھ ساتھ اس کا پورا جسم ساکت ہو گیا۔

عمر اس کے راستے میں حائل تھا۔ یوں جیسے وہ اچانک زمین سے اگ آیا ہو۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر تھوک نگلا اور ہراساں نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

"تم دیر تک کچن سے باہر نہیں آئیں تو مجھے شبہ ہوا۔ میں نے کچن میں جانے کی کوشش کی تو مجھے اندر جانے کی اجازت نہیں دی گئی البتہ میں نے تمہیں عقبی دروازے سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ لہٰذا میں سڑک سے ہو کر اس گلی میں آگیا۔ شکر ہے کہ پارلر کی عمارت سے دوسری عمارتیں جڑی ہوئی نہیں ہیں ورنہ مجھے لمبا چکر کاٹ کر آنا پڑتا اور شاید تم جا چکی ہوتیں۔" وہ اس کی جانب چل کر آتے ہوئے عام سے انداز میں بتا رہا تھا۔

"اور تم نے رات کے وقت اتنے گہرے رنگ کے چشمے کیوں لگا رکھے ہیں؟ اگر یہ کسی جدید رجحان کا نتیجہ ہے تو مجھے معاف کرنا۔ میں ایک سادہ مزاج دیہاتی لڑکا ہوں۔ مجھے فیشن کی زیادہ سمجھ نہیں۔" وہ ایسے بات کر رہا تھا جیسے ان دونوں میں خوشگوار مراسم ہوں۔

"تمہارے سیل فون پر میں نے لاتعداد کالز کیں، تم نے جواب کیوں نہیں دیا اور پرسوں رات سے تمہارا نمبر بند مل رہا ہے۔ تم اپنے گھر بھی نہیں آئیں۔ میں کئی کئی گھنٹے وہاں تمہارا انتظار کرتا رہا۔ تم کہاں تھیں؟"

صوفیہ نے کوئی جواب نہ دیا اور آہستگی سے چلنے لگی۔

"تم مجھے باتھ روم میں بند کر کے چلی گئی تھیں۔ پوچھو گی نہیں کہ مجھ پر کیا بیتی۔ پوری رات مجھے کسی نے نہیں نکالا۔ میں نے باتھ ٹب میں لیٹ کر رات گزاری۔ اگلی صبح نو بجے کے قریب ایک میڈ کمرے میں آئی تو مجھے رہائی ملی۔ میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ بعض اوقات ہم جلد بازی میں کچھ ایسے کام کر جاتے ہیں۔ جنہیں کرتے ہوئے ہمیں کوئی اندازہ نہیں ہوتا کہ ہم یہ کس لیے کر رہے ہیں۔ صوفیہ! کیا میں اتنا برا ہوں کہ مجھ سے بات کرنا تک تمہیں گوارہ نہیں اور ہاں یہ اسکارف تم پر بہت جچ رہا ہے۔"

وہ اس سے دو قدم آگے چپ چاپ چلی جا رہی تھی۔ عمر ایک لمبا ڈگ بھر کر اس کے سامنے آگیا۔

"میں تمہیں لے جانے آیا ہوں۔ گھبراؤ مت، میں تمہارے وقت کی مناسب قیمت ادا کروں گا۔ میں نے تمہارے ساتھ کام کرنے والی ایک ویٹرس سے معلوم کیا ہے۔ پارلر میں تمہیں ایک گھنٹے کے چھ ڈالر دیے جاتے ہیں۔ میں بھی اسی حساب سے ادائیگی کر دوں گا۔"

"تم مجھے سمجھتے کیا ہو؟ میں کوئی hooker ہوں جو تم مجھے معاوضہ دینے کی بات کر رہے ہو؟ تمہیں میری توہین کرنے کا کیا حق ہے؟" یکلخت وہ چیخ پڑی۔

"میں نے یہ تو نہیں کہا۔" وہ گڑبڑا گیا۔ "میں تو صرف یہ چاہ رہا تھا کہ......"

صوفیہ نے اس کا جملہ کاٹا۔ "میں تمہیں نہیں پہچانتی۔ میں تم سے کبھی نہیں ملی۔ میں نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔ تم جو کوئی بھی ہو، اور میں جاننا بھی نہیں چاہتی کہ تم کون ہو۔ میرے راستے سے ہٹ جاؤ، میرا تعاقب نہ کرو۔ میں اجنبیوں سے بات نہیں کیا کرتی۔ یہ میری عادت کے خلاف ہے۔"

وہ اس کے پہلو سے کترا کر نکلی اور تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔

"صوفیہ! مجھے معاف کر دو۔ میں نے حقیقتاً تمہاری توہین کی ہے۔ مجھے گفتگو کا ڈھنگ ہی نہیں آتا میں آیندہ محتاط رہوں گا۔ تم ایک بہت خاص لڑکی ہو اور میں دل سے ایسا سمجھتا ہوں۔ میرے ساتھ چلو ہم کسی پارک میں تھوڑی دیر بیٹھیں گے، باتیں کریں گے اور اس کے بعد اگر تم محسوس کرو کہ مجھ سے ملنا ٹھیک نہیں تو دو ٹوک الفاظ میں مجھے بتا دینا۔ میں دوبارہ تمہیں پریشان نہیں کروں گا۔ کوئی جواب تو دو کیا تم نے مجھے معاف کر دیا ہے؟"

اس کا دل بھر آیا۔ آنکھوں میں پانی جمع ہونے لگا تھا۔ کیا وہ اس قابل تھی کہ اس عاجزی سے اس سے معافی مانگی جائے؟

"تم مجھ سے چاہتے کیا ہو؟" وہ رو دینے کو تھی۔

"میں تمہیں جاننا چاہتا ہوں۔"

"اور کتنا جانو گے؟ کیا ہے جو تم سے چھپا ہوا ہے؟"

"تمہاری ذات کے کئی پہلو ہیں جن سے میں بے خبر ہوں۔ میں ان سب سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں، تمہیں ہر شے کی خبر ہے۔ تم جادو کرتے ہو اور پھر خود کو عام انسانوں جیسا ظاہر کرتے ہو۔"

"میں عام انسان ہوں۔ مجھ میں کوئی مافوق الفطرت صلاحیت نہیں ہے۔ میں نے جادو نہیں کیا اور نہ ہی میں کر سکتا ہوں۔"

صوفیہ نے بے اعتباری سے اسے دیکھا تھا۔

"اس رات میرے ساتھ جو ہوا اس کے بعد بھی تم جادوگر ہونے سے انکار کر رہے ہو۔ وہ جادو نہیں تھا تو کیا تھا؟ کیا عام زندگی جینے والے عام انسانوں کو ایسا واقعہ پیش آنا ممکن ہے؟ اس کی کوئی عقلی توجیہہ تمہارے پاس یا دنیا کے کسی بھی آدمی کے پاس ہے؟"

"اس رات کیا ہوا تھا؟"

"انجان مت بنو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اس رات مجھ پر کیا بیتی؟"

عمر نے آسمان کو دیکھتے ہوئے بہار کی ہوا جیسی پرسکون آواز میں کہا۔ "ہاں میں جانتا ہوں کہ اس رات کیا ہوا ہو گا؟"

"کیا؟" صوفیہ نے سانس روک کر پوچھا۔

"تم نے گناہ نہیں کیا۔ تمہیں روک دیا گیا۔"

صوفیہ رکی ہوئی سانس نتھنوں سے باہر دھکیل کر بولی۔ "پھر بھی تم بضد ہو کہ تم جادوگر نہیں ہو۔ میں یہ کیسے مان سکتی ہوں؟"

"ہاں میرا دعوا برقرار ہے اور میرے پاس اس کی عقلی توجیہہ بھی موجود ہے۔ کیا تم اسے سننا نہیں چاہو گی اگر تمہارا جواب ہاں میں ہے تو یہاں سے دو بلاک دور ایک چھوٹا سا پارک ہے۔ ہم وہاں آرام سے چند گھنٹے گزار سکتے ہیں۔"

"میں تمہارے ساتھ اتنی دیر تک نہیں رہوں گی۔" صوفیہ نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم پارک میں جانے پر راضی ہو بھلے تھوڑے وقت کے لیے ہی سہی۔"

صوفیہ کو ادراک ہوا کہ بے خیالی میں وہ اقرار کر چکی تھی۔

"میں اس لڑکے کے مقابل اتنی بے بس کیوں ہوں میں سڑک کے کنارے پڑا ہوا یہ بھاری پتھر اٹھا کر اس کا سر کیوں نہیں پھاڑ دیتی اور راتوں رات یہ اسٹیٹ چھوڑ کر کہیں دور کیوں نہیں چلی جاتی؟"

وہ خود کو اس کے احکامات کی تعمیل کرنے کا پابند کیوں پاتی تھی؟

"میں وجہ معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے کوئی ذہنی وضاحت چاہیے ورنہ تجسس سے میری شریانیں پھٹ پڑیں گی۔ میں پارک میں چلوں گی۔" اس کی زبان بھی تو اس لڑکے کے تابع تھی۔ اس سے وہ ہی الفاظ ادا ہوتے تھے جو وہ سننا چاہتا تھا۔

پھر ان دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی۔ پارک تک کا راستہ خاموشی میں ملفوف رہا۔ جب وہ زمین میں گڑے ہوئے پایوں والے سنگی تخت کے دونوں سروں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے تو صوفیہ نے اپنے جوتے اتار کر گھاس پر اچھال دیے اور ٹانگیں سمیٹ کر تخت پر رکھتے ہوئے ہاتھ سے پیروں کے پنجوں کو دبانے لگی۔

"میرے پاؤں درد کر رہے ہیں۔" اس نے بلاوجہ عمر کو بتایا۔

عمر نے ایک نظر گھاس پر پڑے ہوئے اس کے جوتوں کو دیکھا اور بولا۔ "اس روز بھی تم نے یہ ہی جوتے پہن رکھے تھے۔"

"ہاں۔" صوفیہ نے سر کو جنبش دی۔

"میرا خیال ہے ان جوتوں کی وجہ سے تمہارے پاؤں دُکھ رہے ہیں۔ یہ دیکھنے میں ہی تکلیف دہ معلوم ہوتے ہیں۔"

"تم صحیح کہہ رہے ہو۔" صوفیہ بولی۔ "یہ میرے پیروں کے لیے ذرا سے کھلے ہیں۔ چلتے ہوئے میرے پنجے اگلی سمت کھسکتے رہتے ہیں۔ میری ماں کے پاؤں مجھ سے بڑے تھے۔ میں نے سنا تھا کہ ہسپانوی عورتوں کے پاؤں بڑے حسین ہوتے ہیں۔ میری ماں کے معاملے میں یہ جھوٹ نکلا۔ وہ مجسم بدصورتی تھی۔ یہ اسی کے جوتے ہیں۔"

"البا مارسیلو کے۔"

عمر کے منہ سے البا کا نام سن کر وہ حیران نہیں ہوئی۔ اس میں مزید حیران ہونے کی سکت ہی نہیں تھی۔ اس نے گھٹنے کھڑے کر کے دونوں ہتھیلیاں گھٹنوں پر رکھیں اور گردن ڈھلکا کر بیٹھ گئی۔

"تمہاری ماں کی المناک موت پر مجھے افسوس ہے۔"

"مجھے بھی ہے لیکن اس بات پر کہ وہ اتنی آسانی سے کیوں مری۔ اگر مجھے اختیار دیا جاتا تو میں اس کی جان لینے کا کوئی بے حد دردناک طریقہ ایجاد کرتی۔"

اس کے لہجے میں نفرت کی ایسی شدت تھی کہ عمر ششدر رہ گیا۔

"اتنا غصہ کیوں؟ مرے ہوئے لوگوں کے لیے دعا کی جاتی ہے۔ انہیں برا بھلا نہیں کہا جاتا۔ وہ تو تمہاری اپنی ماں تھی۔"

"غصہ؟" صوفیہ نے چیخ کر کہا۔ "میری نفرت کی کوئی حد نہیں ہے۔ میں اس کی قبر کھود کر اس کی سڑی ہوئی لاش پر تھوکنا چاہتی ہوں' اپنے برتھ سرٹیفکیٹ سے اس کا نام مٹانا چاہتی ہوں۔"

"اس کے باوجود تم اس کے جوتے پہنتی ہو۔ کتنی عجیب بات ہے۔" عمر نے دونوں بازو سینے پر باندھ لیے۔

"ہم یہاں البا اور میرے تعلقات پر بحث کرنے نہیں آئے۔ تم مجھے کچھ بتانے والے تھے۔" صوفیہ نے اسے یاد دلایا تھا۔

"میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ تم اس رات کا احوال بیان کرو۔ موٹیل کے کمرے سے نکلنے کے بعد کیا ہوا؟"

"کیا بتاؤں؟ مجھے خود نہیں معلوم کہ میرے ساتھ کیا ہوا۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتی کہ میں خواب میں تھی یا جاگ رہی تھی۔" وہ آنکھیں بند کر کے بولنے لگی۔

عمر نے سنا' سمجھا اور جانا کہ دعا کی طاقت کیا تھی۔ اللہ کی بڑائی کے سامنے وہ ایک ذرے کی مانند سمٹا ہوا تھا۔ کن فیکون ..... ہوا میں ایک صدا کی بازگشت تھی۔ اس نے فرشتے کا پر دیکھا۔ وہ منور تھا اور آسمان کی طرف اٹھ رہا تھا۔ اس کا لمس عمر کے وجود کو ملائمت سے چھوتا تھا۔ اس کا دل اتنا نرم پڑ گیا کہ اس کے مائع بن کر بہہ جانے میں فقط ایک گام کا فاصلہ رہ گیا۔

"میں سب تفصیلات مکمل درستی کے ساتھ نہیں سنا سکتی۔ بس اتنا سمجھ لو کہ وہ میری زندگی کی سب سے بھیانک رات تھی۔"

صوفیہ نے آنکھیں کھولتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ عمر کے چہرے پر ایک ناقابل بیان تاثر نظر آتا تھا۔ اس کے لب دھیرے سے ہلے۔ "میں تمہیں لکھ کر دینے پر تیار ہوں کہ اس سے اچھی رات شاید تمہاری زندگی میں کبھی نہ آئے۔" اس کا گلا رندھا ہوا تھا۔

وہ جملہ قابل فہم نہ تھا۔

"تم نے یہ کیسے کہا؟ تم نے مجھ پر کیا عمل کیا تھا' تم نے جادو کہاں سے سیکھا ہے؟"

"میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ تم سراسر غلط خطوط پر سوچ رہی ہو۔"

"تو تم میری غلطی درست کیوں نہیں کرتے؟ تم مجھے پاگل کر دو گے۔" وہ جھنجھلا گئی۔

"میں ہر چیز کی وضاحت کروں گا مگر میری ایک شرط ہے۔"

"اور وہ کیا ہے؟"

"تمہیں اپنے متعلق ہر بات مجھے بتانا ہو گی۔ ہر وہ شے جو تمہاری یادداشت میں محفوظ ہے۔ ہر وہ واقعہ جس نے تمہاری شخصیت کو تلخ بنانے میں کوئی کردار ادا کیا ہے۔ وہ سب کچھ تم مجھے بتاؤ گی اور میں اس کے بدلے میں تمہارے سوال کا جواب دوں گا۔"

"لیکن اس سے تمہیں کیا فائدہ ہو گا۔ ہر چیز تو تمہارے علم میں ہے۔ تم خود کو ایک عام انسان ظاہر کرنے کی زحمت میں کیوں پڑ رہے ہو؟ تم ثابت کر چکے ہو کہ تم جادوئی علوم پر دسترس رکھتے ہو۔"

"میں تمہارے سارے شکوک رفع کر دوں گا۔ فی الحال تم اپنی داستان شروع کرو۔" عمر نے زور دے کر کہا۔

"کیا تم سنجیدہ ہو؟"

"ہاں میں اس سے زیادہ سنجیدہ کبھی نہیں ہوا۔" وہ ذرا سا مسکرایا تو صوفیہ نے نظر چرا لی۔ وہ حتی المقدور اس کے چہرے کو براہ راست دیکھنے سے احتراز برت رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنکھیں ملتے ہی صوفیہ کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اسے ہپناٹائز کر دیا گیا ہو۔ وہ باقی دنیا سے کٹ کر رہ جاتی تھی۔

"اتنی لمبی بات کرنے میں تو ڈھیر سارا وقت خرچ ہو گا۔" اس نے گویا پسپائی کا اعلان کیا۔

"تو کیا ہوا؟ کیا تم عجلت میں ہو؟ تمہیں کہیں جانا ہے؟"

"نہیں کوئی بھی جگہ ایسی نہیں جہاں میرے نہ ہونے سے کسی کو کوئی فرق پڑتا ہو۔ لیکن تمہارے پاس شاید اتنی فرصت نہ ہو اور ایک معمولی لڑکی کے غیر دلچسپ قصے سننے کے لیے حوصلہ بھی تو چاہیے۔"

"مجھے آزما کر دیکھ لو۔ یہ دونوں خواص مجھ میں ہیں۔" وہ پھر مسکرایا تھا "تمہیں برا نہ لگے تو ایک بات کہوں؟"

"پارک میں ناکافی روشنی ہے اور تم نے رنگین چشمے لگا رکھے ہیں۔ تم تھوڑی عجیب سی نظر آ رہی ہو۔"

وہ خفیف ہو گئی "مجھے خیال ہی نہیں رہا۔" اس نے چشمہ اتار کر تخت پر رکھ دیا۔

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ میں نے صبح سے ایک سیب کے سوا کچھ نہیں کھایا۔"

"بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔ ٹھہرو میں کچھ لے آتا ہوں۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟"

"پارک کے نواح میں ایک گیس اسٹیشن ہے۔ میں وہاں سے سینڈوچ لے آتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے البتہ ذہن میں رکھنا کہ میں کسی بھی طرح کا گوشت نہیں کھاتی۔"

"اچھا ہوا تم نے بتا دیا۔ میں خیال رکھوں گا۔" اس نے قدم بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

"کیوں یہ بات تم پہلے سے نہیں جانتے تھے کیا؟" وہ تیزی سے جوتے پہنتے ہوئے بولی۔ "ذرا رکو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

وہ کافی اور سبزیوں والے سینڈوچ خرید کر واپس اسی جگہ آ گئے۔

صوفیہ نے سینڈوچ کھاتے ہوئے بڑی انکساری سے کہا۔ "میں نے تمہیں باتھ روم میں بند کر کے اچھا نہیں کیا۔ تمہیں بہت تکلیف ہوئی ہو گی۔ میں بے حد گھبرا گئی تھی۔ یقین مانو مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا میں کیا کر رہی ہوں۔"

"میں تمہاری کیفیت سمجھ سکتا ہوں۔ میں تمہیں قصوروار تصور نہیں کرتا۔" عمر نے کافی والا کاغذی کپ اس کے نزدیک کھسکایا۔

"اب تم ابتدا کر دو۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

"جو تم کہو۔" صوفیہ نے کپ سے گھونٹ بھرا اور کہنا شروع کیا۔ "جب میں پیدا ہونے والی تھی تو میرا باپ مارسیلو میری ماں کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ ان دنوں وہ بے روزگار تھی۔"

وہ کہتی رہی۔ وہ نفرت سے اٹی ہوئی کہانی تھی۔ اس میں کوئی ایک خوشگوار لمحہ بھی نہ تھا بس کڑواہٹ تھی اور درد تھا۔ صوفیہ اسے یوں سنا رہی تھی جیسے وہ کسی اور کی زندگی کا احوال ہو۔ اس کا لہجہ کسی بھی تاثر سے خالی تھا۔ کسی بھی مقام پر اس کی آنکھ میں نمی نہ آئی۔ وہ ایک چوبی گڑیا تھی جس کے ہونٹ کسی میکنزم سے کھلتے تھے اور بند ہوتے تھے۔

جب رات نصف سے زائد بیت گئی اور پارک تقریباً ویران ہو گیا تو عمر نے کہا۔ "میں کل دوبارہ اسی جگہ تمہیں ملنے آؤں گا۔ میں صبح دس بجے تمہارا انتظار کروں گا۔"

صوفیہ نے چہرہ اٹھا کر درختوں کی چوٹیوں پر پھسلتے ہوئے روشن چاند کو دیکھا اور بولی۔

"تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم اپنے بارے میں بتاؤ گے۔ لیکن اب تک میں اتنی ہی بے خبر ہوں جتنی اس ملاقات سے پہلے تھی۔"

"مجھ پر بھروسہ رکھو۔ میں وعدہ ضرور پورا کروں گا۔ تم آؤ تو اسکارف لے کر آنا۔ تم اس میں بہت اچھی لگتی ہو۔"



اگلی صبح عمر پارک میں آیا تو صوفیہ پہلے سے موجود تھی۔ اس نے سلیٹی رنگ کے لانگ اسکرٹ کے ساتھ ہم رنگ اسکارف پہن رکھا تھا اور اس کے پیروں میں وہی جوتے تھے جن کی ایڑیاں میخوں کی مانند باریک اور نوک دار تھیں۔ عمر کو دیکھ کر وہ آگے آئی۔ اس نے ہاتھ میں ایک ٹوکری لٹکا رکھی تھی۔

"میں دوپہر کے کھانے کے لیے کچھ چیزیں ساتھ لے آئی ہوں۔ رات والے سینڈوچ خاصے بدذائقہ تھے۔"

ٹوکری کو گھاس پر رکھتے ہوئے اس نے چھپے ہوئے رنگین کپڑے کا مستطیل ٹکڑا نکال کر شاہ بلوط کے گھنے پیڑ تلے بچھایا اور عمر کو بیٹھنے کی دعوت دی۔ وہ دونوں جوتے اتار کر چادر پر بیٹھ گئے۔

"تمہارا خیال تھا میں آؤں گی؟" صوفیہ نے سوال کیا۔

"ہاں مجھے ایسا ہی لگتا تھا۔"

"اور اگر میں نہ آتی تو...؟"

"تو کیا؟"

وہ پوچھتے ہوئے جھجکی۔ "تو کیا تمہیں دکھ ہوتا؟"

"یقیناً ہوتا۔" اس نے سادگی سے کہا۔

"تم جوس پیو گے؟" صوفیہ نے انناس کے رس کا ایک ڈبہ اسے دیا۔

"شکریہ۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں آنکھیں جھکائے ہوئے تھا۔

اس نے گہرے نیلے رنگ کی پتلون اور آدھی آستینوں والی سفید قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کے بھورے بال شاخوں سے چھن کر آتی دھوپ میں چمک رہے تھے اور شاہ بلوط کے پتوں کا عکس اس کی پیشانی پر ٹھہرا تھا۔ اس نے جوس پیتے ہوئے نظر اٹھائی تو صوفیہ نیچے بچھی ہوئی چادر کی دھاریوں کو دیکھنے لگی۔

بڑی دیر دھوپ، چھاؤں اور گرم ہوا کو محسوس کرتے رہے پھر صوفیہ بولی۔ "تم کوئی بات کیوں نہیں کرتے؟"

عمر کہنی زمین پر جماتے ہوئے پہلو میں جھک گیا تو پتوں کا سایہ سرک کر اس کی گردن پر آ گیا۔ "بات تو تمہیں کرنا ہے۔ میں یہاں سننے آیا ہوں۔ تم بولتی جاؤ میں سن رہا ہوں۔" وہ مسکرا رہا تھا۔

"کیا تمہاری کوئی گرل فرینڈ ہے؟"

"تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"بس ایسے ہی تم اتنے خوب صورت ہو، ممکن نہیں کہ اب تک کوئی لڑکی تمہاری کشش کا شکار نہ ہوئی ہو۔"

وہ واضح طور پر جھینپ گیا اور رخ پھیر کر دور کھیلتے ہوئے بچوں کے گروہ کو دیکھنے لگا۔

"تم کم سے کم ہاں یا ناں میں تو جواب دے سکتے تھے۔ بہرحال تمہاری مرضی۔"

"ابھی تم صرف اپنی بات کرو جب میری باری آئے

گی تو میں سب کہوں گا۔ رات جب میں رخصت ہوا تو تم گرانٹ کے رویے کے بارے میں بتا رہی تھیں۔"

صوفیہ نے کندھے اچکا کر گہرا سانس بھرا۔ "گرانٹ کہتا تھا خدا گناہ گاروں پر عذاب اتارتا ہے لیکن میں نے سات سال کی عمر میں کیا گناہ کیے تھے، مجھے کبھی معلوم نہیں ہو سکا۔"

انہوں نے اسی جگہ دوپہر کا کھانا کھایا جب دھوپ تیز ہو گئی اور وہ قطعہ سیدھا شعاعوں کی زد میں آ گیا تو عمر نے صوفیہ کی مدد سے چادر کو گھسیٹ کر شاہ بلوط کے بڑے گھیر والے تنے کے قریب کر دیا۔ ظہر کے وقت عمر نے پارک میں لگے ہوئے نل سے وضو کیا اور چادر کے ایک کنارے پر نماز ادا کی۔ عبادت کے دوران اس کا ارتکاز اتنا مکمل تھا کہ صوفیہ کو لگاتار اسے گھورتے رہنے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی۔

وہ شاہ بلوط کے تنے سے کمر جوڑے ساکت بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔

نماز کے بعد عمر کہنی کے بل نیم دراز ہو گیا۔ آج صوفیہ گزشتہ رات کے مقابلے میں زیادہ روانی سے بات کر رہی تھی۔ عمر نے کسی بھی جگہ اسے ٹوکا نہیں۔ جب دھوپ نے پر سمیٹ لیے اور سائے لمبے ہونے لگے تو صوفیہ بولی۔

"میں تھک گئی ہوں، مجھ پر سستی چھا رہی ہے۔"

عمر سیدھا ہو بیٹھا۔ "آلو کے قتلے بڑے مزے کے تھے۔ کاش تم نے تھوڑے سے زیادہ بنائے ہوتے۔"

وہ الوداعی کلمات تھے۔ صفیہ کو اچانک ایک بے پایاں محرومی کا احساس ہوا۔ وہ اس ملاقات کا اختتام نہیں چاہتی تھی۔

"میں اتنی بھی تھکی ہوئی نہیں ہوں۔ اگر تم کچھ دیر اور رکنا چاہو تو......" اس نے جملہ نامکمل رہنے دیا۔

"صوفیہ! تمہیں اللہ سے اتنی شکایتیں ہیں۔ میں نے تمہاری زبان سے اس کے کسی ایک احسان کا ذکر بھی نہیں سنا۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ اس نے تمہارے ساتھ کچھ بھی اچھا نہیں کیا۔"

اس نے زخم کو چھیڑا تھا صوفیہ بلبلا اٹھی۔

"اس نے کئی اچھائیاں کیں۔ مجھے البا جیسی ماں دی اور گرانٹ جیسا شخص باپ کے روپ میں بخش دیا۔ میں نے جو مانگا اس نے نہیں دیا۔ جو پایا اس نے چھین لیا۔ کون سی تکلیف اور کون سا دکھ ہے۔ جو اس نے مجھ پر وارد نہیں کیا۔ میں نے ہر طرح کی تذلیل سہی، جسمانی اور ذہنی تشدد برداشت کیا، تمام زندگی محرومی سے سسکتے ہوئے گزاری۔ کیا یہ سب اس کی مرضی کے بغیر ہوتا رہا؟"

عمر نے اس کے لال بھبھوکا چہرے کو دیکھ کر متوازن لہجے میں کہا۔ "اللہ نے تم پر اتنے احسانات کیے ہیں کہ تم گننے بیٹھو تو تمہارا حساب جواب دے جائے۔ لیکن تمہیں ان کا شعور نہیں ہے۔"

"مثلاً؟"

عمر نے کچھ کہنے کی خاطر ہونٹ وا کیے تو صوفیہ نے شتابی سے کہا۔

"یہ گھسی پٹی باتیں مت کرنا کہ اس نے مجھے آنکھیں دی ہیں۔ ہاتھ اور ٹانگیں دی ہیں۔ یہ ساری چیزیں تو اس نے اربوں لوگوں کو دی ہیں لیکن ان اربوں لوگوں کو اس نے وہ تکلیفیں نہیں دیں۔ جو اس نے میرے لیے چنی ہیں۔"

عمر گھاس کی پتی توڑ کر اسے مٹھی میں مسلنے لگا۔

"میں ان چیزوں کا نام نہیں لینے والا تھا۔ حالانکہ یہ سب اللہ کی نعمت ہیں اور تم اس سے انکار نہیں کر سکتیں۔ ان اربوں لوگوں میں سے چند سو ملین ایسے بھی ہیں جن کے جسمانی اعضاء پورے نہیں ہیں اور تم ان میں سے ایک نہیں ہو۔ تم سوچو اور خود فیصلہ کرو کہ البا اور گرانٹ کے بنائے ہوئے گھریلو ماحول میں رہنے اور اتنے سال ان کی صحبت میں گزارنے کی طاقت تمہیں کس نے دی؟ کیا سب لوگ اتنے ہی مضبوط اعصاب کے مالک ہوتے ہیں؟ تم نے خودکشی کیوں نہیں کی؟ تم گھر سے بھاگ کیوں نہیں گئیں؟ تم اس وقت کسی پاگل خانے میں کیوں نہیں ہو؟"

وہ دم بخود رہ گئی۔ اس انداز میں تو اس نے آج تک نہ سوچا تھا۔ اسے البا یاد آنے لگی۔ تین مردہ بیٹوں کی

ماں اینا' قبرستان کو جانے والی راہ میں گاتی اور ہنستی ہوئی اینا۔

"خدا تم پر اپنی رحمتیں نازل کرے جیسے اس نے مجھ پر انہیں اتارا..... اس نے مجھے صبر دیا۔ اور ایسی ہی بے شمار آسانیاں اس نے تمہارے لیے پیدا کی ہیں جن کی تمہیں خبر تک نہیں۔ میں تمہیں کوئی فہرست بنا کر نہیں دوں گا' تمہیں خود کو ڈھونڈنا ہو گا۔ کل جب ہم ملیں تو تم مجھے کسی ایک احسان کا حال سناؤ گی جو اس نے خاص تمہاری ذات پر کیا ہو۔ ایک رات کم تو نہیں ہے اسے تلاش کرنے کے لیے؟"

وہ طنز نہیں کر رہا تھا مگر صوفیہ کو اس کے الفاظ چبھے۔

"تو کل بھی ہم مل رہے ہیں؟" چند لمحے خاموش رہ کر اس نے کہا تھا۔

"اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو۔ ابھی ہماری بات ادھوری ہے۔ کل پیر ہے تو شام کے وقت ملیں گے لیکن۔" اسے کچھ یاد آیا تھا۔ "تمہیں تو پڑا پار کر جانا ہو گا۔ تم رات کی شفٹ میں کام کرتی ہو۔"

صوفیہ نے بکھرا ہوا سامان ٹوکری میں منتقل کرتے ہوئے گردن ہلائی۔ "میں اب یہاں کام نہیں کرتی۔ میں سارا دن فارغ رہوں گی۔ تم جو بھی وقت مقرر کرو گے میرے لیے موزوں ہو گا۔"

"اچھا تو پھر شام چار بجے ٹھیک رہے گا کیونکہ مجھے یونیورسٹی جانا ہے۔" وہ چادر لپیٹنے میں اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔

"چلو تمہارے بارے میں ایک بات تو مجھے پتہ چل گئی کہ تم پڑھتے ہو۔"

"یونیورسٹی کسی اور کام کے سلسلے میں بھی جا سکتا ہوں۔"

صوفیہ نے اسے جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

"تم بڑے پر اسرار ہو۔"

وہ ہنس رہا تھا۔ "ویسے یہ واحد چیز نہیں ہے جو تم میرے متعلق جانتی ہو' تمہیں میرا نام بھی معلوم ہے۔"

پارک کے دروازے پر وہ اسے خدا حافظ کہہ کر رخصت ہونے لگا تو بولا۔ "سنو صوفیہ! انسانوں کے اعمال کو پیمانہ بنا کر اللہ کے بارے میں رائے قائم کرنا احمقانہ ترین افعال میں سر فہرست ہے۔ ہم زندگی میں کسی نہ کسی مقام پر یہ غلطی ضرور کرتے ہیں۔ میں بھی کر چکا ہوں۔ تم اب کر رہی ہو۔

سنار کی کارگاہ میں ایک اہرن ہوتا ہے' لوہے سے بنا ہوا۔ سنار اس پر سونے کو زیورات کی شکل میں ڈھالتا ہے۔ سالہا سال اہرن پر سونا کوٹا جاتا ہے لیکن اہرن لوہے کا ہی رہتا ہے۔ اس کا ایک ذرہ بھی سونے میں تبدیل نہیں ہوتا۔ بعض دل سنار کے اہرن کی طرح ہوتے ہیں۔ سونے کا لمس اور سنار کی ہتھوڑی کی ضربیں ان پر کوئی اثر نہیں ڈالتیں۔ یاد رکھو کہ ساری دنیا سونے کے زیور کو دیکھتی ہے' اہرن کو کوئی نہیں دیکھتا۔ تم اہرن بننا چاہتی ہو یا زیور' اپنے آپ سے پوچھ لو۔"



وہ پل کے کٹہرے میں بازو پھنسائے گزرتی ہوئی گاڑیوں کو خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

ان گھڑیوں میں وہ بیرونی دنیا سے یکسر لاتعلق تھی۔ اس کے اندر ایک جہان آباد تھا۔ پر ہنگام اور متموج۔ تہہ در تہہ' پرت در پرت' ایک پردہ ہٹتا تو ایک آئینہ نمودار ہوتا اور اس آئینے کے اندر سینکڑوں آئینوں کے عکس ظاہر ہوتے..... ہر آئینے میں ایک جدا منظر۔ ایسے لاکھوں پردے اور ان گنت آئینے تھے۔ اس مینا خانے میں وہ ہر گام پر ٹھٹکتی جھانکتی اور آگے بڑھ جاتی ..... چکر پہ چکر۔ لامتناہی گردش جیسے وہ کسی بھنور میں گرفتار ہو۔ وہ تحت الشعور کی بھول بھلیوں میں بھٹکتی تھی اور راہ ڈھونڈتی تھی۔

خدا نے اس پر جو کرم کیے تھے' وہ اسے کیوں نظر نہیں آتے تھے۔ عمر کہتا تھا وہ تعداد میں اتنے ہیں کہ گنتی ختم ہو جاتی ہے' شمار ختم نہیں ہوتا تو پھر وہ اس کی آنکھ سے اوجھل کیوں تھے؟

"اس نے مجھے خوب صورت بنایا ہے۔ یہ یقیناً ایک عنایت ہے لیکن یہ خاص مجھ پر تو نہیں۔ وہ اور

لوگوں کو بھی خوب صورت بناتا ہے۔"

ان کے علاقے میں ایک وبائی بخار پھیل گیا تھا تو کنبوں کے کنبے اس میں مبتلا ہوئے تھے تاہم وہ بچی رہی تھی۔ اس بخار سے پیدا ہونے والی کیفیات دردناک تھیں۔ وہ خدا کا احسان ہی تو تھا پھر بھی وہ اس کی ذات تک محدود نہیں تھا۔ کچھ اور لوگ بھی محفوظ رہے تھے اِلبا بھی ان بچ جانے والے لوگوں میں سے تھی۔ اگر خدا نے البا جیسی بری عورت کو تکلیف سے بچالیا تھا تو اسے بچالینے میں کیا اختصاص ہوا۔ وہ تب ایک معصوم بچی تھی۔

اور جب وہ میبل کے ساتھ تھی اور پولیس کی اچانک آمد پر ان کے ہاتھ نہیں آئی تھی۔ اسے بھی ایک احسان مانا جاسکتا تھا مگر وہ قصوروار تو نہیں تھی۔ اگر پولیس اس کی وہاں موجودگی سے واقف ہو جاتی تو وہ باآسانی انہیں مطمئن کر سکتی تھی۔ یہ کوئی ایسی قابل ذکر بات نہیں تھی۔

اس نے کئی واقعات یاد کیے اور انہیں رد کر دیا۔

"کل شام میں عمر کو کیا بتاؤں گی۔ اگر میں کہوں گی کہ خدا نے مجھ پر کوئی خاص احسان نہیں کیا تو وہ سمجھے گا کہ میں ہٹ دھرم اور کوڑھ مغز ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ میری بابت ایسا خیال اس کے دل میں آئے۔"

ایک گاڑی کا ہارن بار بار بج رہا تھا۔ وہ چونک کر متوجہ ہوئی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک کار رکی ہوئی تھی۔ وہ اس کار کو اچھی طرح پہچانتی تھی اگرچہ وہ ایک عرصے بعد اسے دیکھ رہی تھی۔

کارل میکارتھی دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ وہ اکیلا تھا اور قدرے دبلا ہو گیا تھا اور اس کا چہرہ پہلے کی نسبت لمبا لگ رہا تھا۔

"آہا صوفیہ!" اس نے تھیٹر کے کسی اداکار جیسا اونچا اور کھوکھلا قہقہہ لگایا۔

"دنیا میں کیسے کیسے واقعات ہوتے ہیں۔ آج گھر سے نکلتے ہوئے میں نے ہرگز یہ نہیں سوچا تھا کہ تم سے سامنا ہو گا یعنی صوفیہ...... عظیم صوفیہ اور میں ایک حسین رات میں 'سڑک کے درمیان' آمنے سامنے' رومان...... خالص رومان۔" وہ پتلون کی جیبوں میں انگوٹھے اڑسے اس کے پاس آگیا۔

ایک وقت تھا جب وہ اسے مسحور کر دیا کرتا تھا اور آج وہ ایک معمولی شخص تھا۔ اتنا معمولی کہ صوفیہ کی آنکھوں کے سامنے ابھی اگر کوئی گاڑی اسے کچل کر گزر جاتی تو وہ نائن ون ون پر اطلاع دینے اور چند منٹ غمگین رہنے کے سوا کچھ بھی نہ کرپاتی۔ نظر کیسے بدلتی ہے۔ دنیا میں کیسے کیسے واقعات ہوتے ہیں۔ جانے کیوں وہ کارل اور عمر کا موازنہ کرنے لگی۔

اگر دونوں کو کسی ایک جگہ اکٹھا کر دیا جاتا تو اسے یقین تھا کہ کارل کو کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا لیکن وہ یہ موازنہ کر ہی کیوں رہی تھی۔ 'ہرن کو کون دیکھتا ہے' سب سونے کے زیور کو دیکھتے ہیں۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"وقت گزار رہی ہوں۔" اس نے بھڑک کے بنا کہا۔

"وقت گزارنے کا یہ انداز کتنا اکتاہٹ بھرا ہے۔ تم چاہو تو میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ میں ایک شاندار قسم کی پارٹی میں شریک ہونے جا رہا ہوں۔ تمہیں بھی ساتھ لے چلتا ہوں بشرطیکہ تم اس کام کا معاوضہ طلب نہ کرو۔ البتہ تمہارا حلیہ ایسا ہے کہ تم فیونرل کے علاوہ کسی دوسری پارٹی میں گھسنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتیں۔ فیونرل بھی ایک طرح کی پارٹی ہی تو ہے۔ تم بالکل نن دکھائی دے رہی ہو۔ بہرکیف تمہارے پاس اس مسئلے کا کوئی حل ہے تو فوراً بتادو۔ سوچنے کے لیے میں تمہیں دس سیکنڈ کی مہلت دیتا ہوں۔"

"میں سوچ چکی ہوں۔" صوفیہ نے ترنت کہا۔

"اچھا تو کیا سوچا تم نے؟"

"پہلے تم میرے ایک سوال کا جواب دو۔ کیا میں تمہیں بدصورت نظر آرہی ہوں؟" کارل نے گال کو ناخنوں سے کھجایا۔ "نہیں تو' مجھے صرف اس اسکارف اور ننوں والے لبادے پر اعتراض ہے۔"

"لیکن کارل! تم مجھے بدصورت نظر آرہے ہو۔ تم

ہر لباس اور ہر حلیے میں مجھے بدصورت لگو گے۔ میری نظر میں خرابی یا شاید درستی ہو گئی ہے...... تم سڑک کے بیچ کھڑے ہو۔ کوئی گاڑی تمہیں کچل سکتی ہے۔ اپنا خیال رکھنا۔"

وہ اس کے رد عمل کا جائزہ لیے بغیر وہاں سے چلی آئی تھی۔



وہ ایک بار پھر روبرو تھے۔ عمر کے پاس گتے کا ایک ڈبہ تھا لیکن اس نے صوفیہ کو بتایا نہیں کہ اس میں کیا تھا حالانکہ اس نے اصرار بھی کیا تھا۔

"کل میں نے تمہیں ایک سوال حل کرنے کو دیا تھا۔ تم اس کا جواب لائی ہو؟" عمر نے دریافت کیا۔

"جواب مجھے مل گیا ہے۔ تم صحیح کہہ رہے تھے۔" صوفیہ نے خوش دلی سے شکست کا اعتراف کیا۔

"یعنی تم مانتی ہو کہ اللہ نے خاص تمہاری ذات پر احسانات کیے ہیں؟" عمر کی آنکھوں میں خوشی کی جھلک تھی۔

"میں مانتی ہوں۔"

"تو بتاؤ۔"

"رات کو مجھے کارل میکارتھی ملا تھا۔"

عمر کے لیے یہ نام نامانوس تھا۔ "کون ہے وہ؟"

"ایک غیر اہم شخص ہے لیکن اس سوال کا جواب اس سے جڑا ہے......"

گزشتہ رات کارل میکارتھی کی باتیں سنتے ہوئے اس کی نظروں میں پروم پارٹی کا پورا منظر گھوم گیا تھا۔ اس رات وہ کارل کی "ڈیٹ" ہونے پر خود کو خوش نصیب گردان رہی تھی اور جب گرانٹ سب کے سامنے اسے مارتے پیٹتے ہوئے زبردستی وہاں سے لے گیا تھا تو اس بے عزتی پر اس کا مرجانے کو جی چاہا تھا۔ ہائی اسکول کے طلباء سے منہ چھپانے کی غرض سے اس نے اسکول جانا ترک کر دیا تھا۔ بعد میں کارل اور اس کے دوست کی گفتگو سے اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ دونوں اس رات خفیہ طور پر اس کی فوٹیج حاصل کرنے کا انتظام کر چکے تھے۔ اصل بے عزتی تب ہوتی جب وہ کارل کے ہمراہ اس کے دوست کے اپارٹمنٹ میں جانے میں کامیاب رہتی اور اس کی فوٹیج منظر عام پر آتی۔

پارٹی کے دوران گرانٹ سے ایک تھپڑ کھانا تو اس ذلت کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھا۔ سر میں ایک مٹھی دھول پڑ جانا اور گٹر میں گر جانا...... دونوں تجربے یکساں نہیں ہیں۔ اس رات گرانٹ کو بھیج کر خدا نے ایک انوکھے طریقے سے اسے ذلیل ہونے سے بچالیا تھا۔ اس نے من و عن سارا قصہ عمر کے گوش گزار کر دیا اور حیرت کی بات تھی کہ اسے شرمندگی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ کوئی بھی چیز اس سے پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتی تھی۔

عمر نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔

"آج بھی تم اپنا بھید نہیں کھولو گے؟" صوفیہ نے کہا تو وہ مسکرانے لگا۔

"آج نہیں' آج میں جلدی میں ہوں۔ مجھے اسپتال جانا ہے۔"

"کس لیے؟"

"کوئی بیمار ہے۔ اسے دیکھنے جانا ہے۔"

"میری کوئی مصروفیت نہیں ہے۔ کیوں نہ میں بھی اس بیمار کو دیکھنے چلوں۔" عمر نے اس تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ "پھر کسی دن تمہیں لے جاؤں گا اور ہاں یہ میں تمہارے لیے لایا تھا۔"

اس نے ڈبہ اٹھا کر گود میں رکھا اور اسے کھول کر بغیر ایڑی کے بے ڈھب سے جوتے نکال کر صوفیہ کو تھما دیے۔ "ان کی قیمت محض بارہ ڈالر ہے اور یہ دیکھنے میں بھی کافی بھدے ہیں۔ مجھے احساس ہے کہ نوجوان لڑکیاں ایسے جوتے پہننا اپنی توہین کے مترادف سمجھتی ہیں۔ مگر ان جوتوں میں ایک خوبی ہے کہ یہ آرام دہ ہیں۔" عمر لجاجت سے کہہ رہا تھا۔

"مجھے تمہارے پاؤں کے ناپ کا علم نہیں تھا تو میں اندازے سے خرید لایا ہوں۔ تمہیں پسند نہیں آئے

ہوں گے۔ لیکن دیکھو یہ اونچی ایڑیوں والے لال جوتے تمہاری ماں کے ہیں جو مر چکی ہے۔ یہ تمہارے پیروں کے لیے نہیں ہیں۔ تم انہیں مت پہنو۔ جو پیروں کو کاٹیں' ان جوتوں کو چھوڑ دینا ہی اچھا۔ تو کیا تم میرے لائے ہوئے جوتے.....“

اس کا جملہ مکمل ہونے سے قبل صوفیہ ان جوتوں کو پیروں میں پہننے لگی تھی۔ ناپ درست تھا اور وہ نرم سے جوتے حقیقتاً ”آرام دہ تھے۔ وہ آگے پیچھے چل کر عمر کو دکھانے لگی۔ اس کے انداز میں اتراہٹ سی تھی۔

”اتنے خوب صورت جوتے آج سے پہلے کبھی میری نظر سے نہیں گزرے۔“

”تم مجھے شرمندہ کر رہی ہو۔ اب مجھے لگ رہا ہے کہ ان کا رنگ بھی خاصا برا ہے۔ انہیں خریدنا میری غلطی تھی۔“ وہ واقعی شرمندہ تھا۔

”میرے نئے جوتوں کو برا مت کہو' میرا دل دکھتا ہے۔“ وہ مسکرائی تھی۔

عمر کے جانے کے بعد اس نے الباکے جوتوں کے دونوں پاؤں ٹھوکروں سے مخالف اطراف میں اچھال دیے اور اپنے نئے جوتوں پر نظریں جمائے ہوئے سہج سہج قدم رکھنے لگی۔

پارک کے داخلی دروازے اور گھاس کے آخری قطعے کے بیچ ایک کچا میدان حائل تھا' جس میں گھاس نہیں لگی ہوئی تھی۔ اس میں داخل ہوتے ہوئے صوفیہ نے جوتے اتار کر ہاتھ میں پکڑے اور ننگے پاؤں میدان کو پار کیا۔ اسے ڈر تھا کہ جوتوں کو گرد لگ جائے گی۔ پارک کے دروازے کے باہر سڑک پر اس نے ایک رومال سے اپنے مٹی بھرے پیروں کو رگڑ رگڑ کر صاف کیا اور دوبارہ جوتے پہن لیے۔ بس اسٹاپ تک وہ نہایت احتیاط سے جوتوں کو مٹی سے بچاتے ہوئے چلتی رہی۔

اپارٹمنٹ میں گھستے ہی اس نے جوتے اتار کر انہیں جھاڑ پونچھ کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا اور اسٹول پر بیٹھ کر انہیں دیکھنے لگی۔

رات کو سوتے ہوئے اس نے بتی جلتی رہنے دی اور بستر پر ڈریسنگ ٹیبل کی طرف رخ کر کے لیٹ گئی۔ وہ دیر تک جوتوں کو پلکیں جھپکائے بنا گھورتی رہی۔

رات کو کسی وقت اسے لگا کہ جوتوں کے پیتاووں پر بنا ہوا مونوگرام اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اٹھی اور انہیں بستر کے قریب ایک کرسی پر رکھ دیا۔ صبح تک اس نے تین دفعہ جوتوں کی جگہ تبدیل کی تھی۔ جب وہ پوری رات آنکھوں میں کاٹنے کے بعد کسی نو دمیدہ شگوفے کی مانند ترو تازہ بستر سے اٹھی تو جوتے اس کے سرہانے رکھے ہوئے تھے۔

☼ ☼ ☼

”میں ایڈم گرانٹ کا بیٹا ہوں۔“

یہ وہ آخری بات تھی جسے وہ عمر کی زبان سے سننے کی توقع کر سکتی تھی۔ وہ سکتے میں آگئی۔

”تم نے کئی بار پرنیاں آئزک کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ میری ماں ہیں۔“

آج سماعت کا عمل صوفیہ کے ذمے تھا۔ وہ عمر کی طرح تحمل سے نہیں سن رہی تھی۔ وہ بے صبری سے جگہ جگہ اسے روکتی اور سوالوں کی بوچھاڑ کر دیتی۔ عمر اسے مطمئن کرنے کی اپنی سی سعی کر رہا تھا۔

صوفیہ کی بعض الجھنیں رفع ہو رہی تھیں تو بعض نئی الجھنیں پیدا ہو رہی تھیں۔ وہ شدید مضطرب تھی۔ عمر کے نقوش کی مانوسیت کا عقدہ کھل گیا تھا اور وہ متعجب تھی کہ عمر اور گرانٹ میں اتنی گہری مشابہت کو وہ کیسے نظر انداز کر گئی تھی۔ دراصل وہ گرانٹ سے اس درجہ بدظن تھی کہ کوئی بھی اچھی بات اس سے منسلک نہ کر پاتی تھی۔

عمر کی کہانی پر غور کرتے ہوئے اسے ایک انوکھی سی خوشی ہو رہی تھی۔ اس میں اور عمر میں ایک تعلق تھا ایک قدر مشترک تھی۔ ان دونوں کی زندگیوں میں ایک کردار یعنی گرانٹ مشترک تھا۔ وہ ایک حوالے سے جڑے ہوئے تھے اگرچہ یہ حوالہ خوش کن نہ تھا مگر تعلق تو اپنی جگہ موجود تھا۔ یہ پیچیدہ نوع کی نسبت

صوفیہ کو خوشی پہنچا رہی تھی۔

”میرا خیال ہے میں نے بہت سی خالی جگہیں پُر کر دی ہیں۔ اب میں ذرا کم پُراسرار ہو گیا ہوں۔“ عمر نے اپنے جوتے کی نوک سے ایک سوکھی شاخ ٹکراتے ہوئے کہا۔

”تمہارا اسیل فون نمبر میں نے گرانٹ سے معلوم کیا۔ گھر کا پتا بھی انہوں نے بتایا۔ یوں بھی ان کی آدھی گفتگو تمہارے گرد گھومتی ہے۔ تم کبھی اسپتال نہیں آتیں۔ وہ اس بات کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ ان کی یادداشت ان کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی رہتی ہے تو کبھی کبھی وہ خود سے فرض کر لیتے ہیں کہ۔

”صوفیہ آئی ہو گی لیکن مجھے بھول گیا ہے۔“

صوفیہ نے اپنی رائے محفوظ رکھی۔ وہ عمر کے سامنے تلخ باتیں کہنے سے گھبراتی تھی۔

”تم پارلر تک کیسے آگئے؟ کیا اس کا پتا بھی گرانٹ سے ملا تھا؟ میں نے اسے بڑا پارلر کا بروشر ضرور دکھایا تھا لیکن اس پارلر کی تو بہت ساری شاخیں ہیں۔ اس نے اس مخصوص شاخ کی نشاندہی کیسے کر دی؟“

”تم درست کہتی ہو۔ انہیں تو اس کا نام تک یاد نہیں تھا۔ اس معاملے میں مجھے تھوڑا سا ذہن لڑانا پڑا۔ جس رات میں تمہیں موٹیل کے کمرے میں لے کر گیا تو تمہارے پرس پر پارلر کا لوگو بنا ہوا تھا۔ پھر ایک موقع پر تم نے رومال سے پسینہ صاف کیا تو اس رومال پر بھی مجھے وہ لوگو دکھائی دیا۔ میں اس سے قبل اسپتال میں تمہارے منہ سے سن چکا تھا کہ تم کسی بڑا پارلر میں ملازمت کر رہی ہو۔ میں نے لاس اینجلس میں قائم شاید تمام شاخوں کے پتے حاصل کیے تمہارے گھر سے نزدیک ترین پارلر سے تلاش کا آغاز کیا اور تب.....“

اس نے کندھے اچکا دیے۔

تفاخر کی طاقتور لہر صوفیہ کی رگوں میں سرائیت کر گئی۔ کیسا اعزاز تھا کہ عمر اسے ڈھونڈنے کی زحمت اٹھا رہا تھا۔

”صوفیہ! اگر میں کہوں کہ تم گرانٹ کو معاف کر دو تو؟“ وہ سابقہ موضوع پر لوٹ آیا تھا۔

صوفیہ نفرت سے سکڑ گئی۔ ”تم ایسا کیوں کہو گے؟“

”وہ شکنجے میں کسے ہوئے ہیں۔ قابل رحم ہیں۔ تم معاف کر دو گی تو ان کا بوجھ کم ہو جائے گا۔“

”اس نے مجھ پر کبھی رحم نہیں کھایا' میں اس پر رحم کیسے کروں؟“

عمر نے چھڑی کو زور سے جوتے پر مارا۔ ”میں نے بھی تو انہیں معاف کیا ہے۔ انہوں نے میرے ساتھ جو زیادتی کی ہے۔ وہ تم سے کیے ہوئے سلوک سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔ پھر بھی میں نے اللہ کے لیے.....“

”میں' تم نہیں ہوں۔ میں تو بس میں ہوں۔ میرا دل چھوٹا ہے' بہت ہی چھوٹا۔“

اس نے عمر سے چھڑی لے لی اور ہتھیلی پر ضربیں لگانے لگی۔ ”تم مجھے اصل موضوع سے بھٹکا رہے ہو۔ موٹیل کے کمرے میں تم نے مجھ پر کیا عمل کیا تھا۔ میں ان مردوں کو بدصورت کیوں دکھائی دی؟ وہ مختلف نسلوں کے مرد تھے اور ان سب نے مجھے پہلی نظر میں ٹھکرا دیا۔ ان میں سے ایک اندھا بھی تھا۔ تم کس طرح مجھے قائل کرو گے کہ یہ واقعہ فطرت کے اصولوں سے ماورا نہیں ہے۔“

”میں تمہیں قائل نہیں کروں گا۔“ عمر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”کیوں؟“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”ضرورت کیوں نہیں ہے؟“ اس کی حیرانی میں اضافہ ہوا۔

”تم خود اس کا جواب جانتی ہو لیکن انسانی فطرت کے عین مطابق ناک کے نیچے کی چیز دیکھ نہیں پا رہی ہو۔ یقین کرو اس سے بڑھ کر سیدھا اور سادہ سوال میرے سامنے کبھی نہیں رکھا گیا۔“

”تم صاف صاف کیوں نہیں کہتے؟“

”تم مجھ ہی سے سننا چاہتی ہو تو سنو' اللہ تم سے پیار کرتا ہے۔ اس نے تمہیں گناہ کرنے سے روک دیا کیونکہ اسے پسند نہیں کہ جہنم کی آگ تمہیں

چھوئے۔ مجھے تم پر رشک آتا ہے' کاش میں بھی اس صف میں تمہارے برابر ہوتا کاش وہ مجھ سے بھی اتنا ہی پیار کرتا۔ تم چنے ہوئے لوگوں میں سے ہو۔"

صوفیہ نے چھڑی پھینک دی۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں سختی سے بھینچ گئیں' سیاہ آنکھیں پانی تلے ڈوب رہی تھیں پھر اس کا نچلا جبڑا کپکپانے لگا۔

"وہ مجھ سے پیار کرتا ہے؟ وہ مجھ سے پیار کیوں کرے گا جو اپنی پوری طاقت سے گناہ کرنے پر تل جائے' جو بغاوت میں حد سے گزر جائے' وہ اس سے پیار کیسے کر سکتا ہے؟ میں چنے ہوئے لوگوں میں سے کیسے ہو سکتی ہوں؟ تم مجھ پر رشک کر رہے ہو' میری برابری کی خواہش کر رہے ہو؟ تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔ خدا مجھ سے پیار کر ہی نہیں سکتا۔"

کوئی اس کے دل کو مٹھی میں لے کر مسل رہا تھا۔

عمر کچھ نہیں بولا۔ وہ شاہ بلوط کی شاخوں سے لپٹتی ہوئی شام کو دیکھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

آہٹ پر عمر دروازے کی جانب متوجہ ہوا۔ صوفیہ چہرے پر ایک عجیب سا تاثر لیے اندر آگئی۔ عمر مسکراتے ہوئے گرانٹ کے بیڈ سے اٹھ گیا۔

"میں نے آپ سے کہا تھا کہ جلد ہی صوفیہ آپ سے ملنے آئے گی۔ دیکھیے! وہ آگئی ہے۔" عمر نے گرانٹ کو اطلاع دی تو اس نے کروٹ بدلتے ہوئے دھندلی آنکھیں صوفیہ پر گاڑدیں پھر خفگی سے بولا۔

"آج تم نے کیسے تکلیف گوارا کی یہاں تک آنے کی؟ پچھلی دفعہ تم کب آئی تھیں؟ مجھے لگتا ہے کہ بہت طویل عرصہ گزر گیا۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا۔ تم بتا سکتے ہو کہ آخری بار کب صوفیہ مجھے دیکھنے آئی تھی؟" وہ عمر سے مخاطب ہوا۔

"صوفیہ آئی تھی۔ زیادہ دن نہیں ہوئے۔ آپ سو رہے تھے۔" عمر نے صوفیہ کو بیٹھنے کو کہا مگر وہ کھڑی رہی وہ کچھ کہنا چاہتی تھی اور ہونٹ نہیں کھلتے تھے۔ لفظ بھی ناپید تھے۔

"تم کیسے ہو گرانٹ!" بالآخر اس نے ہمت کی۔

"تمہیں میری فکر کیوں ہونے لگی؟ میری موت تمہیں مسرت بخشے گی۔ تم ہو ہی ایسی۔ احسان فراموش۔ تمہاری ماں تمہیں قتل کرنے والی تھی' میں نے بچایا تمہیں۔ میں نے ہمیشہ تمہیں اس کی صحبت سے دور رکھا۔ میں نے فولادی ہاتھ سے تمہاری تربیت کی لیکن میں تمہارا بھلا چاہتا تھا۔"

گرانٹ کی آواز پست اور درد آلود تھی۔

"میں تمہارا احسان تسلیم کرتی ہوں۔" معاً صوفیہ مڑی اور نہایت سرعت سے باہر نکل گئی۔ گرانٹ کی نظریں اس کی پیروی میں دروازے تک رینگ گئیں۔

"اس میں کوئی تبدیلی آگئی ہے۔ میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا لیکن محسوس کر سکتا ہوں کہ کچھ نہ کچھ بدل گیا ہے۔ صوفیہ ویسی نہیں رہی' اس پر ایک نیا رنگ چھایا ہوا ہے۔"

"میں آپ سے متفق ہوں۔"

عمر نے گرانٹ سے کہا اور کاریڈور میں آکر صوفیہ کو آواز دی۔ وہ دونوں اسپتال کے سنٹرل گارڈن میں آ گئے تھے۔

"میں نہیں کر سکتی عمر! مجھ سے نہیں ہوتا۔ اسے دیکھتے ہی میرا لہو ابلنے لگتا ہے۔ میں کیا کروں۔ بھڑوں کا چھتہ ہے' جو میرے دماغ میں بھنبھناتا ہے۔ زہر پھیلاتا ہے۔"

وہ اعصاب زدہ نظر آتی تھی۔

"تم یہاں آئیں اور تم دل سے کوشش کر رہی ہو۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ میں تمہاری ہمت کو سراہتا ہوں۔" عمر نے اس کا حوصلہ بڑھایا تھا۔

"ہاں میں کوشش کر رہی ہوں۔ میں اسے ضرور معاف کر دوں گی۔ آج نہیں تو کل یا اس کے بعد کسی دن' پر ابھی مجھے مجبور نہ کرو۔"

"کوئی بات نہیں کئی سالوں کا جمع کیا ہوا غصہ چند لمحوں میں نہیں ڈھل سکتا۔ تم آہستہ آہستہ خود پر قابو پالوگی۔" عمر نے خوش دلی سے کہا۔

"اور آخر میں تمہیں اچھا لگے گا۔ جب تم اپنے

بغض کو پچھاڑنے میں کامیاب ہو جاؤگی تو تمہیں خوشی ہوگی۔"

"خوشی۔" اس نے کھوئے ہوئے انداز میں دہرایا۔ "مجھے نہیں پتا خوشی کیا ہوتی ہے۔ میں اپنی پوری زندگی میں کبھی خوش نہیں ہوئی۔ مجھے نہیں یاد ایک بار بھی میں پورے دل سے ہنسی ہوں۔ مجھے تو ہنسنا آتا ہی نہیں' میں نے سوچا تھا کہ جب میں گرانٹ پر اپنے عزائم آشکار کروں گی تو مجھے خوشی ہوگی لیکن میں اس کے سامنے برنج کے خالی برتن کی طرح ٹھن ٹھن بجتی رہی۔ 'خوشی نہیں ملی۔ میں خوشی کو ترستی ہوں۔ مجھے خوشی چاہیے۔"

عمر نے اسے بتانا مناسب خیال نہیں کیا کہ اس روز گرانٹ نے اس کا کہا ہوا ایک لفظ بھی نہیں سنا تھا۔

"تمہیں اصلی خوشی چاہیے تو اللہ کے لیے کچھ کر کے دیکھو۔ کسی صلے کی امید لگائے بغیر۔ بدلے میں کچھ مانگے بنا۔"

"خدا کی خاطر کیے جانے والے کام تو مشکل ہوتے ہیں۔ ان میں تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔ وہ آسان کیوں نہیں ہوتے؟"

عمر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اسے یاد آرہا تھا کہ امریکہ آنے سے کچھ دن پہلے اس نے اس سے ملتا جلتا سوال حکیم بیگم سے کیا تھا۔ اس نے صوفیہ کا ستا ہوا چہرہ دیکھ کر کہا۔

"ہر کام کا ایک طریقہ مقرر ہے اور اس طریقے پر چلنے میں ہی بھلائی ہے۔

کچھ چیزوں کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ ریشم کا کیڑا فنا ہوتا ہے تو ریشم ملتا ہے۔ کونے میں چھپ کر بیٹھنے سے بات نہیں بنتی' آہو جان سے جاتا ہے تو کستوری حاصل ہوتی ہے۔"

"خدا کا نظام اتنا پیچیدہ کیوں ہے؟ جب اس نے پہیلیاں بنائی ہیں تو ان کو بوجھنے کا ہنر کیوں نہیں دیا؟"

"جسے تم پیچیدہ تصور کر رہی ہو' ہو سکتا ہے وہ پہیلی تمہارے لیے تخلیق ہی نہ ہوئی ہو۔ تمہارے نصاب سے باہر کے سوال وہ تمہیں حل کرنے کو نہیں کہے گا

اور تم اسے خدا (God) کیوں کہتی ہو؟" عمر کو اچانک خیال آیا تھا۔

"کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے؟"

"میری رائے میں تو بہت فرق پڑتا ہے۔ (God) ایک مبہم لفظ ہے۔ یہ کئی معنوں میں استعمال ہو سکتا ہے۔ اللہ اس کا ذاتی نام ہے۔ اس میں قربت ہے۔ ہو سکے تو اسے اللہ کہہ کر پکارا کرو۔ تمہیں خود ہی فرق محسوس ہو جائے گا۔"

"میں آزما کر دیکھوں گی۔"

☼ ☼ ☼

ندی کے مٹیالے پانی میں دھوپ کے نقرئی سکے گرتے اور خاکستری ہو جاتے۔ حکیم بیگم کنارے کی گرم ریت پر بیٹھی دھیرے دھیرے نزدیک آتی ہوئی بیڑی کو دیکھ رہی تھی۔ جب تمام مسافروں کی صورتیں اس کی بینائی کی پہنچ میں آگئیں تو وہ سر نیہوڑا کر انگلیوں سے ریت کریدنے لگی۔ یہ چوتھی ٹولی تھی جو قاسو ملاح اڈہ نور کوٹ سے لے کر آرہا تھا۔ اب اسے اگلے پھیرے کا انتظار کرنا تھا۔

"ماسی! گھر چل کے روٹی کھالے۔ سورج ادھ آسمان میں آگیا ہے۔" صالحہ نے آکر اس کا کندھا ہلایا۔

"تو جا۔ میں آجاتی ہوں ہالی اتھے رہن دے مجھے۔ (ابھی مجھے یہاں رہنے دے) وہ ہاتھوں کی جلد سے چمٹے ہوئے ریت کے ذرات جھاڑنے لگی۔

"کسی کی راہ تک رہی ہے؟ کسی پروہنے نے آنا ہے؟"

"کاکے کو اڈیک رہی ہوں۔" حکیم بیگم کی نظریں بتھیں کے پرلے کنارے پر جھکے ہوئے جھنڈوے برگد کے پہلو میں تیرتی ہوئی خالی بیڑی پر جمی تھیں۔

"بھاء عمر نے آنا ہے؟ وہ امریکہ سے مڑ کے آرہا ہے؟ تو کوئی خاص کھانے نہیں پکے' بدانہ (مٹھائی کی ایک قسم) نہیں آیا۔ میں تو ابھی جاکے کھیر کا دیگچہ دھر دیتی ہوں۔" صالحہ پُرجوش ہو گئی۔

"مجھے کوئی سدھ نئیں' اس نے آنا ہے کہ نئیں۔

میں تے اڈیک کرتی ہوں۔ اڈیک لئی شرط نہیں کہ آن والے نے قول کیا ہو۔ دل تانگھ کرے تے اکھ راہواں تے پہرہ نہ دے۔ بھلا ہو سکدا اے؟ (دل منتظر ہو اور آنکھ راہوں پر پہرہ نہ دے بھلا ہو سکتا ہے؟) اس کے سفید بال ہوا سے کھل کر چہرے پر گر رہے تھے اور سر تواتر سے ہلتا تھا۔

صالحہ کی مسکراہٹ بجھ گئی۔ "ماسی! اٹھ جا تو سیانی بیانی ہے۔ جب بھاء نے آنا ہو گا وہ خط ڈالے گا، ٹیلی فون کرے گا۔" وہ اسے گھر جانے پر آمادہ کرنے لگی۔

"نہ کڑئیے! میں نہیں جا سکدی۔ جدا خیر لی (آخری) بیڑی اس پار آ لگے گی میں آپی آجاواں گی۔" اس نے ہٹیلے پن سے کہا۔

"تیرا وقت نہیں کٹنا ناں۔ تو چل کے بھانڈے بنا ذرا دل لگ جائے گا۔" حکیم بیگم نے پھولی ہوئی سیاہ نسوں والے کانپتے ہوئے ہاتھ صالحہ کے سامنے کر دیے۔

"ٹٹ جان، سڑ جان، نکمے، شدے (ٹوٹ جائیں، جل جائیں، بے کار کمینے) وہ ہاتھوں کو زمین سے ٹکرانے لگی۔

"ونگے ٹیڈھے (ٹیڑھے میڑھے) باسن گھڑتے ہیں۔ کوئی ہنر نہیں کوئی چج (سلیقہ) نئیں اس میں، میرے ہتھ مجھے برباد کر گئے۔ میرا ککھ کنڈا نہ رہا (میرے پاس کچھ نہ بچا۔)"

✡ ✡ ✡

اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور صوفیہ نے باہر جھانکا۔ نفیس لباس اور نکھرا ہوا چہرہ اس کی خصوصی تیاری کی چغلی کھا رہا تھا۔ عمر اس کی رہنمائی میں Den میں آ گیا۔

"میں نے خاصی مشقت کی ہے اس جگہ کو صاف کرنے میں پھر بھی اتنی قابل دید نہیں ہے۔ اگر تمہیں یہاں بیٹھنا اچھا نہیں لگ رہا تو میرے کمرے میں چلتے ہیں وہاں کھڑکی میں بیل لگی ہے اور اچھا نظارہ ہے۔ اس گھر میں اور کوئی ایسا مقام نہیں جہاں میں تمہیں بیٹھنے کی پیشکش کر سکوں۔"

صوفیہ گھبرائی ہوئی تھی۔ یہ اسے ایک نظر دیکھ کر کوئی بھی بتا سکتا تھا۔ وہ بازوؤں کو کبھی سینے پر لپیٹ لیتی اور کبھی پہلوؤں میں گرا دیتی۔ وہ مہک رہی تھی اور آنکھوں میں کھب رہی تھی۔

عمر نے کمرے میں نظر گھمائی اور ستائشی انداز میں ہنکارا بھرا۔ "یہ جگہ بہت اچھی ہے بلکہ شاندار ہے۔ مجھے پتا ہوتا میری وجہ سے تمہیں اتنی زحمت ہو گی تو میں یہاں آتا ہی نہیں۔"

"کیسی زحمت؟"

"یہ ہی صفائی وغیرہ اور لگتا ہے تم نے صوفوں کی پوشش اور پردے بھی دھوئے ہیں۔" اس نے تازہ دھلے ہوئے پردے کا کونا ہاتھ میں لے کر اسے سونگھا۔

"تم بیٹھ جاؤ۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔ سب تیار ہے۔" وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔

عمر صوفہ چیئر پر بیٹھ گیا تھا۔ چھوٹی چوکور میز پر کھانے کے برتن رکھتے ہوئے صوفیہ نے شرمندگی سے کہا۔

"ڈائننگ ٹیبل نہیں ہے تو اسی پر اکتفا کرنا ہو گا۔"

"مجھے تکلفات پسند نہیں ہیں۔" عمر نے کہا۔

"ٹھیک ہے مگر آج میں خود کو ایک اچھی میزبان ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہوں۔" وہ بھنی ہوئی مرغی کی رکابی اور ٹماٹر کے سوس والا پیالہ اٹھا کر لائی اور میز پر دھرتے ہوئے ایک اسٹول پر بیٹھ گئی۔ "شروع کرو۔"

"یہ کیا ہے؟" عمر نے مرغی والی قاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"کیا تمہیں پسند نہیں ہے؟" وہ افسردہ ہونے لگی۔

"پسند ہے لیکن تم تو گوشت نہیں کھاتیں۔"

"تم تو کھاتے ہو نا۔"

"پھر تم کیا کھاؤ گی؟"

"میں تمہیں کھاتے ہوئے دیکھوں گی۔ ویسے میرے لیے یہ سلاد جو ہے۔"

"مجھے کوئی کھاتے ہوئے دیکھے تو مجھ سے کھایا نہیں جاتا۔" عمر نے مکمل سنجیدگی سے بتایا۔

"اچھا ہوا تم نے بتا دیا ورنہ تم ایک لقمہ بھی نہ کھا سکتے۔" صوفیہ اس سے زیادہ سنجیدہ تھی۔

کھانے کے بعد وہ کچھ خطوط اور پرانی تصاویر لائی اور انہیں صوفے کے چپٹے بازو پر ڈھیر کر دیا۔

"یہ تم رکھ لو۔ یہ تمہارے ماں باپ کی شادی کی تصویریں ہیں۔ گرانٹ ہمیشہ انہیں ایک دراز میں بند کر کے رکھتا تھا اور اگر کوئی ان کو چھونے کی جرأت کرتا تو وہ غضب ناک ہو جاتا تھا۔ وہ طویل عرصے سے تمہاری ماں کے نام خطوط لکھتا رہا ہے۔ اکثر وہ مجھے ان خطوط کو پوسٹ کرنے کی ذمہ داری سونپا کرتا تھا۔ بہت سے تو میں ضائع کر دیتی تھی اور بہت سے اپنے بستر کے گدے تلے گھسیڑ دیتی تھی۔"

عمر نے ان مٹتی ہوئی، جا بجا اچٹی ہوئی تصویروں میں دو حسین، خوشی میں ڈوبے، جوانی کے رنگ سے دمکتے ہوئے لوگوں کو دیکھا تو اس کے دل کو کچھ ہوا۔

"میری ماں کتنی خوب صورت ہیں۔ میں نے کبھی انہیں غور سے دیکھا ہی نہیں۔" اس نے ایک تصویر صوفیہ کی آنکھوں کے قریب کر دی۔

✡ ✡ ✡

برنیاں ایئرپورٹ کے چکنے فرش پر سنبھل سنبھل کر چلتی تھی کیونکہ اس کی ٹانگوں میں جان نہیں تھی اور گھٹنے کانپ رہے تھے۔ انسانوں کے جمگھٹے میں شکلیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ مختلف آوازوں کے اختلاط سے ایک بے ہنگم شور اٹھ رہا تھا جیسے بے شمار جھینگر مل کر جھنگار تے ہوں۔ اس کا سر یوں چکراتا تھا جیسے وہ کسی گول گول گھومنے والے برقی جھولے میں سوار ہو۔ جس پہلے چہرے کو اس نے شناخت کیا، وہ عمر کا چہرہ تھا اور اس کے پہلو میں کون تھا؟ اس کی نظر پھسلی، گری اور پھر سنبھلی۔ وینس اسے دیکھ چکی تھی۔ داؤد اس کی جانب قدم اٹھا رہا تھا۔ اسے خبر نہ ہوئی کہ وہ چل رہی تھی یا تھم گئی تھی اس کی آنکھیں پتھر تھیں، زبان گنگ تھی۔ جب وینس نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر سینے سے بھینچ لیا تو وہ ایک گیلے اسفنج میں تبدیل ہو

گئی۔ پانی سے بھرا ہوا اسفنج جب نچوڑا جائے تو اس کا کیا حال ہوتا ہے۔ وہ ہی پرنیاں کا حال تھا۔ ہر مُو سے آنسو ابل رہے تھے۔ وینس اسے چوم رہی تھی اس کی پیشانی، آنکھیں، ہونٹوں اور گردن کو اپنے ضعیف ہاتھوں سے کسی اندھے کی مانند ٹٹول رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ پرنیاں کو اپنے اندر جذب کرلے۔

"پرنیاں! تم نے کیا کردیا؟ تمہیں مجھ پر ترس کیوں نہ آیا؟ کسی کا کچھ نہ بگڑا ہوگا۔ میرا تو کچھ بھی صحیح نہ رہا۔ کسی کا کیا گیا، دنیا ختم ہوئی تو میری، دل اجڑا تو میرا، تم ایک بار مجھ سے معافی مانگ لیتیں، میں معاف کر دیتی۔ ساری دنیا تمہیں دھتکار دیتی، میں نہ دھتکارتی میں تمہیں کبھی Disown نہ کرتی چاہے ساری دنیا تمہیں اپنانے سے انکاری ہو جاتی کیونکہ میں۔۔۔" وہ آنسوؤں میں بہہ گئی۔

پرنیاں کل بھی اس کی مجرم تھی آج بھی اس کے سامنے سر نہ اٹھا سکتی تھی۔ داؤد اور عمر خاموش کھڑے انہیں دیکھ رہے تھے۔

وینس ہچکیوں کے درمیان بولی۔ "اب ماں بنی ہو تو تمہیں پتا چل گیا ہوگا کہ ماں خدا کی بنائی ہوئی سب سے مجبور مخلوق ہے۔ اولاد سے محبت نہ کرنا اس کے بس کی بات ہی نہیں۔ ماں کا دل خدا نے کسی مختلف مٹی سے بنایا ہے۔"

پرنیاں نے وینس کے ہونٹوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ "مجھے خوب پتا چل گیا ہے۔" وہ کنکھیوں سے عمر کو دیکھتی تھی۔ عمر نظریں ہٹا کر اس کے سامان کی جانب متوجہ ہوگیا۔

کار ڈرائیو کرنے کے دوران داؤد بیک ویو مرر میں پرنیاں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"تمہارے چہرے میں اب بھی وہ ہی سانس روک دینے والی صلاحیت ہے۔ لگتا ہی نہیں کہ میں اتنے سالوں بعد تمہیں دیکھ رہا ہوں۔"

"تمہارے بچے کیسے ہیں اور تمہاری بیوی؟"

"تم ابھی تھوڑی دیر میں ان سب سے مل لوگی۔ البتہ میں پہلے سے بتا دوں کہ میرے تینوں بچوں میں سے کوئی بھی تمہارے بیٹے کی طرح خوب صورت نہیں ہے۔ وہ سب اپنی ماں پر گئے ہیں۔"

وہ ہنس رہا تھا اور اس کی آوازیں پھنس کر نکل رہی تھی جیسے اس کے گلے میں درد ہو۔

☼ ☼ ☼

اسپتال کے اس کمرے میں جانے سے پہلے تک پرنیاں اسی گمان میں تھی کہ داؤد کسی غلط فہمی میں مبتلا تھا۔ وہ کسی اور کو گرانٹ تصور کر رہا تھا۔ بھلا وہ حقیقت کب تھا۔ وہ جو اس کے تخیل میں بستا تھا، جو پریوں کی کہانیوں کا ایک کردار تھا، جو رنگین کھوٹے کی اوٹ سے اسے "cara mia" کہہ کر بلاتا تھا۔ جس کے ہاتھ مائیکل اینجلو کے "موسز" کے ہاتھ تھے جو اسے جہاں چھو لیتے، نشان چھوڑ جاتے۔ جو پھولوں کی زبان سے واقف تھا اور تین سفید جل زادیوں کے آسمانی گیت کا عنوان تھا بھلا وہ حقیقت کیسے ہو سکتا تھا۔ داؤد نے کسی دوسرے کو گرانٹ سمجھ لیا تھا، کسی اجنبی کو۔ دروازہ کھولتے ہی اسے ایک دھچکا لگا۔

داؤد کو مغالطہ نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کے سامنے تھا۔ اس کے نقوش پر وقت نے جالا بن دیا تھا مگر اس کے گرانٹ ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں اب بھی کوئلوں جیسی سیاہ تھیں، تاہم ان پر راکھ کے ذرے جمے تھے۔ مائیکل اینجلو کے موسز والے ہاتھ سفید چادر پر بے حس و حرکت پڑے تھے۔ یہ وہ شخص تھا، جس نے اس کی زندگی کا رخ بدل ڈالا تھا۔ وہ زمین پر بسنے والی ایک عام لڑکی تھی۔ اس شخص سے ملنے کے بعد وہ یا تو آسمان پر رہی یا پاتال میں، پھر بھی زمین اس کے قدموں تلے نہ آسکی۔

وہ فسوں کار سیاہ آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں اور پھر اس نے کچھ کہا۔ وہ پرنیاں سے مخاطب نہیں تھا بلکہ اپنے سرہانے بیٹھے عمر سے پوچھ رہا تھا۔

"یہ عورت کون ہے؟"

(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سب امتحان عشق کے اپنے کڑے رہے
ہم کوزہ گر کے چاک پہ برسوں پڑے رہے

اُن کی نگاہیں شوخ تھیں، ہم تھے حیا پسند
مشتاق وہ، ہم اپنے کہے پر اڑے رہے

سوچا تھا ساتھ مل کے جئیں گے تمام عمر
مصروف تھے وہ، کام ہمیں بھی بڑے رہے

دونوں جہاں سے رابطہ رکھتا تھا برقرار
آنکھیں فلک پہ، پاؤں زمیں میں گڑے رہے

بجھنے دیا نہ رات بھر ہم نے چراغ شوق
پلکوں پہ رت جگوں کے نگینے جڑے رہے

بیٹھے رہے ہم رات کی راہوں کے خواب گر
دل، مرحلۂ دید میں حائل کھڑے رہے

○ شبہ طراز



جو تم ملو تو عید ہو

یہ چاندنی کھلی ہوتی
ہزاروں سال سے یونہی
کہیں ہنسی، کہیں خوشی
ہزاروں رنگ میں ملی
مگر نظر کی تشنگی
کسی طرح نہ مٹ سکی
ہمارے واسطے بھی تو
یہ عید خوش نصیب ہو
جو تم ملو تو عید ہو
جو تم ملو تو عید ہو

اُمِّ رومان

سکوتِ شب میں اندھیروں کو مسکرانے دے
بجھے چراغ تو پھر جسم و جاں جلانے دے

دُکھوں کے خواب نما نیم وا دریچوں میں
وفورِ کرب سے تاروں کو جھلملانے دے

میرے وجود میں کانٹوں کا ایک جنگل ہے
وہ اپنی ذات کے پھولوں میں کیوں سمانے دے

کِسے خبر ہے کہ ہم دونوں اپنے قاتل ہیں
جو بے خبر ہیں، انہیں چیخ کر بتانے دے

جب اپنے پاؤں میں زنجیر پڑ گئی ہے تو پھر
چلا تو جاتا نہیں، گرد ہی اُڑانے دے

بھٹک رہا ہوں بگولوں کے رنگ میں نقّاش
بدن تو خاک ہوا، روح بھی جلانے دے

نقّاش کاظمی

عشق کی جوت جگانے میں بڑی دیر لگی
سائے سے دُھوپ بنانے میں بڑی دیر لگی

میں ہوں اس شہر میں تاخیر سے آیا ہوا شخص
مجھ کو اک اور زمانے میں بڑی دیر لگی

یہ جو مجھ پہ کسی اپنے کا گماں ہوتا ہے
مجھ کو ایسا نظر آنے میں بڑی دیر لگی

اک صدا آئی جھروکے سے کہ تم کیسے ہو
پھر مجھے لَوٹ کے جانے میں بڑی دیر لگی

بولتا ہوں تو میرے ہونٹ جُھلس جاتے ہیں
اس کو یہ بات بتانے میں بڑی دیر لگی

میں سرِ خاک کوئی پیڑ نہیں تھا تابشؔ
اس لیے پاؤں جمانے میں بڑی دیر لگی

عباس تابش

امت الصبور

خاموش کی ڈائری

سیّدہ نسبت زہرا کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر غافرؔ شہزاد کی یہ غزل آپ سب قارئین بہنوں کے لیے۔

تیرے جہاں میں بے پھل شجر نہیں ملتا
بس ایک اشک ہیں، جن کا ثمر نہیں ملتا

اندھیرے پھیل گئے کچھ ایسے بستی میں
چراغ مل بھی اگر جائے۔ گھر نہیں ملتا

میں روز کتنے ہی کنکر سمیٹ لیتا ہوں
مگر جو آنکھ سے نکلا، گہر نہیں ملتا

کبھی تو ریت سے بھر جاتی ہیں میری آنکھیں
کبھی چراغ سرِ رہگزر نہیں ملتا

یہ کیسا نقش کہ سبھی خدوخال بکھرے ہیں
یہ کیسا شہر کہ کوئی معتبر نہیں ملتا

ہمیں کب اس کی تمنا نہیں رہی غافرؔ
بس اس قدر کہ طلب کا ہنر نہیں ملتا

فردوس نصیب کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر منہاج حسن امیر کی چھوٹی سی نظم خواتین ڈائجسٹ پڑھنے والی تمام بہنوں کے لیے۔

بہت کچھ اور لکھنے کی تمنا تھی
مگر میں کیا کروں کہ موسم جاں کو
ہنر مندی کے لمحے کم میسّر تھے
ابھی میں نے قلم پکڑا تھا ہاتھوں میں
ابھی تو پیاس بھی قرطاس کی بجھنے نہ پائی تھی
ابھی لفظوں کو میرے آئینہ پوشاک ہو کر
تیرگی کی بدگماں دہلیز پر
خورشید کی صورت اُترنا تھا
ابھی تو میری تحریروں کو تازہ روشنی بن کر بکھرنا تھا
مگر میں کیا کروں کہ موسم جاں کو
ہنر مندی کے لمحے کم میسّر تھے

نادیہ اسلم کی ڈائری سے

شاعری ہمارے دلی جذبات کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔ ”ادھوری عورت“، میری طرح بہت سی بہنوں کے دل کی آواز ہو گی۔ یہ نظم پڑھیے اور داد دیجیے۔

ادھوری عورت

بے معنی حیات کی بامعنی باتیں
بے زار دن بے کیف راتیں
میرے لیے میرے پاس وقت نہیں
یہ دُکھ صدیوں سے کاٹ رہا ہے میری رگ و جان
میں نہ مانگوں تو میرے لیے محبت نہیں
میں تمام دن کی تھکن
اپنی روح پہ اتار لیتی ہوں مجھ سے وابستہ ہیں جو
ان کے لیے زندگی سہل کرنے کی تمنا میں

اپنے لیے سانس بھی
انہی سے مستعار لیتی ہوں مگر کبھی
جب آئینہ مجھے میرا چہرہ دکھائے
گھر کے کاموں سے جی اکتا جائے
تو میری خالی خالی آنکھیں
بے ساختہ آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں
اور میرے اندر کوئی کہتا ہے
جو کہتا ہے۔ خدایا!
میری حیات کو بھی جیل کر دے
یا پھر میری زندگی کے معنی تبدیل کر دے

نغمانہ بٹ کی ڈائری سے

اطہر نفیس کی یہ غزل جب بھی پڑھتی ہوں، اداسی اور بے چینی بڑھ جاتی ہے اور تنہائی کا احساس اپنی پوری شدت کے ساتھ حملہ آور ہوتا ہے۔ ہر شعر اپنے اندر بے بسی کا اک جہان چھپائے بیٹھا ہے۔

نہ منزل ہوں نہ منزل آشنا ہوں
مثال برگ اڑتا پھر رہا ہوں

میری آنکھوں کے خشک و تر میں جھانکو
کبھی صحرا کبھی دریا نما ہوں

وہ ایسا کون ہے جس سے بچھڑ کر
خود اپنے شہر میں تنہا ہوا ہوں

میرے انفاس کی توقیر کرنا
بڑی مشکل سے میں زندہ ہوا ہوں

جو میری روح میں اترا ہوا ہے
میں اس سے بے تعلق بھی رہا ہوں

بتاتا کیوں نہیں کوئی کہ اب میں
کہاں ہوں کس طرف کو جا رہا ہوں

سلا دو اے ہواؤ اب سلا دو
بہت راتوں کا میں جاگا ہوا ہوں

ارم احمد کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر امجد اسلام امجد کی یہ غزل آپ سب قارئین بہنوں کے نام۔

اک نام کی اڑتی خوشبو اک خواب سفر میں رہتا ہے
اک بستی آنکھیں ملتی ہے اک شہر نظر میں رہتا ہے

کیا اہل ہنر کیا اہل شرف سب ٹکڑے ردی کاغذ کے
اس دور میں ہے وہ شخص بڑا جو روز خبر میں رہتا ہے

پانی میں روز بہاتا ہے اک شخص دیے امیدوں کے
اور اگلے دن تک پھر ان کے ہمراہ بھنور میں رہتا ہے

جو پیڑ پہ لکھی جاتی ہے، جو گیلی ریت سے بنتا ہے
کون اس تحریر کا وارث ہے؟ کون ایسے گھر میں رہتا ہے

جو شہر کہا بھی ہے امجد اک قصہ سوتے جاگتے کا
ہم دیکھیں جس کردار کو بھی جادو کے اثر میں رہتا ہے



میری بیاض سے

خالدہ جیلانی

نوشین بہزاد ــــــــ یوپی موڑ کراچی
اک عمر رہا ہوں میں اندھیرے مکان میں
ہمسائے کے مکاں کا اجالا گواہ ہے!

ناصرہ ندیم ــــــــ جھنگ
ہم چراغوں کو تو تاریکی سے لڑنا ہے فراز
گل ہوئے پر صبح کے آثار بن جائیں گے

آسیہ رفیق ــــــــ خانیوال
میری نگاہیں تلاش کرتی ہیں
کوئی ضمیر کا لہجہ، کوئی اصول کی بات

فرح بابر ــــــــ کراچی
کبھی یک بہ یک توجہ، کبھی دفعتاً تغافل
مجھے آزما رہا ہے — کوئی رخ بدل بدل کے

ثمرین صفدر ــــــــ کراچی
سوکھی ہیں بہت دیر سے پلکوں کی زبانیں
بس آج تو جی بھر کے رلا دے کوئی

سحر کاشف ــــــــ لاہور
سب کی نظر میں میری تباہی کے واسطے
اتنا خلوص تھا کہ شکایت نہ ہو سکی

شہلا اظہر ــــــــ وہاڑی
ہم شہر بھر میں اذیت پسند مشہور ہیں
گر دعا چاہیے تو میرا دل دکھائیے

سندس عمران ــــــــ گارڈن کراچی
جسے اپنا یار کہنا، اسے چھوڑنا بھنور میں
یہ حدیث دلبراں ہے، یہ کمال دلبری ہے

صندل عمران ــــــــ کراچی
تم ناحق ناراض ہوئے ورنہ مے خانے کا پتا
ہم نے ہر اس شخص سے پوچھا جس کے نین نشیلے تھے

شازیہ سہیل ــــــــ روہڑی
تم کو یہ انداز نجانے کہاں سے آئے
اسی طرح آنکھ سے چھپنا کہ خدا ہو جانا

رقیہ ارشد ــــــــ رینالہ خورد وزیر آباد
یہی کیا کم ہے کہ ہم تیری تمنا میں جئیں
لطف منزل نہ سہی، حسرت منزل ہی سہی

سمیرا حیات ــــــــ رینالہ خورد
تشخیص بجا ہے کہ مجھے عشق ہوا ہے
نسخے میں لکھو، ان سے ملاقات مسلسل

صبا افضل بٹ ــــــــ رینالہ خورد
کاش کہ برس جائے یہاں بھی نور کی بارش
ایمان کے شیشوں پہ بڑی گرد جمی ہے

مسز بشریٰ بٹ ــــــــ رینالہ خورد
صبح کے تخت نشین شام کو مجرم ٹھہرے
ہم نے پل بھر میں نصیبوں کو بدلتے دیکھا

ثناء عمر ــــــــ لاہور
بے اثر کب رہی داستان وفا
جب چھڑی سننے والوں کو نیند آ گئی

حیا ممتاز ــــــــ گلستان جوہر
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

شگفتہ فیاض ــــــــ ناظم آباد کراچی
نہ سمجھ سکے اس کا کوئی بھی بہانا
کبھی پلکوں پہ بٹھانا، کبھی نظروں سے گرانا

نادیہ نجم ــــــــ حیدر آباد
کچھ وقت سے اک بیج ثمر ہوتا ہے
کچھ روز میں اک قطرہ گہر ہوتا ہے
اے بندۂ ناصبور! تیرا ہر کام
کچھ دیر میں ہوتا ہے، مگر ہوتا ہے

فرحت شہزاد ــــــــ نیو کراچی
ٹال دیتے ہیں یہی کہہ کر میرے مطلب کی بات
آج پر کیا منحصر ہے، پھر کبھی ہو جائے گا

مسرت جبیں ________ سیالکوٹ

ان سے ملنے کی تمنا ہو جسے وہ سوچ لے
عمر بھر کرنا پڑے گی جستجو میری طرح

غزالہ شہباز ________ کراچی

ہم کو اچھا نہیں لگتا کوئی بھی ہم نام تیرا
کوئی تجھ سا ہو تو پھر نام بھی تجھ سا رکھے

عائشہ رسول ________ سرجانی ٹاؤن

لب بستگی کو دیجیے آداب دل کا نام
آنکھوں سے بات کیجیے رسوا زباں نہ ہو

ثوبیہ کاشف ________ لاہور

میں ایک ہی منزل کا پرستار ہوں ناصر
ہر چاند سے چہرے کا طلب گار نہیں ہوں

سمیرا علی ________ لاہور

سب سے ہے عشق مجھے حسن نظر کے ہاتھوں
مجھ کو ہر شخص نے دیوانہ بنا رکھا ہے

سمیرا ندیم ________ اسلام آباد

خوشی ہو سینے کی ان خراشوں پر
پھر تنفس کے یہ سلسلے بھی کہاں
آؤ، آپس میں کچھ گلے کر لیں
ورنہ یوں ہے کہ پھر گلے بھی کہاں

فریال صلاح الدین ________ گلستان جوہر کراچی

شہر گر تم سے مانگے علاج تیرگی
صاحب اختیار ہو، آگ لگا دیا کرو

رخسانہ ظفر ________ لاہور

وفا کی قدر تو کسی سے نہ ہو سکی
ان کی جفا پہ ایک زمانہ نثار تھا

یاسمین ظفر ________ لاہور

یہی بہت ہے کہ بیٹھا ہے سر جھکائے ہوئے
مجھے اُجاڑ کے وہ شخص شرمسار تو ہے

بے بی ماہم ________ ملتان

میرے دل کو سمجھ رکھا ہے دلّی یار لوگوں نے
کبھی آباد کرتے ہیں، کبھی برباد کرتے ہیں

سعدیہ ثاقب ________ کراچی

زندگی یونہی نہیں آجائے گی باہنوں میں
غم دوراں کے ذرا ناز اٹھاؤ یارو!

الماس تنویر ________ ہری پور ہزارہ

نہ ملے زہر تو اپنا لہو پیتے ہیں
جام خالی نہیں رہتے سقراطوں کے

مہک علی ________ کراچی

کل اُس کی آنکھوں نے کیا زندہ گفتگو کی تھی
گمان تک نہ ہوا وہ بچھڑنے والا ہے

نسیم سحر ________ کراچی

ہم نے ہنس ہنس کر بھرم اہل وفا کا رکھا ہے
ہم بھی رو دیتے اگر عشق میں جھوٹے ہوتے

مدیحہ احمد ________ رحیم یار خان

ہم نہ ہوں گے تو کون منائے گا تمہیں
یہ بری بات ہے ہر بات پہ روٹھا نہ کرو

نسرین اختر ________ کراچی

ہم چھین لیں گے تم سے یہ ادائے بے نیازی
تم مانگتے پھرو گے اپنا غرور ہم سے

کومل عدنان ________ ملیر کراچی

میری خلوتوں کو دوام دے
میں بھی بادہ کش ہوں کہ جام دے
تیری آنکھ میں، میں ٹھہر سکوں
مجھے مختصر سا قیام دے

زرتاشیہ شیرازی ________ جڑانوالہ

اپنی ہر ایک شام ہر اک رات بیچ کر
اب آ گیا ہے جینا ہمیں ذات بیچ کر
ہم بھی ہیں کیا عجب کڑی دھوپ کے تلے
صحرا خرید لائے ہیں برسات بیچ کر

اریبہ سلطان ________ اٹک

ہونا تو وہی ہے جو مقدر میں میرے ہے
لیکن وہ میرے خواب، میرے خواب، میرے خواب

صدف شہزاد ________ اسلام آباد

اگرچہ کوئی بھی اندھا نہیں تھا
لکھا دیوار کا پڑھتا نہیں تھا
تم ہی نے کون سی اچھائی کی ہے
چلو مانا کہ میں اچھا نہیں تھا

شگفتہ جاہ

رنگ رنگ پھول

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے "مکھی کے ایک پر میں زہر اور دوسرے میں شفا ہے۔ جب وہ کھانے (یا پینے) کی چیز میں گر پڑے تو اس میں ڈبو دو (پھر نکال کر پھینک دو) کیونکہ وہ زہر (والا پر) آگے اور شفا (والا پر) پیچھے رکھتی ہے۔"

(سنن ابن ماجہ)

فوائد و مسائل :۔

1۔ مکھی جب چائے، پانی یا دودھ وغیرہ میں گر پڑے تو کھانے پینے کی چیز کو ضائع کر دینا جائز نہیں۔

2۔ اللہ تعالیٰ نے مکھی کے ایک پر میں جراثیم کش مادہ بھی رکھا ہوا ہے، جو متعدد قسم کے جراثیم کو ختم کرنے کی قوی صلاحیت رکھتا ہے۔ جب مکھی کو (جس چیز میں وہ گری ہے) ڈبو یا جائے تو وہ جراثیم کش مادہ مکھی کے پر سے نکل کر اس چیز میں شامل ہو جاتا ہے۔

3۔ اللہ تعالیٰ نے بہت سی بیماریوں کا علاج ان کے اسباب کے قریب ہی رکھ دیا ہے۔ جیسے علاقائی بیماریوں کا علاج، ان ہی علاقوں کی جڑی بوٹیوں میں موجود ہوتا ہے۔ یہ انسانوں پر اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہے۔

4۔ جدید تحقیقات سے حدیثوں میں مذکور حقائق کی تصدیق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیل بھی ہے اور احادیث کے قابل اعتماد ہونے کا ثبوت بھی۔

یقین،

ایک ولی سے ابلیس نے کہا۔ "تجھے اللہ پر بہت یقین ہے۔ تو اونچے پہاڑ پر چڑھ جا اور چھلانگ لگا دے۔ دیکھتے ہیں تیرا اللہ تجھے بچاتا ہے کہ نہیں۔ ولی نے کہا۔ "شیطان! دفع ہو جا۔ یہ اللہ کا کام ہے مجھے آزمائے۔ میرا کام نہیں کہ میں اس کو آزماؤں۔"

زینب احسن ۔ فیصل آباد

زندگی،

اگر تم سے کوئی پوچھے، بتاؤ زندگی کیا ہے
ہتھیلی پہ ذرا سی خاک رکھنا اور اڑا دینا

نمرہ، اقراء ۔ کراچی

چھوٹی سی بات،

کامیاب لوگ اپنے ہونٹوں پر دو چیزیں رکھتے ہیں ۔ خاموشی اور مسکراہٹ۔ مسکراہٹ مسئلے کو حل کرنے کے لیے اور خاموشی مسئلے سے دور رہنے کے لیے۔

فریحہ شبیر ۔ شاہ نکڈر

اخبار کا تراشہ،

"یہ تم اخبار سے کون سی خبر کاٹ رہے ہو؟" ایک دوست نے دوسرے دوست سے پوچھا۔

دوست نے جواب دیا۔ "اس میں چھپا ہے کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو اس لیے طلاق دے دی کہ وہ اس کی جیبوں کی تلاشی لیتی تھی۔"

"تو تم اس خبر کا کیا کرو گے؟" دوست نے دوبارہ سوال کیا۔

"اپنی جیب میں رکھوں گا۔" دوست نے جواب دیا۔

شیبا وقاص ۔ گوجرانوالہ

کلمہ طیبہ،

کلمہ طیبہ کے دو حصے ہیں۔ دونوں میں بارہ بارہ

حروف ہیں۔ دونوں نقطے کے بغیر ہیں۔ پہلا حصہ مقصدِ زندگی سکھاتا ہے اور دوسرا حصہ طرزِ زندگی۔

آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

مشورہ

ایک صاحب بہت مایوس اور افسردہ بیٹھے تھے ان کے دوست نے پوچھا۔

"کیا بات ہے، کیوں پریشان ہو...؟"

کہنے لگے "یار! تمہیں تو معلوم ہے مجھے کرکٹ سے بہت لگاؤ اور کرکٹ میچ دیکھنے کا بہت شوق ہے لیکن اب میں کرکٹ میچ دیکھنے کے لیے اسٹیڈیم نہیں جاسکتا۔"

"وہ کیوں بھئی...؟"

"مجھے ڈاکٹر نے پُرہجوم جگہوں پر جانے سے منع کر دیا ہے۔"

"تو اس میں کیا پرابلم ہے۔ تم صرف "ٹیسٹ میچ" دیکھنے کے لیے گراؤنڈ میں چلے جایا کرو۔" دوست نے مشورہ دیا۔

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

نہ تم مرتے...

قبرستان میں ایک قبر پر ایک شخص زاروقطار رو رہا تھا۔ اور وہ روتے ہوئے بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔

"تمہاری موت نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ میں تباہ و برباد ہوگیا۔ میری اولاد ___ کا مستقبل تاریک ہوگیا۔ اب گھر میں جاتا ہوں تو گھر کھانے کو دوڑتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمہاری موت نے میرے نصیب کو جلا کر رکھ دیا ہے۔ تم ہی بتاؤ میں کیا کروں اور کہاں جاؤں۔"

یہ دردناک آہ و فغاں سن کر وہاں پر موجود ایک نرم دل اور ہمدرد شخص نے اس کی دلجوئی کرتے ہوئے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ یہ قبر تمہاری چہیتی اور وفادار بیوی کی ہے جس کی جدائی اور اچانک موت سے تمہیں بہت زیادہ صدمہ ہوا ہے۔"

اس پر وہ نوحہ کناں بولا۔

"نہیں یہ میری بیوی کی قبر نہیں بلکہ اس کے سابق شوہر کی ہے۔ میں اس لیے روتا ہوں کہ نہ یہ مرتا اور نہ وہ میرے پلے پڑتی۔"

مسرت معصوم راہی۔ راولپنڈی

شیریں بیانی

- "اور میرے بندوں سے کہہ دو کہ جو بات کہیں خوش کلامی کے ساتھ کہیں۔"
(قرآنِ حکیم)

- خوش کلامی جنت کی اور بدزبانی دوزخ کی نشاندہی کرتی ہے۔
(رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم)

- خوش کلامی صراطِ مستقیم کی طرف لے جاتی ہے اور بدکلامی ناہموار راستوں کی طرف۔
(جانسن)

- میں تصنع اور بناوٹ کے ساتھ الفاظ بنانے سے قاصر ہوں لیکن اپنی خوش گفتاری سے لوگوں کے دل موہ لیتا ہوں۔
(شیکسپیئر)

- خوش کلامی ایک ایسا وصف ہے جو سامعین کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔
(پاسکل)

- خوش کلامی ایک ایسے تیز دھار خنجر کی طرح ہے جس پر تیل مل دیا گیا ہو۔
(سولگٹ)

کنول شاہین قیصر۔ تلہ گنگ

دُعا

یہ سچ ہے کہ اوپر والا بہت مہربان ہے۔ وہ ہماری دُعاؤں میں کوئی کٹوتی نہیں کرتا۔ وہ ہماری کسی دُعا کو رَد نہیں کرتا۔ انہیں قبول کر لیتا ہے۔ یا تو اسی لمحے یا بعد کے لیے سنبھال کر رکھ لیتا ہے۔ اور یا پھر انسان کے کسی گناہ یا کسی کوتاہی کو اس دُعا کے بدلے ختم کر دیتا ہے لیکن وہ کسی دُعا کو رَد نہیں کرتا اور جو دُعا دل سے نکلی ہو وہ کبھی رَد ہو ہی نہیں سکتی۔ دل سے دُعا مانگو تو لگتا ہے ساری کائنات ہاتھ باندھے کھڑی ہے اور دُعا آسمان کے سات پردوں کے پیچھے اللہ تک پہنچ رہی ہے۔

سمیرا حیات۔ رینالہ خورد

دیکھ بھال

"ارے سیما! تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ بہت تھکی تھکی لگ رہی ہو؟" حرا نے پوچھا۔

"تمہیں تو معلوم ہے کہ میرا شوہر بیمار ہے اور مجھے دن رات اس کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔" سیما نے جواب دیا۔

"دن رات...؟" حرا نے حیرت سے پوچھا۔ "جہاں تک مجھے معلوم ہے تمہارے شوہر کی تیمارداری کے لیے تو رات کو نرس آتی ہے۔"

"ہاں بھئی، اسی لیے تو مجھے رات کو زیادہ دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔" سیما نے جواباً کہا۔

نمرہ، اقرأ۔ کراچی

مہکتی کلیاں

- انسانی رویے موسموں کی طرح ہوتے ہیں جس سے نمٹنے کے لیے لہجوں کے لباس بدلنا پڑتے ہیں۔
- ہم کسی کو کچھ نہیں دے سکتے، سوائے محبت یا نفرت کے۔
- "نہیں" سے بات شروع ہو تو دامن ہی نہیں دل بھی تنگ ہو جاتا ہے۔ پھر نہ دل میں جگہ ملتی ہے اور نہ ہی دامن میں۔
- شام ڈھلے گھر میں اتنی روشنی ضرور کر لیا کرو کہ تمہیں اپنا آپ دکھائی دیتا رہے۔
- ہر خوبصورت چیز کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرو۔ چاند ستارے آسمان کی خوبصورتی کے لیے ہیں، دامن بھرنے کے لیے نہیں۔
- یہ ٹھیک ہے کہ محبت مرتی نہیں، مگر اس کے معیار ضرور بدلتے رہتے ہیں۔
- جب ہمارا خود اپنے دل پر اختیار نہیں تو کوئی دوسرا ہم مزاج کیسے بن سکتا ہے؟

عائشہ، تحریم۔ گوجرہ

لین دین

مامون عباسی کے زمانے میں ناپ تول میں کمی کرنے والے کسی تاجر کو پچاس کوڑوں کی سزا سنائی گئی۔ اس نے جلاد کو ایک ہزار درہم رشوت دے کر کہا کہ وہ کوڑے اس کے بدن پر مارنے کے بجائے زمین پر مارے۔

جلاد نے 49 کوڑے زمین پر مارنے کے بعد آخری کوڑا پوری قوت سے تاجر پر دے مارا۔ اس کو شدید تکلیف ہوئی تو اس نے جلاد سے کہا۔

"میں نے تجھے محض اس لیے رشوت دی تھی کہ مجھے کوڑے نہ لگنے تاکہ مجھے کوئی گزند نہ پہنچے۔ آخر تو نے مجھے ایک کوڑا کیوں مارا؟"

"میں تمہیں احساس دلانا چاہتا تھا کہ اس لین دین میں تم فائدے میں رہے ہو۔" جلاد نے کہا۔

کرن، بینش۔ فیصل آباد

غور کیجیے

"کیا ضروری تھا کہ میں "فوج" میں آتا۔ میری عمر کے بہت سے لڑکے یونیورسٹیز اور کالجز میں پڑھ رہے ہوں گے اور میں بائیس سال کی عمر میں اگلے کچھ دنوں میں اپنے سینے پہ گولی کھا کے اس دُنیا سے دُور ہو جاؤں گا۔"

"کس کے لیے؟"

"اُن لوگوں کے لیے جو غازیوں اور شہیدوں کے بجائے سنگرز کو اہمیت دیتے ہیں۔ جو اس ملک کے دشمنوں کی فلمز اور ڈرامے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ جو یہ تک سن نہیں سکتے کہ ہم نے موت کو کہاں جا کر دیکھا۔ صرف اس لیے کہ ان لوگوں کے عیش و آرام پر کوئی حرف نہ آئے۔"

(اقتباس۔ کیپٹن علی احمد شہید کی ڈائری وزیرستان)

انابیہ خان۔ جہلوال

سچ ہی تو ہے

- یادوں کی تلخ حقیقت کو اتنا کڑوا نہ بننے دو کہ تم کو یاد آئیں تو تمہارا اپنا آپ کڑواہٹ سے

بکھر جائے۔

- خواہشوں کے مینار پر چڑھنے سے پہلے ایک بار سوچ لینا کہ آندھی کسی کو نہیں بخشتی۔
- اعتبار کی دیواروں کو اتنا مضبوط کر لو کہ اسے شک کا کوئی طوفان گرا نہ سکے۔
- چراغ کی روشنی سے فائدہ اُٹھاؤ، یہ مت دیکھو کہ وہ کس کے ہاتھ میں ہے۔
- دُنیا تمہیں اس وقت تک نہیں ہرا سکتی۔ جب تک تم اپنے آپ سے نہ ہار جاؤ۔
- حوصلہ کبھی یہ نہیں پوچھتا کہ پتھر کی دیوار کتنی اونچی ہے۔
- انسان کی باشعور زندگی کسی آزمائش کے بعد شروع ہوتی ہے۔
- مجلس میں زبان پر، غصے میں ہاتھ پر اور دسترخوان پر بھوک پر قابو رکھنے والا کبھی پریشانیوں اور بیماریوں سے بچ جاتا ہے۔
- بخیل آدمی کی دولت اس وقت زمین سے باہر آتی ہے۔ جب وہ خود زمین کے اندر چلا جاتا ہے۔
- جو شخص دوسروں کی بات اس لیے کاٹتا ہے کہ دوسروں پر اس کا علم و فضل ظاہر ہو، لوگ ایسے شخص کو بے وقوف اور جاہل سمجھتے ہیں۔
- وہاں رہنا آپ کی نادانی ہے، جہاں آپ کی ضرورت اور قدر نہ ہو۔
- محبت تو پتوں کی "سائیں سائیں" کی طرح ہوتی ہے۔ نہ دکھائی دیتی ہے نہ پکڑ میں آتی ہے بس اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

عزت،

حضرت طارق بن شہاب رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہمارے ساتھ ملک شام میں رہتے تھے۔ حضرت عمر بن خطاب رض وہاں تشریف لائے تھے۔ ان کے ساتھ اور صحابہ کرام رض بھی چل رہے تھے۔ چلتے چلتے راستے میں پانی کا ایک گھاٹ آگیا۔ حضرت عمر فاروق رض اونٹنی پر سوار تھے۔ وہ اونٹنی سے نیچے اُترے اور موزے اُتار کر اپنے کندھے پر رکھ لیے اور اپنی اونٹنی کی نکیل پکڑ کر اس گھاٹ میں سے گزرنے لگے تو حضرت ابوعبیدہ رض نے عرض کیا۔

"اے امیر المومنین! آپ یہ کیا کر رہے ہیں کہ موزے اُتار کر کندھے پر رکھ لیے ہیں اور اونٹنی کی نکیل پکڑ کر اس گھاٹ میں سے گزرنے لگے ہیں؛ مجھے اس بات سے بالکل خوشی نہیں ہوگی کہ اس شہر والے آپ کو اس حال میں دیکھیں۔"

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

"اے ابوعبیدہ! اگر آپ کے علاوہ کوئی اور یہ بات کہتا تو میں اسے ایسی سخت سزا دیتا، جس سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری امت کو عبرت ہوتی۔ ہم تو سب سے زیادہ ذلیل قوم تھے۔ اللہ نے اسلام کے ذریعے ہمیں عزت عطا فرمائی ہے۔ ہم جب بھی اس کے علاوہ کسی اور سے عزت حاصل کرنا چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ ہمیں ذلیل و خوار کر دیں گے۔"

طوبیٰ۔ گجرات

مسئلے کا درست حل،

نہر کا محافظ: "جناب! سیلاب کا پانی خطرے کے نشان تک پہنچ چکا ہے۔"

افسر: "جلدی سے خطرے کا نشان اور اوپر بنا دو۔"

سحر لطیف۔ نواب شاہ





علیم ڈار سے ملاقات

شاہین رشید

پاکستان زرخیز ذہنوں اور باصلاحیت لوگوں کا ملک ہے۔ اس ملک میں کئی ایسے لوگ ہیں جو صرف اور صرف پاکستان سے محبت کرتے ہیں اور پاکستان کا نام روشن کرنے کی تگ و دو میں ہر لحظہ مصروف عمل رہتے ہیں۔ ایسے لوگ نہ بکتے ہیں اور نہ جھکتے ہیں۔ ایسے ہی قابل فخر لوگوں میں "علیم ڈار" بھی ہیں، جنہوں نے تیسری بار دنیا کے بہترین امپائر کا ایوارڈ حاصل کیا اور یہ ایوارڈ لگاتار حاصل کر کے ہیٹ ٹرک بھی مکمل کی علیم ڈار نے 2009ء 2010ء اور 2011ء میں بہترین امپائر کا ایوارڈ حاصل کیا اور یہ ہمارے لیے بڑے فخر کی بات ہے۔

"کیسے مزاج ہیں علیم ڈار صاحب! ہماری طرف سے اور ہمارے ادارے کی طرف سے بہترین امپائر کا ایوارڈ حاصل کرنے اور ایوارڈ کی ہیٹ ٹرک مکمل کرنے پر مبارک باد قبول کیجیے۔"

"بہت شکریہ.... میں آپ سب کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے عزت دی۔"

"کیا احساسات ہیں آپ کے؟"

"بہت خوش ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اس ایوارڈ سے نوازا۔ یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے۔ مسلسل تین مرتبہ ایوارڈ ملنے کی وجہ میرے گھر والوں، میرے ہم وطنوں اور چاہنے والوں کی دعائیں ہیں۔ یہ ایوارڈ میرا نہیں پاکستان کا ہے۔ میری کوشش ہوگی کہ اگلی مرتبہ بھی یہ ایوارڈ لے کر آؤں۔

آٹھ سال سے یہ ایوارڈ دیا جا رہا ہے اور چھ مرتبہ بہترین امپائر کے لیے میں نامزد ہوا ہوں.... اور چھ دفعہ کی نامزدگی میں 3 مرتبہ بہترین امپائر کا ایوارڈ جیتنا یہ مجھ پر اللہ کا بڑا کرم رہا ہے۔"

"آپ کے روز مرہ کے معمولات کیا ہیں؟"

"میں روزانہ جیم خانہ جاتا ہوں۔ کلب جاتا ہوں وہاں امپائرنگ کرتا ہوں۔ کلب کے میچز کی امپائرنگ کرتا ہوں۔ پھر ایکسرسائز بھی کرتا ہوں۔"

"کس طرح نامزدگی کے لیے سلیکشن ہوتا ہے اور

پھر کس طرح ایوارڈ کے لیے منتخب کیا جاتا ہے..... کچھ اس کے بارے میں بتائیں۔"

"یکم جولائی سے لے کر 30 جون تک یعنی پورے سال کی کارکردگی دیکھی جاتی ہے۔ اس میں کیپٹن رپورٹس ہوتی ہیں۔ میچ ریفریز کی اور پھر آئی سی سی کی اپنی رپورٹس ہوتی ہیں..... اس کے بعد ویری ایشن بنتی ہے، پھر یہ ویری ایشن دوبارہ ریفریز اور آئی سی سی کے پاس جاتی ہیں۔ پھر ووٹنگ ہوتی ہے اور جو بھی ووٹ زیادہ لے جائے' وہ ایوارڈ کا مستحق قرار پاتا ہے۔"

"کرکٹ کا کھلاڑی بننے کی بجائے کرکٹ کا امپائر بننے کا خیال آپ کو کیسے آیا؟"

"اصل میں تو میں کھلاڑی ہی بننے آیا تھا۔ میرے بڑے بھائی کرکٹ کھیلتے تھے لیکن وہ صرف کلب لیول پہ ہی کھیلتے تھے۔ میں گوجرانوالہ سے لاہور اسی سلسلے میں آیا تھا۔ پی اینڈ ٹی جیم خانہ جوائن کیا۔ پہلے بحیثیت باؤلر سلیکٹ ہوا' پھر بیٹنگ کے لیے میرے مرحوم بھائی ندیم ڈار مجھے لاہور لے آئے تو لاہور میں' میں نے الائیڈ بنک سے فرسٹ کلاس کرکٹ کھیلی' لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ میں ایک اچھا کھلاڑی نہیں بن پاؤں گا۔

ایک دن میرے دوست اظہر زیدی صاحب نے مجھے امپائر بننے کا مشورہ دیا۔ اس زمانے میں کرکٹ بورڈ میں ماجد خان' خالد محمود صاحب' رمیز راجہ اور اقبال قاسم صاحب تھے تو انہوں نے ایڈورٹائز کیا کہ جو فرسٹ کلاس کرکٹر اس فیلڈ میں آنا چاہیں' ہم ان کو ویلکم کریں گے۔ میں نے اپلائی کیا..... اور ایک سال میں میں نے انڈر 19 اور فرسٹ کلاس میچوں کی امپائرنگ کی اور ایک سال کے اندر اندر میں نے اتنا امپروو کر لیا کہ ایک سال کے بعد ہی مجھے انٹرنیشنل میچز کے لیے سلیکٹ کر لیا گیا۔"

"اس کے لیے آپ نے کوئی تربیت حاصل کی تھی یا کوئی کورسز کیے تھے؟"

"ایک نئے امپائر کے لیے ایف اے تک تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ اگر فرسٹ کلاس کرکٹر یا ٹیسٹ کرکٹر رہ چکے ہوں تو اس کا فائدہ ضرور ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ایک اچھا کھلاڑی ایک اچھا امپائر بھی ہو۔ یہ سب کچھ شوق پر منحصر ہوتا ہے۔ کچھ کورسز اور کچھ ٹریننگ بھی ہوتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اس فیلڈ میں سرخرو کیا۔"

"پہلا انٹرنیشنل میچ کون سا تھا کہ جس کی آپ نے امپائرنگ کی؟"

"میری والدہ کا شہر گوجرانوالہ ہے۔ یہاں پاکستان اور سری لنکا کا میچ ہوا تھا اور میں نے اور اسد رؤف نے اس کی امپائرنگ کی تھی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اب ہم دونوں دنیا کے بہترین امپائرز میں سے ہیں۔ اگر میں پہلے نمبر پر ہوں تو اسد رؤف دوسرے نمبر پر ہیں۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ کیریئر کا آغاز کیا اور پہلا ڈیبو (Debut) بھی ہمارا ایک ساتھ ہوا تھا اور ہمارا تعلق بھی ایک ہی کلب سے ہے۔"

"کتنے سال ہو گئے اس فیلڈ میں آپ کو؟"

"2000ء میں میرا ڈیبو Debut ہوا اور اب 2011ء چل رہا ہے تو مجھے اس فیلڈ میں گیارہ سال ہو گئے ہیں۔"

"کبھی انٹرنیشنل میچز میں غلطی ہوئی؟ اور کتنے میچز کی امپائرنگ کر چکے ہیں؟"

"ہاں کیوں نہیں..... ہر انسان سے ہر امپائر سے غلطی ہوتی ہے لیکن جو کم غلطی کرتا ہے' وہ ہی اچھا امپائر ہوتا ہے تو میرے اچھے میچز کی تعداد کافی زیادہ ہے میں نے 146 ون ڈے میچز کی امپائرنگ کی جو کہ سب سے زیادہ ہے اور 68 ٹیسٹ میچز کی امپائرنگ کی۔ اس میں' میں دوسرے نمبر پر ہوں۔"

"2011ء کے ورلڈ کپ کا سیمی فائنل ہم ہار گئے تھے۔ امپائرنگ پر بھی بہت اعتراضات ہوئے تھے کیا آپ نے اس وقت سوچا تھا کہ کاش میں اس سیمی فائنل میں امپائرنگ کر رہا ہوتا؟"

"میں نہیں سمجھتا کہ امپائرنگ کی غلطی کی وجہ سے ایسا ہوا..... کیونکہ ہماری اپنی غلطیاں بھی تھیں۔ کیچز بھی چھوٹ گئے تھے..... اور ہار جیت تو ہوتی ہی رہتی ہے..... ویسے میں ہمیشہ پاکستان کے لیے دعاگو رہتا ہوں لیکن امپائرنگ کے وقت نیوٹرل رہتا ہوں اور امپائرنگ کرتا ہوں۔"

"سیمی فائنل کے لیے یہ بات مشہور ہوئی کہ یہ "فکس" تھا۔ آپ کیا کہیں گے؟"

"آپ اگلا سوال کریں۔ ہمیں اس پہ بات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔"

"چلیں تو یہ بتائیں کہ آپ کو کبھی کس نے خریدنے کی کوشش کی؟"

"مجھ پہ اللہ کا بڑا کرم ہے اور جو میری شخصیت کا امیج بن چکا ہے' میں اس کی بہت حفاظت کرتا ہوں۔ میں بلاوجہ کمرے سے باہر نہیں نکلتا (میچ کے بعد) نہ ہوٹل کے فون اٹینڈ کرتا ہوں..... اور جو میرے کولیگ ہوتے ہیں' ان سے بھی زیادہ بات نہیں کرتا..... جب میں کوئی ایکٹویٹی رکھتا ہی نہیں تو کوئی مجھ سے غلط بات کیسے کر سکتا ہے۔"

"آپ نے بہت ساری ٹیموں کے لیے امپائرنگ کی۔ آپ کے خیال میں سب سے زیادہ محب وطن کون سی ٹیم ہے؟"

"یہ اندازہ لگانا تو بہت مشکل ہے' کیونکہ جب میچ ہو رہے ہوتے ہیں تو سب ہی کوشش کر رہے ہوتے ہیں کہ میچ جیتیں تو مجھے تو سب ہی محب وطن نظر آ رہے ہوتے ہیں۔ باقی دلوں کے حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔"

"تقریباً" تمام ممالک میں آپ جا چکے ہیں۔ کس ملک میں آپ کو جانا اچھا لگا اور کیا کسی ملک نے آپ کو شہریت دینے کی بات کی یا پیشکش کی؟"

"جی بالکل..... مجھے آسٹریلیا' انگلینڈ کینیڈا اور دیگر ممالک نے شہریت کی آفر دی ہے' لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میرا اس طرف کوئی رجحان ہے اور نہ ہی میرے بچوں اور بیگم کا..... کیونکہ میں جو کچھ بھی ہوں' صرف اور صرف پاکستان کی وجہ سے ہوں۔ یہاں کے حالات کیسے بھی ہوں' مجھے اپنے ملک میں رہنا اور اس کی نمائندگی کرنا اچھا لگتا ہے۔ میں بیوی بچوں کے ساتھ کافی ممالک جا چکا ہوں' مگر انہیں بھی پاکستان ہی میں رہنا اچھا لگتا ہے۔ 20' 25 دن سے زیادہ کہیں بھی دل نہیں لگتا۔"

"کچھ اپنے بارے میں بتائیے؟"

"میں 6 جون 1968ء میں پنجاب کے شہر "جھنگ" میں پیدا ہوا..... والد صاحب پولیس میں تھے ان کی پوسٹنگ زیادہ تر ایسے شہروں میں ہوتی تھی' جہاں کرکٹ نہیں ہوتی تھی' اسی لیے میں لاہور آ گیا۔ میری والدہ ہاؤس وائف تھیں۔ ماشاء اللہ میرے چھ بھائی ہیں۔ میرے بڑے بھائی آرمی میں بریگیڈیر ہیں۔ وہ سیالکوٹ میں رہتے ہیں۔ دو بھائی انکم ٹیکس میں ہیں۔ ایک بھائی ایڈووکیٹ ہے اور جو مجھ سے چھوٹا ہے وہ بھی جاب کرتا ہے۔ کوئی بہن نہیں ہے..... بہن کی کمی بھائیوں کی بیویوں نے پوری کر دی ہے۔ سب بھائیوں کی بیویاں بہت اچھی ہیں اور بہت پیار' محبت سے رہتی ہیں اور آپ کو یہ سن کر بھی حیرانی ہو گی کہ ہم سب بھائیوں نے ماں باپ کی پسند سے شادی کی۔ اب اگرچہ میرے والدین نہیں ہیں' لیکن ہم سب نے والدین کی بہت عزت کی اور بہت خیال رکھا..... اور والدین کی دعاؤں کی بدولت ہی آج ہم سب بھائی بہت خوشحال ہیں گھر میں امن و سکون ہو تو انسان بہتر طریقے سے کام کر سکتا ہے۔ جب ہم گراؤنڈ میں جاتے ہیں تو جب تک ہمارا مائنڈ فریش نہیں ہو گا' ہم کچھ اچھا کام نہیں کر پائیں گے اور میں اس کا کریڈٹ اپنی وائف کو دوں گا۔"

"وہ واقعہ کب کا ہے جب آپ کی بیٹی کا انتقال ہوا تھا اور آپ کی بیگم نے آپ کو بتایا نہیں تھا کہ آپ ڈسٹرب نہ ہوں؟"

"جی! یہ 2003ء کی بات ہے' جب ورلڈ کپ ہو رہا تھا اور مجھے اس ورلڈ کپ کی امپائرنگ کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ جب میں ورلڈ کپ کے لیے گھر سے نکلا تو تین دن کے بعد میری بیٹی کا انتقال ہو گیا' مگر میری بیگم نے مجھے ورلڈ کپ کے دوران اس بات سے بے خبر رکھا۔ اگر وہ مجھے اسی وقت بتا دیتیں تو شاید میں فوراً"

والپس آجاتا' لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا' کیونکہ وہ میری زندگی کا پہلا ورلڈ کپ تھا میری بیٹی 7 ماہ کی تھی جب اس کا انتقال ہوا۔"

"تعلیم کہاں تک حاصل کر سکے؟ کرکٹر کے علاوہ کچھ اور بننے کی خواہش تھی؟"

"میں نے بی اے کیا ہے..... جب میں کرکٹ کھیلنے لاہور آیا تھا تو مجھے بہت شوق تھا کہ میں کچھ بن جاؤں۔ کرکٹ کے ساتھ ساتھ میں نے تعلیم بھی جاری رکھی اور اللہ کا شکر ہے کہ اپنی تعلیم مکمل بھی کی..... اور جہاں تک کچھ بننے کی خواہش کی بات ہے تو آپ کو پتا ہی ہے کہ ہر والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ ہمارا بیٹا انجینئر بن جائے یا ڈاکٹر بن جائے' لیکن میرا رجحان شروع سے ہی اسپورٹس مین بننے کا تھا۔ کھلاڑی تو نہیں بن سکا لیکن امپائر بن گیا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے لیے یہی فیلڈ منتخب کی ہوئی تھی۔"

"آپ کی شکل ہمارے ملک کے مشہور گلوکار "وارث بیگ" اور کھلاڑی "وقار یونس" سے ملتی ہے۔ آپ کی توجہ کسی نے اس طرف دلائی؟"

"جی بالکل..... کافی لوگوں نے مجھ سے کہا کہ آپ کی شکل وارث بیگ اور وقار یونس سے ملتی ہے۔ وارث بیگ صاحب سے ایک تقریب میں ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے ازراہِ مذاق کہا کہ "آپ بتائیں کہ کون زیادہ خوب صورت ہے' میں یا آپ۔"

"آپ کی سب سے بڑی خواہش؟"

"میری خواہش تھی کہ میں اپنے بیٹے کو حافظِ قرآن بناؤں' اللہ نے میری یہ خواہش پوری کردی ہے' مجھے جو اتنے ایوارڈ ملے ہیں ان میں سب سے بڑا ایوارڈ یہ ہے کہ میرا بیٹا حافظِ قرآن ہے۔"

"کتنے سال ہو گئے ہیں شادی کو اور کتنے بچّے ہیں؟"

"1995ء میں میری شادی ہوئی۔ بیگم کا نام نوشابہ ہے۔ ماشاءاللہ سے تین بیٹے ہیں۔ بڑا بیٹا پندرہ سال کا ہے' پھر 10 سال کا بیٹا ہے اور سب سے چھوٹا بیٹا چھ سال کا ہے۔ میں اس سال بیگم کے ساتھ حج پہ بھی جا رہا ہوں۔"

"ماشاءاللہ ہماری طرف سے پیشگی مبارک باد قبول فرمائیے گفتگو میں تو آپ بہت نرم مزاج لگ رہے ہیں تو کیا غصہ کم آتا ہے آپ کو؟"

"مجھے غصہ بھی آتا ہے۔ لیکن میرا غصہ ایسا ہے کہ پانچ منٹ میں گرم تو ایک منٹ میں ٹھنڈا بھی ہو جاتا ہے اور میری یہ بھی ایک اچھی عادت ہے کہ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو جائے تو میں فوراً" معافی بھی مانگ لیتا ہوں۔ میں اپنی قوم سے بھی یہ بات ضرور کہوں گا کہ ہمارے بہت سے مسائل حل ہو جائیں' اگر ہمیں معافی مانگنا اور معافی دینا یعنی معاف کرنا آجائے۔"

"آپ ماشاءاللہ کئی ممالک جا چکے ہیں۔ کیا بات آپ کو بہت متاثر کرتی ہے؟"

"جب کسی بھی ملک میں جاتا ہوں تو سب سے پہلے وہاں کا ٹریفک دیکھتا ہوں' کیونکہ میرا یہ خیال ہے کہ جس ملک کا ٹریفک ٹھیک ہوتا ہے' اس ملک کا نظام بھی ٹھیک ہوتا ہے۔ ہمارے ملک کے ٹریفک کا جو حال ہے وہ تو سب کو معلوم ہے۔ سب ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں ہوتے ہیں' حالانکہ اگر ایک گاڑی راستہ دے دے تو ساری لائن کلیئر ہو سکتی ہے۔"

"کچھ اپنے بچوں کے بارے میں بتائیں؟"

"جی' جیسا کہ میں نے بتایا کہ میرا بڑا بیٹا محمد علی ڈار حافظِ قرآن ہے۔ اب باقاعدہ اس کی تعلیم کا سلسلہ بھی شروع ہو جائے گا۔ دوسرا بیٹا محمد حسن ڈار کلاس سکس کا طالب علم ہے اور چھوٹے کے ساتھ کچھ پرابلم ہے۔ وہ ٹھیک طرح سے نہیں سُن پاتا۔ میں سب سے گزارش کروں گا کہ وہ میرے بیٹے کے لیے دعا کریں کہ وہ ٹھیک طرح سے سُن اور بول سکے۔"

"جی ضرور!

"ان شاءاللہ تمام پڑھنے والے آپ کے بیٹے کے لیے دعا گو رہیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی ہم نے انٹرویو کا اختتام کیا۔

☼



نادرہ خاتون

نامے میرے نام

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی.
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

آمنہ اجالا..... ڈگری کالج' ڈہرکی

سب قارئین' بہنوں اور تمام اہلیانِ وطن کو عیدالاضحیٰ کی پیشگی مبارکباد۔

خوش قسمتی سے اس بار ڈائجسٹ 7 تاریخ کو ہی مل گیا۔ ٹائٹل اس بار لاجواب تھا۔ اشتہارات کو پھلانگتے ہوئے فہرست میں پہنچے تو فاخرہ آپی بہار کی نوید دیتی ہوئی ملیں اور ہم جی جان سے خوش ہو گئے کہ چلیے اتنے عرصے بعد ہی سہی' فاخرہ جبیں نظر تو آئیں اور پھر اس کے بعد لمحہ بھر کے لیے کہنی سنی کے سامنے ٹھہرے اور پھر سندھ کے باسیوں کے لیے دل سے دعا نکلی کہ اللہ ربّ العزت ان کی مشکلات دور فرمائے اور بحیثیت ایک پاکستانی ایک مسلمان اور ایک ہی قوم کے فرد ہونے کے ناتے تمام پاکستانیوں کو اس مشکل کی گھڑی میں ان کی مدد کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مکمل ناول میں سب سے پہلے فاخرہ آپی کے مکمل ناول "بہار آنے تک" پڑھا' بہت زبردست اسٹوری تھی۔ ہائے جوائنٹ فیملی سسٹم' یوں تو سب ہی کردار الگ الگ خصوصیات کے حامل اور اپنی جگہ پرفیکٹ تھے لیکن عظمیٰ نایاب عرف اوما کا کردار سب سے دلچسپ تھا۔ بڑوں کے اختلافات کے باوجود چھوٹوں کا آپس میں اتنا پیار دیکھ کر بے اختیار ہمیں رشک سا آگیا۔ ویل ڈن فاخرہ جی! اب پھر سے غائب نہ ہو جائیے گا۔ "نگاہ آئینہ ساز میں" شازیہ ہمایوں کا مکمل ناول پڑھ کر احساس ہوا کہ دیارِ غیر میں رہنے والے جو ہمیں لگتا ہے کہ بہت اطمینان اور خوشی کی زندگی بسر کر رہے ہیں' دراصل انہیں وہاں کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے' کتنی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ دیارِ غیر میں رہنے والے پردیسیوں کی مشکلات کی آئینہ دار ان کی تحریر کافی اثر پذیر تھی۔

اس کے بعد ہم اپنی موسٹ فیورٹ تحریر "سفال گر" کی طرف بڑھے اِس قسط میں ساری گتھیاں سلجھ گئیں۔

افسانوں میں سعدیہ حمید چودھری کا افسانہ "ایک کرب مسلسل" کافی اثر انگیز تحریر تھی۔ جہاں انا کی بلند فصلیں ہوں' اس جگہ محبت اپنا آپ نہیں منوا سکتی۔ "سمجھوتے کی چادر" نفیسہ بیگم کا سبق آموز افسانہ تھا۔

سلسلہ وار ناولز میں رفعت ناہید سجاد صاحبہ کا "چراغ آخر شب" بہت ہی زبردست طریقے سے آگے بڑھ رہا ہے۔ لفظوں سے کھیلنے کا ہنر وہ بخوبی جانتی ہیں اور منظر نگاری

اس غضب کی ہوتی ہے کہ بے اختیار انہیں داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

"میرے خواب لوٹا دو" کی یہ قسط بھی کافی اچھی رہی۔ نگہت آپی بہت خوب صورت طریقے سے کہانی کو آگے بڑھا رہی ہیں۔

"جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" کی اس بار قسط نہ پا کر کافی کوفت کا شکار ہوئے۔

خاتون کی ڈائری میں سے سارہ انعم کا انتخاب بہت پسند آیا۔ اشعار میں روز مین' ناز اور ماہا انعام کے اشعار پسند آئے۔

دیگر مستقل سلسلے بھی کافی اچھے جا رہے ہیں۔

ج - پیاری آمنہ اجالا! پرچے کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔ امید ہے کہ آئندہ بھی اپنے تبصرے سے نوازتی رہیں گی۔

شہلا حسین...... بھکر

اب تو یاد بھی نہیں کہ خواتین ڈائجسٹ سے تعلق کتنا پرانا ہے۔ نہ جانے کتنے سال بیت گئے مگر کبھی بھی "میں اتنے سال سے اس ڈائجسٹ کی قاری ہوں" جیسا کوئی خط لکھنے کی ہمت نہ کر پائی۔

آج میری بیٹی چوبیس سال کی ہو گئی ہے اور تین دن بعد اس کی مہندی ہے۔ میری بھابھی مجھے خط لکھتے دیکھ کر خفا ہو رہی ہیں کہ اس عمر میں یہ حرکتیں...... مگر آج واقعی بہت دل چاہا کہ میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کروں۔

خواتین ڈائجسٹ کا معیار شروع میں بھی زبردست تھا اور اب بھی بہترین ہے۔ پرانی رائٹرز کی واپسی سے بے حد خوشی ہوئی۔ نئی آنے والی بچیاں بھی ماشاءاللہ بہت اچھا لکھ رہی ہیں جن میں نایاب جیلانی اور نمرہ احمد مجھے بہت پسند ہیں۔ فرحت اشتیاق اور نگہت عبداللہ کے ناولز اب بھی میرا دل موہ لیتے ہیں۔ اس ماہ شادی کے بکھیڑوں کے باوجود میں نے ڈائجسٹ پڑھا اور پہلی بار خط بھی تحریر کر رہی ہوں۔ شازیہ ہمایوں کی اچھی کاوش تھی۔ "میرے خواب لوٹا دو" پر تبصرہ محفوظ ہے۔ فاخرہ جبیں کی تحریر بھی پسند آئی۔ نمرہ احمد کا ناول بھی خوب صورت تھا۔ ان کی اتنی پختہ تحریروں کے بعد ایک ہلکی پھلکی کہانی اچھی لگی۔ نگین کا وہی پہلے والا روپ پسند تھا، بدلی ہوئی نگین کچھ بھائی نہیں دل کو۔

ج - شہلا بہن! آپ کا اور خواتین کا ساتھ اتنا پرانا ہے جان کر بے حد خوشی ہوئی۔ لیکن آپ نے ہمیں اتنی دیر سے خط کیوں لکھا؟ آئندہ باقاعدگی سے ہمیں اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بیٹی کی ڈھیروں خوشیاں دیکھنا نصیب فرمائے۔ آمین۔

مہر شہوار...... ای میل

خواتین کے ساتھ رشتہ پچھلے تیرہ سال سے قائم ہے۔ میری امی اور خالہ یہ رسالہ پڑھتی تھیں۔ اسی لیے بہت پرانے رسالے بھی پڑھنے کو ملے۔ اب مجھے خواتین ابو لا کر دیتے ہیں اور اس میں "کرن کرن روشنی" اور "رنگا رنگ پھول" ضرور پڑھتے ہیں۔ آپ کے پرچے نے زندگی میں بہت رہنمائی کی ہے۔ اس بار تمام ناول اور ناولٹس بہت اچھے تھے۔ بس ایک بات کہنا چاہوں گی نمرہ کے ناولٹ کے بارے میں کہ پتا نہیں کیوں یہ تحریر مجھے نمرہ کے معیار کی نہیں لگی۔ ہو سکتا ہے کہ باقی بہنیں مجھ سے متفق نہ ہوں۔ فاخرہ جبیں کا ناول بہت عرصے بعد پڑھنے کو ملا۔ بہت اچھا لگا اور افسانے تمام ہی پسند آئے۔ رفعت ناہید سجاد کی تو کیا تعریف کروں۔ ان کی کہانی کے بہت سے حصے ابو کو سناتی ہوں تو وہ حیران ہوتے ہیں کہ اس رسالے میں اتنی پختہ تحریر بھی ہوتی ہے۔

ج - پیاری مہر! آپ کی میل پڑھ کر دلی مسرت ہوئی۔ پرچا ترتیب دیتے ہوئے ہماری ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ تفریح کے ساتھ ساتھ زندگی کے مختلف معاملات کے حوالے سے بہنوں کی رہنمائی بھی ہو سکے۔ ہم اللہ تعالیٰ کے حضور دعا گو ہیں کہ آئندہ بھی آپ سب کی امیدوں پر پورا اتر سکیں۔ آپ کی رائے متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے۔

دیا زورین...... ڈگری کالج، ڈہرکی

تقریباً" ساڑھے تین سال پیچھے کی بات ہے جب ہم میٹرک کے ایگزام دے کر فارغ بیٹھے تھے۔ تب ہماری بہت ہی پیاری سی دوست نے ہمیں خواتین اور شعاع ڈائجسٹ سے متعارف کروایا اور تب سے لے کر اب تک خواتین اور شعاع ہمارے ساتھ ہے اور اب تو اکثر کرن ڈائجسٹ بھی زیر مطالعہ رہتا ہے لیکن خواتین ڈائجسٹ کی تو بات ہی اور ہے۔ خواتین تو ہمارا سنگی، ساتھی ہے، میرا دوست، سہیلی، غمگسار، رہنما، سب کچھ ہے۔ جب بھی ہم ذرا اداس ہوتے ہیں تو ثمرہ آپی شبلی اور جوادی کے ہمراہ آ کر ہمیں بہلاتی ہیں۔ جب بارشوں اور کیریوں کا شوق چرائے تو راحت آپی کی کوئی زبردست سی تحریر پڑھ لیتے ہیں اور پھر جب مما کہتی ہیں کہ ان رسالوں کا پیچھا چھوڑ کے اب کوئی کام وام بھی سیکھ لو تو سگھڑ بننے کے لیے آسیہ رزاقی صاحبہ کی تحریریں پڑھتے ہیں جس میں بردبار اور سگھڑ سی ہیروئن منٹوں میں سارے کام کر لیتی ہے اور ہم بس آہ بھر کر رہ جاتے ہیں۔ سب ہی رائٹرز بہت اچھا لکھتی ہیں۔

اس ماہ کا ٹائٹل بہت ہی خوب صورت اور دیدہ زیب تھا۔ شازیہ ہمایوں ایک نیا نام، انہیں پہلی بار ہی

پڑھنے کا اتفاق ہوا "نگاہ آئینہ ساز میں" کافی اچھی تحریر تھی ان کی "بہار آنے تک" فاخرہ آپی کی بہت ہی زبردست تحریر تھی۔ پلیز فاخرہ جی لکھتی رہا کریں۔ ہمیں ہمیشہ آپ کی تحریروں کا انتظار رہتا ہے۔ افسانوں میں اس بار سمیرا حمید کا افسانہ بہت اچھا تھا۔ باقی دیگر مستقل سلسلے سب ہی اپنی جگہ پرفیکٹ جا رہے ہیں۔ اپا جی! آپ سے ایک چھوٹی سی فرمائش ہے پلیز سنبل اقبال کا انٹرویو بمعہ تصویروں کے شائع کریں۔

ج - پیاری دیا! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے مشکور ہیں آپ کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے۔

صباحت ارشاد باجوہ...... فرید ٹاؤن، گجرانوالہ

جس ناول نے خط لکھنے پہ مجبور کیا وہ "نگاہ آئینہ ساز" ہے۔ شازیہ ہمایوں آپ نے بہت زبردست لکھا۔ آپ کی تعریف کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ "بہار آنے تک" کچھ اچھا نہیں لگا اور پلیز میری آپ سے درخواست ہے کہ "میرے خواب مجھے لوٹا دو" کو زیادہ طول مت دیجیے گا۔ ابرار الحق کا اور جیو نیوز کے نیوز کاسٹر مسعود رضا کا انٹرویو بھی شائع کریں۔

آپی! میرا خط ضرور شائع کیجیے گا نہیں تو میں دوبارہ نہیں لکھوں گی۔

ج - پیاری صباحت! آپ کا خط شائع کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ آپ اپنے تفصیلی تبصرے کے ساتھ شریک ہوں گی۔

عاشی...... ای میل (قطر)

شمارہ ہر بار کی طرح بہت اچھا اور معلوماتی تھا۔ ٹائٹل گرمیوں میں تازگی احساس دلا گیا۔ مصباح خادم کا "کاملیت پسند" سب سے زیادہ پسند آیا۔ اس بار افسانے سب ہی سبق آموز تھے۔ بشریٰ سعید کے لیے مجھے الفاظ نہیں مل رہے کہ ان کو داد دے سکوں۔ عمر جب صوفیہ پر دم کرتا ہے تو مجھے یوں لگا جیسے صوفیہ نہیں میں اس حصار میں آ گئی ہوں۔ شازیہ ہمایوں نے بہت عرصے بعد کچھ لکھا اور دل کو چھو لیا۔ نمرہ احمد کا "وہ میرا ہے" کچھ متاثر نہ کر سکا۔ نمرہ جی! آپ کا جو اسٹائل ہے آپ پر وہی سوٹ کرتا ہے۔ رفعت ناہید جی کو پڑھتے وقت لگتا ہے جیسے ہم 1947ء میں جا پہنچے ہیں۔

ج - عاشی بہن! ہمیں اتنی دور سے یاد کرنے کا بے حد شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے۔ امید کرتے ہیں کہ آئندہ آپ تفصیلی تبصرے کے شرکت کریں گی۔

بشریٰ باجوہ...... اوکاڑہ

خواتین اس دفعہ 5 کو ہی مل گیا۔ ٹائٹل نارمل ہی رہا۔ پہلے "کرن کرن روشنی" سے مستفید ہوئے "ڈوب رہی ہے زندگی" ام ثمامہ کا مضمون پڑھ کر دل غم زدہ ہو گیا۔ فاخرہ جبیں کا ناول دیکھ کر خوشی ہوئی پڑھا تو لطف آ گیا۔ راحت اور فاخرہ کی منظر نگاری لائق تحسین ہوتی ہے۔ بہت ہی سینئر اور جونیئر رائٹرز غائب ہیں۔ کدھر ہیں بھئی آپ سب۔ پلیز کچھ لکھیں ہمارے لیے، نمرہ احمد آپ کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں مصحف جیسی، بے مثال، تحریر مدتوں یاد رہے گی۔ شکریہ فرحت اشتیاق! آپ نے ہمارے لیے ناول لکھا۔ بشریٰ سعید کا "سفال گر" زبردست ہے۔ حکیم بیگم کا کردار بہت پیارا ہے۔ افسانوں میں صرف کاملیت پسند پڑھا اچھا لگا تمام سلسلے اے ون تھے۔

میں تھوڑا سا اپنے شہر اوکاڑہ کا تعارف کروانا چاہتی ہوں۔ اوکاڑہ کی آبادی ساڑھے بائیس لاکھ کے قریب ہے دو تحصیلیں ہیں رینالہ خورد اور دیپال پور۔ فیصل آباد روڈ پر کیڈٹ کالج ہے تین دریا ستلج راوی بیاس گزرتے ہیں۔ پاکستان کی دو بڑی شوگر ملز عبداللہ اور بابا فرید ہیں۔ براعظم ایشیاء کا سب سے بڑا فارم بہادر نگر اوکاڑہ میں ہے۔ مغلیہ دور میں پنجاب میں ملتان کے بعد بڑا دفاعی قلعہ دیپال پور میں تھا۔ دیپال پور کا گورنر غیاث الدین بلبن بعد میں شہنشاہ ہند بنا۔ بادشاہ فیروز محمد تغلق بھی دیپال پور میں پیدا ہوا۔ فیروز تغلق کی والدہ دیپال پور کی تھیں۔ گورنمنٹ کے دو کالجز گرلز، ایک بوائے کا ہے لاتعداد پرائیویٹ کالجز، اسکولز اور تعلیمی ادارے ہیں۔ آرمی کی چھاؤنی ہے کینٹ ایریا جس کو گمبیر کہا جاتا ہے۔ سترہ پولیس اسٹیشن ہیں۔ مشہور آزادی کے حریت لیڈر رائے احمد خاں گوگیرہ کے قریب دریائے راوی کے کنارے انگریزوں سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ ہمایوں کو دوبارہ تخت دہلی پر بٹھانے والا

بلوچ رہنما سردار چاکر خاں رند جس کو بلوچ قوم چاکر اعظم کہتے ہیں اوکاڑہ کے قریب ستگھرہ میں ان کا مقبرہ ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے کے مشہور دربار کرمانوالہ (رینالہ خورد) بہاول شیر قلندر (حجرہ شاہ مقیم) داؤد بندگی (شیر گڑھ) دیپال پور کے علاقے میں ہے۔ پاکستان میں سب سے زیادہ آلو مکئی دیپال پور میں ہوتا ہے۔ رینالہ خورد (کرمانوالہ) میں مالٹوں کے فارمز ہیں ادھر سے جام اسکواش وغیرہ پورے ملک کے علاوہ باہر بھی در آمد کیے جاتے ہیں۔

ج ۔ بشریٰ بہن! آپ کے شہر کے بارے میں جان کر بہت اچھا لگا۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کا تبصرہ پہنچایا جارہا ہے۔

سعدیہ یاسین...... جگہ نامعلوم

میں خواتین ڈائجسٹ شوق سے پڑھتی ہوں اور بہت پرانی قاری ہوں۔ فرحت اشتیاق، نمرہ احمد اور عمیرہ احمد میری فیورٹ رائٹرز ہیں۔ مجھے آپ سے شکایت ہے کہ آپ میرا خط شائع کیوں نہیں کرتیں۔ کیا غلطی ہوتی ہے مجھ سے جو ہر دفعہ شائع ہونے سے رہ جاتا ہے۔ کئی دفعہ کوشش کرچکی ہوں۔

ج ۔ سعدیہ بہن! صفحات کی کمی اور دیر سے خط موصول ہونے کے باعث بھی خط شائع ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ آپ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کریں گی اور ہاں اپنے شہر یا گاؤں کا نام لکھنا نہ بھولیے گا۔

ام کلثوم...... علیوال اقبال ٹاؤن، فیصل آباد

آج پہلی دفعہ خواتین ڈائجسٹ میں شرکت کررہی ہوں اگر میرا خط شامل ہوا تو آئندہ بھی ضرور شرکت کروں گی۔ خواتین ڈائجسٹ مجھے بے حد پسند ہے جب تک خواتین ــــ کا کوئی ناول وغیرہ نہ پڑھوں رات کو نیند ہی نہیں آتی۔ بڑی مشکل سے ڈائجسٹ منگواتی ہوں کیونکہ میں ایک گاؤں میں رہتی ہوں۔

اب میں ذرا اس ماہ کے شمارے کے متعلق تھوڑا سا تبصرہ کرلوں۔ اکتوبر کا شمارہ بے حد اچھا تھا۔ ٹائٹل بھی بہت اچھا تھا۔ بس ماڈل کے لپ اسٹک اگر پنک لگی ہوتی تو اور زیادہ خوب صورت لگتی۔ سب رائٹرز بہت اچھا لکھتی ہیں۔ سب کو پڑھنے کا بہت مزا آتا ہے لیکن جو مزا فرحت اشتیاق آپی کے ناول کو پڑھ کر آتا ہے اس کی بات ہی اور ہے۔

ج ۔ پیاری ام کلثوم! آپ کا خط شائع کیا جارہا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ آئندہ آپ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کریں گی۔

ثوبیہ زیب...... ای میل (ایڈمونٹن، کینیڈا)

میں خواتین، شعاع، کرن کی پچھلے 25 سال سے خاموش قاری ہوں۔ پہلے پاکستان اور شادی کے بعد لیبیا پھر کینیڈا، جہاں بھی رہی ان ڈائجسٹ کا ساتھ نہیں چھوٹا۔ لیبیا میں پرچے نہیں ملتے تھے تو میں اپنی بہنوں سے کہتی تھی کہ وہ سال بھر کے پرچے جمع کرکے رکھیں اور میں وہاں جاتی تو سارے ساتھ لے کر آتی۔ اللہ کا شکر ہے کہ کینیڈا آکر یہ مشکل ختم ہوئی ہے، لیکن اب میاں صاحب کی جاب نارتھ میں ہونے کی وجہ سے پرچا بہت لیٹ ملتا ہے۔ سو اب آپ سے ہر ماہ پرچا منگوانا چاہتی ہوں اس کے لیے ایڈریس بتادیں۔ خواتین نے پردیس میں میرا ایسا ساتھ دیا ہے کہ میرے پاس بتانے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ اس کے تمام سلسلے بہت اچھے ہیں۔ "کرن کرن روشنی" اور "آپ کا باورچی خانہ" کی تو کیا ہی بات ہے۔ ساری مصنفات بہت بہت زبردست لکھتی ہیں۔ کبھی کبھی پرانی رائٹرز کو بھی بہت مس کرتی ہوں۔

ج۔ پیاری ثوبیہ! یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ کا اور ہمارا ساتھ اتنا پرانا ہے اور ہمارے پرچے پردیس میں وطن سے آپ کے رابطے کا ذریعہ اور رہنما ہیں مگر آپ سے یہ شکایت بھی ہے کہ اتنا عرصہ آپ "خاموش قاری" کیوں رہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اب آپ باقاعدگی سے ہمیں میل کرکے اپنی تعریف و تنقید سے آگاہ کرتی رہیں گی۔ پرچے کی سالانہ خریدار بننے کے لیے ایک رسالے کا سالانہ چندہ کینیڈا کے لیے 6000 اور تینوں پرچوں کے لیے 18000 ہوں گے اگر آپ ابھی پاکستان میں ہیں تو رقم پاکستان سے ہی ہمیں روانہ کردیں۔ مزید معلومات کے لیے 021-32735021 پر رابطہ کرلیں۔

الفت زہرہ ہراج...... دودالا تلمبہ، خانیوال

آپ کا شمارہ بہت اچھا ہے میں اسے بے حد شوق سے پڑھتی ہوں۔ اس مہینے شازیہ ہمایوں اور فاخرہ جبیں کے ناول لاجواب تھے۔ میں نے خواتین ابھی تقریباً پانچ ماہ

پہلے سے پڑھنا شروع کیا ہے میری والدہ وفات پاچکی ہیں۔ مگر اس ڈائجسٹ نے مجھے ہر وہ بات سمجھائی جو ماں بچوں کو سکھاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ آپی! اگر آپ نے میرا خط شائع کیا تو میں اگلے ماہ بھرپور طریقے سے شرکت کروں گی۔ (تبصرے کے ساتھ) اور آپی! فرحان علی قادری کا انٹرویو شائع کریں۔

ج ۔ پیاری الفت! آپ کا خط شائع کیا جارہا ہے۔ پرچا پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ مگر آئندہ تفصیلی تبصرہ کے ساتھ شرکت کریں تو ہمیں زیادہ خوشی ہوگی۔

رخسانہ رضوان...... گوکھووال، فیصل آباد

خواتین اور شعاع سے وابستگی بہت پرانی ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ جب سے اردو پڑھنا آئی، اسی وقت سے پڑھ رہی ہوں۔ البتہ خط پہلی دفعہ لکھ رہی ہوں۔ اب آتی ہوں اس ماہ کے شمارے کی طرف خوب صورت ماڈل، خوب صورت ڈریس، خوب صورت بیک گراؤنڈ غرض ٹائٹل بے حد خوب صورت تھا۔ فہرست پہ نظر دوڑائی واہ! دو گمشدہ رائٹرز فاخرہ جبیں جو میرے گمشدہ لکھنے کے بعد گمشدہ ہوگئی تھیں شازیہ عطاء جن کی ولید والی اسٹوری آج بھی یاد ہے۔ سب سے پہلے "بہار آنے تک" پڑھی عام سی کہانی عام سے کردار جو پہلے بھی کئی دفعہ پڑھ چکے ہیں لیکن انہیں خاص بنایا ہے فاخرہ کے شگفتہ اور برجستہ انداز تحریر نے۔ اچھا لگا ناول، لیکن عائشہ چچی کا روما کے والد سے پوچھے بغیر رشتہ طے کرنا کچھ عجیب لگا۔ دوسرا ناول "نگاہ آئینہ ساز" آپ کے یقین کے عین مطابق بہت بہت پسند آیا۔ عائشہ کا کردار بہت پسند آیا جب علی مراد نے عائشہ کو طلاق دی تو بہت دکھ ہوا اختتام کچھ جلدی میں کیا گیا۔ باپ بیٹی کی ایک ملاقات تو ہونی چاہیے تھی۔ نمرہ احمد کا "وہ میرا ہے" پڑھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ آپ مزاح بھی اتنا اچھا لکھ لیتی ہیں۔ ہلکے پھلکے ناولٹ نے ثمرہ بخاری اور فائزہ افتخار کی کمی پوری کی۔ افسانوں میں "بھید" بالکل پسند نہیں آیا۔ آسیہ کی زبان درازی اور شوہر کو سدھارنے کا طریقہ بالکل اچھا نہیں لگے۔

"کاملیت پسند" اک کرب مسلسل، "سمجھوتے کی چادر" اچھے افسانے تھے۔

سمجھوتے کی چادر میں مزنہ کا فیصلہ اچھا لگا۔ اب آتی ہوں اپنے موسٹ فیورٹ "سفال گر" کی طرف آپ نے کمال کردیا ہے۔ بشریٰ جی اتنا زبردست ناولٹ پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے جیسے ہم خود امریکہ میں ہیں میں بہت پہلے سے جانتی تھی کہ عمر اور صوفیہ کی ملاقات ضرور ہوگی حکیم بیگم کا کردار ہمیشہ یاد رہے گا۔ "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" کے دوسرے حصے کا انتظار ہے اسے تب ہی پڑھوں گی جب اس کی تمام اقساط پوری ہوجائیں گی تین چار اقساط والے ناولز میں ایسے ہی پڑھتی ہوں۔ انٹرویوز پہ سرسری نظر ڈالی ایک جیسے سوالات ایک جیسے جوابات، ویری سوری یہ سلسلہ مجھے خاص پسند نہیں ہے۔ عفت سحر طاہر کی رویحہ گل سے ملے ہوئے کتنے ماہ ہوگئے ہیں۔ اور فائزہ جی کا "حصار محبت" کہاں غائب ہیں آپ دونوں؟ اگر میرا خط شائع ہوا تو میری زندگی کا یادگار لمحہ ہوگا۔

ج ۔ رخسانہ بہن! خواتین سے آپ کا محبت بھرا ساتھ اتنا پرانا اور ہمیں خط اتنی دیر سے لکھا؟ آئندہ اتنی دیر نہیں ہونی چاہیے۔ پرچے کی پسندیدگی کے لیے ہم آپ کے تہہ دل سے مشکور ہیں۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے۔

ثمرین شفیع...... شاہدرہ لاہور

یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ آپ کو کبھی خط نہیں لکھا کیونکہ بے شمار خطوط لکھ رکھے ہیں۔ ہاں مگر کبھی پوسٹ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ جانے نصیب میں کیا لکھا ہے۔ مگر جس خوب صورتی سے رفعت ناہید صاحبہ "چراغ آخر شب" میں پاکستان کی تاریخ کو دہرا رہی ہیں یوں لگتا ہے جیسے ہم خود ان مسائل کا سامنا کررہے ہیں اور اسی دکھ سے گزر رہے ہیں جو اس وقت کے بڑے بزرگوں نے سہا تھا۔ یوں تو پورا ڈائجسٹ ہی بہت زبردست ہے۔ مگر "سفال گر" میں تو بشریٰ سعید نے جس انداز میں کہانی اور اس کے کرداروں کو دین سے جوڑ رکھا ہے وہ داد طلب ہے۔ گوکہ نمرہ احمد کا "وہ میرا ہے" ہلکا پھلکا سا ناولٹ اچھا تھا مگر ان کے مزاج سے ذرا ہٹ کے تھا۔ کچھ مصنفین نئی ہیں مگر بے مثال لکھتی ہیں۔ جیسے کہ شازیہ ہمایوں، ہوسکتا ہے یہ نئی لکھاری نہ ہوں مگر میرے لیے ان کا نام نیا نیا سا ہے وجہ ان کا مکمل ناول "نگاہ آئینہ ساز" ہے جو اس ماہ کا بہترین ناول رہا مجھے اس میں بہت سی الجھنوں کی سلجھن حاصل

ہوئی مگر امام صاحب اور ان کے خاندان کی سنگ دلی نے دکھی کردیا مگر یہ بھی تو المیہ ہی ہے کہ ہم قرآن مجید کو بس پڑھتے ہیں سمجھتے نہیں، مجھے خوشی ہے کہ ہر ماہ شمارہ اپنے اندر بہت سی خوب صورتیوں کے ساتھ مذہبی معاملات سے بھی روشناس کروانے کا باعث بنتا ہے اور یہی وجہ مقبولیت بھی ہے۔ کرب مسلسل، سمجھوتے کی چادر، بھید اور کاہلیت پسند سمیت پورا شمارہ لاجواب تھا۔

ج ۔ پیاری ثمرین! کتنا اچھا ہوتا اگر آپ وہ سارے خط ہمیں پوسٹ کردیتیں۔ قارئین کی تعریف و تنقید سے ہی ہمیں اپنے پرچوں کو مزید بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ امید کرتے ہیں کہ اب آپ باقاعدگی سے ہمیں اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیں گی۔ متعلق مصنفین تک آپ کا تبصرہ پہنچایا جارہا ہے۔

بیناشاہ...... ٹوپی، صوابی

تمام قارئین کو سلام اور بقرعید مبارک! پہلی مرتبہ کسی شمارے میں شرکت کررہی ہوں۔ خواتین نے بہت سی رائٹرز کو متعارف کروایا ہے۔ "فرحت اشتیاق، عمیرہ احمد، فائزہ افتخار، بشریٰ سعید اور بہت ساری رائٹرز جو کہ قابل سیلیوٹ ہیں۔ ہم توان سب کو خواتین کے توسط سے ہی جانتے اور پسند کرتے ہیں۔ بشریٰ سعید کے "سفال گر" میں حکیم بیگم اور عمر کا کردار بہت زبردست ہے۔ کیا آج کے خود غرض دور میں حکیم بیگم جیسا دل رکھنے والے لوگ اس دنیا میں ہیں..... فرحت باجی آپ کی صحت یابی کے لیے تو ہم خدا سے دعا گو ہیں کہ آپ جلدی سے ٹھیک ہوجائے (آمین) نگہت عبداللہ کا "میرے خواب لوٹا دو"

بھی ان کے دوسرے ناولز کی طرح بہت زبردست جارہا ہے۔ بہار آنے تک "فاخرہ جبیں" اور شازیہ ہمایوں کے ناول بھی اچھی تحریریں تھیں۔ نمرہ احمد کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ اس دفعہ بھی ناولٹ "وہ میرا ہے" بہت زبردست تھا۔ افسانے اور انٹرویو بھی اچھے تھے۔

ج ۔ پیاری بینا! خواتین کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ امید کرتے ہیں اگلی بار تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کریں گی۔ آپ کی رائے متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جارہی ہے۔

نسرین اور بے نظیر سومرو...... گاؤں علی بحر ضلع ٹھٹھہ

ہم کبھی بھی آپ کو خط نہ لکھتے اگر ہمیں خواتین ڈائجسٹ خریدنے میں ایک مسئلہ نہ درپیش ہوتا۔ بات یہ ہے کہ گاؤں میں رہنے کی وجہ سے باربار شہر نہیں جاسکتے۔ خواتین ڈائجسٹ ٹھٹھہ کے اسٹالز پہ بہت دیر سے آتا ہے کبھی کبھی تو 20 تاریخ بھی گزر جاتی ہے۔ حالانکہ اس کا ٹائٹل پیج ہم شعاع کے شمارے میں دیکھ چکے ہوتے ہیں۔ ہمارا یہ مسئلہ برائے مہربانی حل کرکے دیں۔ ہم آپ کے شماروں کے آٹھ سال سے پکے اور خاموش قاری ہیں۔ ہم سب سلسلے اور کہانیاں پڑھتے ہیں جو بہت بہت اچھے ہوتے ہیں۔ پروردگار آپ کے پرچوں کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین

ج ۔ پیاری نسرین اور بے نظیر! ہماری ایک سال کی ممبر شپ حاصل کرنے کے لیے صرف اتنا کریں کہ ہمیں 600 روپے کا ڈرافٹ یا منی آرڈر خواتین ڈائجسٹ 37 اردو بازار، کراچی۔ کے پتے پہ ارسال کریں۔ پرچا گھر بیٹھے آپ کو مل جائے گا۔

آپ اتنے عرصے سے پرچے پڑھ رہی ہیں تو کبھی ہمیں خط کیوں نہیں لکھا؟ ہمیں خوشی ہوگی اگر آئندہ آپ پرچے پر تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کریں۔

عائشہ رابی...... نامعلوم

خواتین ڈائجسٹ کے لیے یہ میرا پہلا خط ہے۔ اور وجہ بشریٰ سعید ہیں۔ "سفال گر" نے تو مجھے حیران کردیا۔ اتنے طویل ناول میں مصنفہ کی گرفت اول روز سے مضبوط ہے۔ مجھے یاد ہے وہ سردیوں کی ایک سرد رات تھی جب میں نے اس ناول کی پہلی قسط پڑھی تھی اور اس وقت سے ہر ماہ خواتین کا انتظار رہتا ہے۔ فرحت اشتیاق کا بہت نام سنا تھا

اب ان کی تحریر "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" کی صورت انہیں پڑھنے کا موقع بھی مل گیا۔ دوسری قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ ایک ناول بھجوایا تھا وقت وقت کی بات" کے نام سے اس ناول کے بارے میں آپ کی رائے کی طلب گار ہوں۔

ج ۔ پیاری عائشہ! آپ نے اپنے شہر کا نام تو لکھا ہی نہیں اور خط بھی اتنا مختصر، امید کرتے ہیں کہ آئندہ آپ تفصیلی تبصرے کے ساتھ تشریف لائیں گی۔ افسانوں کے لیے آپ 32721666-021 پر فون کرکے معلوم کر

سکتی ہیں۔

فرخ فاطمہ...... حویلی لکھا، ضلع اوکاڑہ

ٹھنڈی میٹھی رُت میں اپنے پیارے خواتین ڈائجسٹ کے مطالعے کا مزا ہی انوکھا ہے اور خصوصاً اس صورت میں کہ ہماری پیاری فاخرہ جبیں بھی رونق افروز ہوں۔ فاخرہ! آپ نے آج سے پانچ سال پرانے خواتین ڈائجسٹ کی یاد دلادی۔ بالکل وہی رنگ، شوخیاں، شرارتیں، قہقہے...... اللہ اللہ، اب مہربانی فرماکر ہمیں دوبارہ اتنا انتظار مت کروائیے گا۔ شازیہ ہمایوں کا مکمل ناول پڑھ کر واقعی ایسا لگا کہ وہ امریکہ سے آئی ہیں۔ بہت اچھا ناول تھا۔ وطن کی قدر، پردیس کی صعوبتیں، سب کچھ ہی تھا۔ خضر ہمیشہ بھٹکے ہوؤں کو روشنی دکھاتا ہے۔ بشریٰ سعید کا "سفال گر" پڑھ کر تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اتنا بھی نوازتا ہے کہ وہ اپنے قلم سے ہزاروں دل جیت سکتا ہے۔ حکیم بیگم تو مجھے کوئی زندہ کردار لگتی ہیں جن کو بشریٰ نے صفحات میں قید کردیا ہے۔ گاؤں کی ایک سادہ سی ان پڑھ عورت اور اللہ پر ایسا یقین؟ اللہ ہم سب کو ایسے ہی توکل کی دولت سے مالا مال کرے۔ (آمین)

نمرہ احمد کی ہلکی پھلکی سی تحریر دل کو چھوگئی۔ ہاں یاد آیا، کبھی کبھی ناولٹ کی فہرست میں "ہم سے ہے زمانہ" بھی شامل ہوتا تھا۔ ثمرہ بخاری! ہم زبردست احتجاج کرتے ہیں۔ نگہت عبداللہ جی! ناول سست جارہا ہے۔ کچھ تیزی لائیں۔ اس دفعہ بھی افسانے بہت اچھے تھے۔ "کاملیت پسند" میں پرانی بات کو نئے انداز سے بیان کیا گیا۔ "اک کرب مسلسل" سب سے اچھا تھا۔ سمیرا حمید کا "بھید" اس چیز کی عکاسی کرتا تھا کہ "عورت واقعی ہی ایک پہیلی ہے

میں نے ایک افسانہ بھیجا تھا۔ پلیز اس کے متعلق بتادیں۔ اگر ناقابل اشاعت ہے تو میری تحریر کی خامیوں کی وضاحت فرمادیں تاکہ میں اپنی اصلاح کرسکوں۔

ج ۔ پیاری فرخ! خواتین کو پسند کرنے کا بہت شکریہ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے۔ افسانے کے بارے میں 32721666-021 پر فون کرکے پوچھا جاسکتا ہے۔

شبانہ نوید...... ملتان

پہلی بار آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ مگر یہ ہرگز نہیں لگ رہا۔ کیونکہ ہر ماہ رسالوں کے ذریعے آپ سے رابطہ رہتا ہے۔ نمرہ احمد کے مصحف کو پڑھ کرپکا ارادہ تھا خط لکھنے کا، مگر ہمیشہ دیر کردیتی ہوں ہر کام کرنے میں۔ یہ ایک بہت اچھی تحریر تھی۔ نمرہ احمد اور فرحت اشتیاق کی تحریر پڑھنے کے بعد یعنی اس کے اختتام پر مجھے کبھی تشنگی محسوس نہیں ہوئی۔ خط لکھنے کی دوسری وجہ بشریٰ سعید کا "سفال گر" ہے۔ بہت خوب صورت جامع تحریر ہے۔ ماشاء اللہ بہت باصلاحیت رائٹر ہیں۔ اس بار شازیہ ہمایوں کا مکمل ناول بہت اچھا لگا۔ بے شک موضوع نیا نہیں تھا۔ مگر شازیہ نے ہم نام نہاد مسلمانوں کے سامنے آئینہ رکھتے ہوئے جن باتوں کی نشاندہی کی ہے، وہ غور طلب ہیں۔ اصل میں ہمارے یہاں کلچر تو سکھایا جاتا ہے مگر دین نہیں۔ چند مذہبی فرائض کی ادائیگی کو ہی مکمل اسلام سمجھ لیا جاتا ہے۔ افسانوں میں "کاملیت پسند" اچھا لگا۔

ج ۔ پیاری شبانہ! ہمیں خوشی ہوگی اگر آئندہ آپ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کریں۔ خواتین کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔

آسیہ قادر...... کوئٹہ کینٹ

خواتین اور شعاع کو پڑھتے کافی عرصہ ہوگیا ہے جب سے پڑھنا شروع کیا ہے یقین جانیے اپنے آپ میں بہت اچھی تبدیلی محسوس کی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو ان کرداروں میں ڈھال لوں جو ہماری رائٹرز اپنے الفاظ میں بیان کرتی ہیں جب سے پڑھنا شروع کیا بہتر سے بہتر پایا لیکن کبھی خط لکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

اس ماہ کا ٹائٹل بہت خوب تھا۔ رفعت ناہید اور نگہت عبداللہ کے ناول اچھے جارہے ہیں۔ مکمل ناول میں شازیہ ہمایوں صاحبہ بازی لے گئیں۔ اتنا اچھا ناول لکھنے پر آپ کو

ڈھیر ساری مبارک باد۔ ایسی تحریریں پڑھ کر ہمارے دلوں میں موجود خواتین کے لیے محبت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ افسانے سارے ہی اچھے تھے، ناولٹ بھی اچھے رہے۔ باقی تمام سلسلے بھی خوب تھے۔ آخر میں ایک درخواست، پلیز آپی! خواتین کی تحریروں کے لیے اسکیچز بنانے والوں کے انٹرویو ضرور شامل کریں۔

ج۔ پیاری آسیہ! آپ کا خط شائع کیا جارہا ہے۔ امید ہے کہ اب آپ باقاعدگی سے ہمیں اپنے تبصرے سے آگاہ

کرتی رہیں گی۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے ہم آپ کے تہہ دل سے مشکور ہیں۔

روشن ہاشم...... شاہ فیصل کالونی، کراچی

اس بار سمپل، خوب صورت سا سرورق بہت پسند آیا۔ کھلی کھلی ماڈل اچھی لگی۔ کہنی سنی سے لے کر بیوٹی بکس کے مشورے تک ایک ہی دن میں سب پڑھ ڈالا۔ ام ثمامہ کا "ڈوب رہی ہے زندگی" پڑھا کاش کہ ہمارے ارباب اختیار بھی ایسا ہی حساس دل رکھتے ہوں تو آج ہمارے اردگرد ہمارے پیارے یوں سسک سسک کرپانی میں دم نہ توڑیں۔ ام ثمامہ نے بہت اچھا لکھا۔ "موسم کے پکوان" میں مغلئی چاول اور ڈبل روٹی کے پکوڑے پسند آئے۔ سعدیہ شیریں کا باورچی خانہ اچھا لگا۔ "روشن حرف وہ سارے" میں سیما ممتاز عباسی کے روشن لمحے جن کی یاد بہت خوب صورتی سے تازہ کی ہے، انہوں نے دل کو چھو لیا۔ آپی میں نے بھی روشن حرف میں سلسلہ بھیجا ہے، چھپنے کے قابل ہے کہ نہیں اور ایک افسانہ "کعبے پر پڑی جب پہلی نظر" بھیجا تھا اس کا کیا ہوا؟ "خاتون کی ڈائری" اور اشعار دونوں ہی اچھے تھے۔

ناولٹ میں "سفال گر" کی قسط شاندار رہی۔ "وہ میرا ہے" میں نمرہ احمد اس بار زیادہ متاثر نہیں کرپائیں۔ ویسے وہ بہت زبردست رائٹر ہیں۔ فاخرہ جبیں کا "بہار آنے تک" پُربہار کہانی تھی پسند آئی۔ اس ماہ کی بیسٹ کہانی "نگاہ آئینہ ساز" تھی۔ شازیہ ہمایوں کو مبارک باد دے دیجیئے گا۔ اس طرح کی کہانیاں پڑھنے سے ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ کہانی، کہانی نہیں لگتی ایسا لگتا ہے کہ معاشرے کو سُدھارنے کا اور ادب کی خدمت کرنے کا اس سے اچھا ذریعہ کوئی نہیں جو ہماری قلم کار کررہی ہیں۔

افسانے سب ہی اچھے تھے "جھوٹے کی چادر" نفیسہ بیگم کا "اک کرب مسلسل" سعدیہ حمید کا "بھید" اور کاملیت پسند کا موضوع بہت اچھا تھا۔ "چراغ آخرِ شب" رفعت ناہید اور "میرے خواب لوٹا دو" نگہت عبداللہ اپنے کرداروں سے انصاف کررہی ہیں۔ فرحت اشتیاق! آپ کو اس ماہ ہم نے بہت مس کیا ہے۔ جلدی سے آجائیں اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کامل عطا فرمائے انٹرویوز اچھے تھے۔ اور غزلیں سب ہی اچھی لگیں۔ آپی! کیا میں اپنی لکھی ہوئی غزلیات بھیج سکتی ہوں۔ انشاء جی کا کالم تو موسٹ فیورٹ ہے۔

ج۔ پیاری روشن! آپ اپنی کہانیاں اور شاعری ہمیں بھجوادیں۔ اسے پڑھ کر ہی بتاسکیں گے کہ وہ قابل اشاعت ہے یا نہیں ایک ماہ بعد 021-32721666 پر فون کر کے معلوم کرلیں۔ خواتین کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔

عمارہ نیازی...... بھکر

ماڈل میں نیل پالش کے سوا کچھ پسند نہ آیا۔ فاخرہ جی کے ناول "بہار آنے تک" میں شیراز حسن کا کردار اچھا تھا۔ صائمہ چودھری کا ذکر خوب بھایا۔ اچھی کاوش تھی بہرحال "میرے خواب لوٹا دو" بہت زبردست جارہا ہے۔ فرحت اشتیاق کو نہ پاکر بہت غصہ آیا مگر ان کی طبیعت کی ناسازی کا پڑھ کر دکھ ہوا۔ اللہ انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے۔

ان کا ناول ہمسفر میں نے اب پڑھا ہے اور پڑھ کر سوچا ہے کہ میں نے یہ پہلے کیوں نہیں پڑھا۔ بہت ہی خوب صورت ہے۔ شازیہ ہمایوں کی تحریر کچھ خاص متاثر نہ کر سکی۔ نمرہ جی کا ناولٹ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ یہ مزاح بھی لکھتی ہیں۔ میرا تو ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔ ویسے اس ناولٹ کا نام کچھ عجیب لگا۔ قصہ مختصر، رسالہ زبردست تھا۔

ایک بار پھر جاوید چودھری کے انٹرویو کی فرمائش کروں گی آپ لوگ صرف اداکار اور اداکاراؤں کو ہی بلاتے ہیں انٹرویوز کے لیے، کیا ہمارے عظیم ادیب و کالم نگار ہمارے ہیروز نہیں ہیں۔ پلیز ان کو ضرور بلائیے گا۔ "آپ کا باورچی خانہ" میں چکن منچورین کی ترکیب ضرور شائع کریں۔

ج۔ عمارہ بہن! خواتین کی پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ کی فرمائش ہم نے نوٹ کرلی ہے۔ امید کرتے ہیں کہ آئندہ آپ پرچے پر تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کریں گی۔

دُنیا کا کوئی بھی انسان جذبات و احساسات سے خالی نہیں۔ نرم و نازک جذبات زندگی کی اساس ہیں۔ جس طرح خوشبو کے بغیر پھول فقط رنگ رہ جاتا ہے، اسی طرح اظہار کے بنا جذبے اکثر بے مول رہ جاتے ہیں۔ اظہار کا پیرایہ چاہے کوئی ہو، اس کا ہونا ہی سرشاری ہے۔ شاعری اظہار کا ایک خوب صورت ذریعہ۔ اکثر طویل گفتگو بھی آپ کے احساس کو اس طرح واضح نہیں کرپاتی جو فقط ایک شعر کہہ دیتا ہے اور آپ بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں۔ "ارے یہ ہی تو میرے دل میں تھا۔"

زندگی کی طویل دُھوپ چھاؤں میں بہت سی یادیں، بہت سی باتیں آپ کی ہم سفر رہی ہوں گی۔ کبھی آنکھ میں آنسو بن کر، کبھی لب پر پھول کھلائے۔ اپنی یادوں میں ہمیں بھی شریک کیجیے، مگر صرف منظوم پیرائے میں۔ یہ کوئی شعر بھی ہو سکتا ہے، نظم بھی اور غزل بھی۔ اس ماہ سے ہم آپ کے لیے ایک نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ "روشن حرف وہ سارے"

سوالات یہ ہیں۔

1 وہ شعر جو اکثر آپ کے لبوں پہ رہتا ہے؟
2 وہ شعر، نظم یا غزل جو آپ کے پسندیدہ شاعر سے تعارف کی بنیاد بنا؟
3 کسی نے آپ کو دیکھ کر بے ساختہ کوئی شعر پڑھا ہو؟
4 وہ غزل جو آپ نے ٹی وی یا ریڈیو پر سنی تو گائیکی کی بنا پر آپ کو اچھی لگی؟
5 کلاسیکی شاعری میں سے آپ کا انتخاب؟

روشن حرف وہ سارے

ماوراء گل

1۔ انسان کو پل کی خبر نہیں، کب زندگی بے وفائی کرجائے...... اک پلک کے جھپکنے میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔

پانی کا بلبلہ ہے انساں کی زندگانی
دم بھر کا یہ سفینہ پل بھر کی یہ کہانی

چھوٹے چاچو وقاص، جن کی میں انتہائی لاڈلی بھتیجی تھی اور جنہیں چھوڑنے کا میں کبھی تصور بھی نہ کرسکتی تھی۔ بہت بے دردی سے ان پر گولیاں چلائی گئی تھیں۔ ان کے چلے جانے کے بعد یہ شعر میری نوک زباں پہ رہنے لگا ہے۔

باتیں کرنا میرا من پسند مشغلہ ہے حالانکہ جو زیادہ بولتا ہے، بے وقوف کہلاتا ہے اور اکثر زیادہ بولنے پر شرمندگی کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے، تب یہ شعر لبوں سے ادا ہو جاتا ہے۔

لب کشائی پہ سزا پائی تو احساس ہوا
انجمن میں تیری خاموش ہمیں رہنا تھا

2۔ سید ضمیر جعفری ایک منفرد سا نام جو حساس موضوع کو مزاح کے لبادے میں پیش کرتے ہیں۔ جیساکہ ان کی نظم "آدمی" مگر ان کی نظم "کھڑاؤنز" ان سے تعارف کی وجہ بنی۔

کھڑا ڈنر

"بوفے" دعوت پہ بلوایا گیا ہوں
پلیٹیں دے کے بہلایا گیا ہوں
کبھی باتوں میں الجھایا گیا ہوں
کہیں کرسی سے ٹکرایا گیا ہوں
کبابوں کی رکابی ڈھونڈنے کو
کئی میلوں میں دوڑایا گیا ہوں
برائے قتل قتلہ ہائے ماہی
چھری کانٹے سے لڑوایا گیا ہوں
مٹر کے واسطے جب کی مٹر گشت
تو آلو گوشت میں پایا گیا ہوں
ضیافت کے بہانے درحقیقت
مشقت کے لیے لایا گیا ہوں

3۔ ہائے کیسا پرلطف سوال کیا ہے! میرے لیے کسی نے بے اختیار شعر پڑھا؟

ویسے میرا حلقہ احباب اتنا "باذوق" واقع ہوا ہے کہ بجائے شعر کے "گانے" کے بول گنگنا دیے جاتے ہیں۔ جیسے عائشہ ظفر نے کہا۔

اک اونچا لمباقد
دوجے سوہنی وی توحد
تیجا روپ تیرا چم چم کروانی (آہم آہم.....!)

ایک بار کالج میں دوسرے گروپ سے بحث طول پکڑ گئی، اچھی خاصی جھڑپ ہو گئی تھی۔ تب اچانک میں نے خود کو بے حد تنہا محسوس کیا۔ میں کسی کے سامنے خود کو ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی مگر شاید آنکھوں میں کوئی نمی سی ٹھہر گئی تھی کہ انتہائی لاابالی اور شریر عائشہ کی نظروں میں آ گئی۔ (جانے کیسے) وہ بے اختیار بولی تھی۔

تندیٔ باد مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

اور پھر یہ بھی کہا.....

"ماورا! یہ نہ سوچو لوگ کیا ہیں، یہ سوچو "آئی ایم دا بیسٹ۔"

"ریئلی عائشہ! تمہارے یہ الفاظ میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئے۔

"آئی ایم پراوڈ آف یو"

4۔ یہ غزل پہلی مرتبہ F.M پہ سیالکوٹ میں سنی تھی، منی بیگم کی آواز میں۔ اس کا بار بار سننے کا دل چاہتا ہے۔

اے میرے ہم نشیں چل کہیں اور چل
اس چمن میں اب اپنا گزارا نہیں

بات ہوتی گلوں تک تو سہہ لیتے ہم
اب تو کانٹوں پہ بھی حق ہمارا نہیں

گلستاں کو خوں کی ضرورت پڑی
سب سے پہلے ہی گردن ہماری کٹی

اب ہم ہی سے کہتے ہیں یہ اہل چمن
یہ چمن ہے ہمارا تمہارا نہیں

کلاسیکی ادب سے میرا انتخاب.....!

نہ گیا کوئی عدم کو دل شاداں لے کر
یاں سے کیا کیا نہ گئے حسرت و ارماں لے کر

باغ وہ دشت جنوں تھا کہ کبھی جس میں
لالہ و گل گئے ثابت نہ گریباں لے کر

پردۂ خاک میں سو، سو رہے جا کر افسوس
پردۂ رخسار پر کیا کیا یہ تاباں لے کر

ابر کی طرح سے کردیویں گے عالم کو نہال
ہم جدھر جاویں گے، یہ دیدۂ گریاں لے کر

پھر گئی سوئے اسیران قفس بادِ صبا
خبر آمد ایامِ بہاراں لے کر

مصحفی گوشہ عزلت کو سمجھ تخت شہی
کیا کرے گا تو عبث ملکِ سلیماں لے کر

☼



آپ کا باورچی خانہ

صبا سحر

عیدین ہو یا شادی بیاہ و سالگرہ کی تقریبات، گھر کی تفصیلی صفائی ایک لازمی امر ہے۔ یوں تو گھر کا ہر حصہ قابل توجہ ہوتا ہے مگر باورچی خانہ خصوصی صفائی کا متقاضی ہوتا ہے اور عیدالاضحیٰ پر تو یہ زیادہ توجہ کا مرکز ہوتا ہے کیونکہ قربانی، روزمرہ کے پکوان اور دعوتوں کے اسپیشل پکوان کے لیے باورچی خانے میں زیادہ وقت گزرتا ہے۔

عیدالاضحیٰ کے موقع پر اگر آپ صفائی کے ساتھ ساتھ چیزوں کو بھی مناسب ترتیب دے لیں تو کھانا پکانے میں سہولت ہو جائے گی اور یوں آپ وقت کی بچت کے ساتھ ساتھ افراتفری کا شکار ہونے سے بھی بچ جائیں گی۔

عید سے قبل آپ یقیناً "اپنا مینو ترتیب دے چکی ہوں گی۔ اسی لحاظ سے آپ مسالاجات تیار کر کے رکھ لیں یعنی اگر عید کے پہلے روز آپ نے شامی کباب، پلاؤ/بریانی، پائے اور کوفتے پکانے کا ارادہ کر رکھا ہے تو ان ڈشز کے مسالے پہلے سے تیار کر کے ایک جگہ پر رکھ لیں تاکہ بوقت ضرورت آپ کو پریشانی نہ ہو، کیونکہ اکثر خواتین ایک ساتھ دو، دو ڈشز تیار کر رہی ہوتی ہیں۔ ایسی صورت میں قبل از وقت مسالوں کی تیاری آپ کی بھرپور سہولت کا باعث بنے گی۔

عید سے قبل فریج کی بھی صفائی کر لیں اور اضافی سامان نکال دیں۔ فریزر کو اچھی طرح صاف کر کے خالی کر دیں اور تھرموسٹیٹ نارمل کر دیں تاکہ برف جمنے کی رفتار کم ہو جائے۔

قربانی کے بعد (اگر آپ کے گھر قربانی نہ ہوئی ہو تو گوشت کی آمد کے بعد) گوشت کو اپنے مینو کے مطابق تقسیم کر لیں۔ دھو کر پیکٹس بنا لیں اور اس پر مارکر سے نام بھی لکھ لیں تاکہ بھرے ہوئے فریزر میں ڈھونڈنے کی دقت نہ اٹھانی پڑے اور نہ ہی ایمرجنسی کی صورت میں پریشانی ہو۔

مختلف ڈشز کے لیے گوشت کی تقسیم کرنا یقیناً" آپ جانتی ہوں گی، پھر بھی آپ کی سہولت کے لیے تھوڑی گائیڈ لائن دے دیتے ہیں۔ پلاؤ کے لیے عموماً"

ہڈیوں والی بوٹیاں رکھیں۔ مقدار کا تعین آپ خود کر لیں۔ بریانی کے لیے ذرا بڑی سائز کی بوٹیاں رکھیں۔ کڑاہی کے لیے نسبتاً" چھوٹی بوٹیاں بنوائیں۔ کچھ ایسی ہڈیاں بھی ہوتی ہیں، جو سالن یا چاول میں ہرگز مناسب نہیں لگتیں، انہیں ضائع کرنے کے بجائے سوپ یا یخنی کے لیے رکھ لیں۔ یوں بھی سردیاں قریب ہیں لہٰذا سرد موسم میں یخنی یقیناً" فائدہ مند رہے گی۔ شامی کباب، کوفتے، قیمہ اور سیخ کباب وغیرہ بنانے کے لیے ایک ساتھ باریک قیمہ کروالیں۔ پھر ڈشز کے مطابق الگ الگ کرلیں۔

عیدالاضحیٰ پر چونکہ ساری ڈشز گوشت کی بنائی جاتی ہیں اور ایک سے زائد بنائی جاتی ہیں، اس لیے خیال رکھیں کہ جو بھی پکائیں، کم مقدار میں پکائیں کیونکہ دوسرے وقت پر یقیناً" گھر والے کچھ اور کھانا پسند کریں گے، اس طرح کھانے کے ضائع ہوجانے کا احتمال ہے۔ لہٰذا کوشش کریں افراد خانہ کے حساب سے کھانا بنایا جائے کیونکہ ضرورت سے زیادہ پکالینا، پھر ضائع کرنا اچھی بات نہیں ہے۔

کھانا پکانے کے بعد کھانا پیش کرنے کا مرحلہ آتا ہے جو کہ بہت اہم ہوتا ہے اور دعوت کی کامیابی کی ضمانت ہوتا ہے مگر بیشتر خواتین اسے نظرانداز کرجاتی ہیں۔ انواع اقسام کے لذیذ پکوان تو بنالیتی ہیں مگر سلیقے سے پیش کرنے کو اہم نہیں جانتیں۔ یہ بے توجہی آپ کے سگھڑاپے اور سلیقہ مندی پر حرف لاسکتی ہے، اس لیے اس مرحلہ کو بھی خوش اسلوبی سے نمٹانے کی کوشش کریں۔ زیادہ محنت کی نہیں بس تھوڑی سی توجہ کی ضرورت ہے۔

کھانا پکانے کے بعد تمام برتن نکال کر دھولیں اور خشک کرکے رکھ لیں تاکہ مہمانوں کے سامنے افراتفری کا مظاہرہ ہونے سے بچ جائے۔ اس کے علاوہ مہمانوں کے سامنے برتن نکالنا غیر مناسب لگنے کے ساتھ مہمانوں کو بھی یہ تاثر دیتا ہے کہ شاید وہ وقت سے کافی پہلے آگئے ہیں۔

دسترخوان پر اضافی برتن رکھیں۔ پانی کا گلاس افراد کی تعداد کے برابر رکھیں۔ سالن یا چاول کی کم از کم دو ڈشز رکھیں اور اگر مہمان کافی زیادہ ہوں تو پھر دو سے بھی زیادہ رکھیں تاکہ انہیں کھانا لینے کے لیے باری کا انتظار نہ کرنا پڑے کیونکہ اس طرح مہمانوں کو شرمندگی ہوتی ہے۔

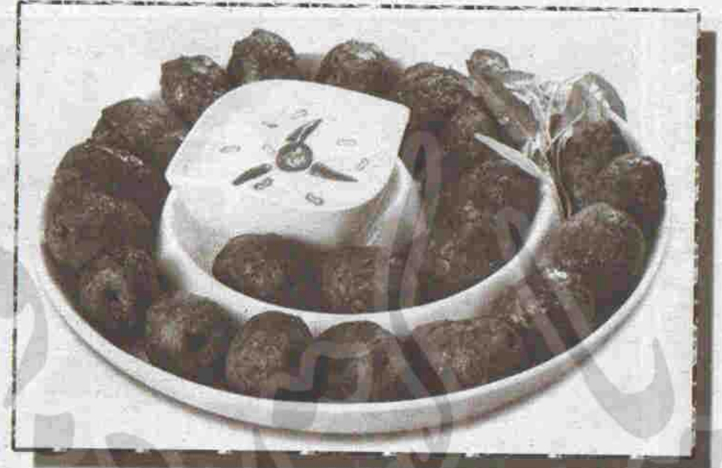
سوئٹ ڈش کھانے کے بعد لائیں کیونکہ یہ بھی ایک اہم سیگمنٹ ہے۔ کھانے کے بعد تمام برتن اٹھالیں اور دسترخوان صاف کرکے پھر سوئٹ ڈش (اور اس کے برتن) رکھیں۔ عموماً" لوگ فروٹ بھی رکھتے ہیں۔ یہ بھی اچھا لگتا ہے۔ فروٹ باسکٹ کے علاوہ ایک چھری، کانٹے (اگر فروٹ کاٹ کر رکھا جائے تو) اور ایک اضافی پلیٹ ضرور ساتھ رکھیں۔

کھانا اگر فرشی نشست پر چُنا گیا ہے تو خیال رکھیے، دسترخوان صاف ستھرا اور خوش رنگ ہو اور روٹی کا کپڑا بھی صاف ہو۔ اگر ڈائننگ ٹیبل پر اہتمام کیا گیا ہے تو ٹیبل میٹس کی صفائی پر ضرور توجہ دیں۔ اگر ٹیبل پر گنجائش ہو تو چھوٹا سا گلدان بھی رکھا جاسکتا ہے۔ اس سے ماحول میں خوشی اور خوب صورتی کا تاثر ابھرتا ہے۔ اگر آپ نے اپنے مہمانوں کو ڈنر پر مدعو کیا ہے تو کھانے اور میٹھے سے فارغ ہونے کے بعد چائے یا کافی کا بھی ضرور خیال رکھیں۔

اگر آپ نے ان تمام باتوں کا خیال رکھا ہے تو یقین کرلیں کہ آپ کے مہمان آپ کے فین ہوگئے ہیں۔ چلتے چلتے ایک بات یاد رکھیں۔

عیدالاضحیٰ کے مقدس اور خوشیوں سے بھرے ایّام میں جب آپ قربانی کے گوشت سے لطف اندوز ہو رہے ہوں تو اپنے آس پاس بھی نظر دوڑائیے گا، مبادا کوئی ان خوشیوں سے محروم تو نہیں رہ گیا۔





عیدالاضحیٰ کے پکوان

خالدہ جیلانی

بہاری بریانی

اجزا :

گوشت	1کلو
چاول	1کلو
بیسن	2کھانے کے چمچے
پسا گرم مسالا	1کھانے کا چمچہ
ثابت گرم مسالا	1کھانے کا چمچہ
پسی سرخ مرچ	2کھانے کے چمچے
لہسن ادرک پیسٹ	2کھانے کے چمچے
کچری پاؤڈر	2کھانے کے چمچے
لیموں	1عدد
دہی	آدھا کپ
ٹماٹر	2عدد
پیاز	1عدد
ہری مرچ	4عدد
دھنیا پودینہ	آدھی گٹھی
نمک	حسب ذائقہ
تیل	1کپ

ترکیب :

گوشت کی چھوٹی چھوٹی (تقریباً" ایک انچ کی) بوٹیاں کرلیں۔ دہی کو اچھی طرح پھینٹ کر اس میں بیسن 'لہسن ادرک پیسٹ 'کچری پاؤڈر 'سرخ مرچ 'پسا گرم مسالا اور نمک ملا کر ایک مرتبہ اور اچھی طرح پھینٹ لیں پھر گوشت میں ملا کر تقریباً" چھ گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔

دیگچی میں تیل گرم کرکے مسالا لگے گوشت کو ڈال دیں۔ ساتھ ہی ایک کپ پانی شامل کرکے پکنے کے لیے ہلکی آنچ پر چھوڑ دیں۔ جب گوشت گل جائے تو بھون لیں۔ سالن تیار ہے۔

ایک الگ دیگچی میں چاول کو ثابت گرم مسالا 'نمک اور ایک چمچہ تیل ڈال کر ابال لیں۔ ایک کنی رہ جائے تو نتھار لیں۔ اب ایک بڑی دیگچی میں ایک چمچہ تیل لگائیں۔ دیگچی میں سب سے پہلے ایک تہہ چاولوں کی لگائیں 'پھر سالن کی اس کے اوپر سلائس میں کٹے ہوئے لیموں 'چوکور کٹے ہوئے ٹماٹر 'کتری ہوئی ادرک 'لچھے دار کٹی ہوئی پیاز 'کترا ہوا دھنیا پودینہ اور مرچ کی ایک تہہ بچھا دیں۔ آخر میں بچے ہوئے چاول کی آخری تہہ لگا دیں۔ چاول کے اوپر ایک چھوٹا روٹی کا ٹکڑا رکھ کر اس کے اوپر ایک دہکتا ہوا کوئلہ رکھ دیں۔ کوئلے پر تھوڑا سا گھی بھی ڈال دیں تاکہ دھواں نکلے 'پھر فوراً" ڈھکن بند کرکے دم پر لگا دیں۔ پہلے تیز آنچ کردیں پھر دس منٹ کے لیے ہلکی آنچ پر دم دیں۔

عیدالاضحیٰ پر بہترین ڈش حاضر ہیں۔

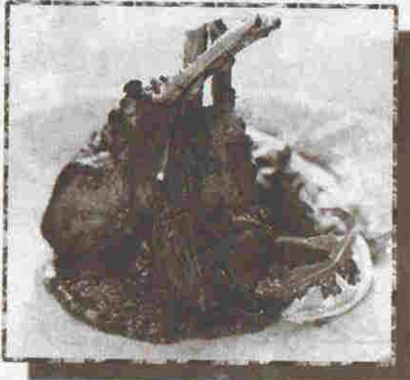
پسندے کڑاہی

اجزا :

گوشت	1کلو
ادرک لہسن پیسٹ	2کھانے کے چمچے
ٹماٹر	ڈیڑھ پاؤ
لیموں کا رس	2کھانے کے چمچے
سرخ کٹی مرچ	2کھانے کے چمچے
ثابت دھنیا	1کھانے کا چمچہ
ہری مرچ	4عدد
ادرک	1چھوٹا ٹکڑا
نمک	حسب ذائقہ
تیل	1کپ

ترکیب :

گوشت کے پسندے بنوالیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کرکے لہسن ادرک پیسٹ اور پسندے ڈال کر فرائی کریں۔ لیموں کا رس 'نمک 'سرخ کٹی مرچ 'ثابت دھنیا (کوٹ کر) اور ٹماٹر (باریک کاٹ کر) ڈال کر مکس کریں۔ ٹماٹر گل جائے تو بھون لیں اور تھوڑا سا پانی ڈال کر گلنے کے لیے ہلکی آنچ پر چھوڑ دیں۔ پسندے گل جائیں تو پھر بھونیں 'تیل اوپر آجائے تو ہری مرچ اور ادرک باریک کاٹ کر ڈال دیں۔ گرم گرم نان کے ساتھ پیش کریں۔



لکھنوی گلاوٹ کباب

اجزا :

قیمہ	1کلو
کچری پاؤڈر	2چائے کے چمچے
پسی ادرک	1کھانے کا چمچہ
پسی سرخ مرچ	حسب ذائقہ
سفید زیرہ	2چائے کے چمچے
پسا ہوا کھوپرا	4چائے کے چمچے
پسا گرم مسالا	1چائے کا چمچہ
خشخاش	2چائے کے چمچے
جائفل	1چٹکی
جاوتری	1چائے کا چمچہ
دار چینی	2انچ کا ٹکڑا
بیسن	4کھانے کے چمچے
پیاز	1عدد
دہی	4کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ

تیل — تلنے کے لیے

ترکیب :

سفید زیرہ، کھوپرا اور خشخاش بھون کر باریک پیس لیں۔ جائفل، جاوتری اور دار چینی بھی پیس کر گرم مسالا اور نمک کے ساتھ قیمہ میں ملا دیں۔ کچری پاؤڈر اور ادرک کا پیسٹ بھی شامل کر دیں۔ اچھی طرح مکس کر کے دو گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔

دہی میں بیسن اور پیاز (بیسن بھون کر اور پیاز سنہری کر کے پیس کر) ملا دیں اور اسے بھی آدھے گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔ پھر قیمے میں دہی کا آمیزہ ملا کر گول یا کسی بھی شکل کے کباب بنالیں اور ہلکی آنچ پر تل لیں۔

مزیدار لکھنوی گلاوٹ کباب تیار ہیں۔

جہانگیری تکے

اجزا :

- قیمہ — 1کلو
- پیاز — 4عدد
- لہسن ادرک پیسٹ — 2کھانے کے چمچے
- ثابت دھنیا — 1کھانے کا چمچہ
- کچری پاؤڈر — 1کھانے کا چمچہ
- سرخ پسی مرچ — 2کھانے کے چمچے
- نمک — حسب ذائقہ
- تیل — 4کھانے کے چمچے

ترکیب :

تمام مسالا جات سل پر باریک پیس لیں اور ایک بڑے برتن میں قیمے کے ساتھ خوب اچھی طرح مکس کر کے درمیان میں ایک دہکتا ہوا کوئلہ رکھ دیں۔ کوئلے پر ایک چائے کا چمچہ گھی یا تیل ڈال دیں تاکہ اس میں سے دھواں نکلے۔ ڈھکن بند کر کے دس منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔

اب ایک الگ دیگچی میں تیل گرم کریں اور پیاز سرخ کر لیں۔ کوئلہ نکال کر قیمہ پیاز والی دیگچی میں ڈال دیں اور تھوڑی دیر تک خوب بھونیں۔ دیگچی چولہے سے اتار لیں اور قیمہ ٹھنڈا ہونے دیں۔ جب قیمہ ٹھنڈا ہو جائے تو اسے سیخوں پر چڑھا کر کوئلوں سے دہکتی ہوئی آگ پر سینکیں۔

سرخ ہونے پر ایک بڑی پلیٹ میں نکال لیں اور گول گول کٹی ہوئی پیاز اور چٹنی کے ساتھ خود بھی کھائیں اور گھر والوں کو بھی کھلائیں۔

توا مٹن چانپ

اجزا :

- چانپ — 1کلو
- ٹماٹر — 1پاؤ
- لہسن ادرک پیسٹ — 2کھانے کے چمچے
- پسی سرخ مرچ — حسب ذائقہ
- نمک — حسب ذائقہ
- دہی — آدھا پاؤ
- تیل — 1کپ

ترکیب :

چانپوں کو توے پر ڈال کر ابال لیں۔ اس دوران دو مرتبہ پانی تبدیل کریں۔ خیال رکھیں کہ آنچ ہلکی ہو اور چانپیں بالکل ہی نہ گل جائیں کیونکہ انہیں بھوننے کا مرحلہ ابھی باقی ہے۔ چانپیں گل جائیں تو اس میں ٹماٹر، لہسن ادرک پیسٹ، نمک اور مرچ ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ اب ایک دیگچی میں تیل گرم کریں اور مسالے میں بھگوئی ہوئی چانپوں کو تلنا شروع کریں۔ دہی ڈال کر تھوڑی دیر تک بھونیں۔ جب چانپیں تیل چھوڑ دیں تو سمجھ لیں کہ توا مٹن چانپ تیار ہے۔ ایک بڑی پلیٹ میں ہرا دھنیا، کٹی ہوئی ادرک اور لیموں کے ساتھ سجا کر پیش کریں۔

دم کلیجی

اجزا :

- بکرے کی کلیجی — 1عدد
- ہری مرچ — 6عدد

- ثابت لہسن — 6جوے
- لیموں — 2عدد
- ادرک — چھوٹا ٹکڑا
- پسا گرم مسالا — آدھا چائے کا چمچہ
- نمک — حسب ذائقہ
- تیل — 1کپ

ترکیب :

کلیجی کو کیوبز میں کاٹ لیں۔ تھوڑے سے تیل میں ہری مرچ اور ثابت لہسن فرائی کر کے باریک پیس لیں۔ کلیجی میں گرم مسالا، فرائی مسالا (لہسن اور مرچ والا) اور نمک ملا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں، پھر پانی ڈال کر پکا لیں۔ گل جائے تو تیل ڈال کر بھون لیں۔ کوئلہ دہکا کر دیگچی میں رکھ دیں۔

پیش کرتے وقت ادرک اور لیموں باریک کاٹ کر سجا دیں۔

مغز مسالا

اجزا :

- بکرے کا مغز — 4عدد
- لہسن ادرک پیسٹ — 1چائے کا چمچہ
- پیاز — 2عدد
- ہرا دھنیا — آدھی گٹھی
- ہری مرچ — 4عدد
- لیموں — 2عدد
- پسی سرخ مرچ — ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
- پسا گرم مسالا — 1چائے کا چمچہ
- دہی — آدھا کپ
- نمک — حسب ذائقہ
- تیل — 1کپ

ترکیب :

مغز کو خوب اچھی طرح صاف کر کے دھو لیں اور ابال کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ لیں۔ دیگچی میں تیل گرم کر کے پیاز سرخ کر لیں۔ آدھی نکال کر الگ رکھ لیں۔ باقی آدھی پیاز میں لہسن ادرک پیسٹ، گرم مسالا، نمک اور دہی ڈال کر بھونیں۔ مسالے میں تیل اوپر آجائے تو مغز ڈال کر دیگچی ہلائیں (چمچہ ہرگز نہ چلائیں) جب مسالا تیل چھوڑ دے تو ہرا دھنیا، ہری مرچ، لیموں کا رس اور بقیہ سرخ پیاز ڈال کر گرم گرم پیش کریں۔

جیلی شاہی ٹکڑے

اجزا :

- بڑی ڈبل روٹی — 1عدد
- جیلی — 1پیکٹ
- بادام پستے — 2کھانے کے چمچے
- گاڑھا دودھ — آدھا کپ
- کریم — آدھا کپ
- چینی — 4کھانے کے چمچے
- گھی — تلنے کے لیے

ترکیب :

ڈبل روٹی کے سلائس کاٹ کر گھی میں تل لیں اور الگ پلیٹ میں رکھ لیں۔ جیلی کو 2کپ پانی ڈال کر پکا لیں اور کسی پیالے میں جما کر سلائس کی طرح کاٹ لیں۔ کنڈینسڈ ملک (با آسانی دکانوں پر دستیاب ہے) سلائس پر لگائیں پھر جیلی رکھیں۔ دوسرا کنڈینسڈ ملک لگا سلائس اس کے اوپر رکھیں۔ پھر کریم لگائیں اور اس کے اوپر بادام پستے چھڑک دیں۔

نمکین عید پر ایک میٹھی ڈش بھی ضروری ہے۔



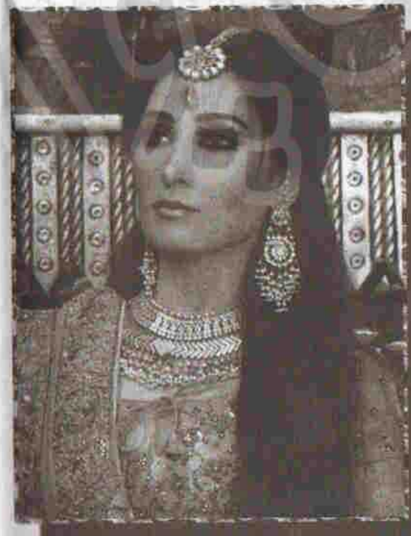
خبریں وغیرہ

تبصیر نشاط

پاگل

معروف ڈرامہ نگار سیما غزل نے ڈرامہ نگاری کا آغاز 1998ء میں کیا۔ انہوں نے اب تک تقریباً" پانچ سو سیریلز لکھی ہیں، جن میں سے تین سو سے زائد سیریلز آن ایئر ہو چکی ہیں۔ (باقی دو سو اس قابل نہیں کیا) اس کے علاوہ سیما غزل نے طویل دورانیے پر مبنی لاتعداد ڈرامے، چھ ناول اور تقریباً" پانچ ہزار افسانے بھی تحریر کیے ہیں۔ (اللہ دین کے چراغ کا جن شاید اتنا پڑھا لکھا نہیں، اس لیے اتنا سب کچھ سیما غزل کو خود ہی تحریر کرنا پڑا۔) اس قدر زیادہ لکھنے کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ۔

"میں تقریباً" چوبیس گھنٹے ہی لکھتی ہوں۔ دن رات لکھتی ہی رہتی ہوں، مگر اس کے باوجود نہ تو صحت





پر کوئی برے اثرات مرتب ہوئے ہیں اور نہ ہی الحمدللہ میں پاگل ہوئی ہوں۔"

(جی ہاں! مگر ناظرین تو ہو گئے ہیں نا۔ ہمارا مطلب ہے کہ آپ کے ڈراموں کے پیچھے۔)

اگلے سال....

شادی کو "بور کا لڈو" قرار دیا جاتا ہے، جو کھائے، سو پچھتائے، جو نہ کھائے، وہ بھی پچھتائے۔ معروف اداکارہ ریما نے اس لڈو کا ذائقہ چکھنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے۔ (بالآخر) کچھ عرصہ قبل اپنی فلم کی تیاری کے دوران جب ریما سے اس بارے میں پوچھا گیا تھا تو اس وقت انہوں نے کہا تھا کہ ابھی وہ "تو میں گم" ہیں۔ وقت آنے پر وہ خود ہی بتا دیں گی۔ گویا اب وہ وقت قریب آگیا ہے کہ ریما "زیور" پہن کر "نکاح" کر کے "دولہا

لے کر جاؤں گی" کا نعرہ لگانے والی ہیں۔ (کوئی دولہا کی مرضی بھی تو معلوم کرلے۔)

ریما نے اپنے "دولہا" کا انتخاب کرنے کے لیے کسی چینل کا سہارا نہیں لیا، بلکہ ایک مکمل مشرقی لڑکی کی طرح گھر والوں کی پسند پر سر جھکا دیا۔ ریما نے ابھی اپنے ہونے والے شوہر کا نام اور دیگر حدود اربعہ ظاہر نہیں کیا۔ شادی اگلے برس ہونا متوقع ہے۔

جہاں اس خبر سے کئی خواتین پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہوئی ہوگی تو وہیں کئی دل بجلیوں کی زد میں بھی آئے ہوں گے۔

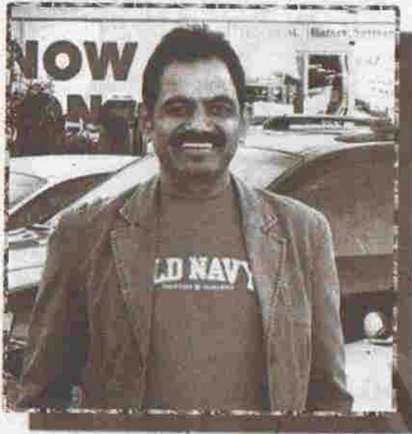
(ریما جی! شادی کے لیے "اگلے سال" کا وقت آپ پہلے بھی دیتی آئی ہیں۔ کوشش کیجیے گا کہ اس مرتبہ یہ کام ہو ہی جائے، ورنہ ایسا نہ ہو کہ سب آپ کو دیکھتے ہی گانا شروع ہو جائیں۔

"اگلے سال، اگلے سال، اگلے سال....")

شوق

انسان اپنے دل میں ہزاروں شوق پالتا ہے۔ شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر انسان کیا کچھ کر گزرتا ہے، جب ہی تو کہتے ہیں کہ "شوق دا کوئی مول نئیں۔" کبھی کوئی شوق انسان کو اونچی فضاؤں کا ساتھی بنا دیتا ہے تو کبھی کسی شوق کے باعث رسوائی بھی دامن گیر ہو جاتی ہے۔

معروف گلوکار عامر سلیم کو لڑکپن میں فلمیں دیکھنے کا شوق تھا، چنانچہ اپنا شوق پورا کرنے وہ اکثر سینما کا رخ کرنے لگے۔ جب ان کا یہ شوق جنون کی حدوں کو چھونے لگا تو گھر والوں نے سینما جانے پر پابندی لگادی، مگر جناب! وہ شوقین ہی کیا جو باز آجائے۔ عامر سلیم نے اپنی عقل کے گھوڑے دوڑائے اور — اس مسئلے کے معقول حل تک پہنچ کر ہی دم لیا۔ (اور یہ گھوڑے کس سے ادھار لیے تھے؟) عامر نے سینما جانا ترک نہیں کیا۔ وہ فلم کے درمیانی وقفے (انٹرول) میں



تھوڑی دیر کے لیے گھر والوں کو اپنی شکل دکھا آتے (اور اپنی حرکتیں؟) اور پھر کوئی بہانہ کر کے گھر سے نکل جاتے۔ سینما پہنچ کر بقیہ فلم دیکھ لیتے۔ انٹرول بہت مختصر ہوتا ہے، لہٰذا وہ اس دوران گھر آنے جانے کے لیے رکشا استعمال کرتے تھے۔

ایک دن عامر سلیم کے پاس زیادہ پیسے نہیں تھے۔ ان کا ایک دوست بھی ساتھ تھا۔ دونوں نے طے کیا کہ گھر کے قریب پہنچ کر رکشا سے چھلانگ لگادیں گے اور گلیوں میں رفو چکر ہو جائیں گے۔ یہ فیصلہ کر کے دونوں رکشا میں بیٹھ گئے۔ گھر ابھی تھوڑے فاصلے پر ہی تھا کہ عامر سلیم نے اپنی نظریں رکشا ڈرائیور پر جما دیں اور دوست کی طرف جھک کر اسے سرگوشیوں میں چھلانگ لگانے کے لیے تیار رہنے کو کہا، مگر دوست کی طرف سے کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا۔ انہوں نے فوراً" اس کی طرف دیکھا تو ان کی سٹی گم ہو گئی۔ ان کا دوست پہلے ہی چھلانگ لگا چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ بھی رکشا سے کود جاتے" ڈرائیور نے فوراً" رکشا روک کر انہیں گردن سے دبوچ لیا اور پھر خاصی "عزت افزائی" کی۔ (اور بنیں ہوشیار!)

عامر سلیم نے گھر سے پیسے دلوا کر اس سے گلو



خلاصی کرائی۔ عامر سلیم کا کہنا ہے کہ انہیں کافی عرصے تک اپنی "عزت افزائی" سے زیادہ اس بات کا افسوس رہا کہ ان کی وہ فلم ادھوری رہ گئی۔

(عامر جی! لگتا ہے آپ کا بچپنا ابھی تک گیا نہیں؟ کل ایک رکشے والا آپ کا پتا پوچھ رہا تھا۔)

بیاہ سے توبہ

انسان بھی قدرت کی کیا عظیم تخلیق ہے۔ جتنے مختلف مزاج اور رنگا رنگ طبیعتیں انسانوں میں پائی جاتی ہیں' وہ دنیا کی کسی اور مخلوق میں نہیں ہیں۔ کوئی انسان کہتا ہے کہ سیلاب تو گزر گیا' اب بند باندھنے سے فائدہ؟ یا سانپ تو گزر گیا' اب لکیر پیٹنے سے کیا حاصل؟

تو کسی کے خیال میں ایک سیلاب گزر جانے کے بعد بھی بند باندھ لینا' مستقبل قریب یا بعید میں آنے والے سیلاب کی تباہ کاریوں سے بچاتا ہے' اور سانپ گزر جانے کے بعد لکیر بھی ضرور پیٹو بلکہ اس زور و شور سے پیٹو کہ دوسرے یہ دیکھ کر کچھ عبرت ہی حاصل کرلیں۔ شاید اسی لیے سید نور نے اپنے ایک حالیہ انٹرویو میں مشورہ عام دیا ہے کہ "شادی تو بس ایک ہی کرنی چاہیے' اس طرح زندگی اطمینان سے گزرتی ہے۔"

(شادیوں کے ریکارڈ کے پیچھے سرگرداں نور صاحب کے اس مشورے کے پس منظر میں شاید کوئی تلخ تجربہ بول رہا ہے۔ اب صائمہ جی کو ہوشیار رہنا چاہیے کیونکہ کوئی اب ان سے یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ۔

"کی تیرے ملن کے بعد اس نے بیاہ سے توبہ")

خراج تحسین

کینیڈا کی پاپ گلوکارہ کرسٹی ینگ نے معروف پاکستانی گلوکار عالمگیر کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ان کے ایک معروف گیت "کہہ دینا" کو ری مکس کیا ہے (تو گورے ہمیں مان ہی گئے)۔ گزشتہ دنوں انٹرنیٹ پر اس گانے کی ویڈیو جاری ہوئی ہے۔ اس ویڈیو میں عالمگیر بھی نغمہ سرا ہیں اور کرسٹی ینگ سے زیادہ ینگ اور تروتازہ دکھائی دے رہے ہیں۔ بیماری کے بعد یہ عالمگیر کی پہلی ویڈیو ہے۔ اس ویڈیو کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے عالمگیر نے کہا کہ۔

"اس ویڈیو کا بہت اچھا رسپانس ملا ہے۔ محض ایک ہفتے کے دوران اسے پسند کرنے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی ہے۔ دنیا بھر سے میرے پاس تعریفی فون آرہے ہیں۔ گلوکار فاخر اور ہارون نے بھی مجھے فون



کرکے مبارک باد دی ہے۔ (دل سے دی ہے نا؟) دنیا کے کئی چینلز اس ویڈیو کے حقوق حاصل کرنے کے لیے مجھ سے رابطہ کررہے ہیں۔"

(انہیں بتادیا تھا کہ یہ حقوق پیسے دے کر ملیں گے؟)

مومی مجسمہ

معروف فنکار معین اختر کو ہم سے بچھڑے چھ ماہ ہوچکے ہیں' مگر ہمارے دلوں میں ابھی تک ان کا غم روز اوّل کی طرح تازہ ہے۔ معین اختر ان چند گنے چنے فنکاروں میں سے ایک ہیں جن کے فن کے سورج نے دنیا کے کئی گوشوں کو منور کیا ہے۔ عالمی سطح پر ان کی بے مثال فنی خدمات کے اعتراف کے طور پر ان کا مومی مجسمہ لندن کے مشہور زمانہ "مادام تساؤ میوزیم" میں رکھا جارہا ہے۔ معین اختر پہلے پاکستانی فنکار ہیں جن کا مجسمہ اس میوزیم میں رکھا جائے گا۔

(کاش! یہ کام معین اختر کی زندگی ہی میں انجام پا جاتا'



لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ کسی کی موت کے بعد اسے چاہنے کی روایت صرف ہمارے ہاں ہی نہیں' بدقسمتی سے تمام اقوام عالم میں زندہ ہے۔)



عدنان

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

آ۔ فیصل آباد

آپ نے اگر شادی سے انکار کیا تو ضروری نہیں گھر والے آپ کی بات مان لیں، آپ نے خود لکھا ہے کہ آپ جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہتی ہیں۔ انکار کریں گی تو بہت بڑا فساد کھڑا ہو جائے گا۔

بہتر یہی ہے کہ آپ اللہ پر بھروسا کریں اور والدین کی مرضی پر سر جھکا دیں۔ ہو سکتا ہے کہ جب آپ اس کی بھابھی بن جائیں تو وہ اپنے بھائی کے ڈر سے آپ کو تنگ نہ کرے۔ اس کو آپ سے بھی خطرہ ہو سکتا ہے کہ کہیں آپ اس کی ساری باتیں اس کے بھائی کو نہ بتا دیں۔

اپنا سیل نمبر تبدیل کرلیں اور نمبر کسی کو نہ دیں۔ پرانا نمبر بند کر دیں۔

ایک بہن..... گوجرانوالہ

اچھی بہن! زندگی ہمیشہ یکساں حالت میں نہیں گزرتی۔ غریبی، دکھ، بیماری، عروج و زوال زندگی کا حصہ ہیں۔ جو کچھ آپ کے ساتھ ہوا، وہ انوکھا نہیں ہے بہت لوگ اس سے گزرتے ہیں اور اپنوں کے ہاتھوں انسان زیادہ دکھ اٹھاتا ہے۔ ایک بات یاد رکھیے کہ وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ اگر آج برا وقت ہے تو کل اچھا وقت ضرور آئے گا۔ لیکن کامیابی صرف ان کا مقدر ہوتی ہے جو برے وقت میں صبر و تحمل سے کام لیتے ہیں اور محنت کو اپنا شعار بناتے ہیں۔ آپ پڑھائی میں دل لگائیں۔ ذہنی یکسوئی کے لیے قرآن کریم کی باقاعدگی سے تلاوت کریں اور نماز کی پابندی کریں اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ خود کو مصروف رکھیں۔

طلعت

طلعت بہن! آپ کا طویل خط ملا۔ آپ کا اپ سیٹ ہونا قدرتی امر ہے لیکن لڑکے اور لڑکی کی دوستی مناسب نہیں۔ کیونکہ اس کے نتائج اچھے نہیں نکلتے۔ آپ کی یہ خوش قسمتی ہے کہ کوئی برا نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی دوستی کا اختتام ہو گیا۔ ویسے یہ دوستی تھی بھی نہیں اور اگر تھی تو یک طرفہ تھی۔ میں تو اسے بچپنے اور نادانی کا نام دوں گا۔ نادانی بعض اوقات بہت نقصان دہ، جی کا زیاں ثابت ہوتی ہے اور میرے نزدیک تو وہ ایک بھلا آدمی ہی ہے جس نے آپ کی نادانی سے فائدہ اٹھانے کے بجائے بار بار آپ کو آگاہ کیا، خبردار کیا کہ خط و کتابت نہ کریں اور ملنے سے بھی گریز کیا۔

میرا مشورہ یہ ہے کہ اس قصے کو بھول جائیں اور آئندہ کوئی خط نہ لکھیں۔ نماز پابندی سے شروع کریں۔ اگر چاہیں تو اپنی کیفیت سے آگاہ کرتی رہیں۔

ف۔ف۔ راولپنڈی

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں ہر وقت پریشان رہتی ہوں میری عمر تقریباً" اکیس سال ہے میری منگنی میرے خالہ زاد سے ہو چکی ہے۔ یہ رشتہ ہم دونوں کی خوشی اور والدین کی رضا سے ہوا ہے۔ ہماری منگنی کو تقریباً" دو سال ہو گئے ہیں۔ میرے کزن بظاہر تو اس منگنی سے خوش ہیں لیکن کچھ عرصے سے وہ اپنی بہن کی نند میں دلچسپی لے رہے ہیں جو میرے لیے بہت تکلیف دہ ہے۔ میں جب بھی ان دونوں کو ہنستا بولتا دیکھتی ہوں مجھے نہ جانے کیا ہو جاتا ہے۔ پلیز میرے مسئلے کا حل بتا دیجیے ورنہ شاید میں پاگل ہو جاؤں گی۔

میں گھر میں سب سے بڑی ہوں۔ پرائیویٹ انٹر کر رہی ہوں اور ٹیچنگ بھی کرتی ہوں۔ چونکہ میں سب سے بڑی ہوں اس لیے والدین کو بھی مجھ سے بہت سی توقعات ہیں اور میں بھی نہیں چاہتی کہ میرے کسی فعل سے انہیں دکھ پہنچے۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ اس معاملے میں شاید بول پڑوں۔

ج ۔ بہن ف۔ف! بعض اوقات ہم جو کچھ سنتے ہیں، دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں۔ حقیقت وہ نہیں ہوتی۔ کسی سے ہنستا بولنا اور بات ہے اور منگنی شادی دوسری بات ہے۔ وہ آپ کے خالہ زاد ہیں ان کی رضامندی سے ہی منگنی ہوئی ہے۔ بہن کی نند سے بات چیت اور بے تکلفی کو آپ غلط رنگ نہ دیں۔ اپنا ذہن صاف رکھیں۔ کبھی کبھی بدگمانی اور جلد بازی میں کیے گئے فیصلے عمر بھر کا روگ اور پچھتاوے بن جاتے ہیں۔

ش۔ کراچی

ایک بہن ش نے خط لکھا ہے۔ والدین کے جھگڑوں کی وجہ سے گھر کا ماحول خراب رہا اور یہ والدین کی محبت سے محروم رہیں۔

یہ لکھتی ہیں۔ ایف اے کے بعد میں نے ایک پرائیویٹ اسکول میں نوکری کرلی۔ عجیب سا ڈر و خوف ذہن پر سوار رہتا تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ کوشش کی اپنے آپ کو سنوارنے کی۔ بہت محنت کی، آخر کار خدا کے فضل سے وہ عزت ملی جس کی مجھے خواہش تھی۔ پورے اسکول میں منفرد شخصیت کے خطاب سے نوازا جانے لگا۔ اپنے اخلاق کو مزید بہتر بنایا، میں بہت خوش تھی۔ ایک دن میں آفس میں بیٹھی ہوئی سوچنے لگی کہ اگر مجھے کوئی تکلیف ہو جائے یا تھوڑی سی کوتاہی ہو جائے تو کیا یہ ساری خوشیاں مجھ سے چھن جائیں گی؟ یہ سوچ ایک لمحے کے لیے آئی اور میں بہت پریشان ہو گئی میں نے اپنے آپ کو اندر ہی اندر ختم ہوتا محسوس کیا۔ پرنسپل صاحب کبھی تعریف کر دیتے ہیں تو میں بہت پریشان ہو جاتی ہوں۔

عدنان بھائی! اب میرا وہ مقام اور عزت نہیں رہی۔ دل و دماغ ساتھ نہیں دیتے، لگتا ہے میں پاگل ہو جاؤں گی۔ ہر طرف سے مجھے اپنی غلطی دکھائی دیتی ہے، خوشیوں سے میرا اعتبار اٹھ چکا ہے، خدا کے لیے میری رہنمائی کیجیے مجھے حوصلہ دیجیے۔

ش۔ بہن! آپ بہت اچھی لڑکی ہیں۔ ناموافق ماحول کے باوجود جس طرح آپ نے تعلیم حاصل کی اور اپنی صلاحیتوں کو منوایا وہ قابل تعریف ہے۔ اپنے ذہن سے ہر طرح کے خدشات کو نکال دیں۔ دوسروں پر اپنی محبت ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ دوسروں کے لیے محبت کے جذبات رکھتی ہیں تو یقین کریں کہ آپ کے زبان سے کہے بغیر یہ جذبات ان تک پہنچ جائیں گے۔ آپ پرائیویٹ طور پر بی اے کی تیاری کریں۔ فارغ اوقات میں مطالعہ کریں۔ اور محنت اور دیانت داری سے اپنے فرائض ادا کریں، سب آپ سے خوش رہیں گے۔

ص۔م

آپ اس کی محبت میں حد سے گزرنے کے بعد مجھ سے پوچھ رہی ہیں کہ میں کیا کروں؟ وہ ڈاکٹر شادی شدہ اور چار بچوں کا باپ ہے۔ وہ آپ سے شادی کیوں کرے گا؟ اگر بالفرض محال وہ شادی پر رضامند ہو جاتا ہے تو آپ کے گھر والے دوسری برادری میں شادی پر رضامند نہیں ہوں گے۔ ان حالات میں مناسب تو یہ تھا کہ آپ اپنی والدہ کو ساری بات بتا کر ان سے مدد چاہتیں لیکن چونکہ آپ کے والد بھی دوسری شادی کر چکے ہیں، اس لیے یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ اب آپ کے لیے یہی بہتر ہے کہ اس سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کرلیں کیونکہ اسی میں آپ کی عافیت ہے۔ اگر آپ نے اس سے ملنا نہ چھوڑا تو کہیں کی نہ رہیں گی۔ خود تو تباہ ہوں گی ہی اپنے گھر والوں کو بھی رسوا کریں گی۔

آئندہ خودکشی کی کوشش نہ کریں۔ حرام موت مریں تو دوسری دنیا میں بھی ہمیشہ کا عذاب بھگتنا پڑے گا۔

بیوٹی بکس

امت الصبور



ماریہ۔۔۔۔ لاڑکانہ

س : میں نے خوب صورت بنیے اور بیوٹی بکس سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔

باجی! اس بار اپنا ایک اور مسئلہ لکھ رہی ہوں میری رائٹ آنکھ کی آئی لڈ بہت سوج جاتی ہے اور آج کل تو ہمیشہ سوجی ہوئی رہتی ہے۔ مہربانی کرکے کوئی گھریلو ٹوٹکا بتایئے آپ کی بہت مہربانی ہوگی اور ایک بار میں نے بیوٹی بکس میں پڑھا تھا کہ موٹاپے کے لیے قہوہ بہت فائدہ مند ہے تو کیا Green Tea لازمی ہے یا ہم عام قہوہ پی سکتے ہیں۔ اور دن میں کتنی دفعہ پینا ہے؟

ج : ماریہ! آنکھوں کے مسائل کافی نازک ہوتے ہیں۔ اس کے لیے بہتر ہوگا کہ آپ ڈاکٹر سے رجوع کریں۔ مگر ایک سادا سا ٹوٹکا حاضر ہے۔ آنکھوں کی عمومی سوجن تھکن یا نیند کی کمی کے باعث ہوتی ہے اس لیے نیند پوری لیں مگر رات کو دیر تک جاگنا پھر صبح دیر تک سونا اچھی عادت نہیں ہے۔ جلدی سونے کی عادت ڈالیں۔ کھیرے کے قتلے کاٹ کر آنکھوں پر رکھیں۔ ٹھنڈک ختم ہوجائے تو ٹھنڈے پانی میں ڈبو کر دوبارہ رکھیں۔ کم از کم آدھے گھنٹے تک روزانہ یہ عمل کریں۔ ٹھنڈے پانی سے اکثر اپنی آنکھوں کو دھوتی رہیں۔ پانی زیادہ پیا کریں۔

موٹاپا کم کرنے کے لیے گرین ٹی بہترین ہے۔ دن میں کم از کم دو مرتبہ ضرور استعمال کریں۔ سادہ قہوہ بھی مفید ہے مگر اس میں شگر کم ڈالیں اور ہو سکے تو آدھا لیموں نچوڑ لیں۔ زیادہ بہتر اور مفید یہ ہوگا کہ آپ رات کو سوتے وقت ایک گلاس نیم گرم پانی میں ایک لیموں نچوڑ کر پی لیں۔ ایک مہینے کے مسلسل استعمال سے آپ واضح فرق محسوس کریں گی۔

جویریہ عاصم۔۔۔۔ مسلم ٹاؤن لاہور

س : میری رنگت تو بالکل صاف ہے مگر میرے ہونٹ بہت کالے ہیں۔ پلیز کوئی اچھا سا نسخہ لکھ دیں تاکہ میرے ہونٹ گلابی ہوجائیں۔

ج : ہونٹوں کے لیے لیموں بہترین ہے۔ لیموں کے چھلکے پر آدھی چٹکی باریک چینی ڈال کر ہونٹوں پر رگڑیے۔ خالی چھلکے یا خالی رس بھی ہونٹوں پر باقاعدگی سے لگانے سے ہونٹوں کی رنگت گلابی مائل ہوتی ہے۔ بالائی میں دو چار قطرے لیموں کے ملا کر بھی لگائے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ پھٹکری کی سطح ہموار کرکے ہونٹوں پر ہلکے ہاتھوں سے رگڑیں۔ اس سے نہ صرف ہونٹوں کی رنگت کھلتی ہے بلکہ ہونٹ نرم ملائم بھی ہوجاتے ہیں۔

